خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

اگست 2013

عید نمبر

فہرست



اگست 2013
جلد 41 شمارہ 4
قیمت 50 روپے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)	600 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ	5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا	6000 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اُردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

مدیر

کھی باتیں

خواتین ڈائجسٹ کا اگست کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

اگست کا مہینہ۔ برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ کا اہم سنگ میل جب دنیا کے نقشے پر ایک ملک کا نام اُبھرا۔ جس کی بنیاد ایک نظریہ، ایک سوچ اور ایک فکر تھی۔ ہندو، مسلمان دو قومیں ہیں جن کا مذہب، تہذیب، ثقافت یکسر مختلف ہیں۔ مسلمانوں کو اپنی شناخت کے لیے ایک علیحدہ وطن چاہیے۔

آج بھارت میں مسلمانوں کے بدترین حالات اور زبوں حالی دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پاکستان ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا انعام ہے۔

قارئین کو جشن آزادی مبارک۔

رمضان المبارک کا مقدس مہینہ اختتام پذیر ہو رہا ہے۔ آپ عید کی تیاریوں میں مصروف ہوں گی۔ تہوار خوشی کی علامت ہوتے ہیں۔ عربی زبان میں عید کے لغوی معنی خوشی اور مسرت کے ہیں۔ عید کے سچے اور حقیقی رنگ اسی وقت نکھرتے ہیں جب سب کے دل مسرور ہوں۔ دن بہ دن بڑھتی گرانی نے اچھے اچھے گھرانوں کو مشکل میں مبتلا کر دیا ہے۔ بے شمار گھرانے سفید پوشی کا بھرم رکھے ہوئے ہیں۔ آپ کے اردگرد بھی ایسے کچھ لوگ ضرور ہوں گے۔ اپنی خوشیوں میں انہیں ضرور یاد رکھیے گا۔

ہماری جانب سے عید کی مبارک باد قبول کیجیے۔ عید کے دن آپ سب کے لیے، ہمارے لیے، خوشیوں کا، محبتوں کا سورج لیے طلوع ہو۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- سائرہ رضا کا مکمل ناول۔ اصل حکایت،
- رشک حبیبہ کا مکمل ناول۔ زنگ آلود آئینے،
- نگہت سیما کا مکمل ناول۔ زمین کے آنسو،
- آمنہ ریاض اور حیا بخاری کے ناولٹ،
- عفت سحر پاشا، بشریٰ احمد، صدف آصف اور صبا سحر کے افسانے،
- روشن ہے صبح عید۔ قارئین سے سروے،
- سرِعام کے اینکر۔ اقرار الحسن سے ملاقات،
- اینکر، ماڈل نازیہ ملک سے باتیں،
- کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- آپ کا باورچی خانہ، ہمارے نام، خبروں دیریں، نفسیاتی ازدواجی اُلجھنیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

خواتین ڈائجسٹ کا عید نمبر آپ کو کیسا لگا؟ اپنی رائے ضرور دیجیے گا۔ ہم آپ کے خطوط کے منتظر ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

خطبہ سننا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس شخص نے اچھے طریقے سے وضو کیا، پھر جمعہ پڑھنے آیا اور نہایت توجہ اور خاموشی سے خطبہ سنا تو اس کے گزشتہ اور اس جمعہ کے دوران کے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں، بلکہ مزید تین دن کے بھی۔ جس شخص نے کنکریوں کو چھوا (یعنی دوران خطبہ ان سے کھیلتا رہا) تو اس نے بے کار حرکت کی (یعنی اپنا ثواب جمعہ ضائع کیا)۔" (مسلم)

فوائد و مسائل

1۔ اس میں ایک تو اچھے طریقے یعنی سنت کے مطابق وضو کرنے کی ترغیب ہے۔ دوسرے، جمعے کی فضیلت کا بیان ہے، جو ہر عاقل، بالغ، صحت مند اور مقیم مسلمان پر فرض ہے، چاہے وہ شہری ہو یا دیہاتی اور یہ جمعہ مسجد میں باجماعت ہی ادا ہوتا ہے، گھر میں انفرادی طور پر نہیں۔ تیسرے، ہر نیکی کا کم از کم اجر دس گنا ہے اس اصول سے ایک جمعہ پڑھ لینے سے دس دنوں کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ چوتھے، خطبے کے دوران خاموشی ضروری ہے، ورنہ جمعے کا ثواب ضائع ہو سکتا ہے۔ پانچویں، جمعے کا خطبہ بھی ضرور سننا چاہیے کیونکہ یہ دو رکعت کے قائم مقام ہے۔ خطیب کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ مختصر خطبہ دے۔

وضو کی فضیلت

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب مسلمان یا مومن بندہ وضو کرتا ہے، اپنا چہرہ دھوتا ہے تو اس کے چہرے سے پانی (کے استعمال) کے ساتھ ہی یا آخری قطرہ آب کے ساتھ وہ تمام گناہ نکل جاتے (معاف ہو جاتے) ہیں جو اس نے اپنی آنکھوں سے کیے تھے، پھر جب اپنے ہاتھ دھوتا ہے تو اس کے

ہاتھوں سے پانی (کے استعمال) کے ساتھ ہی یا آخری قطرہ آب کے ساتھ وہ سب گناہ نکل جاتے ہیں جو اس نے ہاتھوں کو استعمال کرکے کیے تھے، پھر جب وہ اپنے پیر دھوتا ہے تو پانی (کے استعمال) کے ساتھ ہی یا پانی کے آخری قطرے کے ساتھ، اس کے وہ تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں جو اس نے پیروں سے چل کر کیے تھے، یہاں تک کہ وہ گناہوں سے پاک صاف ہو جاتا ہے۔" (مسلم)

فوائد و مسائل

1۔ اس میں وضو کی فضیلت کا بیان ہے۔ ظاہر ہے جو شخص پابندی سے روزانہ پانچ مرتبہ وضو کرے گا، کس طرح گناہوں سے پاک نہ ہو گا؟ گویا وضو سے ظاہری جسمانی پاکیزگی بھی حاصل ہوتی ہے اور باطنی پاکیزگی بھی کہ اللہ تعالیٰ اس سے گناہ معاف فرما دیتا ہے۔

صغیرہ گناہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "پانچوں نمازیں، جمعہ دوسرے جمعہ تک اور رمضان دوسرے رمضان تک، درمیان کے تمام گناہوں کو دور کردینے والا ہے، (لیکن) جب کبیرہ گناہوں سے بچ کر رہا جائے۔" (مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ ایک مومن اگر کبیرہ گناہوں سے اپنا دامن بچا کر رکھے، اسی طرح حقوق العباد میں بھی کوتاہی نہ کرے تو پھر مذکورہ عبادات کے ذریعے سے وہ گناہوں سے بالکل پاک صاف رہتا ہے۔

آسان نیکی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کیا میں تمہیں ایسے اعمال نہ بتلاؤں جن کے کرنے سے اللہ گناہ مٹا دے اور درجے بلند فرمادے؟"

صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا۔

"کیوں نہیں اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ضرور بتلائیے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "گرانی اور ناگواری کے باوجود کامل طریقے سے وضو کرنا، مسجدوں کی طرف زیادہ قدم چلنا، (یعنی دور سے آنا) اور ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا۔ یہ (اجر و ثواب میں) سرحد پر مورچہ زن رہنے ہی کی طرح ہے۔" (مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ رباط، سرحد پر مورچہ زن رہ کر سرحدوں کی حفاظت کرنے کو کہتے ہیں، یعنی یہ جہاد کا عمل مسلسل ہے جس کی دوسری احادیث میں بہت زیادہ فضیلت وارد ہے۔

2۔ اعمال صالحہ اور عبادت پر مواظبت (ہمیشگی) کو رباط کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ مکارہ پر (ناگواری اور مشقت کے باوجود) مکمل وضو کرنے کا مطلب ہے، **مثلاً** "سخت سردی میں تمام اعضا کا صحیح طریقے سے دھونا نہایت گراں ہوتا ہے لیکن ایک مسلمان اللہ کی رضا کے لیے ایسا کرتا ہے، اس لیے اس کا اجر بھی بقدر مشقت زیادہ ہو گا۔

3۔ مسجد کا قرب بھی اگرچہ بعض اعتبار سے نہایت مفید ہے لیکن گھر کا مسجد سے دور ہونا اس لحاظ سے بہتر ہے کہ جتنے قدم مسجد کی طرف اٹھیں گے، اتنا ہی اجر و ثواب اس کو زیادہ ملے گا۔ اس فضیلت سے قریب رہنے والے محروم رہیں گے۔

دو نمازیں

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو کوئی دو ٹھنڈی نمازیں پڑھتا ہے، وہ جنت میں جائے گا۔" (بخاری و مسلم)

دو ٹھنڈی نمازوں سے مراد صبح اور عصر کی نماز ہے۔

فوائد و مسائل

1۔ ان دونوں نمازوں کی خصوصی حفاظت کے لیے یہ فضیلت اور ترغیب اس لیے بیان کی گئی ہے کہ ان دونوں نمازوں میں تساہل اور تغافل کا زیادہ امکان ہے۔ فجر کی نماز میں اٹھ کر آنا نہایت مشکل ہے۔ اسی طرح عصر کا وقت، دن بھر کے کاموں کو نمٹانے کے لیے نہایت مشغولیت کا وقت ہے، جس میں نماز کے فوت ہونے کا بڑا امکان ہے۔ جو شخص ان دو نمازوں کی حفاظت کر لیتا ہے، وہ دوسری نمازوں کی حفاظت بطریق اولیٰ کر لیتا ہے۔ اور یہ نمازوں کی حفاظت اسے جنت میں لے جانے کا بہترین ذریعہ ثابت ہو گی۔

2۔ ان نمازوں کو چھوڑنے پر بڑی سخت وعید ہے۔ فجر کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ یہ منافقوں پر بھاری ہے اور عصر کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس نے عصر کی نماز چھوڑ دی اس کے اعمال برباد ہو گئے۔" (صحیح البخاری)

بیماری

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب بندہ بیمار ہوتا یا سفر اختیار کرتا ہے تو اس کے لیے اس کے مثل عمل لکھ دیے جاتے ہیں، جو وہ اقامت اور صحت کی حالت میں کرتا تھا۔" (بخاری)

فوائد و مسائل :

1۔ اس سے مراد ایسے اعمال ہیں جو استحباب اور نفل کے طور پر ایک مومن کرتا ہے، ورنہ فرائض کی ادائی تو ہر حالت میں ضروری ہے۔

نیکی صدقہ ہے

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ہر نیکی صدقہ ہے۔" (اسے امام بخاری نے روایت کیا ہے اور مسلم نے اسے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔)

فوائد و مسائل :

1۔ اس سے معلوم ہوا کہ مومن جو بھی نیکی کا کام کرتا ہے، اسے اس پر صدقے کی طرح اجر ملتا ہے۔ معروف سے مراد ہر قسم کی نیکی اور بھلائی ہے۔ علاوہ ازیں معصیتوں کا ترک بھی ایک معروف (نیکی) ہے۔

درخت لگانا

حضرت جابر رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو بھی مسلمان کوئی درخت لگاتا ہے، تو اس سے جتنا حصہ کھا لیا جاتا ہے، وہ اس کے لیے صدقہ ہے۔ جو اس سے چرا لیا جائے، وہ صدقہ ہے اور جو کوئی اسے نقصان پہنچائے، وہ اس کے لیے صدقہ ہے۔" (مسلم)

اور مسلم ہی کی ایک اور روایت میں ہے۔

"مسلمان جو درخت لگاتا ہے، تو اس سے کوئی انسان، کوئی جانور اور کوئی پرندہ (جو کچھ) کھاتا ہے، وہ قیامت والے دن تک اس کے لیے صدقہ ہو گا۔"

اور مسلم کی ایک اور روایت میں ہے۔

"مسلمان جو درخت لگاتا اور کوئی کھیتی بوتا ہے، تو اس سے کوئی انسان، کوئی جانور یا کوئی اور چیز کھائے تو وہ اس کے لیے صدقہ ہے۔"

(بخاری و مسلم نے اسے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کیا ہے۔)

فوائد و مسائل

1۔ اس میں زراعت و باغبانی کی فضیلت کا بیان ہے۔ علاوہ ازیں اس کی فضیلت ہی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کاشت کی ہوئی چیزوں میں سے جو چوری یا غصب یا تلف ہو جائے اور مسلمان اس پر صبر کرے تو اسے اس پر اجر دیا جائے گا۔

2۔ زمین دار لوگوں کے کیس سب سے زیادہ عدالتوں میں ہوتے ہیں اور اس کی منجملہ وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کسی کے جانوروں نے دوسرے کی کھیتی کا نقصان کر دیا تو وہ ان سے لڑ پڑے۔ انسان اگر قرآن و سنت کے علم سے واقف ہو اور اس ثواب کا اسے علم ہو تو ایسے مسائل ہرگز پیدا نہ ہوں۔

مسجد سے دوری

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بنو سلمہ نے مسجد کے قریب منتقل ہونے کا ارادہ کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ملی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا۔

"مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ تم مسجد کے قریب منتقل ہونا چاہتے ہو؟"

انہوں نے کہا۔ "ہاں' اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ہم نے یقیناً" یہ ارادہ کیا ہے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"بنو سلمہ! تم اپنے گھروں ہی میں رہو' تمہارے قدموں کے نشانات لکھے جاتے ہیں۔" (مسلم)

ایک اور روایت میں ہے "بے شک! تمہارے ہر قدم پر ایک درجہ ہے۔" (اسے مسلم نے روایت کیا ہے اور بخاری نے بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اسی کے ہم معنی روایت کیا ہے۔)

فوائد و مسائل :

1۔ عمل میں جتنی محنت و مشقت ہوگی' جزا بھی اسی حساب سے زیادہ ہوگی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ بلاوجہ اپنے آپ کو مشقت میں مبتلا کیا جائے جیسا کہ بعض صوفی اور بدعتی کرتے ہیں۔

2۔ گھر کتنا ہی دور ہو' نماز مسجد میں آکر باجماعت پڑھنی چاہیے۔

ثواب

حضرت ابو منذر ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

ایک آدمی تھا' میں نہیں جانتا کہ کسی اور شخص کا گھر اس سے زیادہ دور ہو' اس سے کوئی نماز نہیں چھوٹتی تھی۔ اسے کہا گیا یا میں نے اسے کہا "اگر تو ایک گدھا خرید لے جس پر تو اندھیرے میں اور گرمی کی شدت میں سوار ہو کر آیا کرے؟ اس نے جواب دیا۔

"مجھے یہ بات اچھی نہیں لگتی کہ میرا گھر مسجد کے پہلو میں ہو' (اس لیے کہ) میں تو یہ چاہتا ہوں کہ (دور سے) میرا مسجد کی طرف چل کر جانا اور پھر وہاں سے میرا لوٹنا' جب میں اپنے گھر والوں کی طرف لوٹوں' یہ سب کچھ میرے حساب میں لکھا جائے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اس کی یہ بات سن کر) فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ نے یہ سب تیرے لیے جمع فرما دیا ہے۔" (مسلم)

ایک اور روایت میں ہے۔

"بلاشبہ تیرے لیے وہ ثواب ہے جس کا تو نے ارادہ کیا۔"

فوائد و مسائل

1۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اندر ثواب اخروی حاصل کرنے کا جو جذبہ بے پایاں تھا' اس میں اس کا بیان ہے۔

2۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اجر و ثواب انسان کی نیت کے مطابق ملتا ہے اور اس لحاظ سے گھر کا مسجد سے دور ہونا بھی انسان کے لیے فضیلت کا باعث ہے۔

چالیس خصلتیں

حضرت ابو محمد عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"چالیس خصلتیں ہیں' ان میں سب سے اعلیٰ (کسی کو) دودھ پینے کے لیے بکری دے دینا ہے۔ جو عامل بھی ان میں سے کسی ایک خصلت پر ثواب کی امید سے اور اللہ کی طرف سے کیے گئے وعدوں کی تصدیق کرتے ہوئے عمل کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور جنت میں داخل فرماتا ہے۔" (بخاری)

فوائد و مسائل

1۔ اس طرح کسی چیز کو اپنی ملکیت میں رکھتے ہوئے' وقتی اور عارضی فائدے کے لیے کسی کو دے دینا بھی باعث اجر ہے۔

آگ سے بچو

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے روایت

ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"تم آگ سے بچو! اگرچہ کھجور کے ایک ٹکڑے (کے صدقے) کے ساتھ ہی۔" (بخاری و مسلم)

بخاری و مسلم کی ایک اور روایت حضرت عدی رضی اللہ عنہ سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم میں سے ہر شخص سے (براہ راست) اس کا رب ہم کلام ہوگا' اس کے اور اس کے رب کے درمیان کوئی اور ترجمان نہیں ہوگا۔ چنانچہ انسان اپنی دائیں جانب دیکھے گا تو اسے اپنے آگے بھیجے ہوئے عمل ہی نظر آئیں گے۔ بائیں جانب دیکھے گا تو ادھر بھی اپنے کرتوت ہی دیکھے گا اور اپنے سامنے دیکھے گا تو جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ اس کے چہرے کے سامنے ہو گی۔ چنانچہ تم آگ سے بچو! اگرچہ کھجور کے ایک ٹکڑے کے ساتھ ہی ہو (یعنی اس کا صدقہ کر کے) اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو اچھی بات کے ذریعے سے (دوزخ سے بچو)۔"

فوائد و مسائل :

1۔ اس میں سخت ترغیب کا پہلو یہ ہے کہ ہر شخص کو براہ راست اپنے رب کے سامنے کھڑے ہو کر' جب کہ اس کے دائیں بائیں' اس کے اعمال ہوں گے' اپنے عملوں کا جواب دینا ہوگا۔

2۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ ہر شخص کو اپنی طاقت کے مطابق اللہ کی راہ میں صدقہ و خیرات کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اسی طرح خصال حمیدہ (خوش گفتاری وغیرہ) کا اختیار کرنا بھی نجات کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

3۔ قیامت والے دن صرف انسان کا عمل صالح ہی اس کے کام آئے گا۔

شکر کرنا

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"یقیناً" اللہ تعالیٰ اس بندے سے بڑا خوش ہوتا ہے جو کھانا کھائے تو اس پر اللہ کا شکر ادا کرے اور پانی پیئے تو اس پر اللہ کی حمد کرے۔" (مسلم)

فوائد و مسائل

1۔ کھانا پینا' جس میں انسان کے کام و دہن کی لذت کا سامان ہے' اس پر انسان اللہ کا شکر ادا کرے تو اس پر بھی اجر و ثواب ملتا ہے اور کھانا پینا بھی نجات کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

صدقہ

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ہر مسلمان کے لیے صدقہ کرنا (ضروری) ہے۔"

ابو موسیٰ نے پوچھا "اگر وہ صدقہ کرنے کے لیے کچھ نہ پائے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اپنے ہاتھوں سے کام (محنت' مزدوری) کرے اور (اجرت حاصل کر کے) اپنے نفس کو بھی نفع پہنچائے اور صدقہ بھی کرے۔"

انہوں نے پوچھا "اگر اسے اس کی بھی طاقت نہ ہو؟"

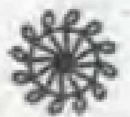
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "وہ کسی مصیبت زدہ' حاجت مند کی مدد کرے۔"

انہوں نے کہا۔ "اگر وہ اس کی بھی طاقت نہ رکھے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "وہ نیکی یا بھلائی کا حکم کرے۔"

انہوں نے پوچھا! "اگر وہ یہ بھی نہ کرے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "وہ دوسروں کو نقصان پہنچانے سے باز رہے' یقیناً" یہ بھی صدقہ ہے۔" (بخاری و مسلم)



قینچی نکل آئی

انشاجی

اخبار جہاں میں ایک مراسلہ دیکھا کہ وطن عزیز میں ایک سرجن نے ایک مریض کا آپریشن کیا اور وہ صاحب تندرست ہو کر ٹانکے لگوا کر گھر چلے گئے۔ لیکن تھوڑے دنوں بعد پیٹ میں درد کی شکایت شروع کردی۔ عزیزوں نے سوڈا واٹر پلوایا۔ چورن کھلوایا۔ جلاب دیا، لیکن شکایت رفع نہ ہوئی، اسی عطار سے یعنی اسی ڈاکٹر سے رجوع کیا تو اس نے کہا۔

"بابا میرا کام آپریشن کرنا ہے۔ پیٹ کا درد دور کرنا نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے مریض کو وہم ہے اور اس کا علاج جدید ڈاکٹری میں کیا، قدیم طب تک میں نہیں ہے۔ اس کے آگے حکیم لقمان تک جو زنانہ و مردانہ پیچیدہ و غیر پیچیدہ و غیر سنجیدہ، دیرینہ و غیر دیرینہ امراض کے مریضوں کا آخری سہارا تھے۔ لاچار تھے۔"

عزیزوں کے پرزور اصرار پر ایکسرے کرایا گیا تو آنتوں کے درمیان ایک قینچی نظر آئی۔ آپریشن کرنے والے ڈاکٹر نے کہا۔

"بابا یہ بھی تمہارا واہمہ ہے۔ پیٹ کے اندر بعض ہڈیاں قینچی کی شکل کی ہوتی ہیں۔"

لیکن آج کل زمانہ ایسا آن لگا ہے کہ لوگ ڈاکٹر کی زبان کا کم ایکسرے کا زیادہ اعتبار کرتے ہیں۔ حالانکہ ڈاکٹر صاحب اپنے فن کے ماہر ہیں۔ جس کی شہادت ان کے مریض دیں گے۔ جن میں سے آدھے اِس دنیا میں، آدھے اُس دُنیا میں بے تابی سے ان کا انتظار کررہے ہیں۔

آخر ایک دوسرے سرجن نے آپریشن کیا اور اسے حسن اتفاق کہیے کہ قینچی نکل بھی آئی۔

اتنی سی بات تھی جسے لوگوں نے یعنی مذکورہ مریض کے لواحقین نے بصورت دیگر ان کے پسماندگان کہلاتے ہیں افسانہ کردیا۔ آخر قینچی ہی تو تھی کلہاڑا تو نہیں تھا۔ اور یہ پہلے ڈاکٹر کی دیانت اور سیر چشمی نہیں تو کیا ہے کہ انہوں نے قینچی کو دیکھ کر کہا کہ یہ میری نہیں ہے۔ مریض چاہے تو اسے اپنے پاس رکھ سکتا ہے۔ اگر بالفرض یہ ان ڈاکٹر صاحب کی تھی بھی تو یہ دیکھنا چاہیے کہ اس نے مریض کے پیٹ میں اپنی طرف سے کچھ ڈالا ہی، کچھ نکالا تو نہیں۔ اگر مریض کے پیٹ میں پہلے سے قینچی ہوتی اور ڈاکٹر صاحب اسے نکال کر اپنی جیب میں ڈال لیتے تو البتہ اعتراض کی بات ہوتی۔ مریض کو تو خوش ہونا چاہیے کہ اسے بیٹھے بٹھائے اتنی اچھی چیز مل گئی۔ ہم نے پچھلے دنوں آپریشن کرایا۔ اس میں تو کچھ نہیں نکلا جو ہمارے کام آسکتا۔

بہرحال یہ اپنی اپنی قسمت ہے۔ قینچی کے بڑے فائدے ہیں۔ اس سے بال کاٹے جاسکتے ہیں۔ مونچھیں تراشی جاسکتی ہیں۔ کان کاٹے جاسکتے ہیں۔ ناخن کاٹے جاسکتے ہیں۔ لوگوں کے کپڑے کاٹے جاسکتے ہیں۔ پورے کپڑوں کے علاوہ خالی جیبیں بھی کاٹی جاسکتی ہیں اور بے روزگاری کا مسئلہ حل کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی کارخانے وغیرہ کے افتتاح کا فیتہ کاٹنے کے لیے بھی قینچی درکار ہوتی ہے۔ اس کے بغیر کارخانہ نہیں چل سکتا۔ گویا ساری مشینیں ایک طرف اور قینچی ایک طرف۔ انسان کا رشتہ حیات جلد قطع کرنے کے لیے سگریٹ مجرب اور آزمودہ چیز ہے۔ شاید اسی لیے ایک مشہور سگریٹ کا نام قینچی رکھا گیا۔

☼ ☼ ☼

☼ ☼ ☼

آدمی تھوڑا سا (زیادہ نہیں) لکھا پڑھا ہو تو قینچی کی بدولت نامی گرامی جرنلسٹ بھی بن سکتا ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ فی زمانہ لیڈر یا جرنلسٹ یا کالم نگار بننے کے لیے قلم اتنا کام نہیں آتا جتنی قینچی کام آتی ہے۔ بعض اخبار تو پورے کے پورے قینچی سے مرتب ہوتے ہیں۔ ایک بزرگ نے تو اسی حقیقت کے اعتراف میں اپنے اخبار کا نام ہفت روزہ قینچی تجویز کیا تھا۔ حضرت اسلام سلمانی بی اے نے ان کو مبارکباد کا تار بھیجا۔ جس میں اپنے تعاون کا یقین دلایا تو ان کو یہ نام بدلنا پڑا کہ کہیں لوگ اس کو باربر برادری کا اخبار نہ سمجھ لیں۔ کیونکہ فی الحال ہمارے معاشرے میں بال کاٹنے والوں کے مقابلے میں بال کٹوانے والوں بلکہ بال نہ کٹوانے والوں کی اکثریت ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جو لوگ اپنے سر کے بال کٹوانے سے کتراتے ہیں وہ ہفت روزہ قینچی کی سرپرستی کیوں کرنے لگے۔

قینچی سے اخبار مرتب کرنے میں فائدہ یہ ہے کہ مضمون نگاروں کی خوشامد نہیں کرنی پڑتی اور کاتبوں کے ناز نہیں اٹھانے پڑتے۔ تراشہ نیچے رکھا اور اس کی فلم نکالی اور جوڑ دی۔ حوالہ دینے کا ہمارے ملک میں رواج نہیں۔ حالانکہ دوسرے ملکوں میں حوالہ نہ دینے والوں کو حوالہ پولیس تک کیا جاسکتا ہے۔ بہت مہربانی کی تو مثال کے طور پر خبر یا فیچر کے شروع یا آخر میں بریکٹ میں لکھ دیا (ا - ج) یہ انشاجی یا اللہ جوایا بھی ہوسکتا ہے۔ جس نے اخبار ہذا کے لیے نامہ نگار کے طور پر محنت شاقہ سے خبر حاصل کی یا مضمون بنایا۔ اور تحقیق کریں تو اخبار جنگ میں جہاں سے وہ تحریر کاٹی گئی۔ ایسا بھی ہوا کہ کہیں سے کوئی غزل تراشی گئی تو شاعر کا نام کٹ کر اصل اخبار یا رسالے ہی میں رہ گیا اور ایڈیٹر کو از راہ ایثار اس پر اپنا نام دینا پڑا۔ بقول شخصے نام میں کیا دھرا ہے۔ لوگوں کو تو شعر پڑھنے سے یعنی آم کھانے سے مطلب ہے، پیڑ کون گنتا ہے۔

اس معاملے کا ایک قانونی پہلو بھی ہے۔ اس مریض سے دریافت کرنا چاہیے کہ اس نے اتنے دن قینچی کیوں اپنے پیٹ میں چھپائے رکھی۔ یہ اسپتال کی جائیداد تھی۔ مریض کے باوا کا مال نہیں تھا۔ اسپتال میں اس کی کسی بھی وقت ضرورت پڑ سکتی ہے۔ کسی نرس کو اپنے ناخن کاٹنے ہوں، بھویں تراشنی اور چتون تیکھی کرنی ہو، کسی ڈاکٹر کو اخبار سے معمہ کاٹنا ہو کہ آپریشن بھی کرتے جائیں، دل بہلانے کے لیے غور و فکر بھی کرتے جائیں کہ ذیل کے فقرے میں...

اکبر کے زمانے میں... اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے۔ خالی جگہ میں لفظ "شیر" لکھنا زیادہ مناسب ہوگا یا "بھیڑ" زیادہ موزوں رہے گا۔ جو محاورے سے دور، لیکن عقل کے زیادہ قریب ہے۔ بہرحال اس مریض کے خلاف پرچہ کٹنا چاہیے اور اسی قینچی سے کٹنا چاہیے۔ تاکہ آئندہ کوئی مریض چھری، چاقو، قینچی، بستر کی چادر، تکیہ، ڈاکٹر صاحب کی عینک، اسٹیتھسکوپ، نرس کی نیل پالش یا لپ اسٹک، وارڈ بوائے کی نسوار کی ڈبیہ یا فلمی گانوں کی کاپی اٹھا کر پیٹ میں نہ رکھ لے۔ آج کل کے مریضوں کا کچھ اعتبار نہیں۔ ایک مریض کے پیٹ میں تو آپریشن کرنے پر داڑھی نکلی۔ تحقیق پر معلوم ہوا کہ اس کی اپنی نہیں تھی۔ اس ڈاکٹر کی تھی جنہوں نے کہیں پہلے ان کا آپریشن کیا تھا۔ بے چارے بہت دنوں لوگوں سے منہ چھپائے پھرتے رہے جب تک کہ نئی داڑھی نہیں آگئی۔



اداکارہ، ماڈل اور فیشن ڈیزائنر

باتیں نازیہ ملک سے

شاہین رشید

1۔ اصلی نام؟
نازیہ ملک۔

2۔ گھر والے پیار سے کیا پکارتے ہیں؟
نازیہ ہی کہتے ہیں۔ مجھے آج تک کسی نے کوئی پیار کا نام نہیں دیا۔

3۔ تاریخ پیدائش/شہر؟
20 فروری/کراچی۔

4۔ قد/اسٹار؟
5 فٹ 3 انچ/Pisces۔

5۔ بہن بھائی/آپ کا نمبر؟
ہم چھ بہن بھائی ہیں۔ دو بھائی اور چار بہنیں اور میرا نمبر آخری۔

6۔ تعلیمی قابلیت؟
بی کام اور کافی سارے ڈپلوما کیے ہیں ان میں ڈپلوما ان آرٹ، ڈپلوما ان میک اپ، ڈپلوما ان "فیشن ڈیزائننگ" ڈپلوما ان فوڈ ڈپلوما ان فوٹو گرافی، ڈپلوما ان گرافک ڈیزائننگ" وغیرہ وغیرہ کیونکہ مجھے یہ سب کچھ سیکھنے کا بہت شوق تھا۔

7۔ شادی؟
جی میرا نکاح ہو گیا ہے ان شاء اللہ دسمبر تک رخصتی بھی ہو جائے گی۔

8۔ پہلا پروگرام؟
ایک کوکنگ شو کیا تھا۔

9۔ وجہ شہرت؟
کوکنگ شو ہی تھا جس کا نام "کچن کوئین" اور یہ ٹی وی ون سے ہوا تھا۔

10۔ پہلی کمائی اور کہاں خرچ کیے؟
پہلی کمائی یاد تو نہیں لیکن جب میں نے کالج جوائن کیا تھا تو ڈریسز بنا کر "آؤٹ لیٹ" پہ رکھوا دیا کرتی تھی۔

11۔ شوبز کی بڑی برائی؟
ہر برے انسان کو ہر چیز بری نظر آتی ہے اور ہر اچھے انسان کو ہر چیز اچھی نظر آتی ہے۔

12۔ دل میں گھر کرنے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟
دوسروں کے بارے میں تو مجھے نہیں پتا لیکن میں نے لوگوں کے دلوں میں اپنے پیار، اپنی محبت اور اپنے کام کی وجہ سے جگہ پیدا کی ہے اور میں اپنے آپ پر فخر کرتی ہوں اور شوبز کی وجہ سے بھی مجھے عزت ملی ہے۔

13۔ آپ کی صبح کب ہوتی ہے؟
آج کل دس بجے ہوتی ہے۔

14۔ صبح اٹھتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟
پانی پینے کو دل چاہتا ہے۔

15۔ گھر والوں کی کون سی بات بری لگتی ہے؟
کوئی نہیں۔

16۔ اپنے ملک کا کون سا قانون برا لگتا ہے؟
قانون تو سب اچھے ہیں مگر کاغذ پر ہیں۔ ان کو نافذ بھی ہونا چاہیے اور ان پر سختی بھی ہونی چاہیے۔

17۔ تہوار جوش و شوق سے مناتی ہیں؟
عید بہت شوق سے مناتی ہوں۔

18۔ اپنی شخصیت میں کیا کمی محسوس کرتی ہیں؟
اللہ نے جیسا مجھے بنایا ہے۔ بہت صحیح بنایا ہے۔

19۔ شدید بھوک میں آپ کی کیفیت؟
دماغ کام نہیں کرتا طبیعت چڑچڑی ہو جاتی ہے۔

20۔ ملک میں کون سی تبدیلی ضروری ہے؟
تعلیم بہت ضروری ہے۔ لاء اینڈ آرڈر کی صورت حال اچھی ہو جائے تو ملک میں بہت بہتری آجائے گی۔

21۔ کس دن کا شدت سے انتظار رہتا ہے؟
جب ہمارے ملک میں کوئی ایسا انسان آئے جو ملک کو سو فیصد تبدیل کر دے اور لوگوں کو اچھی زندگی دکھانے والا کوئی آجائے۔

22۔ شدید تھکن کے باوجود کہاں جانے کے لیے تیار رہتی ہیں؟
اپنے میاں سے ملنے کے لیے اور کتنی بھی تھکی ہوتی ہوں۔ ان سے ملتی ضرور ہوں۔

23۔ خوشی کا اظہار کس طرح کرتی ہیں؟
میں تو ہمیشہ خوش رہتی ہوں۔

24۔ محبت ایک بار ہوتی ہے؟
پسند تو ہر کوئی آسکتا ہے لیکن عشق کی حد تک محبت ایک ہی بار ہوتی ہے۔

25۔ بیرون ملک میں کس بات سے متاثر ہوتی ہیں؟
یہ پوچھیں کہ کس بات سے متاثر نہیں ہوتی، کون سی ایسی چیز نہیں ہے وہاں۔ جس سے انسان متاثر نہ ہو۔

26۔ طبیعت میں ضد ہے؟
بہت ضدی ہوں کام کے معاملے میں۔ اگر کوئی چیز یا کام ٹھیک نہ ہو رہا ہو تو اس کو ایک چیلنج سمجھ کر کرتی ہوں۔

27۔ دماغ کا کب گھومتا ہے؟
جب کوئی کام غلط ہو رہا ہو۔ جبکہ میری غلطی بھی نہ ہو۔

28۔ غصے میں کیفیت؟
کبھی سنا دیتی ہوں، کبھی چپ کر کے بیٹھ جاتی ہوں مگر سنا کر سوچتی ہوں کہ سنانی چاہیے بھی تھیں کہ نہیں۔

29۔ مردوں میں کیا بات اچھی لگتی ہے؟
ہارڈ ورکنگ (محنتی) مرد اچھے لگتے ہیں۔ ایسے ہارڈ ورکنگ جنہوں نے پورا انتظام ہی سنبھالا ہوا ہوتا ہے۔
30۔ اور کیا بات مردوں کی بری لگتی ہے؟
پاکستانی مردوں کی بات کریں تو انہیں چاہیے کہ وہ ہر انسان کو عزت دیں اپنے آپ کو خدا نہ سمجھیں اگر اللہ نے ان کو باوردی ہے تو۔
31۔ کوئی لڑکا اگر مسلسل گھورے تو؟
تھپڑ کھائے گا۔
32۔ پرائز بانڈ نکلنے کی منتظر رہتی ہیں؟
بالکل بھی نہیں کیونکہ مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ بالکل بھی محنت کی کمائی نہیں ہے۔
33۔ گھر میں کس کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟
ہمارے گھر میں کسی کا غصہ تیز نہیں ہے۔ سب ایک دوسرے کی عزت کرتے ہیں۔
34۔ کوئی چیز جو وقت سے پہلے مل گئی ہو؟
اللہ تعالیٰ مجھے کوئی چیز وقت سے پہلے نہیں دیتا۔ شاید اس کو معلوم ہے کہ میں قدر نہیں کروں گی۔
35۔ جوائنٹ اکاؤنٹ ہونا چاہیے یا سنگل؟
اگر میری محنت کی کمائی ہے تو میرا اپنا ہی ہونا چاہیے اور میاں کی کمائی ہے تو پھر جوائنٹ اکاؤنٹ ہونا چاہیے۔
36۔ شاپنگ میں سب سے پہلے کیا خریدتی ہیں؟
کپڑوں کی شاپنگ بہت کرتی ہوں۔ کیونکہ بیگز اور جوتوں سے زیادہ کپڑے پسند ہیں۔
37۔ پیسہ خرچ کرتے وقت کیا سوچتی ہیں؟
بہت سوچتی ہوں کیونکہ مستقبل کے لیے بچت بہت ضروری ہے، پیسے کو بہت سوچ سمجھ کر خرچ کرنا چاہیے۔
38۔ آپ کے دنیا میں آنے کا مقصد؟
انسانیت کی خدمت، اچھے طریقے سے زندگی گزارنا اور حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی ادائیگی کرنا۔

39۔ کوئی برا وقت جو آپ نے گزارا ہو؟
اصل میں ہم خود وقت کو برا بنا دیتے ہیں۔ لیکن پھر بھی برا وقت وہ تھا جب میرے ڈیڈی بہت بیمار تھے۔ گزشتہ دنوں ان کی طبیعت خراب ہوئی وہ برا وقت تھا۔
40۔ بہترین تحفہ آپ کی نظر میں؟
میری نظر میں بہترین تحفہ قرآن پاک ترجمے کے ساتھ ہے۔ مجھے بھی کسی نے یہ تحفہ دیا ہے اور مجھے بہت پسند ہے۔
41۔ کون سی بات موڈ پر اچھا اثر ڈالتی ہے؟
کوئی بھی دینی لیکچر یا قرآن کی بات موڈ پر اثر تو کیا آپ کی زندگی کو اچھا کر دیتی ہے۔
42۔ پسندیدہ پروفیشن؟
میں آج کل "میک اپ" کے پروفیشن کو بہت انجوائے کر رہی ہوں۔
43۔ اپنے لیے تعریفی جملے جو بھول نہیں سکتیں؟
اکثر لوگ کہتے ہیں کہ نازیہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ بہت تمیزدار ہے اور اس فیلڈ میں رہتے ہوئے سب سے ہٹ کر ہے۔
44۔ مخلص کون ہوتا ہے؟ اپنے یا پرائے؟
جس انسان میں انسانیت ہو گی، وہ خواہ اپنا ہو یا پرایا وہ مخلص ہی ہو گا۔
45۔ چھٹی کا دن کہاں گزارنا پسند کرتی ہیں؟
زیادہ تر گھر پر ہی ہوتی ہوں۔ کیونکہ گھر میں وقت گزارنا اچھا لگتا ہے۔
46۔ لباس میں کیا پسند ہے؟
کچھ بھی ہو اسٹائلش ہو۔
47۔ اپنی شخصیت کے لیے ایک لفظ یا جملہ؟
محبت کرنے والی انسان ہوں۔
48۔ گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟
اپنے بیڈ روم میں جہاں بیڈ پر میرا لیپ ٹاپ ہوتا ہے اور میں بیٹھ کر کام کرتی رہتی ہوں۔

49۔ کس کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً دیتی ہیں؟
سب کے سوائے ان کے جو تنگ کرتے ہیں۔
50۔ بوریت دور کرنے کے لیے کیا کرتی ہیں؟
بوریت مجھے تو ہوتی ہی نہیں ہے۔ کیونکہ میں تو اپنے کاموں میں مصروف رہتی ہوں۔
51۔ ایک کمرشل جو بہت ہٹ گیا ہو؟
جس زمانے میں پاک ٹیل ہوا کرتا تھا۔ وہ کمرشل بہت ہٹ گیا تھا۔
52۔ ایک پروگرام جو آج کل ہٹ ہے؟
"چائے ٹائم" شام چھ بجے سی این بی سی پاکستان سے روزانہ ہوتا ہے۔ لائیو پروگرام ہے۔
53۔ کسی کو فون نمبر دے کر پچھتائیں؟
بہت سے لوگ ہیں۔ بہت پچھتاتی ہوں کہ کیوں دے دیا۔ بہت پریشان کرتے ہیں لوگ۔
54۔ مہمانوں کی اچانک آمد کیسی لگتی ہے؟
اگر کوئی کام نہ کر رہی ہوں یا کہیں جا نہ رہی ہوں تو پھر بہت اچھی لگتی ہے مہمانوں کی آمد۔
55۔ اگر آپ پاور میں آجائیں تو کیا کریں گی؟
قوانین پر پابندی اور ٹیکس چوروں کو ایسی سزا دوں گی کہ مت پوچھیں اور تعلیم پر بہت توجہ دوں گی۔
56۔ کیا چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے؟
خود سے جمع کرنے کا شوق نہیں ہے۔ بس جمع ہو جاتی ہیں۔ مجھے سیپیاں اور پتھر جمع کرنے کا شوق تھا اور سوات سے تو میں پتھر لے کر آئی تھی، مگر کسی کام نہیں آئے۔ ہاں میگزین جمع کرنے کا شوق بھی تھا اور وہ میرے کام آرہے ہیں۔
57۔ نصیحت جو بری لگتی ہے؟
زبردستی کی نصیحت کوئی بھی ہو بری لگتی ہے۔
58۔ وقت کی پابندی کرتی ہیں؟
بہت زیادہ۔ کیونکہ لائیو شو کر کر کے عادت ہو گئی ہے۔
59۔ کن لوگوں پر دل کھول کر خرچ کرتی ہیں؟
اپنی امی پر اور اپنے میاں پر۔
60۔ اپنے لیے سب سے قیمتی چیز کیا خریدی؟
قیمتی تو آج تک کچھ بھی نہیں خریدا اپنے لیے۔
61۔ کھانے کے لیے بہترین جگہ چٹائی یا ڈائننگ ٹیبل؟
ڈائننگ ٹیبل۔
62۔ ایک ریسٹورنٹ جہاں کھانا کھانا پسند کرتی ہوں؟
بہت سارے ہیں۔ جہاں کا کھانا اچھا لگے، وہاں کا کھانا میں بار بار کھاتی ہوں۔
63۔ اگر آپ کے علاوہ ساری دنیا سو جائے تو آپ کیا لینا پسند کریں گی؟
لینا تو کچھ نہیں چاہوں گی۔ بس سب کچھ چینج کر دوں گی۔
64۔ انٹرنیٹ اور فیس بک سے آپ کی دلچسپی؟
بہت زیادہ۔۔۔ کیونکہ فیس بک آپ کو بہت سے لوگوں سے قریب کر دیتا ہے۔ میں تو کافی استعمال کرتی ہوں اور اپنے کام سے لوگوں کو اپ ڈیٹ رکھتی ہوں۔
65۔ آپ کی فیوچر پلاننگ؟
ایک زبردست قسم کا سیلون کھولنا ہے۔
66۔ ایک کھانا جو آپ بہت اچھا پکالیتی ہیں؟
میں اسٹیک اور چائنیز بہت اچھا پکالیتی ہوں۔
67۔ عورت نرم دل ہوتی ہے یا مرد؟
عورت۔
68۔ اگر آپ کو کوئی اغوا کرلے تو گھر والوں کی کیفیت؟
ہر کوئی پریشان ہو جائے گا اور سب ٹینشن میں آجائیں گے کہ یہ کیا ہو گیا اور اغوا کرنے والا بھی پریشان ہو جائے گا کہ کس کو اغوا کر لیا میں نے۔
69۔ اگر آپ کسی کو اغوا کریں تو تاوان میں کیا وصول کریں گی؟
نہ جی نہ۔۔۔ میں تو کسی کو بھی اغوا نہیں کروں گی۔
70۔ کن کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟
چھپکلی۔

71۔ خودکشی کرنے والا بہادر ہوتا ہے یا بزدل؟
بزدل۔
72۔ کس قسم کے رویے دکھ کا باعث بنتے ہیں؟
ہر وہ رویہ جس سے کسی انسان کو تکلیف پہنچے۔
73۔ شادی کی رسومات میں آپ کی پسندیدہ رسم؟
ساری ہی اچھی ہوتی ہیں۔ ویسے مجھے سادگی والی رسم پسند ہے۔
74۔ شادی میں تحفہ دینا چاہیے یا نقدی؟
میں تو یہ کہوں گی کہ نقدی دینی چاہیے تاکہ خرچ کرنے والوں کا کچھ ہاتھ ہلکا ہو جائے۔
75۔ ناشتا اور کھانا کس کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند ہے؟
امی کے ہاتھ کا تو لاجواب ہوتا ہے، لیکن بھابھی کے ہاتھ کا اور میری ساس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا بھی بہت پسند ہے۔
76۔ کس تاریخی شخصیت سے ملنے کی خواہش ہے؟
قائداعظم سے ملنا بھی چاہتی ہوں اور بہت سے سوال بھی کرنا چاہتی ہوں۔
77۔ اپنا فون نمبر کتنی مرتبہ تبدیل کر چکی ہیں؟
دو یا تین مرتبہ۔
78۔ کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتیں؟
اپنا بیگ، جس میں سب کچھ موجود ہوتا ہے۔
79۔ آپ کی زندگی عام لوگوں سے کتنی مختلف ہے؟
ایک شخص جب کہیں کھڑا ہوتا ہے تو اسے ایک نارمل انسان کی طرح اہمیت ملتی ہے، جبکہ ہم سے لوگ نہ صرف ملتے ہیں بلکہ توقعات بھی بہت رکھتے ہیں۔
80۔ اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتی ہیں؟
ہاں.... فوراً
81۔ آپ کی کوئی اچھی اور بری عادت؟
اچھی یہ ہے کہ انسانیت ہے۔ مجھ میں انسانوں کا خیال رکھتی ہوں اور بری عادت میرا غصہ ہے۔
82۔ ہاتھ میں پین آئے تو کیا لکھتی ہیں؟
ڈرائنگ کرتی ہوں۔
83۔ کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟
بچپن میں چھوڑ دیتی تھی۔ ویسے اب بھی کوئی ناراض ہو تو کھانا کھانے کا دل نہیں کرتا۔
84۔ مارننگ شو کے بارے میں آپ کے تاثرات؟
اچھے ہوتے ہیں اور شکر ہے کہ ابھی تک انڈیا کے اور ترکی کے مارننگ شوز پیش کرنے کا خیال نہیں آیا۔
85۔ بستر پر لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے یا کروٹیں بدلتی ہیں؟
جب بہت تھکن ہو تو فوراً" آجاتی ہے۔ ورنہ مسئلہ ہوتا ہے۔
86۔ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ کیا کیا رکھتی ہیں؟
یہ پوچھیں کہ کیا نہیں رکھتی۔
87۔ خدا کی حسین تخلیق؟
پوری دنیا۔
88۔ زندگی کب بری لگتی ہے؟
زندگی بری ہے ہی نہیں تو کیوں بری لگے گی۔
89۔ کوئی گہری نیند سے اٹھائے تو؟
بہت غصہ آتا ہے۔ کیونکہ میرا ایک شیڈول ہے کہ اس ٹائم میں سونا ہے، اس ٹائم پہ جاگنا ہے۔
90۔ زندگی کب بدلی؟
جب میں نے قرآن کو ترجمے کے ساتھ پڑھنا شروع کیا۔
91۔ جھوٹ کب بولتی ہیں؟
ہنستے ہوئے.... "جب ضرورت پڑے۔"
92۔ اپنی شخصیت میں کیا چیز بدلنا چاہتی ہیں؟
غصہ آجاتا ہے، کبھی کبھی۔ تو بس اسے کم کرنا چاہتی ہوں۔ کم ہے مگر اور کم کرنا چاہتی ہوں۔
اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے؟
اگر محنت کرتے رہیں گے تو زوال نہیں آئے گا اور اگر محنت نہیں کریں گے تو زوال آجائے گا۔

☆

ہر آنگن میں خوشیوں بھرا سورج اترے
چمکتا رہے ہر آنگن عید کے دن

عید تو نام ہے خوشیوں کا... محبتوں کا... جیسے ہی دور افق پر عید کا باریک سا چاند مسکراتا ہے۔ ہر طرف خوشی کی لہر سی دوڑ جاتی ہے۔ مبارک باد کے پیغامات موصول ہونے لگتے ہیں۔ یوں تو عید کی تیاری پورا مہینہ ہی چلتی ہے لیکن چاند رات کی تو بات ہی اور ہوتی ہے مہندی اور چوڑیوں کا اہتمام بھی چاند رات کو ہی کیا جاتا ہے۔ پھر گھر کی آرائش و صفائی کے ساتھ ساتھ کچن کو بھی دیکھنا ہوتا ہے۔

مبارک باد کی صداؤں میں عید کی پرنور صبح طلوع ہوتی ہے۔ نئے نئے اجلے کپڑوں میں نماز عید کے لیے جاتے مرد اور بچے ایک روح پرور نظارہ پیش کرتے ہیں۔

خوش رنگ کھنکتی چوڑیاں، رنگین آنچل، مہندی سے سجے ہاتھ اور کچن سے آتی مزے دار کھانوں کی خوشبو کتنے ہی رنگ بکھیر دیتی ہے۔ دوست احباب، عزیز و اقارب سے عید ملنے کا سلسلہ، مہمان نوازی اور عیدی کا لین دین عید کی خوب صورت روایتیں ہیں۔ ایسے میں اگر روٹھے من جائیں اور وہ بھی عید ملنے آجائیں۔ نگاہیں جن کی دید کی منتظر ہوتی ہیں تو عید کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔

اس بار سروے ہم نے اسی حوالے سے کیا ہے۔ سوالات یہ ہیں۔

(1) عید کے حوالے سے روایتیں اپنے اندر بڑا حسن رکھتی ہیں۔ چوڑیاں، مہندی، نئے خوب صورت ملبوسات اور مزے دار پکوان۔ آپ عید پر کیا اہتمام کرتی ہیں؟

(2) عید کے دن کا آغاز کیسے ہوتا ہے؟ نماز عید سے پہلے اور بعد میں سارا دن کیا مصروفیات ہوتی ہیں؟

(3) ہر گھر کی کچھ روایتیں ہوتی ہیں۔ ایک روایت تہواروں پر خصوصی ڈشز کا اہتمام بھی ہے۔ کیا آپ کے ہاں کوئی خاص ڈش بنتی ہے؟ ہماری قارئین کے لیے اس کی ترکیب لکھیں۔

(4) عید پر دوست احباب سے ملنے آپ جاتی ہیں یا وہ آپ سے ملنے آتے ہیں۔ عیدی لیتی یا دیتی ہیں؟

(5) مہنگائی اور حالات سے تہوار بھی متاثر ہوئے ہیں۔ آپ محدود آمدنی میں کس طرح کفایت شعاری سے تمام اخراجات پورے کرتی ہیں۔

آیئے دیکھتے ہیں۔ ہماری قارئین نے ان سوالات کے کیا جوابات دیے ہیں۔

روشن ہے صبح عید

ادارہ

حرا قریشی... بلال کالونی ملتان

بڑے ناز و انداز سے سنورتی ہے
عید دلہن کی طرح لگتی ہے...

1۔ اہتمام عید... عام دنوں سے بالکل منفرد اور انوکھا ہوتا ہے۔ جیسے ہی مغرب کے وقت سحاب مل کر شفق اوڑھ لیتے ہیں۔ سورج کسلمندی سے آنکھیں موند لیتا ہے۔ باد صبا حسین دوشیزاؤں کے آنچل اور گیسوؤں سے چھیڑ چھاڑ کرتے گزرتی ہے، گلدان میں نئے گل



لگا دیے جاتے ہیں، بس نہ پوچھیے کہ کیا خوشی کا عالم ہوتا ہے... ؟ کھنکتی چوڑیاں، مہندی سے بھری کلائیاں اور ہاتھ، ہم رنگ ملبوسات، میچنگ جیولری الغرض جا بجا حسن ہی حسن بکھرا دکھائی دیتا ہے چونکہ بازار جانے سے مجھے کوفت ہوتی ہے اسی لیے جب والدہ حیات تھیں تو بابا اور امی جان خود سب کے کپڑے لے دیا کرتے تھے اور ہمیں پسند بھی بخوبی آجاتے تھے۔ کچھ لوگ نہیں سدھرتے کبھی (اپنی بات کر رہی ہوں) ابھی بھی بہن خود ہی لے آتی ہے اور مجھ ناچیز کو بازار جانا نہیں پڑتا۔

کچھ ہمشیرہ ہوتی ہیں نا، بہت نایاب، بہت پیاری، وہ بھی ان میں سے ایک ہے۔

وہ حسن و دلکشی کو جانتے پہچانتے کب ہیں؟
جن کو کھلکھلاتی لڑکیاں اچھی نہیں لگتیں!

کوئی خود تعریف کر دے، ہمارے عام دنوں سے الگ اہتمام کو دیکھ کر تو سر آنکھوں پر، ورنہ ڈھیٹ بن کر خود پوچھ لیتے ہیں کہ کیسے لگ رہے ہیں؟

2۔ تمام کمروں کی آرائش و زیبائش اور چیدہ چیدہ صفائی پہلے ہی مکمل کر لی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اعتکاف سے اٹھنے کے بعد مبارک باد وصول کرنا، ایک نور کا ہالہ سا اپنے گرد محسوس ہوتا ہے، تھکن کا احساس اپنا بوریا بستر سمیٹ کر کہیں دور کوچ کر جاتا ہے۔ نصف شب سے بھی زیادہ وقت گزر جاتا ہے پتا ہی نہیں چلتا۔ گویا کوئی گھڑی کی سوئیاں بہت تیز رفتاری سے آگے کر رہا ہو۔ رات برائے نام نیند لینے کے باوجود علی الصباح اٹھ جاتے ہیں۔

نماز فجر کے بعد صفائی کرنے کا بیڑا اٹھایا جاتا ہے پھر سوئیاں بنتی ہیں پھر نماز عید کے بعد بالخصوص شکرانے

کے نفل ادا کرتی ہوں۔ پھر بابا' بھائی وغیرہ سے اس طرح عید ملتے ہیں جیسے صف میں کھڑے باری کے منتظر ہوں، محلے سے جو چیزیں میٹھے میں آتی ہیں ان کو ٹھکانے لگانے کا سلسلہ ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے پھر اسٹوڈنٹس اور آہستہ آہستہ عزیز و اقارب آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ مہمانوں کو کولڈ ڈرنک کے ساتھ ساتھ نمکین اور میٹھی ڈش بھی سرو کی جاتی ہے۔ ہلکی پھلکی گپ شپ چلتی رہتی ہے۔ برتن ساتھ ساتھ سمیٹتی رہتی ہوں اور اسی طرح کچن بھی۔ ننھے 'نٹ کھٹ' شرارتی بچوں کی وجہ سے جو تھوڑی بہت بے ترتیبی ہوتی ہے اسے بھی خوش اسلوبی کے ساتھ ٹھیک کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح مل جل کر کام کرنے سے بہت سے کام با آسانی اور جلدی نمٹ جاتے ہیں پتا ہی نہیں چلتا' شام کب ہوئی؟ چونکہ سارے دن کی تھکن سر تا پا جسم پہ طاری ہوتی ہے لہٰذا نیند کی دیوی کسی مہرباں ماں کی طرح اپنی آغوش میں بھر لیتی ہے۔ عید دبے پاؤں آتی ہے اور دبے پاؤں ہی گزر جاتی ہے۔

4 ۔ عید کے پہلے دن تو مشکل ہی ہوتا ہے کہ کہیں نکلا جائے' ہاں جب عزیز و اقارب آجائیں تو اچھا لگتا ہے اور کوشش ہوتی ہے کہ اہتمام مہمانوں کے شایان شان کیا جائے۔ اگر بابا کہیں لے جائیں یا سب مل کر کہیں جانے کا پروگرام بنالیں تو عید کے پر رونق دن پر قوس قزح کے رنگ بکھر جاتے ہیں۔ جہاں تک رشتہ داروں کے ہاں جانے کی بات ہے تو جناب ہماری کچھ یہ منطق ہے۔

بڑے لوگوں سے ملنے میں ہمیشہ فاصلے رکھنا
جہاں دریا سمندر سے ملا' دریا نہیں رہتا۔۔۔!

احباب میں سے کسی کی طرف اگر عزیز برادر لے جائیں (جو شاذ و نادر ہی ہوتا ہے) تو خوشی دیدنی ہوتی ہے اور اگر ہم کسی کو دعوت دیں اور وہ پیاری سی دوست ہماری آجائے اپنے قیمتی گراں قدر لمحوں سے کچھ وقت نکال کر تو گھر کے آنگن کی تپتی دھوپ ٹھنڈی لگتی ہے اور یوں لگتا ہے سورج کی آڑ میں چھپا چاند بھی اپنی چاندنی چہار سو بکھیر رہا ہو' بادل چاہت سے بھری خنک ہوا میں لپٹی سرد بوندیں لے کر اپنی آمد کا عندیہ دینے کے لیے بے تاب ہو۔

جہاں تک عیدی لینے اور دینے کی بات ہے تو یہ دونوں کام سرانجام دیے جاتے ہیں۔ بھائی' بابا سے اپنا حق سمجھ کر عیدی وصول کی جاتی ہے۔

5 ۔ کفایت شعار تو ہم شروع سے ہیں۔ مجھے یاد ہے ہمارے بڑے بھائی جب مجھے ہر ہفتے جیب خرچ کے لیے پانچ روپے دیا کرتے تھے' میں وہ جمع کر لیا کرتی تھی اور ان سے جمع شدہ رقم سے بچوں کے رسائل تعلیم و تربیت' نونہال' چندا' بچوں کا باغ' بچوں کی دنیا لیا کرتی تھی۔ عید پر تو کچھ زیادہ ہی فراخ دل ہو جاتے ہیں کہ جناب اپنی خیر ہے ایک سوٹ بھی چلے گا' بچوں (بھانجا' بھانجی) کی فرمائش پوری ہونی چاہئیں۔ چونکہ مہنگائی نے اچھے بھلے لوگوں کے اوسان خطا کر دیے ہیں۔ تو جناب بچت کچھ یوں کرتے ہیں کہ اگر زیادہ قیمتی لباس نہ خرید سکے تو نارمل لے لیتے ہیں کہ بہت عام بھی نہ لگے اور خاص بھی نہ' ہر چیز حفاظت سے رکھتے ہیں احتیاط سے استعمال کرتے ہیں سو پچھلے سال کی بھی چیزوں پر گزارہ کر لیا جاتا ہے۔ سادہ سے لوگ ہیں' لباس پر کتابوں کو ترجیح دیتے ہیں اس پر بھی یہ ظلم ہے کہ ان کی قیمتیں آسمان کو چھو رہی ہیں۔ بس خدائی مدد کے طلبگار ہیں۔

ایک آخری بات کہ ہمیں اس خاص موقعوں پر ان نادار لوگوں کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے' جو خوددار ہیں' آگے بڑھ کر سوال نہیں کرتے' اصل میں وہی ہماری امداد کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر شخص کو اس پر مسرت موقع سے خوشیاں کشید کرنے کی توفیق دے۔ آمین!

سنبل ملک

1 ۔ میں عید پر خصوصی اہتمام کرتی ہوں۔ چونکہ میں خود سلائی کر لیتی ہوں اس لیے روزوں سے پہلے ہی اپنے اور ماما کے دو' دو سوٹ سلائی کر کے رکھ لیتی ہوں۔ گروسری بھی ہم لوگ رمضان سے ایک دو دن پہلے خرید لیتے ہیں پھر پورا رمضان صرف اور صرف عبادت میں گزرتا ہے جبکہ چوڑیوں اور مہندی کی خریداری چاند رات کو ہی کرنے میں مزا آتا ہے۔ میری ماما چونکہ اعتکاف کرتی ہیں۔ سو جب وہ اعتکاف سے فارغ ہوتی ہیں تو پھر میرے ساتھ چاند رات کو شاپنگ کرنے جاتی ہیں۔

2 ۔ عید کے دن کا آغاز نماز فجر سے ہی ہوتا ہے' نماز کی ادائیگی کے بعد تلاوت کلام پاک پھر سویاں بنائی جاتی ہیں جو محلے میں بانٹی جاتی ہیں پھر گھر کی صفائی پھر خود کی تیاری پھر میں اور میری ماما قریبی مسجد میں نماز عید ادا کرنے جاتے ہیں۔ واپسی پر ہم لوگ دوسرے راستے سے واپس آتے ہیں۔ سنت کے مطابق' گھر آکر سب سے عید ملتے ہیں ابو سے' بھائیوں سے' پھر دوپہر کی تیاری شروع دوپہر کے کھانے کے ساتھ ساتھ مہمانوں کی آمد بھی جاری رہتی ہے۔

3 ۔ ہمارے پورے خاندان میں امی کے ہاتھ کے دہی بھلے مشہور ہیں سویاں تو بنتی ہیں مگر میرے کزنز وغیرہ خاص طور پر یہ ڈش شوق سے کھانے عید کے دن ہمارے گھر آتے ہیں جسے میں بھی شوق سے بناتی ہوں ۔ ترکیب یہ ہے۔

دہی بھلے

چنے	ایک پاؤ
چنے کی دال	ایک پاؤ
آلو	ایک پاؤ
آدھا کلو دہی	
دہی	آدھا کلو
ٹماٹر	چار عدد
سبز مرچیں	آٹھ عدد
پیاز	دو عدد



دھنیا۔ پودینہ	آدھی گڈی
نمک	حسب ذائقہ
چاٹ مسالہ	آدھا پیکٹ
بیسن	آدھا کپ
زیرہ	چٹکی بھر
تیل	آدھا کپ

ترکیب:

چنے چار گھنٹے پہلے بھگو دیں۔ بہتر ہے چاند رات کو بھگو دیں۔ دال کو بھی چن کر رات کو ہی بھگو دیں۔ صبح اٹھ کر چنے اور آلو ابال لیں۔ دال کو گرینڈ کر لیں۔ گرینڈ کرنے کے بعد تھوڑا سا زیرہ اور میٹھا سوڈا شامل کر لیں۔ ایک کڑاہی میں تیل ڈال کر گرم کریں اور گرینڈ کی ہوئی دال کو مٹھی میں گول گول دبا کر بھلے کی شکل میں کر کے تیل میں ڈالتے جائیں۔ اب دونوں طرف سے ہلکا براؤن ہو جائے تو ایک برتن پانی کا پاس رکھیں۔ نکال کر اس میں ڈالتے جائیں۔ پھر بیسن کو

پانی سے گاڑھا سا بنالیں اور اس تیل میں سوراخ والی چھلنی کے ذریعے چھوٹی چھوٹی پکوڑیاں تل لیں اور علیحدہ پانی کے برتن میں ڈالتی جائیں۔

جب آلو اور چنے گل جائیں تو ایک باؤل میں نکال لیں۔ آلو چھیل کر باریک کاٹ لیں۔ اب ان میں باریک باریک پیاز، سبز مرچیں اور ٹماٹر کاٹ کر ڈالیں اور چنے، آلو، پیاز، سبز مرچیں، ٹماٹر مکس کرلیں۔ دہی کو پھینٹ لیں۔ پودینا اور دھنیا کو گرینڈ کرلیں۔ آلو چنے کے مکسچر میں پانی سے پکوڑیاں نکال کر شامل کرلیں۔ پھر سرو کرتے وقت ایک ایک بھلہ دہی، سبز چٹنی اور چاٹ مسالا ڈال کر سرو کریں۔

4 ۔ عید پر پہلے دن تو میں کسی کے گھر نہیں جاتی۔ البتہ میرے کزنز وغیرہ اور چند دوستیں ہیں، جو پڑوس میں رہتی ہیں عید کے دن ملنے آتی ہیں۔ جبکہ میں دوسرے دن ملنے جاتی ہوں۔ عیدی ملتی ہے، مگر ماما اور بابا سے۔ ایک بھائی بڑا ہے، شادی شدہ تو وہ ملنے آتا ہے۔ مگر کبھی عیدی دی نہیں اس نے (پتا نہیں کیوں؟) تایا، تائی جی آتے ہیں۔ دادی بھی ہیں۔ مگر عیدی نہیں ملتی۔ جبکہ میرے دو چھوٹے بھائی ہیں۔ میں ان کو ضرور عیدی دیتی ہوں۔

5 ۔ بہت ہی اچھا سوال ہے یہ۔ میرا خیال ہے کہ کفایت شعاری بہت اچھی عادت ہے۔ مہنگائی تو ہے، سو ہے۔ مگر بہت ساری ہماری اپنی غلطیاں یا فیشن کہہ لیں، مہنگائی کا سبب بھی ہیں۔ اگر ہم کھانا ایک وقت میں ایک ہی بنالیں۔ کم مقدار میں بنائیں تو بہت حد تک ہم مہنگائی کا سدباب کرسکتے ہیں۔ جیسے میں اپنے کپڑے خود سلائی کرتی ہوں۔ کڑھائیاں کرکے گفٹ بھی کرتی ہوں۔ ڈیکوریشن پیسز خود بنالیتی ہوں۔ عید کے کارڈز خود بنا کروش کرتی ہوں۔ پیکنگ خود کرتی ہوں۔ بازار سے ہم کبھی کوئی کھانا پیک کرکے نہ لاتے ہیں نہ خود ہوٹلنگ کرتے ہیں۔ گھر کے کام کاج بھی ماما اور میں مل کر کرلیتے ہیں۔ ہمارے گھر میں بھی بھائی اور بابا خود اٹھ کر پانی تک نہیں پیتے۔ مگر ہمیں کام کا کریز ہے۔ کوئی وقت ہم فارغ بیٹھ کر نہیں گزارتے تو ہم لوگ محدود سی آمدنی میں اچھا گزارا کرلیتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ گھر بھی اپنا ہے۔

ثمینہ اکرم..... لیاری کراچی

1 ۔ مہندی، چوڑیاں، نئے ملبوسات اور روایتی کھانے یہ سب اور عیدالفطر لازم و ملزوم ہیں۔ ان چیزوں کے بغیر عید کا رنگ پھیکا لگتا ہے۔ میں عید پر کیا اہتمام کرتی ہوں؟ جناب! عید تو اصل میں بچوں کی ہوتی ہے اور میں بھی عید پر اپنے بچوں کے لیے ان سب چیزوں کا لازمی اہتمام کرتی ہوں۔ میری عید کی تیاریاں ہر سال رمضان المبارک کے شروع ہونے سے پہلے پہلے مکمل ہوجایا کرتی تھیں۔ بازار ہمیشہ میں اپنے بیٹے معیز کے ساتھ ہی جایا کرتی تھی۔ وہ جوڑیا بازار ہو یا پھر جامع کلاتھ، زینب مارکیٹ ہو یا بولٹن مارکیٹ۔ اس بات سے قطع نظر کہ معیز کو دکان دکان پھرنے سے کتنی چڑ ہوتی ہے اور اسے پیدل چلنے کا کتنا شوق ہے۔ مجھے اکثر جامع کلاتھ سے پیدل کھارادر تک لے آیا کرتا تھا۔ باتیں کرتے ہوئے راستے کا پتا ہی نہیں چلتا۔ جب میں تھک جاتی تو کہتا کہ "امی! پیدل چلنے سے عمر لمبی ہوتی ہے۔" دیکھ لیں۔ اس قدر پیدل چلنے والا کس قدر مختصر عمر لے کر آیا تھا۔ ہاں تو بات ہو رہی تھی عید کے اہتمام کی۔ اس سال لمحہ لمحہ میں معیز کو MISS کررہی ہوں۔ یقین جانیں! اس سال میں میرے سے کسی بھی بازار نہیں جاسکی اور نہ ہی میری کوئی عید کی تیاری ہوسکی۔ یہ تو میرے تصور میں بھی نہیں تھا کہ کوئی عید مجھے اپنے شہزادے بیٹے کے بغیر بھی منانا پڑے گی۔ بلکہ اب تو ہر عید ہی اس کے بغیر گزرے گی۔ پھر اس مرتبہ میرے لیے عید کا اہتمام کس قدر دشوار ہے۔ یہ عید تو میری کسی اہتمام کے بغیر ہی سونی اور سوگوار گزرے گی۔

2 ۔ ہر سال عید کے دن کا آغاز اذان فجر کے ساتھ ہوجاتا ہے۔ ہمارے گھر میں سب اذان فجر کے ساتھ بستر چھوڑ دیتے ہیں اور اکرم اور اسلم بھائی (جیٹھ)



معیز، طلحہ وغیرہ مسجد کی پہرہ داری کرتے ہیں۔ اس لیے جلدی مسجد چلے جاتے ہیں۔ عید کی نماز سے پہلے میں کچن میں مصروف ہوجاتی ہوں۔ شیر خورمہ کی تیاری کے ساتھ ساتھ ناشتا بھی تیار کرتی ہوں۔ غسل کرکے نماز عید ادا کرتی ہوں۔ نماز عید کے بعد آنے جانے والوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ محلے سے بھی بچے آتے ہیں اور دوسرے عزیز و اقارب بھی۔ یہاں صرف ہماری سسرال کی فیملی ہے، مگر اس قدر جان پہچان کے لوگ عید ملنے آتے ہیں کہ سارا دن فرصت نہیں ملتی۔ ہمارا حلقہ احباب کافی وسیع ہے۔ دوپہر کے کھانے کی تیاری کے ساتھ ساتھ ملنے جلنے والوں کی خاطر مدارت بھی چلتی رہتی ہے۔

یہی تو عید کا حسن ہے۔ پورے دن ہمارے گھر رونق لگی رہتی ہے۔ جو کھانے کے ٹائم آئے تو وہ بغیر کھانا کھائے نہیں جاتا۔ یہ ہماری روایت ہے۔

3 ۔ عید کے روز میں اپنے گھر بھی کافی کچھ اہتمام کرتی ہوں۔ اپنے بچوں کی پسند کو مدنظر رکھتے ہوئے اور دوست احباب کی خاطر مدارت کے لیے بھی۔ یہاں میں اپنی قارئین کے لیے کھوئے والے شیر خرما کی ترکیب لکھ رہی ہوں، جو بہت مزے دار ہوتا ہے۔ چونکہ یہ عید "میٹھی عید" کے نام سے موسوم ہے۔ اس لیے یہ سوئٹ ڈش ضرور بنائیں اور تعریف سمیٹیں۔

کھوئے والا شیر خرما

اجزا :

سویاں	ایک پیکٹ
دودھ	تین کلو
کھویا	ایک پاؤ
شکر	دو کپ
گھی	ایک چھٹانک
سبز الائچی	چار عدد

چھوہارے	آدھا پاؤ
پستے	آدھا پاؤ
بادام	ایک پاؤ
ثابت کھوپرا	ایک پاؤ

میوہ آدھا آدھا بھی ڈال سکتی ہیں

ترکیب :

سب سے پہلے دودھ کو ہلکی آنچ پر خوب پکالیں۔ سب میوہ کو باریک کوٹ کر ذرا سے گھی میں تل لیں۔ ایک دیگچی میں گھی گرم کر کے سبز الائچی کڑکڑالیں۔ سویاں ڈال کر ہلکا سا فرائی کر لیں۔ دودھ ٹھنڈا کر کے سویوں میں شامل کر دیں۔ شکر اور سارے میوے بھی شامل کر دیں۔ دس منٹ تک پکائیں۔ چمچہ چلاتی رہیں۔ آخر میں کھویا شامل کر کے پانچ منٹ بعد چولہا بند کر دیں۔ ٹھنڈا ہونے پر پیش کریں۔ یہ شیر خورما گاڑھا نہ ہو۔ بلکہ پتلا ہی رہے۔ اگر گاڑھا ہو جائے تو دودھ اور شامل کر لیں۔ فریزر میں ٹھنڈا کرنے پر بھی بہت ذائقہ دار لگتا ہے۔

(نوٹ۔ اگر میوہ زیادہ لگے تو آپ کم بھی ڈال سکتی ہیں۔)

4 ۔ عید کے پہلے دن ہمارے گھر سب دوست احباب اور سسرالی رشتہ دار عید ملنے آتے ہیں۔ عید کے پورے دن اتنی مصروفیت رہتی ہے کہ کہیں نکلنے کا ٹائم ہی نہیں ملتا۔ عید پر میرے اسٹوڈنٹس اور میرے بچوں کے دوست بھی عید ملنے آتے ہیں۔ جبکہ میکے سے کبھی کوئی نہیں آتا۔ کیونکہ امی کا گھر شاہ فیصل کالونی میں ہے۔ اس لیے ہماری پوری فیملی (ذرناجی اور میں) عید کے دوسرے روز امی کے گھر عید ملنے جاتے ہیں۔

عید پر تو میں سب کو عیدی دیتی ہوں۔ محلے کے بچوں کو ٹم نے ٹیوشن اسٹوڈنٹس کو اور سسرال میں بھی۔ البتہ تمیم باجی (نند) سے ضرور عیدی ملتی ہے۔ امی کے گھر میں بھی بھائی وغیرہ اور شکیلہ باجی عیدی ضرور دیتی ہیں۔ جبکہ پھپھو اور خالہ کی حیثیت سے میں بھی عیدی دیتی ہوں وہاں۔ یہاں سسرال میں بھی ممانی کی حیثیت سے عیدی دیتی ہوں۔ جو کہ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔

5 ۔ مہنگائی سے زیادہ لیاری کے خراب حالات کی بدولت ہمارے علاقہ کی رونقیں ماند پڑی ہیں۔ لیاری وہ علاقہ ہے جہاں رات میں بھی دن کا سماں ہوتا تھا۔ مگر اب تو دن میں بھی ہولناک سناٹا چھایا رہتا ہے۔ علاقہ مکینوں کے ذہنوں پر ان دیکھا خوف چھایا رہتا ہے اور ہزاروں لوگوں کی نقل مکانی کے سبب بھی یہاں عید اور رمضان کی رونقیں دیکھنے میں نہیں آرہیں۔ بازار میں بھی پہلے جیسا رش دیکھنے میں نہیں آرہا۔ مہنگائی جو کہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہی جارہی ہے اور بے روزگاری اس سے تیز رفتار میں بڑھ رہی ہے ۔ جیسے ان دونوں میں ریس لگی ہوئی ہے۔ نامعلوم کہاں جا کر یہ دونوں سانس لیتی ہیں۔ مذہبی تہوار تو حالات جو بھی ہوں منانا تو لازمی امر ہے۔

عید کے لیے خریداری میں ہر سال تھوڑی تھوڑی کرتی ہوں۔ اکٹھی ایک ساتھ نہیں کرتی۔ محدود آمدنی میں عید کی تیاری کفایت شعاری سے ہی ہو سکتی ہے ۔ جبکہ میرا ہاتھ بہت کھلا ہے۔ کنجوسی مجھ سے ہو ہی نہیں سکتی۔ نہ لینے دینے کے معاملہ میں اور نہ گھریلو معاملے میں۔ یہ اور بات ہے کہ فضول خرچی نہیں کرتی۔ مگر چونکہ سب کے لیے بہت اچھی نیت سے کام کرتی ہوں۔ اس لیے میرے مال میں بہت برکت ہوتی ہے۔ اسی لیے مجھے اس سلسلے میں کبھی کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔ اسی آمدنی میں اپنے بچوں کے لیے گھر کے لیے اور دینے دلانے کے لیے بھی اچھے سے اچھا کرتی ہوں۔ تاکہ اللہ مجھ سے راضی ہو جائے۔

رمضان میں بھی خرچا بہت بڑھ جاتا ہے۔ پھر عید

بقیہ صفحہ نمبر 283

عنیزہ سیّد

جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم

ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بندر کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا، لیکن اس کے کزنز اسے زبردستی وہاں سے لے گئے۔ وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی وہ اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فنون لطیفہ اور دیگر فنون سے گہرا شغف ہے تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں بلال کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے، کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد سنجیدگی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

ماہ نور گاؤں میں بابے منگو کے میلے میں گئی تو اسے وہاں ایک لوک فنکار کی آواز نے مسحور کر دیا۔ وہ اس سے ملنے گئی۔ تو اسے لگا جیسے وہ فنکار وہی بندر والا ہو۔ اس نے بھی ماہ نور کو شناسا نظروں سے دیکھا۔

خدیجہ نذر فاطمہ، ماہ نور کی خالہ ہیں۔ ماہ نور ان سے ملنے گئی تو وہ دونوں "شہناز" نامی ایک رشتے دار خاتون کو یاد کر رہی تھیں، جس نے گلوکاری کے شوق میں گھر والوں سے بغاوت کی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس کے قتل کی خبر ہی ملی تھی۔

سعد کی نیٹ پر اپنی بہن نادیہ سے بات ہوئی جو پڑھائی کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم ہے۔

سترہویں قسط



"یک طرفہ معلومات پر فیصلہ صادر کرنا بے انصافی نہیں کہلائی جاتی کیا؟"

"یک طرفہ ضرور ہیں لیکن روشن اور واضح ہیں' اتنی روشن کہ تصویر کا اگلا رخ جتنا واضح ہے اتنا ہی پچھلا بھی ہے۔"

"مگر سوال کرنا چاہیے' سوال تو کٹہرے میں کھڑے نامزد ملزم سے بھی کیے جاتے ہیں' جرح کی زد میں تو وہ بھی آتا ہے۔"

"آپ بھی خوب کہتے ہیں سائیں جی!" ایک طنزیہ مسکراہٹ سعد کے چہرے پر پھیلی۔ "سوال جس سے کیے جاتے ہوں' جرح جس پر کی جاتی ہو' وہ شخص اتنا برق رفتار ہو کہ کٹہرے کی نوبت آنے ہی نہ دے' اتنا اسمارٹ ہو کہ خود کو ہر مرحلے پر اپنے ہی حصار میں یوں سمیٹ لے کہ دیکھنے والا بنا کسی سوال کے اسے معصوم قرار دے کر ہر الزام سے بری کردے تو پھر کیسی جرح اور کیسے سوال؟"

"یہ آپ نہیں بول رہے' آپ کی جوانی' اور جوانی کا گرم خون بول رہا ہے باؤجی!" اختر نے گڑگڑی منہ سے ہٹانے کے بعد کہا آپ نہیں آپ کے جذبات بول رہے ہیں جو "Seeing is Believing" پر یقین رکھتے ہیں' جن کے سامنے تفصیل کی کسوٹی اور استدلال کی پرکھ کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اسی لیے میں کہتا ہوں ذرا سنبھل کر' تھوڑا رک کر' ذرا سا سوچ کر کوئی قدم اٹھاؤ۔"

اس نے سرخ سرخ آنکھوں سے سعد کو دیکھا جس نے اس کی بات سن کر یوں سر ہلایا تھا جیسے اسے اس کی بات دیوانے کی بڑ لگی ہو۔

"فقیر کے لنگر پر آج کل شربت بھی ملتا ہے' ٹھنڈا اور فرحت بخش' ایک پیالہ اس کا پیو' افاقہ ہوگا۔" اختر نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر کٹیا کے دروازے تک گیا۔

"چھوٹے سرکار! باؤ صاحب کو ایک پیالہ شربت کا تو پلاؤ بیٹا جی۔" اختر نے اپنے واحد بالکے کو مخاطب کیا۔

"میں کوتاہ نظر ضرور ہوں سائیں جی!" اختر واپس آکر سعد کے سامنے بیٹھا تو سعد نے سر جھکا کر کہا۔ "میری عقل کا قد بھی بہت چھوٹا ہے' شاید زمین سے پھوٹتی نئی فصل کی طرح محض اپنے اوپر بڑھنے کی ابتدائی منزل پر لیکن نظر اور عقل تو سہی' جسم کے باقی اعضا کی طرح دل و دماغ عطا بھی تو ہوتے ہیں نا۔"

"او باؤ جی! میں شک نہیں کررہا' میں شک نہیں کیا کرتا۔" اختر نے مسکرا کر کہا۔ "تو پہلے فقیر کے ڈیرے کا ٹھنڈا شربت پیو پھر آگے بات کرتے ہیں۔" اختر کا بالکا اس کے لیے شربت کا پیالہ لے آیا تو اختر نے اس کی بات کا جواب درمیان میں روکتے ہوئے اسے ایک بار پھر شربت کا پیالہ پینے کی پیش کش کی۔ سعد نے بالکے کے ہاتھ سے مٹی کا پیالہ لے کر سرخ محلول کی اوپری سطح پر نظریں جمائیں۔

"شک تو آپ کررہے ہو باؤ جی؟" اختر قدرے بلند آواز میں ہنسا۔ لال رنگ ہے اور سفید چینی' تخم بالنگا ہے اور چار مغز' بادام کا عرق ہے اس میں۔ گھبراؤ نہیں پی جاؤ' برف کے سلیب لوگ خود چھوڑ جاتے ہیں ان کے بارے میں' میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ کیسے پانی سے جمائے جاتے ہیں' البتہ یقین سے یہ کہہ سکتا ہوں اس میں بوٹی ہے نہ کوئی دوسرا نشہ' بلا جھجک پی جاؤ۔"

"اس وقت تو میرے پاس میری شناخت کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے سائیں جی" سعد نے نیچی آواز میں کہا اور اپنے ہونٹ پیالے سے لگالیے۔ "شک میں نے اس وقت بھی نہیں کیا تھا جب میرے پاس قیمتی گاڑی بھی تھی' میرے والٹ میں رقم بھی تھی' میرا بند آئی فون گاڑی کی سیٹوں کے نیچے پڑا تھا' میرے کریڈٹ کارڈز' میرا شناختی کارڈ سب میرے پاس تھے اور نور فاطمہ نے سل پر پسا ملغوبہ مجھے روٹی پر لگا کر پیش کیا تھا۔ میں نے وہ بھی بغیر شک کے کھالیا تھا' کیونکہ مجھے اپنے لیے شاید کوئی وہم ہے نہ دکھ' جو میں آپ سے عرض کررہا ہوں وہ ان لوگوں کے لیے

ہے جو متاثر ہوئے' جن کی زندگیوں کی شکلیں بگڑ گئیں' جن کے دل بنجر ہوئے' جو خاردار راستوں کے مسافر بنے۔ میں دیکھ بھی لوں اور آنکھیں بند کرلوں۔ یہ کیسے ممکن ہے۔"

اس نے شربت کے چند گھونٹ پینے کے بعد کہا اور کہنے کے بعد پیالہ دوبارہ ہونٹوں سے لگالیا۔

"او باؤ جی! میں غلط نہیں کہتا آپ کو' بس اتنا کہتا ہوں کہ اس پر بھی تو غور کرو کہ گاڑی سیدھا راستہ چھوڑ کر نور فاطمہ کی جھونپڑی کو جانے والی سڑک پر کیوں چڑھ جاتی ہے' دماغ گاڑی کو پکڑنے جانے والی جگہ پر چھوڑ کر ٹانگوں کو بنی گالہ تک پبلک ٹرانسپورٹ پر سفر کرنے اور پیدل چلنے پر کیوں لگا دیتا ہے' دل ہاتھ میں بھرا پستول پکڑ کر کسی کے سر کو نشانہ بنانے کے بجائے فقیر کی کٹیا تک کیوں لے آتا ہے۔"

"یہ سوال دل میں اٹکتا ہے اور دماغ کو کھپاتا ہے' مگر پھر شعوری اور لاشعوری جبلت دل اور دماغ پر حاوی ہوجاتی ہے۔" سعد نے پیالے میں موجود باقی محلول ایک سانس میں ختم کرنے کے بعد کہا۔

"آپ تو عالم انسان ہیں اور شاید عامل بھی ہیں۔" اس نے اختر کی طرف دیکھا۔ "آپ کا علم اور عمل کیا کہتا ہے' اس انسان کے بارے میں' جس کی عمر صنف مخالف کے سر کچلنے اور ماؤں سے بچے جدا کرنے میں گزر گئی' آپ کے پاس ایسے ثبوت ہوں جو واضح ہیں اور روشن اور جن کے ذریعے آپ ایسے ظالم کو عین اس وقت پکڑ لینے پر قادر ہوں جب وہ اپنے رنگے ہاتھوں سے دستانے اتارے کھلے عام پھر رہا ہو تو آپ کیا کریں گے۔"

"دل اور دماغ کی کہتے ہو باؤ جی تو پھر سنو۔" اختر نے گڑگڑی میں موجود بجھتے انگاروں کو پھونک مار کر سرخ رنگ کرنے کی سعی کرتے ہوئے کہا۔

"دل اور دماغ پر آپ کی جو شعوری اور لاشعوری جبلت حاوی ہوئی جاتی ہے کیا اس میں آپ کے خود اپنے اس شخص سے تعلق کا کوئی رنگ شامل نہیں' وہ شخص جو آپ کا نشان نہ ملنے پر اپنے بندوں کو شکاری کتوں کی طرح جاسوسی کرنے پر لگا دیتا ہے' اسے دنیا میں کسی سے نہ سہی' آپ سے تو محبت ہے نا' اس محبت کا کیا کرو گے' اسے کیسے جھٹلاؤ گے باؤ جی؟"

"محبت خود غرض نہیں ہوتی سائیں اختر!" سعد نے سختی سے سر ہلایا "ایک کی محبت انسانوں کے جذبات کا قتل کرنے پر لگا دے تو وہ محبت خود واجب السزا ہے۔"

"محبت کو محبت ہونے کی سزا دو گے؟" اختر نے پوری آنکھیں کھول کر یوں اس کے چہرے پر گاڑیں جیسے اسے یقین نہ آیا ہو جو سعد کہہ رہا تھا۔

"شاید میں ایسا ہی کرنے والا ہوں" سعد نے اثبات میں سر ہلایا۔

اختر کے چہرے پر ایسا تاثر آیا جیسے اسے سعد کے ارادے پر دکھ ہوا ہو اور جیسے وہ کوئی ایسے الفاظ یاد کرنے کی کوشش کررہا ہو جن کے ذریعے وہ سعد کو اس کے ارادے سے باز کرسکے۔

"سوچ لو باؤ جی! سزا جزا کا اختیار جب انسان اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کرتا ہے تو نہ اس عمل کو پورا کرسکتا ہے نہ اپنی راہ کا مسافر رہ پاتا ہے۔ اس کی حرکت رک جاتی ہے' اس کا سفر بے مراد ہوجاتا ہے اور اپنی اذیتوں کی صلیب اسے کوہ گراں کی مانند محسوس ہونے لگتی ہے' جسے وہ اٹھا پاتا ہے نہ گرادینے پر قادر ہوتا ہے۔"

"مصلحتیں' مصلحتیں' مصلحتیں۔" سعد نے یوں سر جھٹکا جیسے اس پر اختر کی بات کا خاک بھی اثر ہوا تھا۔

"میں اب ان مصلحتوں کا قائل نہیں رہا' خود کو سمجھا لینے کے فرسودہ طور طریقے' جو ان لوگوں کے ساتھ ہو جن کی اذیت مجھے چین نہیں لینے دے رہی' ایسا ہونے ہی میں کوئی مصلحت پوشیدہ ہوگی' اس میں کوئی حکمت ہوگی جیسے قناعت پسندانہ سوچیں۔" اس کے لہجے میں طنز کی آمیزش ہوئی۔ "آپ بتائیں مجھے کہ کسی ماں سے اپنے معصوم بچے کو خود سے یوں جدا کردینے کا فیصلہ کروانا کہ عمر بھر دوبارہ دیکھنے کی امید تک نہ ہو' اس میں کون سی

مصلحت پوشیدہ ہو سکتی ہے۔" اس نے یوں سر ہلایا جیسے اختر کو چیلنج کر رہا ہو کہ اب بتاؤ اس سوال کا کیا جواب ہے۔

"آپ مصلحتوں کو قدرت کو قناعت اور صبر توکل اور امید کو چیلنج کرنے کی اسٹیج پر اتر آئے ہو صاحب!" اختر نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ "آپ کو میرے کسی جواب میں کوئی منطق نظر آئے گی نہ ہی میری کسی بات کی کوئی تک سمجھ میں آئے گی۔۔۔ لہٰذا میں ایک طرف ہٹتا ہوں۔ آپ کے سامنے راستہ کھلا ہے۔ اپنے اسپیڈومیٹر کی سوئی آپ جس انتہا تک لے جانا چاہتے ہیں، لے جائیے۔ مصلحت اور منطق تو اس انجام میں بھی ہو گی جس سے آپ دوچار ہونے والے ہیں مگر قبل از وقت آپ کو سمجھانا اور بتانا بے کار ہے۔ جائیے وہ کیجیے جو آپ کا من چاہتا ہے۔"

اختر کے لہجے میں تاسف تھا۔

"مگر ایک بات یاد رکھیے گا" وہ قدرے توقف کے بعد بولا "وہ بات جو میں نے پہلے بھی ایک بار آپ سے کہی تھی کہ یا من پالو یا پھر زن پالو۔۔۔ اس من کے چکر میں زن کی خواری اور اذیت آپ کی گور گردن پر ہو گی باؤ جی! ایسا نہ ہو کہ اگلی نسل کا کوئی سعد سلطان آپ کو ڈھونڈتا اسی راستے کا مسافر بن جائے جس کے مسافر آج آپ ہیں۔"

یا تو اس مشروب میں واقعی کوئی سرور آمیز شے تھی یا پھر اس کا ذہن ویسے ہی بند ہو رہا تھا۔ سعد نے بوجھل ہوتی آنکھیں اٹھا کر اختر کو دیکھا۔ "جو بھی ہے، آئی ایم سوری سائیں جی! مجھے آپ کی کوئی بھی بات سمجھ میں نہیں آرہی۔"

"اوہ ہو!" اختر نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "آپ کا وقت برباد ہوا۔ میں بھی جھلا ہوں بالکل۔۔۔ مجھے یاد کیوں نہیں رہا کہ نور فاطمہ کی جھونپڑی میں ایک رات گزار کر بھی جب آپ اپنے موقف پر قائم ہیں تو فقیر کی جھونپڑی کا گھنٹہ دو گھنٹہ اس میں کیا تبدیلی لا سکتا ہے۔"

"شاید آپ ٹھیک سمجھے۔" سعد نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ویسے آپ کا یہ لباس دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔" اس نے کیل پر لٹکتے کپڑوں کی طرف اشارہ کیا۔ "گھبرائیے نہیں اتفاق سے نظر پڑ گئی۔"

اس نے اختر کی تیزی سے کپڑوں کی طرف مڑتی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"یقیناً" اس کٹیا اور اس خلعت فاخرہ!" اس نے اختر کی گدڑی کی طرف اشارہ کیا۔ "کی آڑ میں بڑے بڑوں پر ہاتھ ڈالنے کا موقع مل جاتا ہو گا آپ کو۔ آج تک خفیہ والوں کے بارے میں سنا ہی تھا، آج دیکھ بھی لیا۔" اس نے تیزی سے آخری الفاظ کہے اور اتنی ہی تیزی سے باہر نکل گیا۔

"آپ کا پیالہ خالی ہو گیا۔" باہر بیٹھے لڑکے نے اسے کٹیا سے باہر آتے دیکھ کر سوال کیا۔

"میرا پیالہ شاید کبھی بھرا ہی نہیں تھا۔" سعد نے مبہم جواب دیا۔

"آپ نے بھرا پیالہ خالی کیا ہے بھائی جان!" لڑکے نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"آپ کو نظر نہیں آیا شاید یا پھر آپ کو سمجھ نہیں آتی۔" وہ مؤدب سے انداز میں بولا اور کٹیا کے اندر داخل ہو گیا۔



"کیا آپ کو یقین ہے آنٹی! آپ جو کہہ رہی ہیں۔ وہ سو فیصد سچ ہے۔" ماہ نور نے اپنے کھلے منہ کو بند کیا اور آنکھیں جھپکنے کے بعد آپا رابعہ کی طرف دیکھا اور ان سے سوال کیا۔

"سو فی صد سے بھی آگے اگر کوئی درجہ ہے کسی بات کی سچائی ثابت کرنے کو تو مجھے اس کا بھی یقین ہے۔" آپا رابعہ نے سامنے دیکھتے ہوئے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"سعد تو شاید سوچ بھی نہ سکتا ہو کہ جس کو وہ پوری دنیا میں ڈھونڈتا پھرتا ہے، ایک ایسی تلاش جس کی خاطر وہ زندگی کی کسی بھی اور دلچسپی کی طرف متوجہ نہیں ہو پاتا، جس کی کھوج میں اس نے کتنے ہی روپ بدلے اور نامراد رہا، اس کھوج کا سرا آپ کے ہاتھ میں ہے۔" ماہ نور نے آپا رابعہ کے دونوں ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ "آپ کو سامنے دیکھ کر بھی آپ کے سوال کو ٹال گیا وہ۔" اس نے اضطراری انداز میں ان کے دونوں ہاتھ ہلائے۔

"قسمت کو اسے مزید بھٹکانا جو منظور تھا۔" آپا رابعہ نے کہا اور ماہ نور کی طرف دھیان کیا۔ "اسے ڈھونڈو بیٹا" اس کا پتا چلاؤ، اسے یہ ساری بات سناؤ، کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اپنی سی کر لینے کے بعد بھی ناکام ہو جانے والا انسان مایوسی کے غیظ میں مبتلا ہو جاتا ہے، اور وہ کر ڈالتا ہے جس پر عمر بھر کے پچھتاوے کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔"

"آپ فکر نہیں کریں۔ نجانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ سعد کی زندگی میں میرا کردار میری نظروں کے سامنے واضح ہو گیا۔ اسے آپ تک لانے میں میرا ہی تو کردار ہو گا۔"

اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "ورنہ میں تو سوچ سوچ کر تھکنے لگی تھی کہ اس کی زندگی میں میری آمد کی کیا ضرورت تھی، وہ مجھ سے پہلے اور میرے بعد، میں اس سے پہلے اور میں اس کے بعد۔ کوئی بھی تو فرق نہیں پڑا تھا زندگی میں۔" وہ بے خیالی میں بولے چلی جا رہی تھی۔ "لیکن اب مجھے سمجھ میں آرہا ہے۔ یقیناً سمجھ میں آرہا ہے۔"

پھر اس نے خود کو یقین دلایا۔

"شاید ایسا ہی ہو میری بچی!" آپا رابعہ نے ماہ نور کے بال سہلائے۔

"لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی آنٹی!" ماہ نور کو اچانک یاد آیا۔ "سعد تو خیر آپ کو جانتا نہیں تھا۔ اسی لیے پہچان نہیں پایا مگر آپ کی بیٹی سعدیہ۔" اس نے آپا رابعہ کی طرف دیکھا۔ "سعدیہ تو آپ کے ساتھ رہی ہمیشہ سے پھر وہ کیوں کہہ رہی تھی کچھ ایسا جس میں سوال تھے، جیسے وہ بھی آپ کو پہچان نہ پائی ہو اب تک۔"

"سعدیہ!" آپا رابعہ نے افسوس کے ساتھ سر ہلایا۔ "اس کا معاملہ الگ ہے بیٹی! اس کو میں نے غربت میں پالا، اسے صبر اور توکل کا سبق پڑھایا، اسے یقین دلا دیا کہ زندگی کی جو نعمتیں اوروں کو میسر ہیں وہ ہمارے لیے نہیں ہیں۔ یہ میری نادانی تھی۔ میری سہیلی، میری غم گسار مجھے ہمیشہ سمجھاتی رہی رابعہ تم میں معاملات کو پہنچاننے کی حس یا تو ہے نہیں یا پھر بہت ہی کم ہے۔ تمہیں کیوں پتا نہیں چلتا کہ لوگوں کے ذہنوں اور سوچوں کے اپنے اپنے لیول ہوتے ہیں۔ وہ ٹھیک کہتی تھی۔ اپنی سہیلی اپنی غم گسار کے جانے کے بعد مولوی سراج سرفراز کے ساتھ شہر در شہر بدلتے، دنیا سے چھپتے چھپاتے میں نے اپنی سہیلی کی زندگی سے سیکھے سبق کو جو اپنی زندگی پر اپلائی کر لینے کی ٹھانی اور توکل، فقر اور غنا کی چادر اوڑھ لی تو میں یہ تو بھول ہی گئی کہ سعدیہ تو ابھی بچی ہے۔ اس بے چاری کی زندگی کا یہ المیہ کیا کم ہے کہ وہ مولوی سراج سرفراز جیسے بے حس انسان کے گھر پیدا ہو گئی، جسے کھانے پینے اور اوڑھ لینے کے سوا کوئی غم ہی نہیں۔ اوپر سے اس بے چاری کی چھوٹی چھوٹی خواہشات پر میں نے اپنے اسباق کا پردہ ڈال دیا، وہ کیا سوچتی ہے، وہ کیا محسوس کرتی ہے میں نے اس طرف کبھی دھیان ہی نہ دیا۔ جب تک وہ چھوٹی تھی، میرے ذہن سے سوچتی تھی تب تک تو بات بنی رہی، لیکن جب اس نے خود اپنے ذہن سے سوچنا شروع کیا تو بات بگڑنے لگی، اس پر میں نے جھلا کر ایک حماقت اور کر ڈالی۔"

وہ سانس لینے کو رکیں اور دیکھا کہ ماہ نور دم سادھے ان کی بات سن رہی تھی، وہ یقیناً "انکشافات کا دن تھا۔

"میں نے گھبرا کر اس کی کچھ سننے کے بجائے اس کی انگلی پکڑ کر کہیں آگے ہانک دینے کا فیصلہ کر لیا۔ کھاری معصوم تھا اور بے ضرر بھی، میرا احترام دل و جان سے کرتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ میری بات ٹالنے کی مجال نہ ہو گی اسے، سو میں نے اس سے کہا کہ سعدیہ سے بیاہ کر لے، وہ بے چارہ میری اس گزارش پر حق دق بیٹھا میری طرف

آنکھیں پھاڑے دیکھ ہی رہا تھا کہ میرے اپنے لیے تعجب کا باعث بنی سعدیہ نے بھی اس کے سامنے آکر اس کی منتیں کرنی شروع کردیں کہ وہ اسے بیاہ کرلے جائے۔"

"خود سعدیہ نے؟" ماہ نور کو بات سنتے سنتے جھٹکا لگا۔

"ہاں خود اس نے۔" رابعہ آپا نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ "اب سمجھ میں آتا ہے کہ اس محدود سی دنیا میں اسے بھی اپنا نجات دہندہ دوسرا کون نظر آسکتا تھا۔"

"کھاری اور نجات دہندہ۔" ماہ نور نے بے اختیار کہا۔ "سعدیہ پاگل تو نہیں تھی؟"

"اس میں بھی میرا قصور ہے۔ میں نے سعدیہ کی کبھی سنی ہوتی۔ اس سے اپنی کبھی کہی ہوتی تو اس کا ذہن وسیع ہوتا نا۔ وہ سمجھی اور اب تک سمجھ رہی ہے کہ کھاری کے ساتھ سے اسے مجھ سے، مولوی سراج سے اس گھر کی دقیانوسیت اور گھٹے ہوئے فقیرانہ ماحول سے نجات مل گئی۔ وہ خودرو پودا تھی، جدھر کو بڑھنے کا موقع ملا، بڑھ گئی۔"

"آپ ابھی تو بتا رہی تھیں کہ آپ کو تہذیب کی تربیت اپنی سہیلی سے ملی۔ کیا انہوں نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ بیٹیوں کی پرورش کیسے کی جاتی ہے؟"

"بیٹیاں!" وہ تمسخرانہ انداز میں ہولے سے ہنسیں "اس کے ہوتے ہوئے تو ہم بیٹے کی دولت دامن میں سمیٹے پھولے نہ سما رہے تھے، بیٹیوں کو تو ہم نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔"

"لیکن خود آپ کی جو تربیت انہوں نے کی، کیا وہ آپ کو یاد نہیں تھی۔" سعدیہ کے سلسلے میں ماہ نور کو سعدیہ سے ہمدردی محسوس ہونے لگی تھی۔

"اس تربیت کی وجہ سے ہی تو اپنی اوقات سے بڑی باتیں سوچنے لگی تھی، نظروں میں جچنے سے دل انکار کرنے لگا، اور پھر زندگی طیفے لاٹر جیسے کے ہاتھوں برباد ہو کر شہر در شہر چھپتے چھپاتے گزارنے پر مجبور ہونا پڑا، اسی لیے تو سعدیہ کی تربیت اپنی سہیلی کے ابتدائی درس کے بجائے آخری درس کی روشنی میں کی، توکل، فقر، تمنا اور عاجزی کے اسباق اٹھا کر سعدیہ کو پڑھانے کی کوشش میں کئی سال نکل گئے، یہ تو ذہن میں ہی نہیں رہا کہ تربیت تو بڑے گھر کی پردہ دار بی بی کے درس اسباق سے اٹھا کر رہی ہوں، خون میں جو تا جے میراثی کی جبلت کی آمیزش ہے اسے کیونکر خون سے فلٹر کر پاؤ گی۔ اور دیکھ لو تربیت پر جبلت حاوی گئی آخر میں، توکل، فقر، غنا اور عاجزی کے عفریت سے بھاگ کر اس نے فارم ہاؤس کی دھما چوکڑی میں جا سکھ کا سانس لیا مگر مشکل تو کھاری کے لیے ہوگئی نا!" وہ دکھ کے ساتھ بولیں۔

"کھاری کے لیے کیا مشکل ہوگئی؟" ماہ نور نے کہا۔ "وہ تو قسمت والا ہے جسے آپ جیسی ساس اور آپ کے ہاتھوں پلی بڑھی سعدیہ جیسی بیوی مل گئی، وہ اس قابل کہاں تھا، کم عقل، احمق، معصوم اور ان پڑھ لڑکا۔"

"نہیں ماہ نور بیٹی!" رابعہ آپا نے نفی میں سر ہلایا۔ "تمہاری عمر ابھی کم ہے اور تم لوگوں کی پہچان نہیں رکھتیں، ہم لوگ تو وہ ہیں، جن کے پاس بڑے بڑے عزت دار اونچے شملے والے لوگ اپنے خاندانی شجرے رکھواتے تھے، ہمیں بندے کی ہڈی بوٹی سب پتا چل جاتی ہے ایک نظر میں، اگلے کے اٹھنے بیٹھنے، نظریں اٹھانے جھکانے سے ہی خون کی نجاست نجابت دونوں ہی کا پتا چل جاتا ہے۔ کھاری کی قسمت کہ وہ ادھر میرے تیرے ہاتھوں پلا، اس کی تو جسم کی ایک ایک جنبش بتاتی ہے کہ وہ کسی اعلا خاندان کی اولاد ہے۔"

"اف!" ماہ نور نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ "میں تو شاید ہی کبھی کسی گورکھ دھندے کو سمجھ پاؤں، مجھے تو ویسے بھی پزلز اور رڈلز (پہیلیوں) میں ذرا سی بھی دلچسپی نہیں۔ لیکن پلیز آپ سعدیہ کو اپنے پاس بلائیے، جو پہلے نہیں بتایا تھا وہ اب بتائیے تاکہ اس کی زندگی کو کوئی واضح شکل مل سکے۔"

"مجھے ایسا لگتا ہے میں سعدیہ سے نظریں نہیں ملا پاؤں گی۔ ساری عمر اس نے میرے چند الفاظ سنے اور کان کھڑے کرلیے کہ یہ ماں اتنی بھی جاہل نہیں تھی، اتنی بھی بے نیاز نہیں تھی۔ تو اگر میں شروع سے ہی اس کے سامنے جہالت اور کم عقلی کا برقعہ اوڑھے ایک بے نیاز ماں نہ بنی رہتی تو آج شاید اس کے حالات بھی مختلف ہوتے۔ میں نے خود ہمیشہ اسے ڈاکٹر بنانے کی بات کی۔ وہ میری بتائی ہوئی لائن پر چلتی گئی۔ محنتی تھی۔ نہ سردی دیکھتی تھی نہ گرمی برسات۔ اسکول جانے کا کبھی ناغہ نہیں کیا اس نے، پھر مجھے کیا سوجھی کہ اس کی آنکھوں میں نئے خوابوں کا ذرا سا رنگ ابھرتے دیکھ کر بدک کر پیچھے ہٹ گئی۔ میں کیوں بھول گئی کہ بچیاں جب جوان ہونے لگتی ہیں تو نئی چیزیں دیکھ کر نئے خواب بھی دیکھنے لگتی ہیں۔ ماؤں کا کام ہی یہ ہوتا ہے کہ بچیوں کے خوابوں کو سیدھا راستہ دکھائیں تاکہ سیدھے راستے سے دوسری طرف ہٹا دیں۔"

"آپ اسے ڈاکٹر کیسے بناتیں آنٹی! آپ کے وسائل شاید اس کے متحمل نہ ہو پاتے، اس لیے آپ کا وہ فیصلہ ٹھیک ہی تھا۔ کھاری اور سعدیہ ابھی کم عمر ہیں۔ جوں جوں بڑھیں گے سنبھلتے جائیں گے۔" ماہ نور نے آپا رابعہ کو خود ساختہ پچھتاوے سے نکالنے کی کمزور سی سعی کی۔

"جو چوہدری سردار ایک درخواست پر سعدیہ کو کھاری کے ساتھ بیاہ کرلے جاتا ہے۔ وہ ایک درخواست پر اسے ڈاکٹر بنانے کے لیے وسائل بھی مہیا کروا دیتا۔ شاید بس مجھے ہی عجلت کی بیماری لگ گئی تھی۔" آپا رابعہ کھوئے ہوئے انداز میں بولیں۔

"وہ تو ابھی بھی ہو سکتا ہے آنٹی! میں چچا سردار سے بات کروں گی۔ سعدیہ اگر ڈاکٹر بننا چاہتی ہے تو وہ سب انتظام کردیں گے۔"

"نہ بی بی نہ۔۔۔ اب نہیں۔" آپا رابعہ نے تیزی سے کہا۔ "کھاری بے چارے کا کیا قصور کہ وہ چھوٹی گاڑی کا پہیہ بن کر رہ جائے، اب تو جو ہو گیا سو ہو گیا، بس اللہ کرے دونوں ساتھ خیریت کے نباہ لیں۔"

"ہیلو ماہ نور۔ مجھے صرف یہ بتانا ہے کہ سعد تو نہیں، اس کی گاڑی البتہ ملی ہے ایک جگہ سے، جس کو دیکھ کر سعد کے والد کا خیال ہے، وہ خیریت سے ہے، گاڑی ملنے کے بعد وہ اطمینان سے بیٹھ گئے ہیں، مزید تلاش رکوا دی ہے جبکہ میں ابھی تک الجھن میں ہوں کہ وہ کہاں غائب ہے۔ کیا اس نے تم سے کوئی رابطہ کیا؟" اسی دوران ماہ نور کے ہاتھ میں پکڑے فون پر ابراہیم کا پیغام وصول ہوا۔

"سعد تو نہیں اس کی گاڑی۔" ماہ نور نے دو، تین مرتبہ ان الفاظ کو پڑھا اور اسے لگا جیسے ایک بار پھر اس کا دل پسلیوں میں دب گیا ہو۔

"وہ کہاں ہے، وہ کہاں گیا؟" آپا رابعہ سے ہونے والی گفتگو کے دوران جو اضطراب کہیں جا سویا تھا، پھر سے جاگنے لگا تھا۔ اس نے دوبارہ سے سعد کا نمبر ملانے کی سعی شروع کردی۔ کبھی دھیان سے کبھی بے دھیانی میں وہ بار بار نمبر ملاتی اور جواب میں مخصوص پیغام سننے لگی۔

"تمہارا مجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا میری بچی! اسے مجھ سے ملا دو، میرے سینے میں لگی آگ جب بجھے گی تو تمہارے راستے کی سب دھول چھٹ جائے گی اس نیکی کے ثواب میں۔" پھر اس نے دیکھا کھاری کی ساس، آپا رابعہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھی تھیں۔

"اللہ تمہاری شان بڑھائے گا، اونچے شملے والوں کو تمہاری چوکھٹ کا غلام بنا دے گا، تمہارے بھاگ جگائے گا، من کی مراد پاؤ گی۔"

ماہ نور کا ذہن صاف سلیٹ کی مانند ہو رہا تھا، جس پر کانوں تک پہنچتے یہ نئے الفاظ ثبت ہونے لگے تھے شان، غلام، بھاگ، مراد۔ کیا اگر میں یہ کام کر پاؤں۔ تو واقعی مجھے بدلے میں وہ سب ملے گا جو یہ کہہ رہی ہیں یا یہ محض

روانی میں دی جانے والی رٹی ٹائی دعا تھی۔ اس نے ذہن کی سلیٹ صاف ہونے کے بعد پہلی بات سوچی۔

پھر جیسے اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔

"میرے ڈیڈی کا خیال ہے کہ کیونکہ میری والدہ میراثن تھیں لہٰذا مجھ میں بھی میراثیانہ وصف جینز کے ذریعے بدرجہ اتم ٹرانسفر ہو چکے ہیں۔" کبھی کے سنے الفاظ اس کی یادداشت سے ٹکرائے ذہن کی سلیٹ پھر سے پرانے الفاظ سے بھرنے لگی۔

"آپ کی کہانی پر مجھے یقین آگیا آنٹی! اگرچہ کہیں کہیں آپ نے بات کو توڑا موڑا ہے، لیکن میرا آپ سے وعدہ ہے میں سعد کو آپ تک ضرور لاؤں گی۔ آپ کے سینے میں لگی آگ ضرور بجھے گی، آپ کے سینے میں موجود ممتا کو جو آگ لگی ہوئی ہے نا اس پر صرف تعلق کا پردہ نہ ڈالیں، وہ جانتا ہے اس کے لیے یہ حقیقت شرمندگی کا باعث نہیں ہے۔ وہ تو سب جاننے کے باوجود مسلسل تلاش میں ہے۔ جب ہی تو عزت داروں کی سوسائٹی کے بجائے میلوں، ٹھیلوں، جھگیوں اور سستے بازاروں میں سرگرداں رہتا ہے۔ میں اس کی یہ تلاش بھی ختم کراؤں گی اور آپ کی پیاس بھی بجھاؤں گی۔ چاہے اس کے بدلے میرے بھاگ میری شان اور میری چوکھٹ یونہی رہے جیسے ہے۔" اس نے بے اختیار ہوتے ہوئے کہا اور آپا رابعہ کے نفی میں ہلتے سر کا مفہوم سمجھے بغیر وہاں سے اٹھ گئی۔

☼ ☼ ☼

"میری آنکھیں کمزور ہو چکی ہیں، اس لیے میں بہت قریب سے بھی دیکھ کر بندہ نہیں پہچان سکتا۔" اس کے سامنے بان کی کھاٹ پر بیٹھے بزرگوار نے آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا سا بنا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ بزرگوار کے ہاتھ بڑھتی عمر کے تقاضوں اور کمزوری کی وجہ سے کانپ رہے تھے۔

"اگر آپ کے کان کمزور نہیں ہوئے تو کیا میں آپ سے چند سوال پوچھ سکتا ہوں" اس نے ان کے مزید قریب آکر بیٹھتے ہوئے منہ تقریباً ان کے کان میں گھساتے ہوئے پوچھا۔

"کان بھی کمزور ہیں، مگر آنکھوں سے کم۔" بزرگ نے اس کے منہ اور کان کے درمیان ہاتھ کا فاصلہ حائل کرتے ہوئے کہا۔ "ذرا یہ تو بتاؤ پہلے کہ تم کون ہو، کہاں سے آئے ہو، یہاں آمد کا مقصد کیا ہے۔"

"یہ تو مجھے آپ بتائیں گے کہ میں کون ہوں۔" اس کے چہرے پر بے بس سی مسکراہٹ ابھری۔ "یہ ہی معلوم کرنا میری یہاں آمد کا مقصد ہے۔"

"سوئی گیس کا پریشر آج پھر کم ہو گیا۔ لاکھ حکومت کہے ہم سپلائی بند نہیں کریں گے، سچ تو یہ ہے دیہاتی علاقوں کے ساتھ سوتیلوں کا سلوک کرتی ہے حکومت چاہے کسی کی بھی ہو۔" بڑے میاں کے جواب دینے سے پہلے ایک بڑی بی جو صحت اور بشاشت میں بڑے میاں سے خاصی بہتر حالت میں تھیں، ہاتھ میں کپڑے کی ایک پوٹلی سی پکڑے ادھر چلی آئیں۔

"ارے یہ برخوردار کون ہے؟" بڑے میاں کے پاس بیٹھی اس اجنبی شخصیت کو دیکھ کر وہ چونکیں اور بڑے میاں کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگیں۔

"یہ بچہ ہم سے پوچھنے آیا ہے کہ یہ کون ہے۔" بڑے میاں نے اپنے رعشہ زدہ ہاتھ جھلاتے ہوئے کہا۔

"ہائیں۔" بڑی بی نے مارے حیرت کے پوٹلی کھاٹ پر ٹکا دی۔ "ارے میاں! اتنے بڑے یہ جانے بغیر ہی ہو گئے آپ کہ آپ ہیں کون؟"

"جی کچھ ایسا ہی ہے مونا آنٹی میرا مطلب ہے میمونہ بی۔" اس نے سر جھکا کر بالکل ویسے ہی کہا جیسے برسوں پہلے وہ ان ہی خاتون کے سامنے اپنی کی شرارت یا نقصان کر دینے والی حرکت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کرتا تھا۔

"ہم تمہیں پہلے بھی بولتے تھے میاں کہ ہم کو آنٹی مت بولو، مت بولو لیکن تم لوگ مانتے کب تھے۔" بڑی بی مزید کوئی سوال کیے بغیر اس کے سامنے دھرے بید کی مخدوش حالت والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولیں اور اپنے کرتے کی جیب سے چشمہ نکال کر آنکھوں پر جمانے کے بعد اس کا بغور جائزہ لینے لگیں۔

"ہوں" کچھ دیر اس کا جائزہ لینے کے بعد انہوں نے چشمہ آنکھوں سے اتارا اور ہونٹ بھینچتے ہوئے سر ہلا کر بولیں۔ "ہو تو سہی کوئی مگر ہماری یادداشت جواب دے گئی ہے اس واسطے ڈھنگ سے یاد نہیں آرہا کہ کون سی والی کوٹھی کے سپوت ہو۔

کیوں فضل صاحب؟" پھر بڑی بی، بڑے میاں سے مخاطب ہوئیں۔ "کچھ یاد آیا کہ یہ صاحبزادے کس گھرانے کے نور چشم ہیں۔"

"کوشش کر رہا ہوں، لیکن یاد نہیں آرہا، گنتی بھی تو لمبی ہے برخورداروں کی۔" بڑے میاں نے آنکھوں پر ڈوری کی مدد سے چشمے کو درست کرتے ہوئے کہا۔

"میرا نام سعد سلطان ہے مونا آنٹی! آپ کو سعد اور نادیہ تو یاد ہوں گے، بلال سلطان کا گھر بھی یاد ہو گا جب وہ ویسٹریج میں رہا کرتے تھے۔" اس نے ان دونوں کو مزید ذہنی کشمکش میں ڈالنا مناسب نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

"بلال سلطان صاحب، وہ میم صاحب کا صاحب جو تھا۔" بڑی بی کی یادداشت نے فوراً "جمع تفریق کرنے کے بعد نتیجہ ان کے گوش گزار کیا۔

"نادیہ، وہ پیاری معصوم بچی، بے چاری میم صاحب۔ جس کو جل دے کے بھاگ لی تھی۔" وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولیں۔

"جی بالکل وہی۔" اس نے تیزی سے سر ہلایا۔ بڑی بی بزرگوار کے کان میں کچھ بڑبڑائیں، جسے سننے کے بعد بڑے میاں نے تیزی سے سعد کی طرف دیکھا۔

"میرے انگوٹھے کا جوڑ ابھی بھی ٹھیک نہیں ہوا برخوردار! یاد ہے کرکٹ کی لال گیند مار کر جوڑ توڑا تھا آپ نے میرا۔"

"مجھے سب یاد ہے فضل چاچا!" بڑے میاں کی تیز رفتار یادداشت پر حیران ہوتے ہوئے اس نے سر ہلایا اور ان دونوں کو اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے دیکھ کر تیزی سے اٹھ کر ان کے قدموں میں جا بیٹھا۔

"ہم کبھی نادیہ کو اتنی چھوٹی سی عمر میں اکیلے نہ چھوڑتے، مگر صاحب نے ہمیں دن نکلنے سے پہلے نوکری چھوڑ اپنا ٹھکانا کرلینے کا حکم سنا دیا تھا۔" بڑی بی نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"سعد میاں ہاتھ کیسے زخمی کرلیا آپ نے؟" بڑے میاں کی کمزور نظر اچانک اس کے ہاتھ پر پڑ گئی اور انہوں نے بلا ارادہ اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"ہاتھ کا زخم تو ظاہری ہے فضل چاچا!" اس کی مسکراہٹ میں بھی دکھ تھا اور ایک ایسی بے بسی جس کے اندر غصہ، دباؤ، کشمکش اور رنج چھپا بیٹھا تھا۔ "میں اپنے پوشیدہ زخموں کی گنتی کرنا چاہوں بھی تو نہ کر پاؤں۔"

"اوپر ہو کر بیٹھو سعد میاں!" فضل حسین نے اپنے قریب اس کے لیے جگہ بناتے ہوئے کہا۔ "اور یہ بتاؤ کے برس بعد ہماری یاد آئی۔"

"سالوں کی گنتی بھی ناممکن ہے شاید فضل چاچا اور سچ بتاؤں آپ کی یاد بھی مجھے کسی کے یاد دلانے پر آئی ورنہ خود سے شاید میں کبھی یاد نہ کر پاتا کہ آپ بھی کوئی تھے۔" اس نے سچائی سے اعتراف کیا۔

"لیکن ہم دونوں شاید کبھی نہیں بھولے۔ وہ سارے بچے جن کو ہم نے بڑھنے میں مدد دی، کل چھ گھر تھے جن میں ہم نے باری باری نوکری کی۔" میمونہ نے چھ انگلیاں اٹھا کر دکھائیں۔ "اور مجھے تو صاحب لوگ رکھتے ہی

اپنے بچوں کے واسطے تھے' ان کو کھانا' پینا' اٹھنا' بیٹھنا سکھاؤ' ان کا بولنا بات کرنا سکھاؤ' جن صاحب لوگوں کو زبان سے پیار تھا نا جو زبان کی قدر کیا کرتے تھے وہ' ہمیں نوکری پر رکھتے تھے۔ بلال صاحب نے بھی مجھے ربانی صاحب کے گھر دیکھا تھا اور ربانی صاحب کے سر ہوگئے کہ جب آپ ولایت چلے جاؤ تو میمونہ بی کو میری طرف رکھوا کر جاؤ گے' میں چاہتا ہوں میرے بچے انگریزی اسکولوں میں پڑھتے بڑھتے اردو بولنا' لکھنا' پڑھنا' بھول جانے والے بچوں میں شمار نہ ہوں۔ یوں نوکری مجھے ملی تھی سعد میاں آپ کے گھر' فضل صاحب تو اضافی خانساماں بن گئے میرے شوہر ہونے کی مجبوری کو۔"

وہ فضل دین کی طرف دیکھ کر زور سے ہنس دیں' جواب میں فضل حسین آدھی پوری بات سن سمجھ کر یوں ہی سہلاتے ہوئے ہنس دیے۔

"آپ کے گھر سعد میاں! آپ کو یاد ہے' موٹا باورچی کام کرتا تھا جس کا نام سعادت تھا' جو ہر وقت باورچی خانے میں ٹیپ ریکارڈ وہ موا جس کا نام کیا کرکے تھا بھلا سا۔" وہ یاد کرتے ہوئے بولیں۔

"جیوک باکس۔" سعد نے لقمہ دیا۔

"ہاں وہی" میمونہ بی نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے سرہلایا۔ "ہر وقت لگائے رکھتا تھا اس پر گانے اور چھوٹی جو آپ کی بہن تھی نادیہ اسے کہتا تھا آؤ نادیہ بے بی کتھک ناچ ناچیں برسات کے گیتوں پر یا بریک ڈانس کریں انگریزی گانوں پر وہ جو موا تھا کیا کرکے نام اس کا' کالا بھجنگ' سیاہ فام' گلوکار۔" انہوں نے ایک بار پھر اپنی یادداشت کو کوستے ہوئے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

"ہاں وہ مائیکل جیکسن" میمونہ بی نے سرہلایا۔ "اب یہ سب تو ہوتا تھا باورچی خانے میں جو سعادت کی راجدھانی تھی اور یہ فضل صاحب۔۔۔؟" وہ فضل دین کی طرف دیکھ کر ہنس دیں۔ "یہ باورچی خانے میں دھری پرانی آرام کرسی پر جھولتے رہتے' ایک مرتبہ بھی منع نہ کیا اس موٹے باورچی کو جو چھری پھیرے جانے کے لائق تھا کہ معصوم بچی کے اخلاق کیوں خراب کرتے ہو میاں اپنا کام دھیان سے کرو' مگر یہ تھے اس کا ماتحت عملہ منع کرتے بھی تو کیوں کرتے۔"

میمونہ بھی یادوں کی گلی میں اتر چکی تھیں اور فضل دین کان لگائے سننے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ کیا کہہ رہی تھیں۔

"چھری پھیرنے والی بات بتا رہی آپ؟" فضل دین نے کان کی لو پر دھرا ہاتھ اٹھاتے ہوئے میمونہ بی بی کی طرف دیکھا۔

"ویسے بھئی سعد میاں! اس بات کو غلطی سے سن لینے پر تو ہم نکالے گئے آپ کے گھر سے یوں کرکے صرف چار' پانچ گھنٹے کے نوٹس پر۔" فضل حسین نے چٹکی بجانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے سعد کی طرف دیکھا۔

"کس بات کو سن لینے کی غلطی کی تھی آپ نے فضل چاچا؟" سعد نے منہ ان کے کان کے قریب کرتے ہوئے پوچھا۔

"وہی چھری پھیرنے والی بات سن لینے پر۔" فضل حسین نے ہاتھ جھٹکتے ہوئے مسکرا کر ـــــ کہا جیسے وہ بات جو انہوں نے غلطی سے سن لی تھی۔ اب زبان زد عام قصہ بن چکی ہو۔

"میم صاحب نے صاحب کو غصے میں کہا کہ ان کو سب معلوم صاحب کسی میڈم صاحب کے ساتھ کیا کر چکے تھے' صاف گلے پر چھری پھیری تھی انہوں نے۔ یہ بولی تھیں میم صاحب' صاحب سے۔ ہماری قسمت ہم اس وقت صاحب کے شکار پر جانے کا سامان بیگ میں رکھ رہے تھے' صاحب نے میم صاحب کو تو کیا جواب دینا تھا۔ ہم پر نظر پڑتے ہی ہم پر ہی پل پڑے' ہم سے شکاری بوٹ چھین کر بولے۔ فضل دین! اپنا اور اپنی بی بی کا کوئی دوسرا

بندوبست کرلیجیے صبح ہونے تک۔ آپ فی الفور نوکری سے فارغ سمجھیے اپنے آپ کو۔"

فضل دین نے آنکھوں میں آتے پانی کو کرتے کا کونا اٹھا کر خشک کیا اور دوبارہ چشمہ لگانے سے پہلے اپنی پانی پانی ہوتی آنکھوں سے سعد کو دیکھا' نمی کے اس پار ان کو سعد کے چہرے کے نقوش بگڑتے پھیلتے اور بے ہیئت سے نظر آئے' چشمہ دوبارہ آنکھوں پر جما کر دیکھنے سے بھی سعد کے چہرے کی صورت حال میں انہیں کوئی خاص فرق نہیں محسوس ہوا تھا۔

"بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی کہ ہمارا قصور کیا تھا۔ کیوں میمونہ بی؟" انہوں نے بات کا سلسلہ دوبارہ سے جوڑتے ہوئے میمونہ بی کی طرف دیکھا' جن کے چہرے پر افسردگی چھا چکی تھی جیسے وہ بھی کسی ایسی پرانی یاد کے تصور میں گم تھیں جو تکلیف دہ اور ناگوار تھی۔

"ہمارا تو مغز ہی کم زور تھا لیکن میمونہ بی کو بتایا تو انہیں بھی کچھ سمجھ نہیں آئی کہ وجہ کیا بنی ہماری برخاستگی کی۔ صاحب کے دیے ہوئے وقت کے اندر اندر ہم نے بنا کوئی سوال کیے پھر بھی اپنا بوریا بستر باندھ لیا اور منہ اندھیرے رخصت ہونے کو جب بڑے پھاٹک کے قریب پہنچے تو دیکھا' صاحب پریشان حال ادھر سے ادھر چکر لگا رہے ہیں' پھاٹک تک جاتی روش ابھی زیر تعمیر تھی' بجری کی تازہ بچھی تہہ پر صاحب کے جوتوں کے دباؤ سے کٹاک کٹاک ہوتی اور پھر جب وہ فاصلے پر چلے جاتے تو خاموشی چھا جاتی' سردی کی اس منہ اندھیری صبح کے وقت صاحب کو یوں چکر لگاتے دیکھ کر ہم حیران تھے مگر اگلے ٹھکانے کی پریشانی نے یہ سوچنے نہیں دیا کہ صاحب یوں کاہے کو چکر لگاتے پھر رہے ہیں۔ ہم دونوں نے کچھ دیر رک کر یہ منظر دیکھا اور پھر سر جھکا کر پھاٹک کی طرف چل دیے' جب ہی ہمیں صاحب کی آواز آئی۔ "فضل میاں اور میمونہ بی! یاد رکھیے گا آپ نے رات کچھ نہیں سنا۔" دونوں نے صاحب کی بات سن کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر میں ہمت کرکے صاحب کی طرف دیکھے بنا بولی۔

"صاحب ہمارے تو کان ہی پٹ چکے ہم نے رات سے پہلے بھی جو کچھ آپ کے گھر میں سنا' سمجھیں نہیں سنا۔"

"پھر وہ کچھ نہیں بولے اس پر؟" سعد جواب تک خلاف طبع خاموشی سے ان دونوں کی بات سن رہا تھا۔ پہلی بار سوال کرنے پر مجبور ہوا۔

"نہیں۔ وہ کچھ نہیں بولے اور ہم اپنا سامان اٹھاتے پھاٹک پار کر گئے۔" میمونہ بی نے کہا۔

"سعد میاں! ابھی آپ کی شین قاف ہم اپنی مرضی کے مطابق ٹھیک ہی نہیں کرپائے تھے کہ ہمیں وہاں سے آنا پڑ گیا' چھوٹی بچی نادیہ کو' جس کی ماں میم صاحب جو ہمیں بعد میں پتا چلا کہ اسے چھوڑ کر چلی گئیں' ہم بھی بھلا نہ پائے۔ اسے تو ابھی الف آم' ب بکری والا قاعدہ ہم نے شروع ہی کرایا تھا کہ اسے چھوڑ آنا پڑا۔"

"ہوں۔ سعد نے لمبا سانس لیتے ہوئے سرہلایا۔" میمونہ بی آپ کو تو پتا ہی ہوگا کہ میں کون ہوں' میری ماں کون تھیں؟"

"وہ چھری والی بات اسی لیے تو کہہ رہی تھیں میم صاحب!" میمونہ کے بجائے فضل دین نے جواب دینے کی کوشش کی' لیکن میمونہ بی کے اونہوں کہنے پر فوراً" خاموش ہوگئے۔

"آپ کے گھر جب ہم نوکری کرنے گئے تھے سعد میاں! تو آپ کی والدہ اس وقت بھی ہم نے دیکھیں نہ ان کے بارے میں کوئی بات سنی تھی۔ گھر کی کار مختار میم صاحب تھیں اور ظاہر ہے کہ ان کے رکھے سب ملازم انہی کے زمانے کے تھے' سو آپ کی والدہ کے بارے میں کسی کو علم نہیں تھا' سو ہم بھی کبھی ان کے بارے میں کچھ نہ جان پائے۔" فضل دین کو خاموش کرانے کے بعد میمونہ بولیں۔

"مگروہ چھری پھیرنے والا قصہ تو...." فضل دین نے ابھی بھی میمونہ بی کی آدھی بات سن کر آدھی بات نہ سمجھتے ہوئے اپنی بات کہنے کی ایک مرتبہ پھر سعی کی۔

"ارے فضل صاحب! اس بات کا اس سوال سے کیا تعلق؟" میمونہ نے ایک مرتبہ پھر انہیں خاموش کرایا اور مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ سعد کی طرف دیکھا۔

"فضل چاچا شاید ڈیڈی کو قاتل یا قاتل نما ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں' انہیں ایسا کر لینے دیجیے مونا آنٹی!" اس کے چہرے پر تلخ مسکراہٹ ابھری۔

"ارے سعد میاں۔ کاہے کو آپ ایسا بول رہے ہیں؟" میمونہ بی تیزی سے بولیں۔ "بلال صاحب جیسا وضع دار اور رکھ رکھاؤ والا انسان بھی کبھی کسی کا قتل کر سکتا ہے بھلا۔ یہ فضل صاحب دل سے اپنی برخواستگی نکال نہیں پائے۔"

"یہ ہی تو بات ہے مونا آنٹی!" سعد نے کھاٹ کے نیچے اور اس کے اردگرد زمین پر بکھرے خشک پتوں اور سوکھے تنکوں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "فضل چاچا کو جس بات کو اتفاق سے سن لینے کی پاداش میں کھڑے کھڑے نوکری سے نکال دیا گیا۔ وہ اسے کیسے بھول سکتے ہیں۔ اوپر سے انہیں تنبیہہ بھی کر دی گئی کہ انہوں نے وہ بات نہیں سنی تھی' آپ جانتی ہیں کہ جوں جوں عمر بڑھتی ہے حافظے میں سوئی پڑی پرانی باتیں انگڑائی لے کر جاگنے لگتی ہیں۔"

"وہ بات ٹھیک ہے سعد میاں! مگر آپ کے سوال کا جواب تو وہ نہیں نا جو یہ دے رہے ہیں؟ اور یہ تو بتائیں آپ کہ اتنے سالوں بعد آپ کو کیا ضرورت پیش آگئی کہ یہ سوال لے کر آپ ہم بھولے بسروں سے ملنے یہاں تک آگئے۔"

"یونہی مونا آنٹی! حقائق کی جو ایک پوٹلی میرے ہاتھ میں ہے اس میں موجود گنجلک گتھیوں کی مانند الجھے پڑے ہیں' میں نے سوچا شاید کسی الجھی ڈور کا کوئی سرا آپ کے ہاتھ میں پکڑا مل جائے سو آپ کی طرف چلا آیا' مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہاں آکر میں مزید الجھ جاؤں گا' جن ہاتھوں میں انسانی جذبات کے آلات لوکیٹ کرنے میں میں اب تک ناکام رہا تھا یہاں ان میں پکڑی چھری کی خبر مل گئی۔"

"نہیں نہیں سعد میاں! وہ کوئی اور بات ہوگی۔ نہ فضل صاحب کو سمجھ آئی نہ بلال صاحب کو پتا چلا کہ فضل صاحب نے سن بھی لیا تو سمجھ تو نہیں پائے نا۔" میمونہ بی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"چلیں فضل چچا نہ سہی' میں تو کچھ کچھ سمجھ گیا' یہ تو پتا نہ چل سکا کہ میں کون ہوں البتہ اتنا ضرور پتا چل گیا کہ چھری بھی آلات قتل میں شمار ہوتی ہے۔" وہ طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔

"اتنے سے تھے آپ جب ہم آپ جدا ہوئے۔" میمونہ بی نے ہاتھ کے اشارے سے ایک خیالی اونچائی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "کیا ہوا جو تاڑ جیسا قد نکال گئے اب آپ' یہ بھی تو ذہن میں رکھیے کہ ہم قدبت میں تو اتنے ہی سہی عمروں میں اتنے ہی سال آگے نکل چکے ہیں جتنا کہ آپ' زمانہ ہم آپ سے زیادہ دیکھ رکھے ہیں' چھریاں کانٹے باورچی خانے میں اور دسترخوان پر استعمال ہونے کے اوزار ہیں۔ اوزاروں کو آلات بنانے کی کوشش تو مت کریں سعد میاں! لفظوں کی ذرا سی ہیرا پھیری' سوچ کا ذرا سا آگا پیچھا دوست کو رقیب اور رقیب کو رقیب روسیاہ بنا دیتا ہے یاد رکھیے گا ہماری بات۔"

"ہوں۔" اس نے اپنے خیالات کے گھوڑوں کی لگامیں کھینچتے ہوئے یوں ہی سر ہلا دیا۔ "آپ شاید ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ یہ تو بتائیے کہ آپ لوگ اس جگہ کیسے پہنچے' میرا مطلب ہے آپ دونوں تو اونچے بڑے گھرانوں میں خدمت گاری سرانجام دیتے رہے عمر بھر پھر اب اس عمر میں یہاں کیوں آ بیٹھے۔"

"ہمیں بحریہ میں ملازمت دلوا دی گئی تھی' موٹے باورچی سعادت کی صحبت میں رہتے ہوئے بہت کچھ بنانا سیکھ لیا' بحریہ کے ملازم ہوئے اور افسروں کا کھانا بنانے لگے' میمونہ بی مزے سے ہاؤس وائف بن گئیں' اولاد تو اللہ نے عطا کی ہی نہ تھی تو دوسروں کے بچوں سے ہٹ کر اپنے بچوں کا شین قاف سنوارتیں سو راوی ان کے لیے چین لکھنے لگا' بڑھتی عمر میں بھرتی ہوئے تھے۔ ملازمت کی مدت بھی جلد ختم ہو گئی' جو ملا سمیٹ سماٹ ادھر کو آگئے اپنے آبائی گاؤں۔ یہ مختصر سا مکان اماں باوا کی نشانی ہے' سو ہم ہیں اور یہ ہے چین کی نیند سوتے ہیں سکھ کی آنکھ کھولتے ہیں۔" فضل دین نے کہا۔

"کیا یہ مشکل کام نہیں' ایک طرز زندگی سے دوسرے طرز زندگی میں آبسنا؟"

"جب بندے کو معلوم ہو کہ آخر میں اس کو اپنے اصل وطن ہی کو لوٹنا ہے تو پھر دیس میں بھی اس کی یادوں سے نکلتی نہیں ہے جب ہی آبسنے میں مشکل نہیں پڑتی۔" میمونہ بی نے کہا۔

"لیکن آپ لوگ تو وہاں کئی ایسوں کو جانتے تھے جو آپ کے لیے وہاں نہ صرف بہت اچھا ٹھکانا بنا دیتے بلکہ آپ کی ویسے بھی خبر گیری کرتے رہتے۔"

"نہیں ہمیں وہ نہیں چاہیے تھا سعد میاں!" فضل دین نے کہا۔ "کیونکہ" وہ واپسی کے لیے اٹھتے اٹھتے دوبارہ بیٹھ گیا۔

"کیونکہ ہم نے کچھ نہیں سنا تھا۔" فضل حسین نے مبہم سی بات کی' ایک ایسی بات جو بظاہر بے معنی تھی۔

"مگر آپ جاتے کدھر کو ہو سعد میاں' ہمارے ہاتھ کا چک پی پلاؤ (سفید چنوں کا پلاؤ) نہیں کھائیں گے کیا' آپ کو تو بہت پسند تھا۔" اگلے ہی لمحے فضل دین نے بات بدل دی۔

"نہیں فضل چاچا! میں اب چلوں گا' مجھے بڑا لمبا سفر درپیش ہے مجھے اب چلنا ہی چاہیے۔" اس نے جواب دیا۔

"ایک بار آئے ہیں تو آتے ہی رہیے گا سعد میاں! برسوں بعد آنکھوں میں ذرا سی ٹھنڈ اترتی محسوس ہوئی ہے۔" میمونہ بی اس کا ہاتھ پکڑ کر چومتے ہوئے کہا۔

"آپ میرے لیے دعا کرتی رہیے گا مونا آنٹی!" اس نے ان کے سامنے احتراماً" جھکتے ہوئے کہا۔

"مجھے اس کی تو کچھ خبر دیجیے بے بی نادیہ کی' جو میری پھلواری کی سب سے نوخیز کلی تھی۔" میمونہ بی نے اس کا ہاتھ چھوڑے بغیر کہا۔

"نوخیز کلی شاخ سے ٹوٹ کر الگ ہو جائے بلکہ الگ کر دی جائے تو اس کا کیا حال ہوتا ہے۔ آپ خود سمجھ سکتی ہیں۔" اس نے بھی ایک مبہم اور غیر واضح سا جواب دیا۔

"اس سے کبھی ملنا ہو تو اسے بتائیے گا کہ میمونہ بی اب تک ہر رات کو اس کی تصویر دیکھنے کے بعد سوتی ہیں۔" میمونہ بی نے اپنی نم آنکھیں دوپٹے سے پونچھیں۔

"اور اگر سعادت باورچی کہیں ملے تو اسے بتائیے گا کہ فضل دین تمہیں سلیوٹ پیش کرنا چاہتا ہے۔" فضل دین نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں اب چلوں گا۔" اسے یکدم لگا تھا کہ وہ ایک منٹ بھی مزید وہاں ٹھہر نہ پائے گا۔

"فی امان اللہ۔" میمونہ بی نے اٹھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "جیتے رہو سعد میاں' شاد رہو' آباد رہو۔" فضل دین نے اٹھنے کی ناکام سعی کرتے ہوئے کہا۔

"بیٹھے رہیے فضل چاچا!" اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر انہیں اٹھنے سے منع کرتے ہوئے کہا۔

"ایک آخری سوال فضل چاچا!" یہ بات کہتے ہوئے اس کی آواز خود بخود سرگوشی میں ڈھل گئی اور منہ فضل دین کے کان کے بالکل قریب آگیا۔

"وہ کیا؟" فضل دین نے اسی سرگوشی کے سے انداز میں یوں پوچھا جیسے چھوٹے سے سعد کے ساتھ کوئی نئی شرارت بھری سازش کی تیاری ہو رہی ہو۔

"آپ کی اور مونا آنٹی کی یہاں موجودگی کا علم یعنی قلزا ظہور کو کیونکر ہے؟" اس نے اسی طرح سرگوشی کی' جواب میں فضل دین کے یکایک سفید پڑتے چہرے کو دیکھ کر وہ بری طرح ٹھٹکا تھا۔

"میمونہ بی! آپ خود دروازے تک رخصت کیجیے گا سعد میاں کو۔" اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے میمونہ بی سے کہی فضل دین کی یہ بات اسے بہت کچھ لمحہ بھر میں سمجھا گئی تھی۔

"ہاں ہاں میں جا رہی ہوں۔" میمونہ بی نے سعد سے بھی پہلے آگے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یاد رکھیے گا فضل چاچا! میرے سوال کا جواب ادھار رہا۔" اس نے مڑتے ہوئے اس بار با آواز بلند کہا' جواب میں فضل دین نے رخ دوسری طرف پھیر لیا تھا۔

"فضل صاحب اب سٹھیا گئے ہیں۔ سترے بہترے ہو چکے' ان کو بالکل پتا نہیں چلتا' کیا بات کرنی ہے کیا نہیں' ان کی باتوں پر غور کرنے کی کوئی ضرورت نہیں سعد میاں! میں بھی ایک کان سے سنتی ہوں اور دوسرے سے نکال دیتی ہوں۔" میمونہ بی نے اس کے ساتھ گھر کے داخلی دروازے کی طرف آتے ہوئے کہا۔

"ساٹھ سال کی عمر میں انسان سٹھیاتا ہے مونا آنٹی!" دروازے کے قریب پہنچ کر وہ رک گیا اور میمونہ بی سے مخاطب ہوا۔ "ستر یا ستر سال سے کچھ اوپر جا کر سترے بہترے ہو جاتا ہو گا' آپ ایک فیصلہ کریں ناکہ فضل چاچا دراصل اس وقت عمر کے کس پیٹے میں ہیں۔"

"ارے میاں! عمر تو ان کی اس سے بھی اوپر ہو چکی تو بس کم و بیش وہی حالت ہوئی نا۔ سٹھیائے ہوئے سترے بہترے۔"

"سچ کہہ رہی ہیں۔" وہ مسکرایا "آپ ان کو جو بھی ثابت کرنے کی کوشش کریں' لیکن میری طرف سے تسلی رکھیں' میں ان کی کہی کسی بھی بات کا کسی سے ذکر نہیں کروں گا' کیونکہ میں خود دنیا سے چھپتا چھپاتا آپ تک پہنچا ہوں۔"

"ہوں!" میمونہ بی کے چہرے پر چھائی پریشانی اس سارے عرصے میں پہلی بار قدرے کم ہوئی "اول تو کوئی ادھر کو آتا نہیں' آیا بھی تو ہم بھی کسی سے نہیں کہیں گے۔" وہ گویا اپنے تئیں اس کی شریک راز ہوئیں۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" سعد کو ان کی تسلی پر اطمینان سا محسوس ہوا۔ اس نے احتراماً" سر ہلایا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔ میمونہ بی دروازے پر گرے پردے کو ہاتھ سے اٹھائے اسے دور تک جاتے دیکھتی رہیں۔ اور پھر آہستہ قدموں سے چلتی واپس فضل دین تک پہنچ گئیں۔

"یہ کیسے پہنچ گئے بھلا ہم تک؟" انہوں نے فضل دین سے سوال کیا۔

"میمونہ بی! ہم نے ان کو برخواستگی کا تو بتا دیا۔ یہ کیوں نہیں بتایا کہ ہم کو بحریہ میں ملازمت کس نے دلوائی تھی؟" فضل دین نے الٹا میمونہ بی سے سوال کیا۔

"یہ ہی تو ہم بھی سوچ رہے ہیں اور پھر وہ نہیں بتایا تو یہ بھی کیوں نہیں بتایا کہ ابھی تک ڈھوک کھوکھر کے اس مختصر سے مکان کے دو مکینوں کے لیے ہر ماہ راشن کون بھجواتا ہے۔"

"ہاں ہاں!" فضل دین نے اپنے ہلتے ہوئے سر کو قابو کرنے کی کوشش کی۔ "نہیں بتایا مگر یہ بات پکی ہے کہ وہ خود سے سب جانتے ہیں۔"

"ہائیں وہ کیسے؟" میمونہ بی ادھڑے ٹوٹے بید کی کرسی پر ٹکتے ٹکتے پل بھر کو رکیں۔

"تصویروں والی میم صاحب کا پوچھ رہے تھے کہ وہ ہمیں کیسے جانتی ہیں۔"

"وئی اللہ' سچ کہیں۔" میمونہ بی نے انگشت شہادت اپنی ٹھوڑی پر رکھتے ہوئے کہا۔

"اور نہیں تو کیا۔" فضل دین نے چشمہ آنکھوں سے اتار کر آنکھیں پونچھیں۔ "جو یہ جانتے ہیں کہ تصویروں والی میم صاحب کو ہمارا نام پتا معلوم ہے وہ اور کیا نہ جانتے ہوں گے۔"

"پھر چھری والی بات پر چونکے کیوں؟" میمونہ بی نے سوال کیا۔

"آپ سمجھیں نہیں میمونہ بی! سعد میاں چھری والی بات کی تو ہم سے تصدیق کرنے آئے تھے' باورچی خانے میں استعمال ہونے والے ایک آلے کو آلہ قتل انہوں نے ہی قرار دیا تھا۔" فضل دین مسکرائے۔

"ہائے کیسا خونیں منظر دیکھ کر آئے تھے آپ صاحب کے ساتھ لاہور میں۔" میمونہ بی اپنا سوال بھول گئیں ان کے پردہ تصور پر ماضی کے ایک منظر کا عکس جھلملانے لگا تھا۔

"آلہ جس کا تھا' قتل کس کا ہوا' کچھ سوجھا ہی نہیں' یاد ہے تو بس وہ کٹی گردن اور چاروں طرف بکھرا خون۔ ہم سے بڑی بھول ہو گئی میمونہ بی! ہم نے بے دھیانی میں سعد میاں سے اسی قصے کا ذکر کر دیا جس کی خاطر وہ تصدیق کی خاطر وہ آئے تھے۔"

"یہ ہی تو ہم آپ سے کہتے ہیں فضل صاحب! اب نجانے کیوں باتیں آپ کے منہ سے بلا ارادہ پھسلنے لگی ہیں۔ سننے کو دو کان صرف ہمارے ہی ہیں۔ اس لیے آپ احتیاط نہیں کرتے لیکن آج دیکھا' کیا نتیجہ نکلا اس بے احتیاطی کا کہ سعد میاں کے سامنے وہ بول بیٹھے جو نہیں بولنا تھا' کیونکہ آپ نے تو کچھ سنا تھا نہ دیکھا تھا۔" میمونہ بی نے ناراض لہجے میں کہا اور کھاٹ پر رکھی پوٹلی کھول کر اس کے اندر جھانکنے لگیں۔

"ہم نے تو فوراً" اپنی زبان کو تالا لگا لیا' آپ کہیں اتنے سال سے اپنے اندر وہ واقعہ دفن کیے بیٹھے ہیں کہ نہیں' ہمارے ہاتھوں تو وہ بانسری اب تک نہ نکلی جو بجتے پر پکار ڈالے کہ شہزادے کے گدھے کے کان ہیں۔" فضل دین اپنی صفائی میں بولے۔

"بے چارے سعد میاں بھی ٹھیک پوچھے کہ کوئی تو بتائے وہ کون ہیں۔" میمونہ بی نے فضل دین کی بات ان سنی کرتے ہوئے پوٹلی سے ہاتھ نکال کر کہا۔ "یاد ہے کیسا سختی سے منع تھا گھر میں سعد میاں کی والدہ کا ذکر' شفیق میاں بتا رہے تھے ابھی تک اس معاملے پر چپ چاں کا ماحول ہے ادھر۔"

"نہ میمونہ بی۔" فضل دین نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "جو محسن ہے' اس کا احسان یاد رکھیں ہمیشہ نہ ہم نے کچھ نہ دیکھا نہ ہی ہم کچھ جانتے ہیں۔"

"وہی تو ہم کہتے ہیں۔" میمونہ بی نے پوٹلی سے ایک پاسپورٹ سائز تصویر نکالتے ہوئے کہا۔ "اپنی زبان کو پھسلن سے بچائیے فضل صاحب۔"

"کس سے بچائیں بھئی' یہ سعد میاں آپ کا کیا خیال ہے۔ آج گئے پھر دوبارہ کبھی ادھر آئیں گے۔" فضل دین نے میمونہ بی کے ہاتھ سے تصویر لے کر آنکھوں کے قریب کرتے ہوئے کہا۔

"بے بی نادیہ کی یہ تصویر اس وقت کھنچوائی گئی تھی' زیدیز' سے جب ان کا داخلہ کانونٹ میں کرایا تھا میم صاحب نے۔" میمونہ بی نے فضل دین کو یاد دلایا۔

"یاد ہے' سب یاد ہے۔" فضل دین نے سر ہلایا۔ "شاخ سے ٹوٹی نوخیز کلی۔" انہوں نے آہ بھری۔

"شفیق بتا رہا تھا' بے بی نادیہ کدھر ہیں۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں۔" میمونہ بی نے تصویر واپس اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"میم صاحب بولتی جو تھیں۔ وہ صاحب کی لڑکی نہیں ہیں' ادھر وہ جو کرنل صاحب آتا تھا۔ ہٹلر کی مونچھوں والا' جو رات گئے تک ڈرائنگ روم میں بیٹھا اسکاچ اور وہسکی کی بوتلیں چڑھاتا رہتا تھا' اس کی لڑکی ہوں گی بی بی

نادیہ۔" فضل دین کے لہجے میں غصہ اور سختی اتری۔

"دیکھا پھر پھسلی آپ کی زبان فضل صاحب۔" میمونہ بی نے مصنوعی غصے سے فضل دین کو دیکھا۔

"تصویروں والی میم صاحب شکل کی اچھی تو نہیں تھیں مگر صاحب کو چاہیے تھا ان کو لے کر گھر بسا لیتے ان سے ان گوری میم صاحب سے اچھا گھر بسا لیتیں اور بسائے ہی رکھتیں پھر شاید آج سعد میاں چکری ہو کیلاں کا چکر نہ کاٹ رہے ہوتے۔" فضل دین اپنی دھن میں بولے چلے جا رہے تھے۔

"فضل صاحب' فضل صاحب۔" میمونہ بی نے ان کی زبان کی لگام میں کھینچنا چاہیں۔

"مگر ہمیں خوب یاد ہے' کیسا وہ صاحب سے گرج کر بولی تھیں کہ ان کو اب صاحب کی ضرورت نہیں تھی' کیسا تصویروں والے کاغذ اٹھا اٹھا کر صاحب کی طرف پھینکی تھیں' آخر میں موٹی جلد والی فائل بھی صاحب کے دے ماری تھی' خوب یاد ہے ہمیں' صاحب کچھ نہیں بولے تھے سوائے اس کے کہ۔ "تم نے غلط کیا' تمہیں مجھے بتانا چاہیے تھا یوں آوارہ کتوں بلیوں کی خوراک بننے کو چھوڑ دینے سے بہتر تھا۔ مجھے بتاتیں مل کر گلا گھونٹ دیتے اور کیا کر کے نفرت' نفرت کی گردان بھی کیے تھے صاحب!"

"فضل صاحب! آپ بھول رہے ہیں کہ آپ نے کچھ دیکھا نہ کچھ سنا۔" میمونہ بی نے ایک بار پھر دہائی دی۔

"اور پھر صاحب ہمیں بولے فضل میاں! یہ سب کاغذ' تصویریں سمیٹ لیجیے' ان کو موٹی جلد والی فائل میں سنبھال دیجیے' نفرت کی نشانیاں سنبھالنے کا بھی انسان میں حوصلہ ہونا چاہیے۔"

"فضل صاحب۔" میمونہ بی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر فضل دین کا بازو زور زور سے جھنجوڑا۔

"اس کے بعد تو صاحب باہر کے ملک چلے گئے تھے نا میمونہ بی۔ کیا کر کے ولایت شاید' آگے سے ہم بھول سے گئے بات۔" فضل دین نے میمونہ بی کی طرف دیکھا اور اپنا بازو دوسرے ہاتھ سے سہلانے لگے۔

"ہالٹ فضل صاحب ہالٹ۔" میمونہ بی نے کہا۔

"ہاں ہاں۔ ہم تو چپ ہیں۔" فضل دین نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ "بالکل چپ۔" فضل دین کا سر رعشے کی وجہ سے ہولے ہولے ہل رہا تھا اور میمونہ بی بے بسی سے سامنے کھڑی انہیں دیکھ رہی تھیں۔



"بندہ ویلے نال رولے تو چنگا رہتا ہے سعدیہ باؤ کویلے (وقت کے بعد) رون داتے کوئی فیدہ (فائدہ) ہوتا ہے نہ بندے کے اتھرو (آنسو) پونچھتا ہے کوئی۔" کھاری نے اپنے بازو سے چمٹ کر روتی سعدیہ کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"اماں اتنی اچھی نعتیں پڑھتی ہیں کھاری! اماں اتنی اچھی باتیں سکھاتی ہیں' وہ بول رہی تھیں اور میں نے وہاں بیٹھی عورتوں کو مکر کر کے نہیں سچ میں روتے دیکھا میں نے جو آج دیکھیں یہ وہ اماں نہیں تھیں جو میں نے ہمیشہ اپنے گھر میں دیکھیں۔ بات بے بات غصہ کھانے والی' منہ کے آگے' سوچ کے آگے اپنی لاتوں اور گھونسوں کے بند باندھنے والی' مجھے تو اماں ایک نظر غصے سے دیکھ لیتیں تو میرے کئی دن اس ایک نظر کے خوف کی نذر ہو جاتے تھے۔" سعدیہ نے ہچکیوں کے دوران کہا۔

"بھین جی نے بھی چنگا (اچھا) نہیں کیا سعدیہ باؤ!" کھاری نے افسوس سے سر ہلایا۔ "جس ڈر کے ہاتھوں جس خطرے کی وجہ سے آپ کو اتنا دبا کے رکھا وہ تے ہو کے رہیا' آپ نے سر بھی اٹھایا اور اونچی آواز میں بھی بولیں۔ پر چنگا آپ نے وی نئیں کیا سعدیہ باؤ بلکہ آپ نے تو بڑا برا کیا بہت ہی برا کیا۔"

"مجھے اماں نے مجبور کیا ایسا کرنے پر۔" سعدیہ اس کے بازو سے الگ ہو کر بولی۔ "جب میں پانچویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ اس وقت سے مجھے کہہ رہی تھیں میں' تمہیں ڈاکٹر بناؤں گی' خوب محنت کرو' خوب محنت کرو' میں نے دن دیکھا نہ رات میں کتابیں ہی پڑھتی رہی کتابیں کھول کر پیتی رہی' میں نے کبھی نہ سوال کیا اماں سے کاہے کو آٹے کے سفید تھیلے کھول کر یونیفارم کی شلواریں سی کر دیتی ہیں مجھے۔ کیوں میری نیلی قمیصوں پر ہر سال ہی پیوند کھونچ بھرنے کی سلائیاں' چکناہٹ کے داغ اور جگہ جگہ سے مسکے ہونے کے نشان نظر آتے ہیں۔ کیوں میں کبھی سردی گرمی میں کوئی نیا جوڑا نہیں پہن پائی' کیوں میرے سامنے ہمیشہ پانی میں تیرتے دال کے دانوں یا آلو کی قتلیوں کی رکابیاں ہی آتی ہیں' کیوں ہمارے گھر میں روٹی اتنی ہلکی اور پتلی بنتی ہے کہ دو نوالوں میں ختم ہو جاتی ہے' چاہے پیٹ خالی ہی کیوں نہ رہ جائے۔ بھوک کی شکایت نہیں کی جا سکتی کیونکہ ایک روٹی تو پوری کھالی ہوتی ہے ایک روٹی سے زیادہ کیا کھانا' کیوں بھوک رکھ کر کھانے کا اصول ابا جی پر لاگو نہیں ہوتا جو چپڑی کھاتے ہیں اور جتنی دل چاہے کھاتے ہیں۔"

کھاری نے دیکھا' آنسو بہاتے ہوئے یہ باتیں کرنے کے دوران سعدیہ کی ناک' منہ اور آنکھیں سرخ ہوئی جا رہی تھیں' اس کے بال بکھر گئے تھے اور سر سے اترا دوپٹا کندھوں پر ڈھلکنے لگا تھا۔

"لوگوں کے گھر آتے جاتے مہمان دیکھ کر دل میں جب بھی سوال اٹھا کہ ہمارے گھر کیوں کوئی نہیں آتا' اماں نے کبھی آرام سے نہ بتایا کہ ہمارا آگا پیچھا کوئی کیوں نہیں ہے۔ بس اکھڑ آواز میں چمٹا اٹھا کر گھرک دیا' پھر بھی میں نے کئی سوال اپنے دل ہی میں رہنے دیے۔ کبھی نہ پوچھے' کبھی آواز نہ نکالی' صرف اس ڈر سے کہ کہیں اماں ناراض ہو کر مجھے ڈاکٹر نہ بنانے کی سزا نہ دے دیں۔" سعدیہ کی ہچکی بندھنے لگی۔

"آپ نئیں جانتیں سعدیہ باؤ!" کھاری نے کہنا چاہا۔ "آپ کو ابھی بھی کچھ نئیں پتا بھین جی دیاں مجبوریاں کا' آپ نوں نئیں پتا بھین جی کون کون سے عذاب سہہ کر ادھر تک پہنچے تھے۔"

"مجھے کبھی بتاتیں تو پتا چلتا۔" سعدیہ نے اپنی ہچکیوں اور سسکیوں پر قابو پاتے ہوئے کھاری کی بات کاٹی۔ "اور سب سے بڑا عذاب تو ابا جی تھے ہمارے لیے۔" اس کے لہجے میں نفرت اور سرکشی اتری "اللہ کی خدمت کرنے والے ابا جی گھر میں خدا بنے بیٹھے رہے۔ یہ نہیں کرنا' وہ نہیں کرنا' اللہ سے پہلے ابا جی ناراض ہو جائیں گے۔" اسے نہیں پتا تھا وہ کیا کہے چلے جا رہی تھی۔ "تم نے کبھی ابا جی کو غور سے دیکھا ہے' خوف آتا ہے ان کی شکل دیکھ کر' ابا جی جیسے انسان کے ساتھ زندگی گزارنا ایک بہت بڑا جہاد نہیں تو اور کیا ہے۔ میں نے تو پھر بھی یہ ساری باتیں اماں کے ڈر سے کبھی نہیں کیں۔ اماں کہیں ناراض ہو کر ڈاکٹر بننے سے منع نہ کر دیں۔ پھر بھی کیا ہوا آخر میں؟

وہی ہوا نا' اماں بولیں کوئی ڈاکٹر واکٹر نہیں بننا' ہمارے وسائل ہی اتنے نہیں' سنا تم نے انہوں نے کہا۔ ڈاکٹر بھی نہیں بننا' آگے پڑھنا بھی نہیں بس بیاہ کر دینا ہے تمہارا' بس بیاہ کر دینا ہے۔" وہ بلند آواز میں بولی اور بری طرح رو دی۔

"آپ کی باتیں سن کر مینوں لگدا' چنگا ہی ہویا جو میں بنا ماں باپ دے ادھر رل کھل کر بڑا ہو گیا' جو ماں باپ دے ہونے کی وجہ سے یہ حال ہوتا ہے تو میں تو پھر ایسے ہی ٹھیک ہوں۔" وہ افسردگی سے بولا "مگر تسی ایک بار بھین جی کے پاس آرام سکون نال جا کر بیٹھو' کج ان کی سنو' کچھ اپنی سناؤ' ان کی کہانی سن کر آپ نوں سمجھ آ جائے گی جو انہوں نے کیا او حق تھا او ہی سچ تھا۔" اس نے سعدیہ کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کو یہ نہیں پتا مولوی صاحب کا ساتھ ان کے لیے جہاد تھا کہ نعمت آپ کو نہیں پتا بھین جی کن کنڈیاں (کانٹوں) پر چلتی ادھر تک پہنچی ہیں۔ آپ نوں نہیں پتا بھین جی نے آپ نوں دنیا کی اگ (آگ) توں بچانے کے لیے کتنی بڑی قربانی دی ہے۔ بندے کے اندر کے بھید بندہ آپ جانتا ہے یا اس کا خدا جانتا ہے سعدیہ باؤ! دنیا کی

داتری (درانتی) کے دونوں طرف کنڈے ہیں' یہ ادھر سے بھی کاٹتی ہے ادھر سے بھی کاٹتی ہے' بھین جی نے کس طرح داتری (درانتی) کے وچکار قدم چکتے چکاتے آپ نوں یہاں تک پہنچایا۔ یہ وہی جانتے ہیں سعدیہ باؤ' بے وسائی (بے اعتباری) بڑی وڈی دشمن ہے بندے کی' بے وسائی (بے اعتباری) کرکے ہی تو آپ نے پہلے راستہ کھوٹا کیا اب میری مانو' بھین جی کے پاس جا کر اپنا اور ان کا دل پھولو۔" کھاری کے لہجے میں اداسی تھی اور کچھ کھو جانے کا غم بھی۔

"باقی میں نے پہلے دن عرض کیتی تھی آپ نے ڈاکٹر بننا ہے تو میں چوہدری صیب کی منت ترلہ کروں گا' آپ کو ڈاکٹری پڑھنے سے کوئی روک نہیں سکتا' میں آپ نوں ڈاکٹر بناؤں گا سعدیہ باؤ! میں بناؤں گا۔"

سعدیہ اپنا رونا چھوڑ کر کھاری کا یہ جذباتی انداز دیکھ رہی تھی۔ اس کے ذہن میں ایک سوال نے یکایک سر اٹھایا تھا۔ پڑھے لکھے جاہل اور ان پڑھ عالم میں کیا اور کتنا فرق ہوتا ہے۔

"اور تم... تم کیا کرو گے؟" سوال کچھ اور ہی الفاظ کی شکل میں اس کے منہ سے نکلا تھا۔

"میں۔" وہ بے نیازی سے بولا۔ "میں نے تے یہ بھی پہلے ہی بتا دیا تھا۔" وہ سامنے دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں چوکیدارہ کروں گا' کسی نوں آپ تک پہنچنے نہیں دوں گا' چوکیدارہ تگڑا کروں گا ان شاء اللہ!"

"جاہل جو عامل ہو اور عالم جو بے عمل ہو۔ بس اتنا ہی فرق ہے۔" سعدیہ کے ذہن کے کسی گوشے نے ایک عجیب سا جواب دیا۔



"میں تمہارے مستقبل سے اتنی مایوس ہو چکی ہوں کہ تمہارے بارے میں کوئی خیال ظاہر کرنا بھی وقت کا ضیاع ہی سمجھتی ہوں۔" فائزہ نے کھردرے مگر واضح الفاظ میں کہا۔

"ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں ممی' انہیں میرے بارے میں ایسا ہی سوچنا چاہیے۔" ماہ نور نے فائزہ کی بات کے جواب میں کوئی مزاحمتی جملہ نہ کہنے کا فیصلہ کرتے ہوئے کہا اور ایک سرسری نظر بابا پر ڈالی جو پڑھنے کا چشمہ ہاتھ میں پکڑے ٹھوڑی ہاتھ پر ٹکائے اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس سے نظریں ملنے پر انہوں نے چشمے والا ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے سے نکال کر شانے اچکاتے ہوئے ہاتھ یوں لہرایا جیسے کہہ رہے ہوں۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں کیونکہ تمہاری ماں کی مایوسی بجا ہے۔ اس نے دوبارہ ممی کی طرف دیکھا جن کے چہرے پر بے زاری اور تناؤ تھا۔

"تعلیمی زندگی کا کوئی ایسا سال مجھے یاد کر کے بتاؤ جب تم نے مجھے سولی پر لٹکائے بغیر کلاس پاس کرلی ہو۔" فائزہ نے کہا "کبھی کسی ٹیچر سے مزاج نہیں ملتا تھا اور کبھی عین فائنل ایگزیم کے دنوں میں کتاب یا نوٹ بک گم ہو جاتی تھی اور یہ سال جو تم نے میڈیا سائنسز میں ڈگری لینے کی تگ ودو میں گزارے' ان سالوں نے تو مجھے ناکوں چنے چبوا دیے' ناتم نے۔" ان کی آواز بلند ہوئی۔ "اور وہ بھی لوہے کے۔"

وہ فلور کشن پر سر جھکائے بیٹھی تھی' ممی کی آواز اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی مگر اس کی نظریں ماربل فلور پر بچھے فلور میٹ پر جمی تھیں جس پر اسے ایک سوال ایک بڑے سوالیہ نشان کے ساتھ لکھا نظر آرہا تھا "سعد کہاں ہو سکتا تھا؟"

ابراہیم کے خیال میں یہ ملین ڈالر سوال تھا جبکہ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اس سوال کا جواب بلند پہاڑوں کی درمیانی وادی میں سر اٹھا کر کھڑے ان فلیٹس کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں موجود تھا جن کی طرف ابراہیم کا دھیان اس لیے نہیں گیا تھا کیونکہ اس کے ہم زاد نما دوست نے اسے ان کے بارے میں قطعی طور پر لاعلم رکھا تھا۔ اس کا ذہن سعد سلطان کے بارے میں ایک نئی کہانی گھڑ رہا تھا۔ سارہ خان کی کوئی ایس او ایس کال

ہی سعد سلطان کو یوں آنا "فانا" فارم ہاؤس سے اٹھا کر لے جاسکتی تھی۔

سارہ خان کے ساتھ تعلق کو ایک عملی رشتے میں ڈھالنے کی خاطر ہی وہ اپنے باپ سے' دوستوں سے اور تقریباً" ساری دنیا کی نظروں سے اوجھل ہو سکتا تھا کیونکہ شاید یہ وہ فیصلہ تھا جو اس کے کسی بھی قریبی تعلق دار کے لیے ناقابل قبول ہوتا۔

وہ اپنی اختراع کردہ کہانی پر جوں جوں آگے سوچتی توں توں اس کا اس پر یقین بڑھتا جاتا۔ عشق حسد کی اندھی گلی میں جا پھنسا تھا اور وہاں پھنس کر عقل کا داروغہ گنوا بیٹھا تھا۔

"مگر آنٹی رابعہ۔" حسد اور رشک کی کسک کے اندر سے نیکی اور نیک دلی کا ایک فطری جذبہ سر اٹھاتا۔ سعد سلطان اپنی ذاتی زندگی میں خواہ کسی کا بھی شریک سفر بن جائے' آنٹی رابعہ سے اسے ملوانے کا وعدہ میں نے کیا تھا اور میں ان وعدوں کی ناراضی میں' جو کبھی کیے ہی نہیں گئے' آنٹی رابعہ سے کیا وعدہ کیسے بھلا سکتی ہوں۔" اس کی ذہنی رو ایک خیال سے دوسرے خیال کے درمیان بھٹک رہی تھی۔

"پھر اب تم بتانا پسند فرماؤ گی کہ آئندہ کیا کرنے کا ارادہ ہے' سمسٹر تو ضائع ہو ہی گیا' آگے کیا کیا ضائع کرنے کا ارادہ ہے تمہارا؟" ذہن کی رو سے اچانک فائزہ کی آواز ٹکرائی تو وہ چونک کر حال میں واپس آگئی۔

"مجھے تو شاید یہ اب کچھ نہیں بتائے گی۔ آپ ہی پوچھ لیجئے کہ اگلے سمسٹر کو جوائن کرنے کے درمیان جو فارغ وقت ہے' اس میں یہاں کچھ کرنا پسند فرمائیں گی محترمہ یا چچا کے ساتھ فارم ہاؤس پر مویشیوں اور گاجروں کی افزائش پر مزید تحقیق کرنے کا ارادہ ہے ان کا۔" فائزہ اس کی غائب دماغی اور مسلسل خاموشی پر چڑ کر اٹھتے ہوئے بابا سے مخاطب ہوئی تھیں۔

ممی کے جانے کے بعد بابا نے کچھ دیر نظریں ہاتھ میں پکڑی کتاب پر ٹکائے رکھنے کے بعد اس کی طرف دیکھا تھا۔

"میں دل سے معذرت خواہ ہوں بابا" ماہ نور بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کر بابا کے قریب آئی۔ "میں نے شاید ہمیشہ آپ کو اور ممی کو لیٹ ڈاؤن کیا ہے' کم از کم آج تو مجھے ایسا ہی لگ رہا ہے۔" اس کی آواز بھیگنے لگی۔

"میں ہمیشہ کی بات تو نہیں کروں گا' لیکن اس مرتبہ تو ایسا ضرور ہوا ہے۔" بابا نے کہا۔

"میں جانتی ہوں' اسی لیے ممی کے سامنے بھی کچھ بولی نہیں۔" وہ شرمندگی سے سر جھکا کر بولی۔

"میں شاید تمہاری شخصیت کو کسی اور اینگل سے دیکھ بھی لوں ماہ نور!" بابا نے نیچی آواز میں کہا۔ "لیکن تمہاری ممی ایسا کبھی نہیں کریں گی۔ تمہارے سلسلے میں ان کی تمام کوششیں رزلٹ اورینٹڈ ہیں اور ایسا کرتے ہوئے' تم سے بڑی امیدیں لگاتے ہوئے وہ کچھ غلط بھی نہیں کرتیں۔"

"وہ ٹھیک کہہ رہی تھیں شاید میں نے ہمیشہ ہی انہیں مشکل میں ڈالے رکھا۔" ماہ نور نے اعتراف کرنے کی کوشش کی۔

"سلمان نے بھی ایسا ہی کیا اور اب تک کر رہا ہے۔" بابا نے کہا۔ "لیکن اس میں اور تم میں یہ فرق ہے کہ وہ انہیں چونکا دینے والی کوئی بھی حرکت کرنے سے پہلے انہیں آرام سے بٹھا کر اعتماد میں ضرور لیتا ہے۔"

"میں کیا کروں بابا!" وہ روہانسی ہوئی۔ "میں ہوں ہی گڈ فار نتھنگ انسان۔" "آپ لوگ مجھ سے کوئی اچھی امید نہ ہی لگایا کریں۔"

"اب تم خوامخواہ سیلف پٹی (خود رحمی) کا شکار ہو رہی ہو۔" بابا کا لہجہ قدرے سخت ہو گیا۔ "اب تمہارا دل بھائی سردار کے فارم ہاؤس پر زیادہ لگتا ہے تو اس میں تمہارا کیا قصور۔" اب ان کے لہجے میں ذرا سی شرارت اتری۔ اس نے سر اٹھا کر بابا کی طرف دیکھا جو دوستانہ انداز میں اسے دیکھ رہے تھے۔

"چلو اب تم فٹافٹ بتاؤ کہ آئندہ کرنا کیا ہے تم نے۔" تمہاری ممی میرے ذمہ یہ سوال لگا گئی ہیں اور یقیناً" جواب کی بھی منتظر ہوں گی۔

"سمسٹر تو ضائع ہو ہی گیا۔" ماہ نور نے فلور میٹ پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ اگلا سمسٹر جوائن کرنے میں ابھی وقت ہے میں سوچ رہی ہوں فرقان ماموں کے پاس اسلام آباد جا کر منی ایچر پینٹنگ اور اسکیچنگ کی کلاسز جوائن کرلوں میرا ہاتھ اچھا ہے' چھوٹے موٹے کام تو میں بغیر کسی تربیت کے بھی کرلیتی ہوں' لیکن اگر باقاعدہ تربیت حاصل کرلوں تو بہت اچھا ہو جائے گا' مجھے بہت شوق ہے' یہ دونوں فن سیکھنے کا بابا!" اس نے بچوں کی سی ضد بھری نظروں سے بابا کی طرف دیکھا' اس کے دل میں قوی امید تھی کہ بابا اس کی بات مان جائیں گے۔

"اسلام آباد!" بابا نے ٹھٹک کر پوچھا تھا۔ "اسلام آباد کیوں بھئی' ایسی کلاسز تو یہاں بھی لی جاسکتی ہیں۔ کوئی خاص وجہ۔"

"آپ کو دو شعر سناؤں بابا!" جواب میں اس نے ان کی طرف سر اٹھا کر دیکھا تھا۔

"ضرور... میں ہمہ تن گوش ہوں بھئی۔"

بخت روز وصال دلبر
کہ داد ما را غریب خسرو

سپت ماں کہ ورائے رکھن
جو جائے پاؤں پیا کی کھتیاں
(ترجمہ)
اس محبوب من سے ملن کے اعزاز میں
اے خسرو' جس کے سحر نے مجھے یہاں تک پہنچایا
میں اپنے دل کو قابو میں رکھوں گی
شاید کبھی جو میں اس کے سحر کا راز جان پاؤں

بہت خوب... بابا بے اختیار بولے تھے۔ "کیا سردار چچا سے وہاں بیٹھ کر فارسی زبان سیکھی جارہی تھی۔"

"شاید یہ آپ کے اسلام آباد جانے والے سوال کا جواب ہے بابا!" اس نے دل ہی دل میں جواب دیا تھا اور سر اٹھا کر بابا کی طرف دیکھا تھا۔

"پھر کیا میں امید رکھوں کہ مجھے میری تمام نالائقیوں کے باوجود اسلام آباد جانے دیا جائے گا۔"

"بھئی' میرا ووٹ تو پکا تمہارے لیے ہے' تمہاری ممی البتہ ضرور بحث کریں گی۔ کیونکہ اعتراض شاید اسلام آباد جانے سے زیادہ فرقان کے گھر رہنے پر ہو۔" بابا نے کہا۔

"وہ میں ان کو خود منالوں گی۔ آپ صرف اسلام آباد جانے والی بات پر راضی کرلیں انہیں۔"

ماہ نور نے خوشامدی لہجے میں کہا اور بابا کی مسکراہٹ پر مطمئن ہو کر دوبارہ سے نظریں فلور میٹ پر بنتے مٹتے ملین ڈالر سوال کی طرف گاڑلیں۔



دروازے پر پڑنے والی وہ دستک غیر معمولی تھی یا اس کا دل یوں ہی بری طرح دھڑکا تھا۔ اس نے ہڑبڑا کر دروازے کی طرف دیکھا تھا۔ یمی آنٹی بھنتی ہنڈیا میں چمچہ چلانا چھوڑ کر چولہے کی آنچ مدھم کریں گی۔ پھر اپنے

ایپرن سے ہاتھ اچھی طرح پونچھنے کے بعد ایپرن کی گرہ کھول کر اسے قرینے سے کرسی کی پشت پر پھیلانے کے بعد آہستہ قدموں سے چلتی دروازے تک پہنچیں گی۔ ان سے جلدی تو میں خود دروازہ کھول لوں گی۔

اس نے سوچا اور میز پر بکھرے رنگ اور برش یوں ہی چھوڑ کر دیوار کا سہارا لیتی دروازے تک پہنچ گئی۔

"کون ہے' پوچھ تو لو۔" اس اثنا میں یسی آنٹی کچن کے دروازے تک پہنچ چکی تھیں۔

"کون ہو سکتا ہے۔ نئے ہمسایوں کی وہی بچی ہوگی جسے ہر دوسرے منٹ کسی چیز کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔" اس نے گردن موڑ کر یسی آنٹی کی طرف دیکھا۔

"اور اس کی ماں تم سے کہتی ہے' تم کیسی مسلمان ہو جو ایک عیسائی عورت کے ہاتھ کا پکا کھانا کھاتی ہو۔" یسی آنٹی کی آواز میں غصہ اترا "اور خود اپنی بیٹی کو روک نہیں سکتی جو مجھ سے میرے بنائے پین کیکس اور سوئس رولز مانگنے آجاتی ہے بھوک لگنے پر۔ رہنے دو۔ مت کھولنا۔" وہ تیز آواز میں بولیں۔

"اُفوہ! دیکھنے تو دیں 'کون ہے۔" اس کا ہاتھ بمشکل دروازے کے اوپری سرے پر لگی کنڈی تک پہنچا۔ دروازے کا نچلا ہینڈل اور لاک کئی روز پہلے ٹوٹ گیا تھا اور اب تک مرمت نہیں کرایا جا سکا تھا۔

"پوچھ تو لو۔" یسی آنٹی نے ایک بار پھر کہا۔ مگر ان کی ہدایت پر عمل کرنے سے پیشتر دروازہ کھل چکا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ سارہ کا منہ بھی۔

"یار! میں کوئی عجوبہ تو نہیں بن چکا اتنے دن میں جسے سامنے پا کر اتنی حیرت کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔" آنے والے نے کچھ دیر اس کے دروازے سے ہٹنے کا انتظار کرنے کے بعد اسے نرمی سے پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا اور اندر چلا آیا۔ دروازہ بند کرنے کے بعد اس نے سارہ کے بازو کو اپنے ہاتھ کا سہارا دیا اور اسے لیے آگے بڑھا۔

"کمال ہے یسی آنٹی! کبھی کال بیل خراب ہوتی ہے اور کبھی لاک کا کلچ' کیا اب آپ کو بیرونی حملہ آوروں کی فکر نہیں ستاتی جو خرابیوں کو درست کروانا چھوڑ دیا۔" اس نے اندر آتے ہوئے ـــــــ کچن کے دروازے میں ایستادہ بت سی بنی یسی آنٹی کو مخاطب کیا اور پھر سارہ کو کرسی پر بٹھا کر اپنے بازو پھیلاتے ہوئے بولا۔

"آئی ایم سوری ڈارلنگ! آج میرے ایک ہاتھ میں پھول اور دوسرے ہاتھ میں بڑا سا گفٹ باکس نہیں تھا۔ لہٰذا مجھے یہ فکر بالکل نہیں ستائی کہ میں تمہارے دروازے پر دستک کیسے دوں گا۔" اس نے اپنے خالی ہاتھ جھٹکے اور مسکراتے ہوئے سارہ کو دیکھنے لگا۔

"کیوں' کیا ہوا' ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟" سارہ کے چہرے پر مسلسل حیرت دیکھ کر اس نے اس سے سوال کیا اور پھر یسی آنٹی کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیوں یسی آنٹی! کیا میں واقعی عجوبہ لگ رہا ہوں۔"

"نہیں ـــ" بت بنی یسی آنٹی نے حرکت کی اور دو قدم آگے بڑھیں۔ "کیا کوئی بہت لمبا سفر کر کے سیدھے ادھر پہنچے ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

"نہیں تو۔" اس نے سر ہلایا۔ "کیوں؟"

"تمہارے چہرے کی تھکن اور کپڑوں کی سلوٹوں سے ایسا ہی لگ رہا ہے۔" یسی آنٹی نے اس کے لیے کرسی سیدھی کرتے ہوئے کہا۔ "تم پہلے کبھی اس حلیے میں یہاں آئے نہیں نا؟"

"او ہاں!" وہ جیسے ان دونوں کی حیرت کی وجہ سمجھ گیا۔ "آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میرا یہ حلیہ آپ کے لیے باعث حیرت ہونا بھی چاہیے۔

کیوں بیوٹی فل! کیا تم بھی اسی لیے حیرت زدہ ہو۔" کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے سارہ سے پوچھا۔

"نہیں۔" سارہ نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"پھر؟" اس نے گاڑی کی چابی میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں اس لیے حیران ہوئی کہ اب تک میں مایوس ہو چکی تھی کہ کبھی تم ادھر آؤ گے۔ تمہیں یوں اچانک دیکھ کر میں بے یقینی سی خوشی میں مبتلا ہو گئی۔ جو شاید تمہیں حیرت لگی۔"

"ہا!" وہ مصنوعی حیرت سے بولا۔ "گویا تم میری فاتحہ پڑھ چکی تھیں۔"

"اللہ نہ کرے۔" سارہ نے بے ساختہ کہا اور یسی آنٹی کی طرف کن اکھیوں سے دیکھنے لگی۔

"چائے ملے گی یسی آنٹی؟" اس کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے سعد نے یسی آنٹی کی طرف دیکھا۔ "شدت سے چائے پینے کو دل چاہ رہا ہے۔"

"ہاں۔ کیوں نہیں۔" یسی آنٹی نے کہا اور واپس کچن میں گھس گئیں۔ "ہاں' اب بتاؤ۔ تم کیوں میری طرف سے اتنی مایوس ہو گئی تھیں۔" یسی آنٹی کے جانے کے بعد اس نے اپنا رخ سارہ کی طرف کیا۔

"تم نے کہا تھا' میرے لیے تم پوری دنیا میں ہر وقت حاضر ہو۔" سارہ نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ "لیکن میرا تو تم سے کسی بھی طرح کا رابطہ ہی ناممکن ہو گیا۔ تم نے اپنا نمبر تبدیل کر لیا اور مجھے اطلاع بھی نہیں دی۔"

"اچھا!" سعد یوں بولا جیسے سارہ کی کہی یہ بات اس کے لیے بھی اطلاع ہو۔ "تم سے کس نے کہا کہ میں نے اپنا نمبر تبدیل کر لیا۔"

"مجھ سے کہنا کس نے تھا؟" سارہ نے سر جھٹکا۔ "تمہارا پرانا نمبر کئی دن سے بند ہے۔ اس کا مطلب تم نے نمبر تبدیل کر لیا ہے۔"

"کتنے اچھے قیافے لگاتی ہو تم!" وہ ٹانگیں آگے پھیلا کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا اور پھر کچھ سوچ کر ہنس دیا۔ "قیامت کا نام سنا ہے سارہ خان تم نے۔" اس نے سارہ کی طرف دیکھا۔

"قیامت بہت سے لوگوں کے لیے ابھی تک صرف نام ہوگی سعد سلطان! میں نے نہ صرف اس کا نام سنا ہے' بلکہ یہ مجھ پر گزری بھی ہے۔" سارہ نے اسی کے لہجے میں جواب دیا۔

"ہاں۔ پھر تو تمہیں خوب معلوم ہوگا کہ انسان کی زندگی پر چھوٹی چھوٹی قیامتیں جب گزرتی ہیں تو کیسا محسوس ہوتا ہے۔ اس کا کیا حال ہوتا ہے۔ وہ ویسا نہیں رہتا جیسا کبھی وہ ہوا کرتا ہے۔"

"بالکل معلوم ہے۔" "مگر تمہاری تھیوری کے مطابق تو انسان کو ایسی چھوٹی چھوٹی قیامتوں سے گزرنے کے بعد بھی خوش امید اور زندگی سے بھرپور رہنا چاہیے۔" اس نے سعد کی طرف دیکھا۔

"ہوں!" وہ سارہ کو غور سے دیکھتے ہوئے کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ بے دھیانی میں بولا۔

"ہاں!" پھر سر ہلاتے ہوئے وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "خوش امید اور زندگی سے بھرپور' اپنی اپنی قیامتوں کے گزرنے کے بعد دوبارہ زندگی کی طرف آنے کا اگر موقع ملے تو خوش امیدی اور زندگی سے محبت کا دامن پکڑ لینا چاہیے۔"

"تم یہ سوال کیوں کر رہے ہو؟" سارہ نے پوچھا۔ "اور تمہارا یہ حال حلیہ' تمہارا تو نہیں لگ رہا' اس کی کیا وجہ ہے' تم ٹھیک تو ہو نا؟"

"پتا ہے کیا سارہ خان! میں یقیناً" ساری دنیا میں تمہارے لیے کسی بھی وقت' کسی بھی جگہ حاضر ہوں۔" سعد نے سارہ کے سوال کا جواب دینے کے بجائے ایک دوسری بات کی۔ "کیا تم یقین کرو گی۔ پچھلے کئی دنوں سے میں اجنبی' انجان لوگوں میں رہتے رہتے پہلی بار جس کسی اپنے سے ملنے آیا ہوں وہ تم ہو۔"

سارہ نے چونک کر اسے دیکھا' اس کے چہرے پر بے یقینی تھی۔

"ہو پچھلے کئی دنوں کی خواری کے دوران جن کی فکر مجھے ستاتی رہی' ان میں سے ایک تم ہو اور تم اس مختصر سی

لسٹ میں پہلے نمبر پر ہو۔" اس نے سارہ کو یقین دلانے کی کوشش کی۔ "اسی لیے تو اگلا کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے میں صرف تم سے ملنے آیا ہوں۔ ایک تو اس لیے کہ مجھے تم سے چند ضروری باتیں کرنی تھیں اور دوسرا اس لیے کہ تمہیں سامنے دیکھ کر مجھے زندگی کا احساس ہوتا ہے۔"

"لیکن۔۔۔" سارہ نے کہنا چاہا مگر سعد نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کرا دیا۔

"مجھے کہنے دو سارہ خان۔۔۔! تمہارے بارے میں سب اچھے لفظ کہتے ہوئے جو خوشی میں محسوس کرتا ہوں۔ وہ مجھے کسی اور بات میں نہیں محسوس ہوتی۔"

"لیکن الفاظ سچے بھی تو ہونے چاہئیں۔" سارہ نے بے ساختہ کہا۔

"تمہارا خیال ہے میرے الفاظ جھوٹے ہوتے ہیں۔" وہ برا مانتے ہوئے بولا۔ اسی دم سیمی آنٹی چائے کا طشت اٹھائے چلی آئیں۔

"تھوڑی دیر ہو گئی چائے بنانے میں۔" انہوں نے طشت میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے ایپل ٹارٹس بیک کرنے کے لیے اوون میں رکھے تھے۔ ان کے بیک ہو جانے کا انتظار کرنے لگی۔ لو یہ کھا کر بتاؤ۔ کیسے بنے ہیں؟" انہوں نے سعد کے سامنے پلیٹ رکھی۔ "اور یہ سینڈوچز بھی کھاؤ‘ سارہ نے بنائے ہیں۔"

"سارہ نے!" وہ اپنی ناراضی بھول کر سارہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیا میں زندہ ہوں۔" اس نے اپنی کلائی پر چٹکی کاٹی۔

"ارے سارہ تو اب چھوٹے چھوٹے کتنے ہی کام کرنے لگی ہے۔" سیمی آنٹی مسکرائیں۔ "تم اس الماری میں بچھی شیٹس دیکھ رہے ہو نا!" انہوں نے دیوار میں جڑی ایک مختصر سی کھلی الماری کی طرف اشارہ کیا۔ جس میں چینی کے کچھ برتن سلیقے سے سجے تھے۔ "یہ الماری سارہ نے سجائی ہے۔ گلیزڈ پیپر کی یہ شیٹس خود کاٹ کر بچھانے کے بعد۔"

"آپ یقیناً "مذاق کر رہی ہیں۔" سعد نے دانستہ سارہ کو چڑانے کی خاطر کہا۔

"نہیں یہ مذاق نہیں حقیقت ہے۔" سیمی آنٹی نے کہا اور اپنے ایپرن سے ہاتھ پونچھنے کے بعد ایک میز کی دراز سے چند نیپکنز نکال لائیں۔

"یہ دیکھو!" نیپکنز ترتیب سے سعد کے سامنے بچھاتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"یہ سب ایمبرائیڈری سارہ نے کی ہے۔" سعد نے اپنے سامنے بچھے نیپکنز پر نظر دوڑائی۔ ہلکے رنگ کے چیک کپڑے پر دھاگے سے کشیدہ کیے وہ ننھے ننھے وجود یقیناً "سرکس کے کرتب دکھانے میں مصروف تھے۔ اس نے دو‘ تین نیپکنز اپنے قریب کھسکائے۔ پانچ‘ چھ گیندیں بیک وقت ہوا میں اچھال کر انہیں مہارت سے دبوچتا فگر‘ ایک پہیے کی سائیکل چلاتا وجود‘ لکڑی کی لمبی لمبی ٹانگیں اپنی اصلی ٹانگوں سے باندھ کر گیارہ فٹ کا انسان بنا وجود‘ سعد نے توصیفی انداز میں سرہلایا۔

"یہ ونڈر فل ہے۔ ہے نا سیمی آنٹی!" اس نے سیمی آنٹی کی طرف دیکھا۔

"یہی نہیں ہمارے ہاں جو ایک بلی گھومتی بھٹکتی آجاتی ہے‘ سارہ نے اسے اپنے ساتھ مانوس کر لیا ہے۔ اب وہ یہیں رہتی ہے اور سارہ اسے سرکس کے شیروں والے کرتب سکھاتی رہتی ہے۔ یہ اسٹک دیکھ رہے ہو۔" سیمی آنٹی نے کمرے کے مشرقی کونے میں دیوار کے ساتھ کھڑی چھڑی کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ سارہ کو چلنے میں مدد دیتی ہے اور بلی کو سدھانے میں بھی۔"

"گریٹ!" سعد کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"تم چائے انجوائے کرو‘ میں تمہارے لیے اچھا والا کھانا بناتی ہوں۔ کھانا کھا کر جاؤ گے نا۔" سیمی آنٹی کچن کی

طرف مڑتے ہوئے بولیں۔

"جی بالکل‘ کھاؤں گا!" سعد نے سرہلایا۔ "آج میں سرکس کی ملکہ سارہ خاتون کے ساتھ دن گزارنے آیا ہوں۔" اس نے مسکرا کر سارہ کی طرف دیکھا۔

"تمہیں پتا ہے۔ آج میں کیا محسوس کر رہا ہوں۔" سیمی آنٹی کے جانے کے بعد اس نے سارہ سے کہا۔

"کیا؟"

"مجھے لگ رہا ہے۔ آج میں نے دنیا فتح کر لی ہے۔" وہ سر کو ذرا سا بلند کرتے ہوئے بولا۔

"تمہیں ایسا محسوس ہونا بھی چاہیے۔" سارہ نے میز پر دھری گاڑی کی چابی کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ "ایک ٹوٹے پھوٹے ناکارہ وجود میں زندگی کی رمق ڈالنے‘ اسے حرکت میں لانے‘ پاؤں پاؤں چلنا سکھانے اور رفتہ رفتہ اسے کار آمد بنانے کا سہرا تمہارے ہی تو سر ہے۔"

"نہیں سہرا وغیرہ کچھ نہیں ہے۔ میں نے صرف چاہا تھا کہ ایسا ہو جائے۔ اللہ نے میری دعا سن بھی لی اور گرانٹ بھی کر دی۔" وہ سر جھکاتے ہوئے بولا۔

"مگر bravo پریا رانی! یہ سب تمہارا ہی تو کارنامہ ہے۔" اس نے سر اٹھا کر سرخوشی کے عالم میں کہا۔

"پریا رانی!" سارہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "تم نے مجھے کیا کہا۔ تم نے مجھے کس نام سے پکارا۔" وہ مسرت بھری بے یقینی سے بولی۔

"پریا رانی!" سعد نے دہرایا۔

"کیا واقعی تم نے مجھے اس نام سے پکارا۔" سارہ نے بے اختیار اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں بالکل۔" سعد نے دوسرے ہاتھ سے اپنے بازو پر رکھا اس کا ہاتھ دبایا۔ "اس لیے کہ تم بالکل پریوں جیسی خوب صورت ہو۔ اچھوتی اور نیک دل۔"

"تم بہت اچھے ہو سعد! اتنے اچھے کہ تمہاری اچھائی کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔" سارہ کی آواز خوشی سے کانپ رہی تھی۔ "آج مجھے لگ رہا ہے کہ میں واقعی زندہ ہوں۔ میں ایک جیتا جاگتا وجود ہوں۔ یہ دیکھو‘ یہ میرے ہاتھ۔" اس نے ہاتھ پھیلائے۔ یہ میرا چہرہ! ان میں خون دوڑنے لگا ہے۔" اس نے سعد کی طرف دیکھا جو اس کی بات سنتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

"سچ میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں سعد!" سارہ نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

"میں جانتا ہوں کہ تم سچ کہہ رہی ہو۔" سعد نے سرہلایا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ "اور یہی تو میں چاہتا تھا کہ تم ایسا محسوس کرنے لگو۔" وہ نرمی سے بولا۔

"تو پھر تم آج میرے لیے چاکلیٹس کیوں نہیں لائے؟" سارہ نے بچوں کی طرح اٹھلا کر پوچھا۔ اس کے روم روم میں خوشی رقص کر رہی تھی۔

"کیونکہ میری جیب میں صرف یہاں تک آنے اور واپس جانے کے فیول کے پیسے تھے۔ اس لیے میں تمہارے لیے نہ چاکلیٹس لا سکا‘ نہ ہی پھول۔" وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ "اور میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔"

"ایسے تو نہ کہو۔" سارہ نے کہا۔ "تمہارے کریڈٹ کارڈز اور اے ٹی ایم‘ وہ کیا ہوئے؟"

"واہ بھئی‘ تم بڑی باخبر ہو۔" وہ مسکرایا۔

"تو پھر ان کے ذریعے چاکلیٹس کیوں نہیں لیے۔" سارہ نے ناراضی سے اس کی طرف دیکھا۔

"اس لیے پریا رانی کہ انہیں آپریٹ کرنے سے میں لوکیٹ ہو جاتا۔" اس نے قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے ایک مبہم

کی بات تھی۔ سارہ کو محسوس ہوا اس کے قہقہے میں اداسی سی تھی۔

"مجھے تمہاری بات سمجھ میں نہیں آئی؟" اس نے متوحش نظروں سے سعد کی طرف دیکھا۔ اسے اچانک کسی انہونی کا احساس ہونے لگا تھا۔

"میری بات کو چھوڑو' یہ سنو کہ مجھے تم سے جو ضروری باتیں کرنی ہیں انہیں توجہ اور غور سے سننا ضروری ہے۔" سعد نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر اس کی تہیں کھولتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر بعد وہ وہی کاغذ میز پر پھیلائے ایک کاربن پنسل کی مدد سے اس پر کچھ لکھتا' نشان لگاتا' پہلے سے لکھی کچھ باتوں کے نیچے لکیر کھینچتے ہوئے سارہ کو بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔



"آپ کی سعد سے بات ہوئی فاطمہ خالہ؟ آپ کو اس سے کیا کہنا تھا؟" سنتھ کی باڑھ کے اس پار کھڑی ماہ نور نے لان میں مالی کو ہدایات دیتی فاطمہ سے کہا۔

"ارے ماہ نور۔" وہ اسے دیکھ کر باڑھ کے قریب چلی آئیں۔ "کب آئیں تم' بتایا بھی نہیں کہ آگئی ہو اور یہ کیا بھئی' نہ سلام' نہ دعا اور سعد کی بابت پوچھنے لگیں۔"

"وہ آئی ایم سوری!" اسے اپنی بے خیالی کا احساس ہوا۔ "میں دراصل اس بات پر حیران تھی کہ آپ کو سعد سے کیا کہنا ہوگا اور اس کا نمبر آپ کو کہاں سے ملا۔"

"اچھا' دم تو لو۔" فاطمہ نے پرسکون انداز میں کہا۔ "تم ادھر آجاؤ یا کہو تو باڑھ پھلانگ لوں۔"

"نہیں۔" ماہ نور کو خفت سی محسوس ہوئی۔ "میں آجاتی ہوں۔" وہ باڑھ کے ساتھ چلتی گھر کے عقبی حصے میں پہنچی اور دونوں گھروں کے درمیان لگا لکڑی کا چھوٹا سا گیٹ کھول کر فاطمہ' خدیجہ خالہ کے گھر کے عقبی حصے میں داخل ہو گئی جہاں شاگرد پیشے کے کوارٹر تھے۔

"امرود نہیں توڑو گی کیا۔ خوب پکے ہوئے بھی ہیں اور ادھ پکے' ادھ کچے پستئی رنگ والے بھی۔" باڑھ کے ساتھ کھڑی فاطمہ نے دور سے پکار کر کہا۔

"نہیں۔" وہ تیز قدموں سے چلتی فاطمہ کے قریب پہنچ کر بولی۔

"اچھا' پھر یہ بتاؤ' کیسی ہو اور وہاں گاؤں میں کیا کر رہی تھیں اب تک۔" فاطمہ نے پیار سے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرا۔ "اس لڑکے کے چوتھی چالے بھی اب تک تو ختم ہو چکے ہوں گے۔ جس کی شادی اٹینڈ کرنے تم گئی تھیں۔"

"بس وہ۔" ماہ نور کو اس وقت کسی بھی بات کی تفصیل بیان کرنے میں دلچسپی نہیں تھی۔ "سرواز چچا کے اصرار پر رکنا پڑا۔"

"اور تم رک گئیں۔" فاطمہ نے رہائشی حصے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ "یہاں تمہاری اماں تمہارا سمسٹر ضائع جانے پر سخت برافروختہ تھیں' جانتی ہو۔"

"جی وہ بس۔" اس نے سر جھکا کر اپنے ہاتھ کے ناخنوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "پلیز فاطمہ خالہ بتایئے نا سعد کا نمبر آپ کو کہاں سے ملا۔"

"چھری تلے دم تو لو لڑکی!" وہ لاؤنج میں آتے ہوئے بولیں۔

"نہیں نا' آپ بتائیں پلیز۔" وہ بے چینی سے بولی۔ "اور ہاں یہ خدیجہ خالہ کہاں ہیں؟" اسے یاد آیا۔

"وہ تو کسی کانفرنس میں کاغذ پڑھنے کراچی گئی ہوئی ہیں آج کل!" فاطمہ خالہ نے صوفے پر بیٹھ کر کہا۔

"کاغذ پڑھنے۔" ماہ نور نے اچنبھے سے ان کی طرف دیکھا۔

"ہاں بھئی' وہی کاغذ جسے ریسرچ پیپر کہتے ہیں۔" وہ سادگی سے بولیں۔

"او اچھا!" ماہ نور کو ایک لمحہ کے لیے ہنسی آئی۔ مگر اگلے لمحے اس کی بے چینی اس پر حاوی ہو گئی۔

"اوہو بھئی' سعد کا نمبر میرے پاس کہاں سے آتا۔ اگر وہ خود نہ دیتا۔" فاطمہ نے جھنجلا کر کہا۔

"اس نے دیا تھا۔" ماہ نور نے بے یقینی سے کہا۔ "آپ کو نمبر خود؟"

"ہاں تو کیا میں اب اس عمر میں اس سے فلرٹ کرنے کے لیے اس کا نمبر ٹریس کرواؤں گی۔"

"کب دیا اس نے آپ کو اپنا نمبر؟" ماہ نور کو احساس نہیں ہوا۔ وہ جرح کرنے کے سے انداز میں سوال کر رہی تھی۔

جب وہ ایک روز مجھ سے اکیلا یہاں ملنے آیا تھا۔ تب دیا تھا۔" فاطمہ نے بے نیازی سے کہا۔

"وہ آپ سے اکیلا یہاں ملنے آیا تھا۔" ماہ نور کی آنکھیں پھیلیں۔ "اس نے مجھے تو نہیں بتایا کب آیا تھا؟"

"تمہارے گاؤں جانے سے پہلے آیا تھا ایک روز اور تمہیں نہ بتانے پر تم سے ڈر بھی رہا تھا۔ اسے خوف ستا رہا تھا۔ اگر تم جانو گی کہ وہ تمہیں بغیر بتائے خود سے یہاں آگیا تھا تو تم بری طرح ناراض ہو جاؤ گی۔" فاطمہ نے کہا۔

"ہونہہ۔" ماہ نور کی آواز میں شکستگی جھلکنے لگی۔ "اتنی اس کو میری ناراضی کی پروا۔"

"ارے تم ایسا کہہ رہی ہو۔" فاطمہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "جبکہ اس کی باتیں سن کر مجھے بخوبی اندازہ ہو رہا تھا کہ۔

" How much you mean to him "

(اس کی نظر میں تمہاری کتنی اہمیت ہے)

"کیا بات کرتی ہیں آپ فاطمہ خالہ!" ماہ نور نے فاطمہ کی بات کو یکسر رد کرتے ہوئے کہا۔ "میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ میری اہمیت اس کی نظر میں کیا اور کتنی ہے۔"

"نہ مانو۔" فاطمہ نے مسکرا کر کہا۔

"بس آپ یہ بتائیں کہ وہ آپ کے پاس کیوں آیا تھا؟"

"ارے بھئی تمہارے سامنے ہی تو ہم اپنی کزن شہناز کا تذکرہ کر بیٹھے تھے اس سے' اسی کے تذکرے میں اسے عجیب سی دلچسپی محسوس ہونے لگی۔ اگلے روز اس کے بارے میں مزید تفصیل پوچھنے آیا تھا مجھ سے۔"

"ایک تو یہ سعد بھی! اسے ہر ایسے قصے میں دلچسپی محسوس ہوتی ہے اور یوں تفصیل سے سنتا ہے کہ جیسے اس سے زیادہ اہم بات تو کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی۔" ماہ نور کو سعد کی فاطمہ کے پاس آمد کا مقصد سن کر مایوسی ہوئی۔

"آپ پھر اس سے فون پر بات کیوں کرنا چاہ رہی تھیں؟" اس نے مایوسی سے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

"بات کیا کرنی تھی۔ اس کے اصرار پر مجھے بھی دلچسپی سی محسوس ہونے لگی کہ بھلا کہیں سے پتا تو کراؤں' شہناز کا حقیقت میں کیا انجام ہوا۔ وہ واقعی قتل ہو گئی یا ابھی زندہ ہے۔" فاطمہ نے کہا۔

"پھر؟"

"پھر میں نے اپنی ایک دوست سے' جو فلمی میگزین پڑھنے کی بہت شوقین تھی۔ پوچھا کہ شہناز کے بارے میں کیا کوئی خبر کبھی شوبزنس کے کسی پرچے میں شائع ہوئی تھی۔ اس نے اٹھا کر مجھے جوٹ کے تین بڑے تھیلے ایسے پرانے پرچوں سے بھرے بھجوا دیے۔ ان پرچوں کو کھول کر پڑھنے کی پاداش میں مجھے پندرہ دن الرجی نے دم نہیں لینے دیا۔"

"اچھا تو پھر وہ خبر۔" ماہ نور نے بے تابی سے کہا۔ "میرا مطلب ہے کہ کوئی خبر ملی آپ کی کزن کے بارے میں۔"

"ہاں ایک پرچے میں ایک مختصر خبر لگی ہوئی تھی کہ سروں کی ملکہ شہناز مجید جوان دنوں گمنامی کی زندگی بسر کر رہی تھیں۔ قاتلانہ حملے میں زندہ بچ جانے اور اسپتال سے چھٹی مل جانے کے بعد حج کے لیے روانہ ہو رہی تھیں۔" فاطمہ نے سرہلاتے ہوئے کہا۔

"اوہ تو اس کا مطلب وہ بچ گئی تھیں۔" ماہ نور نے بے ساختہ کہا۔ "مطلب گلا کٹنے سے ہلاکت کی خبر غلط تھی۔"

"خدا جانے بھئی۔" فاطمہ نے بے نیازی سے شانے اچکائے۔ "اس خبر سے تو بظاہر یہی لگتا ہے اور یہ ہی بتانے کے لیے میں سعد سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔ اس سے بات ہی نہ ہو پائی۔"

"آپ کو خود حیرت نہیں ہوئی فاطمہ خالہ۔ آپ کو خود تجسس نہیں ہوا کہ جانیں اپنی کزن کے بارے میں وہ زندہ ہیں ابھی تک یا نہیں۔" ماہ نور نے کہا۔

"یقیناً" ہوا۔" فاطمہ نے اعتراف کیا۔ "لیکن بھئی ہم تم جانو ہم تو اب کہاں سے معلوم کرتے پھریں کہ وہ زندہ ہے یا نہیں۔ میں نے سوچا سعد کو بتاتی ہوں' جوان اور متحرک لڑکا ہے۔ ضرور کچھ پتا چلالے گا۔ مگر اس سے بات ہی نہیں ہوئی' آخر ہے کہاں وہ؟" انہوں نے ماہ نور کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔

"وہ۔۔۔" ماہ نور کی آواز گھٹ گئی۔ "اس کی کچھ خبر نہیں ہے۔ وہ کسی کو بھی کچھ بتائے بغیر کئی دن سے غائب ہے۔"

فاطمہ نے ماہ نور کی آواز اور لہجے پر غور کیا اور اس کی بھیگتی آنکھوں کی طرف دیکھا۔

"کیسا وعدہ خلاف ہے یہ لڑکا بھئی۔ مجھ سے یہاں پختہ وعدہ کرکے گیا تھا کہ تمہیں کبھی کوئی دکھ نہ دے گا۔" انہوں نے با آواز بلند خود کلامی کے انداز میں کہا۔

"وعدہ۔۔۔ کہ مجھے کبھی کوئی دکھ نہ دے گا۔" ماہ نور نے چونک کر فاطمہ کی طرف دیکھا۔

"ہاں بی بی! مجھ سے یہ وعدہ کرتے وقت تو اس کے لہجے میں بڑا خلوص اور سچائی تھی۔" فاطمہ نے رسان سے کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"لیکن تم یہ سب مجھے کیوں سمجھا رہے ہو۔" سارہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "میں کیا کروں گی ان اکاؤنٹس' چیک بکس اور پلاسٹک منی کا۔"

"تم استعمال میں لاؤ گی انہیں' اپنے لیے' اپنے مستقبل کے لیے۔" سعد نے کاغذ اس کی طرف کھسکاتے ہوئے ایک بار پھر کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں دبانے لگا۔

"تو تم کس لیے ہو؟" سارہ نے اس کاغذ کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "اب تک بھی تو تم خود ہی یہ سب کرتے آئے ہو' پھر اب مجھے کیوں دکھا رہے ہو۔"

"اس لیے کہ میں تمہیں خود انحصاری کا سبق پڑھانا چاہتا ہوں۔" سعد نے میچی ہوئی آنکھیں کھولیں۔ "ٹھیک ہے کہ میں پوری دنیا میں تمہارے لیے بروقت حاضر ہوں۔ لیکن کبھی کبھی درمیان میں فاصلے اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے کی آواز اور دکھ سکھ تو سن سکتے ہیں۔ لیکن فوراً" اڑ کر ایک دوسرے کے پاس پہنچنے سے قاصر ہوتے ہیں اور کبھی کبھی تو نیٹ ورک پرابلمز' آؤٹ آف ریچ لوکیشن ہمیں ایک دوسرے سے بات کرنے کا بھی موقع نہیں دیتی۔ ایسے ہی وقتوں کے مسائل سے بچانے کے لیے میں چاہتا ہوں جیسا میں نے تمہیں بتایا ہے ویسا کرو۔"

"پتا نہیں کیوں مجھے تمہاری آواز میں کچھ غیر معمولی محسوس ہو رہا ہے۔" سارہ نے کہا۔ "کچھ ہے جسے میں سمجھ نہیں پا رہی' لیکن وہ کچھ اچھا نہیں ہے' وہ خوشگوار بھی نہیں ہے۔"

"زندگی میں کچھ لمحات' کچھ سچویشنز ناخوشگوار بھی ہوتی ہیں پریا رانی! انسان کو ہر طرح کی صورت حال کا سامنا کرنے کی عادت ہونی چاہیے۔" سارہ کو سعد کے لہجے میں عجیب سا تاسف محسوس ہوا۔

"بس مجھ سے وعدہ کرو جیسا میں نے تم سے کہا ہے' تم ویسا ہی کرو گی۔ تم نے خود دیکھا۔ کتنے کم وقت میں تم نے کیسا پروگریس کیا۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازہ کھول کر پچھلی بالکنی میں جا کھڑا ہوا۔

"وہ پروگریس تمہارے بغیر ممکن نہیں تھی۔" سارہ نے بلند آواز میں کہا۔

"تم جانتی ہو کہ یہ سفر تم نے میرے بغیر طے کیا۔" اس نے بھی گردن موڑ کر بلند آواز ہی میں جواب دیا۔ "جب تک میں ہاتھ بڑھا کر تمہیں سہارا دیتا رہا۔ تم حوصلہ ہار کر کوشش کرنا چھوڑ دیتی تھیں اور میں تمہاری تکلیف کو محسوس کرتے ہوئے تمہیں دوبارہ سے پیپر کرنا شروع کر دیتا تھا۔"

سارہ اپنی جگہ سے میز کا سہارا لیتے ہوئے اٹھی اور کرسیوں' وال کیبنٹس' دیواروں کا سہارا لیتی خود بھی پچھلی بالکنی میں آگئی۔

"اور تم بھی جانتے ہو کہ تم موجود تھے یا نہیں۔ مگر تمہارے ہونے کے احساس کے بغیر میں ایک قدم بھی اٹھا نہ پاتی۔" باہر آتے ہی اسے پچھلی رات سے برستی بارش کے اثر سے بوجھل اور نم ہوا کا احساس ہوا اور اس نے بے اختیار اپنے شانوں پر پڑی ہلکی سی سفید شال کو اپنے گرد مضبوطی سے لپیٹ لیا۔

"تم فکر نہیں کرو' میرے ہونے کے احساس سے تم کبھی بھی محروم نہیں ہو گی۔ میں ہوں گا کہیں نہ کہیں' کسی نہ کسی جگہ پر ضرور موجود ہوں گا۔ بس اس سے زیادہ تیزی سے پروگریس کرنا ہو گی اور دیواروں اور چیزوں کا سہارا بھی لینے کی عادت پر قابو پانا ہو گا۔" وہ رسان سے بولا۔

سارہ نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اس سمت دیکھا۔ جدھر وہ دیکھ رہا تھا۔ اونچے نیچے پہاڑوں پر اگا سبزہ اور درخت بارش میں بھیگ کر معمول سے زیادہ سرسبز دکھائی دے رہے تھے۔ پہاڑوں کے اوپر جانے کے پتھریلے راستوں پر پھسلن تھی اور پتھروں کے درمیان پانی بھی جمع ہو چکا تھا۔ لیکن مقامی بچے' عورتیں اور بچے پھرتی سے بغیر سنبھلے اور کسی کا سہارا لیے اوپر نیچے آجا رہے تھے۔ سڑک کے اس جانب جس کے پیچھے گہرائی اور ڈھلوان تھی' کنارے پر بیٹھا پٹھان بچہ کوئلوں کی آگ پر ریت سے بھری کڑاہی چڑھائے بھٹے بھون رہا تھا۔ مکئی کے بھونے جانے کی خوشبو سارے میں پھیلی تھی۔ پٹھان بچے نے کمال ہوشیاری سے پہاڑ سے گرنے والے جھرنے کی راہ گزر پر بند سا باندھ کر اس میں ربڑ کا پائپ لگا دیا تھا۔ آتی جاتی گاڑیوں کے سوار نہ صرف اس سے گرم بھٹے خریدتے تھے' بلکہ گاڑیوں کے انجن گرم ہو جانے کی صورت میں اس کے پانی کے ذخیرے میں لگے پائپ سے انجن ٹھنڈا کرنے کے لیے کاربوریٹر میں پانی بھی ڈلواتے تھے۔ جس کے عوض وہ نہ جانے ان سے پیسے وصول کرتا تھا۔

"تم نے دیکھا سارہ خان۔" سعد نے سارہ کی طرف دیکھا۔

"This is what life is" یہ زندگی ہے۔

"اس چھوٹے سے بچے نے اپنی زندگی کا سلیقہ خود سے سیکھ لیا اور اب اس عمر میں ہی وہ نہ جانے کتنے افراد کا کفیل بن چکا ہے۔"

سارہ نے آنکھیں زور سے بند کر لیں۔

"یہ ہی زندگی تمہارے پاس بھی ہے۔ جو حادثہ تھا۔ وہ ہو کر گزر چکا۔ زندگی نے موت کو پچھاڑ دیا اور آگے نکل آئی ہے۔ قدرت نے زندگی کی معذوری کی شدت کم کر کے اس کے ہاتھ میں سہارا لینے کو چھڑی پکڑا دی۔ پھر عجب نہیں وقت آگے بڑھے تو یہ چھڑی بھی چھوٹ جائے۔ زندگی اپنے پاؤں پر دوبارہ سے کھڑی ہو جائے۔ جب سب تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو آنے والے دنوں کے سلسلے میں بے یقینی سی کیوں ہے۔" سعد نے سارہ کے بالوں کو ہاتھ سے نرمی سے چھوتے ہوئے کہا۔

"سعد!" جواب میں سارہ نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ "وہ لڑکی کہاں ہے جس کا نام ماہ نور ہے۔" اس نے دیکھا۔ سعد کے چہرے پر ایک تاریک سایہ لمحہ بھر کے لیے لہرایا اور اگلے ہی لمحے اس نے اپنے چہرے کا رخ دوسری طرف کر لیا تھا۔

"سعد!" سارہ نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

"پلیز اس وقت...... مجھ سے اس کا ذکر مت کرو۔ اس وقت میں تعلقات کو پوری سچائی کے ساتھ نبھانے کے موڈ میں ہوں اور ماہ نور، میرے سینے کے اندر بہت گہرائی میں گڑا ایک ایسا تعلق ہے جسے میں نے برتا ہے۔ نبھایا نہیں۔" وہ بھاری آواز میں بولا تھا۔

"سعد! کھانا تیار ہے۔ آجاؤ فٹافٹ، اس سے پہلے کہ ٹھنڈا ہو جائے۔" اندر کمرے سے یمی آنٹی کی آواز آئی۔

"ہاں۔ یہ خوب بروقت بلاوا ہے۔ اب مجھے بھوک لگ رہی ہے۔" وہ مسکرا کر بولا اور اندر چلا گیا۔ سارہ عجیب سے احساس میں گھری اسے اندر جاتے دیکھ رہی تھی۔ زندگی کے کتنے سوالوں کے جواب ادھورے تھے۔ ایسے جواب جن کے کلیوز خود سوالوں سے زیادہ پیچیدہ تھے۔



"بھائی رضوان الحق تسی کدھر ہو بھائی۔"

"میں تو ادھر ہی ہوں، جہاں آپ نے مجھے پایا تھا افتخار بھائی۔ آپ البتہ غائب ہو گئے ہو۔"

"آہو جی! میں تو سارا دا سارا ہی گواچ گیا ہوں بھائی رضوان۔"

"ارے افتخار بھائی! آپ تو لگتا ہے رو رہے ہو۔ کیا ہو گیا، خیر تو ہے۔"

"بڑا برا پھنس گیا ہوں جی میں، کیا تسی میرے پاس ایک دن کے لیے آسکتے ہو، ملنے، صرف ایک دن کے لیے۔"

"ہاں، ہاں کیوں نہیں، میں آج رات ہی بس پر بیٹھتا ہوں۔"

"تہاڈی بڑی مہربانی بھائی آکھیا ہے تو بھائی بن کے دکھانے لگے ہو۔"

"اللہ آپ کا بھلا کرے جی۔"

"اچھا پھر اللہ حافظ، میں کل پہنچتا ہوں۔"

"خدا حافظ!"

(باقی ان شاء اللہ آئندہ شمارے میں)

بشریٰ احمد

اُجالے

"کیابات کررہی ہیں ثوبیہ! آپ کو خود پتا ہے کہ آج کل کتنی مصروفیت ہے۔"

ابھی اس نے تمہیدی بیان کے بعد مختصراً" مدعابیان کیا ہی تھا کہ پرنسپل صاحبہ نے عینک کے پیچھے سے جھانکتے ہوئے اسے اتنی حیرت سے دیکھا' جیسے اس نے چھٹی نہ مانگی ہو بلکہ کوئی بہت ہی ناجائز مطالبہ کردیا ہو۔

"میم! میں نے بتایا تو ہے کہ ـــــ" وہ ایک بار پھر منمنائی۔

"دیکھیں ثوبیہ! میں آپ کی مجبوریاں سمجھتی ہوں آخر میں بھی ایک عورت ہوں لیکن یہ تو دیکھیں ناکہ دو دن بعد اسپورٹس ڈے ہے۔ آپ ہاؤس انچارج ہیں۔ آپ کی ایک دن کی غیر حاضری کا مطلب ہے آپ کے ہاؤس کے بچوں کی نامکمل تیاری۔ بچے ہر ایشو کی رپورٹ والدین کو دیتے ہیں اور والدین کتنے تیز ہیں آج کل کے۔ آپ ایسا کریں کہ اسپورٹس ڈے کے بعد کسی دن کی لیو لے لیں۔" انہوں نے اپنے تئیں مسئلہ حل کرنا چاہا۔

"لیکن میم! میری نند کے بچوں کا عقیقہ ہے۔ وہ میری وجہ سے ملتوی تو نہیں ہوسکتا۔" وہ بے چارگی سے بولی۔

"اچھا پھر ایسا کریں کہ ہاف لیو لے لیں۔ دیکھیں! میں اس سے زیادہ فیور نہیں دے سکتی۔" پرنسپل صاحبہ نے فائل کھول کر اپنے آگے رکھ لی۔ گویا بات ختم کرنے کی طرف اشارہ تھا۔ وہ خاموشی سے باہر نکل آئی۔

"کیا ہوا؟" رضوانہ باہر اسی کی منتظر تھی۔

"وہی ہوا جو ہونا تھا۔" اس نے سر جھٹکا۔

"یعنی چھٹی نہیں ملی؟" رضوانہ تپ گئی۔

"ہاں! کہہ رہی ہیں' ہاف لیو لے لو۔"

"اور تم اللہ میاں کی گائے کی طرح چپ کی چپ رہی ہوگی؟" رضوانہ کو اس کی فطرت کا اندازہ تھا۔

"تمہارے جیسے ہی لوگ ہوتے ہیں جن کی وجہ سے انتظامیہ من مانی کرتی ہے۔" رضوانہ خاصی جارحانہ فطرت کی مالک تھی اور اکثر و بیشتر ہائر اسٹاف سے الجھتی رہتی تھی۔ جس کی وجہ سے خاصی ناپسندیدہ سمجھی جاتی تھی۔ اس کے انداز سے خائف ہو کر اکثر اوقات جان چھڑانے کو اس کی بہت سی باتیں مان بھی لی جاتی تھیں۔ صرف اسکول میں ہی اس کے ساتھ یہ معاملہ نہ تھا۔ سسرال میں بھی وہ ڈنکے کی چوٹ پر رہتی تھی۔

"مجھ سے سسرال کی چاکری نہیں ہوتی۔" وہ بریک ٹائم میں مزے سے چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے کندھے اچکاتی۔

ثوبیہ حیرت بلکہ حسرت سے اسے دیکھ کر رہ جاتی۔ سسرال میں من کی مان کر زندگی گزارنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ وہ تو ہر جگہ من کو مارنے والوں میں سے تھی۔ کسی قسم کی بے سکونی و بدامنی نہ ہو۔ اسکول ہو یا سسرال۔ شوہر ہو یا شوہر کے گھر والے۔ وہ پہلے سے پہلے سب کا موڈ سمجھنے کی کوشش کرتی تھی۔ کسی سے اختلاف رائے کا تو سوال ہی کم ہوتا تھا وہ تو اکثر اوقات اپنی کسی بات' اپنے کسی فعل کی وضاحت بھی نہیں کرپاتی تھی۔ یہ نہیں کہ اس کا کوئی سخت گیر شوہر یا روایتی سسرال تھا' بس وہ اپنی فطرت سے مجبور تھی۔ اس کو اپنی فطرت یا اپنی زندگی سے کوئی خاص گلہ بھی نہیں تھا۔ جب تک اس کو رضوانہ کی صحبت میسر نہ آئی تھی۔ اب اسے اکثر و بیشتر رضوانہ کی زندگی پر رشک آتا تھا۔ کیا بے فکری سی بے فکری ہے۔

آج بھی اسے یقین تھا کہ گھر جاکر جب ساس کو چھٹی نہ ملنے کا مژدہ سنائے گی تو یقیناً" ان کا موڈ آف ہوجائے گا۔ اور ہوا بھی یوں ہی۔ آنٹی کہتی تو کچھ نہ تھیں بس چپ ہوجاتیں۔ وقت تھا کہ وہ اس چپ سے بھی پریشان ہوجاتی۔ لیکن رضوانہ نے اچھی خاصی اس کی برین واشنگ کی تھی۔ اب اسے اکثر باتوں پر غصہ سا آنے لگا تھا۔

"یہ تو کوئی زندگی نہیں کہ بندہ اسکول والوں کے بھی نخرے سہے اور گھر والوں کے بھی۔" وہ سنک میں برتن پٹخ پٹخ کر جھنجلاہٹ کا اظہار کررہی تھی۔ اگر عثمان



سے ذکر کرتی تو وہ فوراً" کہتے۔

"جاب چھوڑ دو۔ سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔" کہتے تو وہ صحیح تھے لیکن وہ کیا کرتی۔ عبدالہادی کو شہر کے بہترین اسکول میں تعلیم دلوانے کی غرض سے اس نے اس اسکول میں جاب کی تھی۔ اب اس کے تینوں بچے اسی اسکول میں زیر تعلیم تھے۔ عبدالہادی گریڈ ٹو میں۔ عبدالباری گریڈ ون میں جبکہ مومنہ مونٹیسوری میں تھی۔ پرکشش تنخواہ سے نہ صرف اس کے تینوں بچوں کے تعلیمی اخراجات پورے ہو جاتے تھے بلکہ کچھ نہ کچھ وہ پس انداز بھی کرلیا کرتی تھی اور بقول رضوانہ "اپنی کمائی کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔" وہ بھی اس قول کی تائید کنندگان میں سے ہوتی۔

"ثوبیہ! تم آج کل رضوانہ کے ساتھ بہت ٹائم گزارنے لگی ہو۔ خیر تو ہے؟" یہ سامعہ تھی اس کی بیسٹ فرینڈ۔ لیکن جونیئر اور سینئر سیکشن میں ہونے کی وجہ سے دونوں کی مختصر ملاقات ہی ہو پاتی۔

"فری پیریڈ اکٹھے ہی ملتا ہے اور بریک ٹائم میں ڈیوٹی بھی ساتھ ہے نا تو اس لیے۔" وہ گڑبڑائی۔

"بس یہی بات ہے نا؟ کہیں تم بھی اس کے معتقدین میں شامل تو نہیں ہونے لگیں؟" سامعہ نے ہنستے ہوئے چوٹ کی۔

"نہیں اب میں اتنی بے عقل بھی نہیں۔" اس نے فوراً" تردید کی۔ لیکن حقیقت تھی کہ وہ کچھ کچھ اس کے دماغ سے سوچنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

ان ہی دنوں اسکول اسٹاف میں ہانیہ عمر کا اضافہ ہوا۔ خوش مزاج، خوش گفتار، خوش شکل اور خوش لباس۔ وہ نہ صرف دیکھنے میں پرکشش تھی بلکہ اس کی شخصیت میں ایک خاص تناسب تھا۔ خود اعتمادی اور وضع داری کے مابین۔

ثوبیہ سے چند ہی دنوں میں اس کی اچھی سلام دعا ہو گئی لیکن رضوانہ اس سے کھنچی ہوئی سی رہتی۔

"ہونہہ! بڑی اپروچ والی ہے۔ اسی لیے آتے ہی من پسند ٹائم ٹیبل مل گیا۔"

"یہ بینش کی جگہ آئی ہے۔ سوائے اسی کا ٹائم ٹیبل ملنا تھا۔ اس میں اپروچ کہاں سے آگئی؟" ثوبیہ نے حیرت سے رضوانہ کو دیکھا۔

"تم بھی نا ثوبیہ! بہت سیدھی ہو۔ طاہرہ کا حق تھا کہ اسے بینش کی جگہ پروموٹ کرتے۔ آخر اسے سال ہونے کو ہے اور ابھی تک ہیلپنگ ٹیچر ہے بے چاری۔ اب اصولاً" تو اسے پروموٹ کرکے ہانیہ کو ہیلپنگ ٹیچر بنانا چاہیے تھا۔ لیکن کیا کریں۔ وہی پرانا المیہ۔ آرمی افسر کی بیوی ہے۔ بورڈ ممبرز تک سے تعلقات ہیں، اسی لیے آتے ہی پکڑ کر مونٹیسوری انچارج بنا دیا گیا۔"

"جی نہیں، مونٹیسوری انچارج اس لیے ہے وہ کہ اس نے باہر سے مونٹیسوری ٹیچنگ میں ڈپلومہ کیا ہوا ہے۔" سامعہ کی عین موقع پر آمد ہوئی۔ اور ثوبیہ جو رضوانہ کی لمبی تقریر سے بس متاثر ہی ہونے لگی تھی، شرمندہ ہو کر رہ گئی۔

رضوانہ بھی برا سا بنا کر چپ ہو گئی کہ باقی تمام معلومات تو اس نے فٹافٹ حاصل کرلی تھیں، تعلیم کی طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا۔

"آرٹ اینڈ کرافٹ" ویک شروع ہونے والا تھا۔ ان دنوں اس کو ہانیہ کے ساتھ کافی وقت گزارنے کا موقع ملا۔ وہ ہاؤس انچارج تھی، ہانیہ کو اس کا اسسٹنٹ بنا دیا گیا۔ وہ واقعی خاصی تعاون کرنے والی لڑکی تھی۔ ثوبیہ کے کہے بغیر ہی اس نے کئی کام اپنے ذمہ لے لیے۔ اسے خاصا سکون ملا۔ اور اس بات کا اظہار اس نے ہانیہ سے بھی کر ڈالا۔

"مجھے معلوم تھا کہ آپ مجھے خود سے کوئی کام نہیں کہیں گی۔ اسی لیے میں نے از خود ذمہ داری اٹھائی۔ اتنا تو میں آپ کی نیچر کو جان ہی گئی ہوں۔" ہانیہ نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔

"ہاں! رضوانہ بھی میری اس کمزوری کو پوائنٹ آؤٹ کرتی رہتی ہے۔" اس نے اعتراف کیا۔

"ناٹ ایٹ آل۔ میں نے یہ تو نہیں کہا کہ یہ آپ کی کمزوری ہے۔ بلکہ آپ بہت سوفٹ نیچر کی ہیں۔ اپنا کام دوسروں پر ڈالنے کے بجائے خود کرنا زیادہ پسند کرتی ہیں۔" ہانیہ نے اسے ٹوکتے ہوئے تصحیح کی۔

"کہاں اچھی عادت ہے۔ کتنا نقصان اٹھاتی ہوں۔ میں تو نہ اسکول میں اپنی مرضی کر سکتی ہوں نہ گھر میں۔ ہر جگہ ہر وقت دوسروں کو خوش رکھنے کی کوشش کرنا پڑتی ہے۔" اس کے لہجے میں افسردگی در آئی۔

آج صبح بھی عثمان ذرا سی بات پر ناراض ہو کر بغیر ناشتا کیے آفس چلے گئے تھے۔ ان کو ٹائی نہیں مل رہی تھی۔ اسے آواز لگائی۔ تیز آنچ پر دودھ چھوڑ کر اندر بھاگی۔ اتنا ڈھونڈنے پر بھی مطلوبہ ٹائی نہیں ملی تو عثمان نے صرف اتنا کہا کہ میری تیاری رات کو ہی مکمل کر دیا کرو۔

کچن میں آئی تو دودھ ابل کر شیلف پر بہہ رہا تھا۔ صبح کا تنگ ٹائم۔ بچوں کے نخرے۔ عثمان کی تیاری۔ کچن کا حال دیکھ کر وہ جھنجلا کر عثمان پر الٹ پڑی۔

"کیا اتنا سا کام آپ رات کو سونے سے پہلے خود نہیں کر سکتے۔ میرے اوپر بھی کتنی ذمہ داریاں ہیں۔ کیا کیا دیکھوں۔" عثمان خاموشی سے بغیر ناشتا کیے آفس چلے گئے۔ یہی بات اس نے ہانیہ کو بتائی تو وہ چپ ہو گئی۔

"ذرا بتاؤ! اگر میں نے ذرا سا غصہ نکال دیا تو کیا وہ برداشت نہیں کر سکتے تھے؟"

"اگر میں کہوں کہ اس میں زیادہ غلطی آپ کی ہے تو۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ بولی تو ثوبیہ حیران رہ گئی۔ وہ تو رضوانہ کی طرح حقوق نسواں کے ضمن میں لمبی چوڑی تقریر کی توقع کر رہی تھی۔

"دیکھیں ثوبیہ! ہم یا تو اپنے آپ کو دوسروں کے لیے "فار گرانٹڈ" کا ٹیگ لگا کر رکھ دیتے ہیں کہ آؤ اور جو چاہے سلوک کرو ہم سے یا پھر وہ روش اختیار کرتے ہیں، جو رضوانہ نے اختیار کر رکھی ہے یعنی "Offence is the best defence" (جارحیت بہتر دفاع ہے) مگر ایک راستہ ان دونوں کے درمیان کا بھی ہے۔ یعنی رسان اور سہولت سے اپنا نقطۂ نظر اگلے بندے کے سامنے رکھ دیں۔ قدرے مہذبانہ انداز میں اور یقین کریں ثوبیہ! آپ کو اپنے ارد گرد زیادہ تر لوگ ایسے ملیں گے جو آپ کی بات آسانی سے سمجھ سکتے ہوں گے۔ اگر عثمان بھائی کو مطلوبہ ٹائی نہیں مل رہی تھی تو آپ ان کے سامنے کوئی دوسرا آپشن بھی رکھ سکتی تھیں نا۔ ٹائی نہ ملنا آپ کا اتنا بڑا قصور نہ تھا کہ عثمان بھائی آپ سے ناراض ہو جاتے۔ آپ کا غصہ ان کو ناراض کر گیا۔ بقول آپ کے پہلے آپ ایسی نہ تھیں تو ظاہر ہے وہ آپ سے اب بھی اس مزاج کی توقع نہیں کرتے ہوں گے۔"

"لیکن میری مصروفیت کو انہیں سمجھنا چاہیے آخر شادی کو اتنا عرصہ ہو گیا ہے۔" اس کے لہجے میں دبا دبا احتجاج تھا۔

"کیا آپ نے کبھی انہیں سمجھانے کی کوشش کی؟" ہانیہ نے سوال کیا تو وہ سوچ میں پڑ گئی۔ اپنی کسی بات یا عمل کی وضاحت دینا تو اس نے سیکھا ہی نہ تھا۔ وہ تو عثمان اچھے تھے جو اس کی اس عادت کا ناجائز فائدہ نہ اٹھاتے تھے۔ لیکن اب وہ خود ہی چڑچڑی ہوتی جا رہی تھی۔

"بہرحال آپ میری باتوں پر غور ضرور کیجیے گا۔" پتا نہیں ثوبیہ کی سمجھ میں کچھ آیا یا نہیں البتہ جب ہانیہ نے کہا تو وہ سرہلا کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ ہانیہ کے ساتھ پرنسپل کے آفس آئی تھی۔ ہانیہ کو چھٹی چاہیے تھی اور اس کو اپنی آبزرویشن فائل پر سائن کروانے تھے۔

"تمہیں چھٹی نہیں ملے گی کیونکہ تم ابھی پروبیشن پر ہو۔" ثوبیہ نے اس کو پہلے ہی خبردار کر دیا تھا۔

"مل جائے گی ان شاء اللہ۔" ہانیہ مطمئن تھی۔ پرنسپل صاحبہ نے اس کی بات سن کر فوراً" انکار کر دیا۔

"پروبیشن پیریڈ اور چھٹی۔۔۔ ناممکن۔"

"ایکچوئیلی میم! عمر کی پھپھو کا بائی پاس ہے۔ عمر کی پرورش ان کی پھپھو نے ہی کی ہے تو اس لیے عمر اس موقع پر ان سے دور نہیں رہ سکتے۔ اور ظاہر ہے یہ میری بھی ذمہ داری ہے۔ میں نے گل اور رابعہ سے بات کی ہے۔ وہ دونوں میری کلاس کو دو روز کے لیے اپنی کلاسز میں کمبائن کریں گی۔ زیادہ پرابلم نہیں ہوگا۔ باقی میں آکر دیکھ لوں گی۔"

پرنسپل صاحبہ کے سامنے اتنی لمبی تقریر۔ ثوبیہ نے حیرت سے اسے دیکھا پھر پرنسپل کو جو پرسوچ انداز میں سر ہلا رہی تھیں۔

"اوکے۔ میں آپ کی دو دن کی لیو اپروو کر رہی ہوں۔ آئی ہوپ یو ول مینیج اٹ۔" پرنسپل نے سائن کردیے اور وہ اتنی ہکا بکا رہ گئی کہ اپنی فائل سائن کروائے بغیر ہی باہر آگئی۔

ہانیہ کا پراعتماد اور مہذب انداز اسے وہ بات سمجھا گیا جو اس دن وہ اسے سمجھانا چاہ رہی تھی۔



رضوانہ کے پاؤں میں موچ آگئی تھی اور وہ دو تین دن سے چھٹی پر تھی۔ ثوبیہ کا ارادہ تھا اس کا حال پوچھنے کا۔ ہانیہ اور سامعہ سے ذکر کیا تو وہ بھی راضی ہو گئیں۔ اسکول سے واپسی پر بچوں کو وین میں گھر بھیج کر وہ سامعہ اور ہانیہ کے ساتھ رضوانہ کی طرف چل دیں۔ رضوانہ کے گھر پہلے ان میں سے کوئی نہیں گیا تھا لیکن اس کا گھر چونکہ ثوبیہ کے راستے میں تھا سو اس نے دیکھ رکھا تھا۔

دروازہ شاید رضوانہ کے سسر نے کھولا۔ تعارف کروانے پر وہ انہیں لیے اندر چلے آئے۔

بڑے سے ہال کمرے میں تخت پر اس کی ساس تسبیح کر رہی تھی۔ دونوں نندیں بھی وہیں بیٹھی کپڑے تہہ کر رہی تھیں۔ ساس کافی خوش اخلاق تھیں۔ رضوانہ کے بیان کے برعکس نندیں بھی مہذب دکھائی دے رہی تھیں۔

دس منٹ میں ہی اس کی ایک نند کولڈ ڈرنکس اور دوسری چیزیں سلیقہ سے ٹرے میں رکھے چلی آئی۔

رضوانہ کمرے میں تھی۔ اس کی نند دو دفعہ دروازہ کھٹکھٹا کر آئی لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"بیٹا! برا مت ماننا لیکن آپ اسے موبائل پر کال کرلیں ورنہ وہ دروازہ نہیں کھولے گی۔" آنٹی نے نظریں چراتے ہوئے کہا تو وہ تینوں بھی رضوانہ کی اس حرکت پر شرمندہ ہو گئیں۔

اور آنٹی کا اندازہ کس قدر درست تھا۔ ایک میسج کرنے کی دیر تھی۔ نہ صرف دروازہ کھل گیا بلکہ وہ خود بھی لنگڑاتی ہوئی باہر نکل آئی۔ ساس نندوں کو بالکل نظرانداز کر کے وہ انہیں بیڈ روم میں ہی لے آئی، جہاں ٹی وی پر کوئی موی لگی ہوئی تھی۔

"کمال ہے! تم تو جاگ رہی تھیں۔" سامعہ نے ٹی وی پر نظر ڈال کر اسے شرمندہ کرنا چاہا۔

"تو اور کیا؟ لیکن مجھے تم لوگوں کے آنے کا پتا نہیں چلا۔ وہ تو میں سمجھی تھی کہ میری ساس ہیں۔ دراصل چائے پانی پوچھنے کے چکر میں وہ میری ٹوہ لینا چاہتی ہیں اسی لیے میں جلدی سے دروازہ نہیں کھولتی۔" رضوانہ منہ کھول کر ہنسی جیسے اپنی چالاکی کی داد چاہ رہی ہو۔

لیکن ثوبیہ کو وہ بہت بری لگی کیونکہ اس کی ساس خاصی نرم مزاج اور معقول خاتون تھیں۔ ان لوگوں نے زیادہ دیر نہیں لگائی تھی وہاں سے اٹھنے میں۔

راستے میں ہانیہ اور سامعہ کے سامنے ثوبیہ کچھ شرمندگی محسوس کرتی رہی کہ ان تینوں میں رضوانہ سے اس کا تعلق زیادہ تھا۔

"رضوانہ جیسے لوگ ہمیشہ اس نشے میں رہتے ہیں کہ وہ دنیا کو اپنی مرضی پر چلاتے ہیں۔ لیکن ان کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس کے بدلے وہ زندگی کے کتنے ہی رنگوں سے محروم رہ جاتے ہیں۔" ہانیہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

یہی خیال ثوبیہ کے دل میں بھی آیا تھا لیکن ہمیشہ کی طرح وہ اپنے خیالات کو الفاظ کا جامہ نہیں پہنا سکی۔

"ہو سکتا ہے اس کی ساس اس کے ساتھ اچھی نہ

ہوں۔ ہمارے سامنے تو انہوں نے خوش اخلاقی سے پیش آنا ہی تھا نا۔" سامعہ نے نکتہ نکالا۔

"ہاں! بالکل ہو سکتا ہے۔ لیکن کوئی بھی شخص سو فیصد اچھا یا برا نہیں ہوتا.... اور میرا خیال ہے دوسروں کی اچھائی اور برائی کا یہ تناسب ہم اپنے رویوں سے کم یا زیادہ کر ہی سکتے ہیں۔ ویسے بھی زندگی کے کسی نہ کسی مقام پر ہمیں اپنے سے وابستہ ان رشتوں کی ضرورت ضرور پڑتی ہے جن کو ہم آج کسی قابل نہیں گردانتے۔"

ہانیہ اپنے مخصوص انداز میں بول رہی تھی۔

"ویسے یار! تمہاری ایج تو اتنی نہیں لیکن فلسفہ تم خوب بول لیتی ہو۔" سامعہ قائل ہو گئی تھی۔

"یہ فلسفہ نہیں ہے جناب! زندگی کی حقیقت ہے۔" ہانیہ بھی ہنسی تھی۔

"بس جناب آپ کی منزل تو آ گئی۔" ہانیہ نے اسے سب سے پہلے ڈراپ کیا تھا۔

"خیریت تو تھی نا ثوبیہ! کہاں گئی تھیں۔" جیسے ہی اس نے گھر میں قدم رکھا ساس نے فکر مندی سے پوچھا۔

"آنٹی! بتایا تو تھا میں نے رضوانہ کا۔ اس کا حال پوچھنے چلی گئی تھی سامعہ اور ہانیہ کے ساتھ۔ آپ کو عبدالہادی نے نہیں بتایا؟"

"ہاں! اس نے بتایا تو تھا لیکن دیر ہو گئی تھی نا اس لیے میں پریشان ہو رہی تھی۔ کیسی ہے رضوانہ اب؟"

"ہاں اب تو ٹھیک ہے۔ کل اسکول بھی آئے گی۔"

"چلو شکر ہے۔ اچھا تم کھانا کھا لو۔ بچوں کو میں نے کھلا دیا ہے۔ نہا دھو کر تینوں سو رہے ہیں۔" اس کی ساس نے کہا تو وہ تشکر آمیز انداز میں انہیں دیکھ کر رہ گئی۔ جوڑوں کے درد کے باعث اس کی ساس زیادہ کام نہیں کر سکتی تھیں۔ لیکن اس وقت اس کو بچوں کی ہی فکر تھی کہ بغیر کھائے پیے نہ سو گئے ہوں۔ فکر دور ہوئی تو اعصاب فوراً ہی پُرسکون ہو گئے۔

آنٹی کا یہ چھوٹا سا فعل اس کے دل میں ان کی قدر و منزلت بڑھا گیا۔

ہانیہ صحیح کہتی ہے اچھائی اور برائی کا تناسب کم زیادہ ہوتا رہتا ہے۔ یہی فطرت انسانی ہے۔

☼ ☼ ☼

"ثوبیہ! میری گرے لائننگ والی شرٹ کہاں ہے؟" صبح سویرے عثمان کی پکار سنائی دی۔

ایک چولہے پر پراٹھا دوسرے پر فرائنگ پین میں آملیٹ تھا۔ "الماری میں دیکھیں۔" وہ وہیں سے بولی۔

"نہیں مل رہی یار! ذرا آ کر دیکھ دو۔" عثمان بیزار ہوئے۔ پراٹھا ہاٹ پاٹ میں رکھ کر فرائنگ پین چولہے سے اتار کر وہ باہر بھاگی۔

"اوہو۔ گرے شرٹ۔ وہ تو...." الماری کا پٹ تھامے۔ سر پر ہاتھ رکھے اسے یاد آیا۔ شرٹ بغیر دھلی پڑی تھی۔ عثمان نے جس روز وہ شرٹ اتاری تھی اسے بتا دیا تھا کہ اسی ہفتہ دوبارہ پہننی ہے اسی لیے ساتھ کے ساتھ دھو کر پریس کر دے اور وہ بالکل بھول گئی۔ ایک لمحہ کو وہ چور سی بن گئی۔ عثمان کا موڈ آف ہو جائے گا۔ وہی خوف دامن گیر ہوا پھر جھنجلاہٹ حملہ آور ہوئی۔

"بھول گئی تو کیا ہوا۔ آخر اتنی مصروف رہتی ہوں۔" اس سے پہلے وہ کچھ بولتی۔ ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ وہ ایک دم پرسکون ہو گئی۔

"سوری عثمان! مومنہ کی طبیعت خراب تھی۔ ایسا الجھی کہ یاد ہی نہیں رہا۔ شرٹ تو دھلی ہی نہیں۔ وہ نئی پینٹ شرٹ نکال دوں جو ہم پچھلے ماہ لے کر آئے تھے؟ آپ نے ابھی تک پہنی ہی نہیں۔" رسان سے کہتے ہوئے اس نے اپنی تجویز بھی پیش کی۔

"اچھا۔" عثمان نے سر کھجایا۔ "چلو! ٹھیک ہے نکال دو۔"

مومنہ کی طبیعت واقعی پچھلے دنوں بہت خراب رہی تھی۔ ان کو بھی پتا تھا۔ اسے اجازت دے کر واش روم میں چلے گئے۔

"زبردست لگ رہے ہیں۔" ڈائننگ روم میں آتے عثمان کو دیکھ کر اس نے سراہا۔

"زبردست تو محترمہ بھی لگ رہی ہیں۔ بلکہ میں دیکھ رہا ہوں کچھ زیادہ ہی کھلی کھلی رہنے لگی ہیں آج کل۔ ورنہ پچھلے دنوں تو میں تمہاری پیشانی کا ہر روز ایک نیا بل گنتا تھا اور سوچتا تھا کہ بڑھاپا نزدیک آ گیا ہے۔ بائی داوے، کون سے پارلر جا رہی ہو بلکہ یار! وہ کیا کہتے ہیں کہاں سے اسکن تھراپی کروا رہی ہو۔" عثمان نے اس کی ناک دبائی۔

"تھراپی تو ضرور کروائی ہے لیکن اسکن کی نہیں بلکہ دل کی۔"

"ہائیں! ہارٹ تھراپی؟"

"ہاں جی! ہارٹ تھراپی.... دل صاف، چہرہ شاداب۔" وہ گنگنائی۔

"تھینکس گاڈ۔ بیگم! ڈرا ہی دیا تھا۔ اتنی خوبصورت اور نازک سی بیوی کی ہارٹ تھراپی کا ذکر ہی مجھے دہلا گیا۔" عثمان نے گویا سکون کی سانس لی۔

"اور یہ بچے کہاں ہیں؟ ابھی تک ان کی تیاری نہیں ہوئی؟" عثمان کو آخر کار ڈائننگ ٹیبل پر بچوں کی عدم موجودگی محسوس ہو ہی گئی تھی۔

"بچوں کی آج چھٹی ہے "ڈیبیٹ ویک" کا فائنل ہے نا آج اسی لیے پرائمری سیکشن کا آف ہے۔ اماں نے کہا کہ بچوں کو سونے دوں۔ ناشتا وہ خود کروا دیں گی بعد میں۔" اس نے تفصیل سے بتایا۔

"زبردست۔ تو پھر کیا خیال ہے 'ڈیٹ پر چلیں؟" عثمان نے آنکھ دبائی۔ بہت دنوں بعد وہ اپنے پرانے موڈ میں لوٹے تھے۔ "پہلے لانگ ڈرائیو۔ پھر کسی پارک کے پرسکون گوشے میں ڈھیر ساری باتیں اور پھر مزیدار سا لنچ۔"

"بالکل بالکل! شام میں آپ مجھے شاپنگ بھی کروائیں گے۔ رات کو مووی دکھائیں گے اور رات کو واپس آتے ہوئے گجرے بھی لے کر دیں گے۔" ثوبیہ نے اور خواب دکھائے۔

"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔"

"لیکن عثمان مجھے یاد پڑ رہا ہے کہ آج آپ کی کوئی امپورٹنٹ میٹنگ ہے جس کے لیے آپ نے گرے لائننگ والی شرٹ پہننی تھی اور میں نے جو یہ نیا اسٹائلش سا ریڈ سوٹ پہنا ہوا ہے تو میرا خیال ہے میرا بھی آج کوئی فنکشن ہے۔ ہے نا!" اس نے بھولپن سے یاد کرنے کی کوشش کی۔

"اف! کیا یاد دلا دیا۔ ظالم بیوی! خیالوں میں تو مزا لینے دیتیں۔" عثمان نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"مزا تو ابھی آپ کو آئے گا جب مجھے ڈراپ کریں گے کیونکہ وین نہیں آئے گی۔ اس لیے جلدی کریں۔ پھر شور مچائیں گے۔" اس نے ایک اور خبر سنائی تو عثمان کو غش آیا۔

"اچھا! اب ایکٹنگ بند کریں اور چائے پی لیں۔ ٹھنڈی ہو جائے گی۔" ثوبیہ نے مسکراتے ہوئے چائے کا کپ اس کے آگے رکھا۔

دل پر جمی گرد صاف ہوئی تو ہر چیز روشن اور اجلی لگ رہی تھی۔ بارش کے بعد نکھرے نکھرے موسم کی طرح۔

☼

عفت سحر طاہر



"اردو دانوں" میں منگنی کیا ہوئی۔ فائقہ نے بلا جھجک اردو ادب کی بے ادبی کرنی شروع کردی۔ بلکہ اردو کے ساتھ منہ ماری کہیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔

"لو جی۔۔۔ اظفر علی طلاق دے چکے اور شائستہ واحدی طلاق لے چکیں۔"

زرمینہ نے میگزین کی تازہ ترین خبر ہم تک پہنچائی۔

"مگر ان دونوں نے ایک دوسرے سے شادی کی ہی کب تھی؟" میں نے تحیر سے پوچھا۔

بھلا ہر ماہ باقاعدگی سے خواتین اور شعاع ڈائجسٹ پڑھتے، کوئی نئی خبر ہم سے چوک جائے یہ ناممکن تھا۔

"اوئے الو۔۔۔ مطلب یہ کہ اظفر نے سلمیٰ کو نو سال بعد طلاق دے دی۔ دو بچوں کے ہوتے دوسری شادی کرلی اور ادھر بے چاری "چائلڈ میرج کیس" شائستہ واحدی۔۔۔ جو صبح صبح لوگوں کو بہترین زندگی گزارنے کے فری مشورے دیتی ہیں۔ اپنے تین بچوں کی پروا کیے بغیر محض شہرت کے نشے کو پورا کرنے کے لیے اپنے شوہر سے طلاق لے لی۔"

زرمینہ جوش میں آئی تو خالص "بٹنی" بن گئی۔ (بٹ کی مونث)

"خیر۔ دفع کرو۔۔۔ مٹی پاؤ۔" میں نے اس کا بی پی نارمل کرنا چاہا۔

"یہ لو۔۔۔ سیف علی خان بھی پورا ہوجانے کو ہے۔" زرمینہ نے پھر سے آہ بھری۔

"ہائے۔۔۔ کیا بیماری ہوگئی اسے؟" مجھے جھٹکا لگا۔

ابھی تو بے چاری کرینہ نے بمشکل شاپنگ شروع کی تھی شادی کی۔

"پورا ہوگیا کیا مطلب؟" فائقہ اب اردو کو ایسے ہی نہیں جانے دیتی تھی۔ نت نئے محاوروں کی ٹانگ توڑنا اس کا انتخابی نشان بنتا جارہا تھا۔

"یعنی کہ کرینہ اس کی نصف بہتر بننے والی ہے۔ آدھا اچھا وہ پہلے ہے، کرینہ کو پاکر پورا ہوجائے گا۔"

زرمینہ کی اس کمال کی تشریح پر مابین احتجاجاً" زور سے اپنی کتاب بند کرکے اسے گھورنے لگی۔

مگر زرمینہ صاحبہ غڑاپ سے دوبارہ میگزین میں غرق ہوچکی تھیں۔

فائقہ نے ایک اور محاورہ ہاتھ آنے پر گہری سانس بھری۔

"اچھا۔۔۔ تو اسے کہتے ہیں پورا ہونا آدمی کا۔" میں نے بھی جان چھڑانے کے لیے اثبات میں سر ہلایا تو وہ مطمئن ہوگئی۔



ادھر بوبی صاحب عین ہمارے قیلولہ فرمانے کے وقت ٹیوشن پڑھنے آنے لگے۔ فائقہ کو غصہ آیا۔

"شام کو آیا کرو۔"

"شام کو میرے پاس ٹیم (ٹائم) نہیں ہوتا جی۔" ادھر ادھر ہلتا سر اور گھومتی آنکھیں، بے نیازی کی حد تھی۔ فائقہ نے دانت کچکچائے۔

"اس وقت میں سو رہی ہوتی ہوں۔"

"اب تو جاگ گئی ہیں ناں، پڑھا دیں۔" پھر بے زاری سے بولا۔

"جلدی کریں جی۔ میرے پاس فالتو ٹیم نہیں ہے۔" وہ ہمیں از حد مکار لگا۔

"او بیا۔۔۔ کا مشیر خاص نہ ہو تو۔"

فائقہ کا ارادہ اسے جھاڑنے کا تھا۔

"فائقہ۔۔۔" دادو نے اپنے تخت پر اونگھتے ہوئے تنبیہی آواز لگائی تھی۔ وہ یقیناً "یہ لایعنی بحث سن چکی تھیں۔

دادو کی قابل رشک قوت سماعت بحال ہوچکی تھی۔

یہ تو خدا کی کرنی تھی کہ ٹیپ ریکارڈر کے ریکارڈنگ والے بٹن میں کوئی خرابی نکل آئی تھی۔ ورنہ دادو جان ہماری زبان کی فصاحت و بلاغت ملاحظہ فرماکر یقیناً" ہماری شادی دہلی میں کروانا پسند فرماتیں۔ بہرحال، اللہ کا شکر، ابھی ہم زندہ ہیں۔

"چلیں جناب عزت ماب بوبی صاحب۔" دانت کچکچاکر فائقہ نے اسے آگے لگایا۔



"نکالو انگلش کی بک۔"

"انگلش کو چھوڑیں جی۔۔۔ وہ تو مجھے فرفر آتی ہے۔" وہی بے نیازی۔

"واقعی۔۔۔" میں نے اس کی انگلش کی کاپی چیک کرتے ہوئے داد دی۔

"ہر ٹیسٹ میں اس کے دس نمبر ہیں۔"

"واقعی۔۔۔؟" فائقہ بے یقین تھی۔ میں نے گہری سانس بھری۔

"ہاں۔۔۔ مگر صفر کے نیچے۔"

"وہ جی۔۔۔ کلاس میں میں ذرا خود ہی پیچھے رہتا ہوں۔ امی کہتی ہیں نظر لگ جاتی ہے۔"

"اللہ رے یہ خود اعتمادی۔" ہم تو اپنی انگلیاں چبا ڈالنے کو تھے۔

"مجھے اردو پڑھایا کریں جی۔" بے تکلفانہ فرمائش۔

"وہ تو اسے خود سمجھ نہیں آتی۔" زرمینہ نے پول کھولی۔

"تو انگلش میں پڑھا دیا کریں۔"

اس نے دانتوں کی نمائش کی تو جواباً" فائقہ نے آنکھوں کی۔ بوبی نے اپنی اردو کی کاپی نکالی۔

"یہ جملے بنانے ہیں جی۔"

"یہ تو خود اردو فیل ہے بیٹا جی۔ یہ کیا جملے بنائے گی۔" میں ہنسی۔

بوبی نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے فائقہ کو بے یقینی سے دیکھا۔

"ہیں جی؟"

بھلا اس کی فرفر انگلش بولتی ٹیچر اتنی نالائق ہو سکتی ہے؟

"ایسے ہی۔۔۔ یہ تو فضول مذاق کرتی رہتی ہیں۔" فائقہ نے اپنی بچی کھچی عزت سمیٹنی چاہی۔

"اور یہ جملے بنانا تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ لاؤ ادھر کاپی۔"

فائقہ نے باآواز بلند جملے پڑھے۔

"کیچڑ اچھالنا، پاؤں زمین پر نہ لگنا، دم دبا کر بھاگنا، منہ پہ کالک ملنا۔" الفاظ پڑھ کے فائقہ بڑے اعتماد سے مسکرائی۔

"لو۔۔۔ یہ کیا مشکل ہے۔ میں بولتی ہوں، تم لکھتے جاؤ۔"

میں اور زرمینہ ہمہ تن گوش ہو گئیں۔ جبکہ ماہین اردو ادب کی متوقع بے عزتی کے تصور سے پہلے ہی وہاں سے آؤٹ ہو گئی۔

"اچھا جی۔۔۔ تو یہ پہلا محاورہ ہے "کیچڑ اچھالنا" اور یہ تو بے وقوف شخص بھی جانتا ہے کہ کیچڑ اچھالنا اچھی بات نہیں ہے۔ اس سے آپ کے ہاتھ تو گندے ہوتے ہی ہیں پاس سے گزرنے والوں کے کپڑے بھی گندے ہو سکتے ہیں۔ اس کا جملہ یہ بنے گا کہ۔۔۔

"اگر کوئی شخص کیچڑ اچھالنا شروع کرے تو برائے مہربانی اس کے پاس سے نہ گزریں۔ اگر گزرنا لازمی ہو تو احتیاط سے گزریں۔"

فائقہ نے اردو ادب کی ایسی کی تیسی کرتے ہوئے فاتحانہ نگاہوں سے ہمیں دیکھا۔ ہم بے چاریاں انگشت بدنداں بیٹھی تھیں۔ فائقہ نے خوش ہو کر غفران عرف بوبی کو دیکھا۔

"دیکھا۔۔۔ تمہاری آپیاں بھی پریشان ہیں کہ مجھے اتنی اعلا اردو کیسے آ گئی۔"

بوبی بھی متاثر ہو رہا تھا۔

"اگلا محاورہ ہے پاؤں زمین پر نہ لگنا۔ اب اس کی تو کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ہو سکتا ہے تیز دھوپ سے زمین تپ رہی ہو۔ اس لیے پاؤں زمین پہ نہ لگ سکتا ہو۔ لیکن دوسرا محاورہ زیادہ بہتر ہے کہ آپ لوگ اتنی اونچی کرسی نہ بنوائیں کہ جس پر بیٹھ کر آپ کے پاؤں زمین سے نہ لگ سکیں۔"

منٹوں میں اس نے ایسا جملہ بنایا اور ایسی تشریح کی کہ میرا زرمینہ کے کندھے میں منہ دے کے رونے کو جی چاہنے لگا۔

"باجی جی تو بڑی "لیق" (لائق) ہیں اردو میں۔"

"ہاں۔۔۔ خدا کا شکر ہے اردو کے تمام بڑے شاعر مر چکے ہیں۔" زرمینہ نے گہری سانس بھری۔ مگر فائقہ تو جوش میں آ چکی تھی۔

"اور یہ دم دبا کے بھاگنا۔ یہ تو سب سے آسان جملہ بنے گا۔ یعنی کہ اگر راستے میں کوئی کتا بیٹھا ہو تو اس کی دم دبا کر مت بھاگیں۔ وہ کاٹ بھی سکتا ہے۔"

ہم دونوں تو مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو گئے۔

"کتے کی دم نہ ہوئی ہمسائیوں کی ڈور بیل ہو گئی۔" میں نے ہنسی روک کر کہا۔

"عمران عباس سے منگنی راس آ رہی ہے مجھے۔ کیسے فرفر اردو آ گئی ہے مجھے۔" وہ اترائی۔

"منہ پہ کالک ملنا، خیر اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ لوگ غریب ہوں ان کے پاس منہ پہ لگانے کے لیے کریم نہ ہو تو انہوں نے منہ پہ کالک ہی ملنا شروع کر دی ہو۔" اور اس آخری تشریح پر تو ہم دونوں سر پکڑ کے بیٹھ گئے۔



ہماری کام والی باجی پیاری آج جو صبح سے آئی تو اپنی داستان غم سنا سنا کے رو رہی تھی اور رو رو کے سنا رہی تھی۔

اس کا نکھٹو شوہر بڑا ظالم تھا۔ نشے کی طلب پوری کرنے کے لیے اس سے پیسے بھی ہتھیا لیتا اور دھنائی بھی خوب کرتا۔

لاؤنج میں موجود ہم سب لڑکیاں پہلے تو ٹی وی ڈرامے میں نقص نکالتی رہیں۔ مگر جب باجی پیاری کا رونا ختم نہ ہوا تو ہمیں بھی انسانیت کے ناتے متوجہ ہونا پڑا۔

"باجی پیاری۔۔۔ تمہیں ضرورت ہی کیا ہے اتنے ظالم شوہر کے پاس رہنے کی؟"

میں نے عالمانہ سوال کیا۔

"بے وقوف۔۔۔ اس کے پاس یہی ایک تو شوہر ہے۔" فائقہ نے مجھے گھورا۔

"سب ہی کے پاس "ایک" ہی ہوتا ہے۔" ہمیں نے جواباً" اسے گھورا۔

مگر باجی پیاری روہانسی ہو کر دادو کو پھر سے اپنی داستان غم سنانے لگی، تو ہمیں اپنی "گھورا گھوری" ختم کر کے متوجہ ہونا پڑا۔

"یہ دیکھیں جی۔ اس نے پچھلے سال میرا جو بازو توڑا تھا اس میں سے ابھی بھی ٹیسیں اٹھتی ہیں۔"

"اگر جواب میں تم نے بھی اس کی ٹانگ توڑی ہوتی تو وہ بھی اس وقت اپنی کسی دادی کے پاس بیٹھا اپنی دکھ بھری آپ بیتی سنا رہا ہوتا۔"

فائقہ نے منتقمانہ انداز میں کہا۔ دادو کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔

"تمہارے گھر میں بیلن نہیں ہے؟"

مینا نے پوچھا۔ تو باجی پیاری فخر سے بولی۔

"ہے جی۔۔۔ بڑی گول گول روٹیاں بیلتی ہوں میں۔"

"باجی پیاری۔ وہ بیلن صرف روٹیاں گول کرنے کے نہیں بلکہ شوہر کے حواس "گل" کرنے کے بھی کام آتا ہے۔" مینا نے تخریب کارانہ مشورہ دیا۔

باجی پیاری تو ایک طرف رہی، دادو تک اچھل پڑیں۔

"ہائیں، ہائیں، حواس میں تو ہو تم مینا کی بچی! اٹھاؤں چھڑی میں؟"

مینا بدک کے دور ہٹی۔

"لو۔۔۔ ابھی پچھلے دنوں مشہور ٹی وی چینل پہ ایک خاتون وزیر نے بھی یہی مشورہ دیا تھا اسے تو کسی نے کچھ نہیں کہا۔" وہ منہ بنا کے بولی۔

"اسی لیے تو کہتی ہوں کہ اس شیطانی ڈبے (ٹی وی) سے دور رہا کرو۔ کبھی جو اچھی بات سیکھی ہو اس سے۔"

وہ تلملا کر بولیں تو ماحول بگڑتا دیکھ کر باجی پیاری چپکے سے نکل لی۔ اور پھر ہم سب کو بھی لاؤنج بدر ہونا پڑا۔



فائقہ کی نیا ڈوبتے ڈوبتے بچی۔

جی ہاں۔۔۔ وہی۔۔۔ محاوروں کی ٹانگ توڑنے کی پاداش میں۔ اتنی بے خوفی سے اردو کے ساتھ منہ ماری

کا کوئی تو نتیجہ نکلنا ہی تھا۔

عمران عباس کی آپابی کا فون آیا تو فائقہ بی بی کھل اٹھیں۔ اِدھر اُدھر کی ساری باتیں کر لینے کے بعد جب سامنے رکھے پیپر پر ماہین سے لکھوائے عالمانہ جملے اور مشکل الفاظ ختم ہو گئے تو فائقہ نے عمران عباس کا حال پوچھ ہی لیا۔

"وہ تو دادا جان کے ساتھ میرپور گیا ہوا ہے۔"

"خیریت؟" فائقہ چونکی۔

"بس... دادا جان کے ایک دوست پورے ہو گئے تھے۔ وہیں گئے ہیں وہ اور عمران۔"

"ارے واہ... دادا جان کے دوست بھی پورے ہو گئے۔"

فائقہ کی خوشی دیدنی تھی۔ اب اس بے چاری کی جانے بلا کہ یہاں "پورے" ہونے سے کیا مراد ہے۔

آپابی اس کے کھنکھناتے لہجے پر پہلو بدل کے رہ گئیں۔ لب اتنی خوش اخلاق بہو بھی کیا کرنی جو کسی کی فوتگی پر بھی کھل اٹھے۔

"ویسے کیا عمر ہے دادا جان کے دوست کی؟" فائقہ نے پوچھا۔

"یہی کوئی ستر سال۔" آپابی نے سرسری سے کہا۔

"ماشاء اللہ... صحت اچھی ہو گی ان کی۔ تب ہی تو اس عمر میں یہ قدم اٹھایا انہوں نے۔"

فائقہ نے توصیفی انداز میں کہا۔

"ہیں... کیا کہہ رہی ہو... کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ عمران کہہ رہا تھا۔ ازمیر کو بتا دینا۔ اس کی بھی کوئی جان پہچان تھی زمان بیگ صاحب سے۔ اس نے جانا ہو تو ڈھائی بجے تک پہنچ جائے۔"

آپابی کے تو سر پر سے فائقہ کی لن ترانی گزر رہی تھی۔ انہوں نے فوراً گفتگو سمیٹ دی۔

فائقہ فون بند کر کے سیدھی میرے پاس آئی۔

"لو جی... میرے دادا سسر کے دوست زمان بیگ صاحب پورے ہو گئے۔"

فائقہ نے سنسنی خیز خبر سنائی جو دادو کے کان میں بھی پڑ گئی۔

"اناللہ وانا اللہ رجعون۔"

دادو نے باآواز بلند کہا تو ہم سب نے ہی ان کی تقلید کی۔

فائقہ نے ایک جھانپڑ مجھے اور ایک ماہین کو رسید کیا اور مینا کو گھورتے ہوئے بولی۔

"بے وقوفو! میں نے ان کے مرنے کی خبر نہیں سنائی۔ پورے ہونے سے مراد وہ بھی کسی کے نصف بہتر ہو گئے ہیں۔ ستر سال کی عمر میں شادی کر رہے ہیں وہ۔"

"اے لو... حد ہو گئی رنگین طبیعت کی۔ نہ یہ کون سی عمر ہے شادی کی۔ کہ جب ٹانگیں قبر میں لٹک رہی ہوں۔" دادو جو لاؤنج میں آ چکی تھیں ناگواری سے بولیں۔

"تو کیا ہوا... منہ تو باہر ہے نا۔" مینا میرے کان میں گھسی تو مجھے زوروں کی ہنسی آئی۔

"آپابی کہہ رہی تھیں میرو کو بتا دو۔ زمان بیگ صاحب کی شادی میں شرکت کے لیے ڈھائی بجے تک پہنچ جائے۔" فائقہ نے کہا۔

"میں بتا دوں گی۔" میں جلدی سے بولی۔

دادو وہیں بیٹھ کر بزرگوں کی رنگین طبیعت پر نقطہ اعتراض اٹھانے لگیں۔ میں آنکھ بچا کے وہاں سے کھسک لی۔ ازمیر صاحب اپنے کمرے میں ہی تھا۔

میں نے میرو کے کمرے کے سامنے کھڑے ہو کر پہلے اپنی سانس معمول پر لانے کی مشق کی۔ دل پہ ہاتھ رکھا تو وہ بے تحاشا تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ پہلے تو میں گھبرائی۔ پھر فوراً ہی خیال آیا کہ دل کے دھڑکنے پر پریشان ہونے کا کیا مطلب؟ پریشانی تو تب ہے جب دھڑکن رک جائے۔

بہرحال... میں نے دروازہ ناک کیا۔ اندر سے اجازت ملنے پر میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو وہ خوشبوؤں میں بسا کہیں جانے کو تیار ہو رہا تھا۔ آئینے کے سامنے کھڑا بال بنا تا وہ شاید زمان بیگ صاحب ہی کی شادی میں شرکت کے لیے جا رہا تھا۔

"مبارک ہو۔"

میں نے دوستانہ انداز گفتگو کا آغاز کیا۔ اس نے آئینے میں مجھے خفیف سا گھورا۔

"میری کون سی لاٹری نکل آئی ہے۔"

"عمران عباس کی آپابی کا فون آیا تھا۔"

میں نے ان لمحوں کو طویل کرنا چاہا۔

"تو ان کا فون کون سا مریخ سے آیا ہے۔ جو مشن کی کامیابی کی مبارک باد دے رہی ہو۔"

"یا اللہ... کریلا بھی اس شخص سے تھوڑا میٹھا ہی ہو گا۔" میں کڑھ کر رہ گئی۔

وہ بال بنا کر میری طرف پلٹتے ہوئے سپاٹ لہجے میں بولا۔

"اب دو منٹ میں سیدھی بات بتاؤ۔ یہ پہیلیاں مجھے نہیں پسند۔"

مجھے بھی سیدھا ہوتے دو منٹ نہیں لگے۔ فر فر بتا دیا۔

"آپابی کہہ رہی تھیں زمان بیگ صاحب کی شادی ہے۔ میرو کو کہنا ڈھائی بجے تک پہنچ جائے۔"

"واٹ...؟" وہ تو جیسے اچھل ہی پڑا۔ پھر بے یقینی سے بولا۔ "وہ تو بستر مرگ پر پڑے تھے۔"

"کس کے بستر پر پڑے تھے؟" میں ہونق ہوئی۔

"بے وقوف... آئی مین وہ تو سخت بیمار تھے۔"

"تو اسی لیے شادی کا سوچا ہو گا نا۔ کوئی دیکھ بھال کرنے والی آ جائے۔"

میں نے سمجھ داری دکھائی۔ مگر وہ بے یقینی کی کیفیت میں تھا۔

"آر یو شیور؟"

"ہاں... میں نے خود اپنے ان گناہ گار کانوں سے سنا ہے۔ فائقہ بتا رہی تھی۔"

میں نے پرزور انداز میں یقین دلانے کی کوشش کی تو وہ مجھے گھورنے لگا۔

مگر مجھے ذرا بھی فکر نہیں ہوئی۔ جی ہاں' آتے ہوئے میں نفاست سے بلش آن اور مسکارا لگا کے آئی تھی۔ یوں ہی گھورتے ہوئے وہ تھوڑا سا آگے بڑھا۔

میں شرما سی گئی۔

اس کی نگاہ میرے چہرے پر تھی۔

"یہ تمہارا چہرا... اتنا بلش کیوں کر رہا ہے؟" وہ یقیناً "سو جان سے فدا ہونے کی تیاری میں تھا۔ میں لجا سی گئی۔

"یوں لال ہو رہا ہے جیسے کسی نے تھپڑ مارے ہوں۔"

"اے لو... نکل گئی رومانس کے غبارے میں سے ہوا۔" میں نے سخت بدمزا ہو کر اس کی طرف دیکھا اور منہ پھلائے باہر نکل آئی۔

☼ ☼ ☼

شام کو وہ دندناتا ہوا پورے گھر میں مجھے اور فائقہ کو پکار کم اور دھاڑ زیادہ رہا تھا۔

میں اور فائقہ گرتی پڑتی لاؤنج میں پہنچیں تو وہاں سب ہی جمع تھے۔

"ہاں... تو کس کی شادی خانہ آبادی تھی آج؟" وہ طنزیہ لہجے میں کہتا کڑے تیوروں سے مجھے اور فائقہ کو گھور رہا تھا۔

"وہ... یہ... فائقہ نے ہی بتایا تھا۔ زمان بیگ صاحب کی شادی ہے اور تم بھی انوائٹڈ ہو۔"

اس کے تیور دیکھتے ہوئے میں نے سچ بولنا ہی مناسب خیال کیا۔

"اچھا... تم بتاؤ۔ تمہیں کس نے یہ خبر دی تھی؟" وہ فائقہ کی طرف متوجہ ہوا۔

"وہ... آپابی کا فون آیا تھا۔ انہوں نے ہی کہا تھا کہ..."

"کہ زمان بیگ صاحب شادی فرما رہے ہیں۔ بلکہ بارات لیے نکل چکے ہیں۔"

میرو طنز سے گویا ہوا۔ تو فائقہ تذبذب کا شکار ہو گئی۔ پھر قدرے تفاخر سے بولی۔

"نہیں... وہ تو میں خود انٹیلی جینٹ ہوں۔ باقی کا اندازہ تو میں نے خود ہی لگا لیا تھا۔ آپابی نے تو بس اتنا ہی بتایا تھا کہ زمان بیگ صاحب پورے ہو گئے ہیں۔"

دادو کی آنکھیں ابل پڑیں۔

میرو لڑنے مرنے کو تیار۔ امی' ابو سر پکڑ کے بیٹھ رہے۔ خود میرا دل بھی اچھل کر حلق میں آن ٹکا۔
"پورے ہوگئے مطلب؟"
"وہی... جو مینا نے بتایا تھا۔ کسی کو اگر نصف بہتر مل جائے تو وہ پورا ہو جاتا ہے یعنی مکمل۔" فائقہ کو سارا سبق یاد تھا۔
"تیرا بیڑہ ہی تر جائے فائقہ کی بچی۔" فائقہ کی امی' یعنی چھوٹی چچی نے ماتھا پیٹا۔
"بے وقوف۔" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ میرو کے نشش پشش انداز دیکھے۔ ایسے شان دار حلیے میں وہ جنازہ اٹینڈ کر کے آ رہا تھا۔
"اوئی نوج... یہ موئی انگلش میڈیم کی پڑھائی۔ اری پورے ہونے کا مطلب تھا کہ وہ فوت ہوگئے ہیں۔"
دادو نے اپنی چھڑی کی نوک فائقہ کے ہاتھ میں چبھوئی۔ وہ ہونق سی ہوگئی۔
"انہوں نے کہا کہ دادا کے دوست پورے ہوگئے۔ اس نے ان کی شادی کے بینڈ بجوا دیے۔ شرم آ رہی ہے مجھے سوچ کر۔ عمران عباس کو فون کر کے میں نے میرج ہال کا پوچھا تو وہ قبرستان کا ایڈریس بتانے لگا۔"
ازمیربٹ کا کشمیری خون ابل رہا تھا۔ ہم دونوں وہاں سے کان دبا کر بھاگے۔
کمرے میں جاتے ہی فائقہ نے ملک دشمن عناصر کی طرح بکھری اردو کی کتابیں اٹھا کر الماری کے نچلے خانے میں ٹھونس دیں۔
"توبہ! اس کئی کئی مطلب والی زبان سے تو اللہ ہی بچائے۔" وہ کانوں کو ہاتھ لگا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"بس... میں نے سوچ لیا ہے کہ میں نے کیا کرنا ہے۔" میں نے تقریر کرنے والے انداز میں ہاتھ لہرا کر ان پانچوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔
"وہ تو مجھے بھی پتا ہے۔ سب سے پہلے تو تم نے واشنگ مشین لگانی ہے۔ کیونکہ آج تمہاری باری ہے۔ پھر شام کی چائے اور رات کی روٹیاں۔"
زرمینہ نے اطمینان سے کہا۔ تو میں نے دانت کچکچائے۔
"مجھے کچھ اور کرنا ہے۔"
"پھر کسی کی دادی کے قل پہ جا کے گٹھلیاں پڑھنی ہوں گی۔" فائقہ کو بہت پرانی یاد آئی۔
"دیکھو... یہاں سب اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔ اگر تمہیں پاکستانی سیاست دانوں کی طرح کوئی دعوے کرنے ہی ہیں تو ایک گھڑا خرید لو۔ اس میں منہ ڈال کے جو جی چاہے بول لو۔" یہ دانش مندانہ مشورہ ماہین پڑھاکو کا تھا۔
جواب بھی ایک موٹی تازی' بلکہ موٹی باسی کتاب پڑھ رہی تھی۔ (ہزار دفعہ کی پڑھی ہوئی جو تھی)
"بکو مت اور غور سے میری بات سنو۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں عورتوں کے لیے ایک این جی او بناؤں گی۔" میں نے بڑھک ماری۔
"سی این جی کی طرح؟ صرف عورتوں کو گیس سپلائی کرو گی؟ اور ابو تمہیں این جی او اسٹیشن کھولنے دیں گے کیا؟" چڑیا آنکھیں پٹپٹا کر حیرت سے پوچھ رہی تھی۔
میں نے ایک دھمو کا اس کے شانے پہ لگایا۔
"ہاں... اور سب سے پہلے تمہیں گیس سپلائی کروں گی۔"
"اچھا... اب پھوٹ بھی چکو کچھ۔"
زرمینہ بدمزا ہو کر بولی تو میں نے جوش سے کہا۔
"میں سچی کہہ رہی ہوں۔ میرا بڑا دل دکھتا ہے عورتوں کو مرد کے ظلم سہتے دیکھ کر۔ اب باجی پیاری ہی کو دیکھ لو۔ اتنی محنت سے کماتی ہے۔ پھر بھی مار کھاتی ہے۔"
"کوئی نہیں۔ دادو کہتی ہیں باجی پیاری تو جنتی ہے۔" نوین نے اختلاف کیا۔ تو میں طنزیہ بولی۔
"ظاہر ہے۔ اتنی مار کھا کے فوت ہو جائے گی تو جنت میں پہنچ ہی جائے گی یہ بشارت تو کوئی بھی دے سکتا ہے۔" ہر جگہ عورت کے حقوق دبائے جا رہے ہیں۔ عورت دکھ سہ رہی ہے۔ عورت مار کھا رہی ہے۔"
"مار سے یاد آیا۔ نکڑ والوں نے اپنا سامنے والا مکان کرائے پہ دے دیا ہے۔ ان کے جو کرائے دار آئے ہیں۔ ان میاں بیوی کے جھگڑے کی بھی بڑی آوازیں آتی ہیں۔" چڑیا کو یاد آیا۔
"واقعی۔" میں حیران ہوئی۔
"دادو کی خاندانی روایت کے مطابق ہم ان کرائے داروں کے گھر پہلے دن کا کھانا دینے گئے تو ان میاں' بیوی کو بھی دیکھ لیا۔ بیوی' یعنی میڈم ممتاز گورنمنٹ کے ایک اسکول میں ٹیچر تھیں۔ خاصی لحیم شحیم اور بارعب دکھائی دینے والی۔
اس کے برعکس ان کا شوہر منحنی سا تھا۔ سننے میں آیا کہ نکما نکھٹو بیوی کی کمائی پہ پل رہا تھا۔ مگر یہی منحنی سا بندہ اتنی بارعب سی میڈم ممتاز کی کیا درگت بناتا تھا یہ خدا ہی جانتا تھا۔ محلے والے تو (بشمول ہمارے) میڈم ممتاز کی چیخیں سن سن کے اس کے ہمدرد ہو چکے تھے۔"
"میرے خیال میں تو فیلڈ ورک یہیں سے شروع کیا جائے۔ یعنی میڈم ممتاز سے۔" میں پرجوش ہوئی۔
میں نے دیکھا تو فائقہ اور نوین میگزین میں' ماہین کتاب میں' چڑیا الماری میں اور مینا اپنی قمیص کی تریائی میں جی جان سے گم تھیں۔
"ہیں... یعنی میں اتنی دیر سے بکواس کر رہی تھی۔" مجھے طیش آیا۔
"پہلے ہوم ورک تو کر لو۔ فیلڈ ورک کی باری تو بعد میں آتی ہے۔" ازمیربٹ کی آواز نے مجھے اچھلنے پر مجبور کر دیا۔
ایک تو یہ شخص' فرشتوں کی طرح ہر جگہ موجود۔
"یہ کیا پلاننگ ہو رہی ہے؟"
وہ یقیناً "سن چکا تھا۔ اس لیے میں نے سچ بولنا ہی مناسب سمجھا۔
باجی پیاری اور میڈم ممتاز کے دلدوز قصے اتنے جذباتی انداز میں اسے سنائے' بلکہ اسے متاثر کرنے کے لیے دو آنسو بھی بمشکل نکال ہی لیے۔
"او شٹ اپ۔" اس نے بے زاری سے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "تم بس گھر بیٹھی انڈین سوپ دیکھ دیکھ کے دماغ چلاتی رہتی ہو۔ آج کل کی عورتیں بھی کم نہیں۔"
"قسم سے میرو! کبھی باجی پیاری کا نیلو نیل چہرہ دیکھو اور وہ میڈم ممتاز جو کما کما کے شوہر کو کھلاتی بھی ہے اور ظلم بھی سہتی ہے۔" میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔
"خبردار... جو سنی سنائی پہ کوئی ایکشن لینے کی کوشش کی ہو تو۔"
اس نے آنکھیں دکھائیں تو میں دبک گئی۔ منمنا ہی سکی۔
"میں کہاں کی کمانڈو ہوں جو کوئی ایکشن لوں گی کسی کے خلاف۔"
"اور وہ جو میں نے تمہیں کھانے پکانے کی ترکیبوں والی دو بکس گفٹ کی تھیں۔ وہ کیا کی ہیں تم نے؟"
"وہ تو اس نے اگلے روز ہی..."
مینا کی زبان برے موقع پہ پھسلنے والی تھی۔ مگر میں نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔
"اگلے روز ہی میں نے جلد کروا کے سنبھال لی تھیں۔"
وہ لمحہ بھر کو مجھے گھورتا رہا۔
اب اللہ گواہ ہے۔ وہ سال بھر پرانی کتابیں تو میں نے غصے کے مارے اگلے ہی دن ردی والے کو دے دی تھیں۔ مگر میرو کے سامنے ایسا اعتراف کرنا اپنی شامت بلوانے کے مترادف تھا۔
شکر اللہ تب ہی اس کی کوئی کال آئی تو وہ وہاں سے چلا گیا۔ میں دھپ سے فلور کشن پہ گری۔
"یا اللہ... تیرا شکر ہے' تو نے مجھے بے عزتی سے بال بال بچا لیا۔"
فائقہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے دعائیہ انداز میں ہاتھ اٹھائے۔

"جو مرضی ہو جائے۔ میڈم ممتاز اور باجی پیاری کو میں ان کے حقوق دلوا کے ہی رہوں گی۔"

میں نے بہانگ دہل اعلان کیا۔ تو باہر کی طرف جاتا میرو وہیں سے بولا۔

"تمہیں تو میں آکرتا تا ہوں۔"

لو جی۔ کہاں کے نعرے' کہاں کی ہمت' الٹا بی پی لو ہو گیا۔

مینا نے گلوکوز پلایا تو کہیں ہوش آیا۔

☼ ☼ ☼

میرو کا ڈر ایک طرف اور خدمت خلق کا جذبہ ایک طرف۔ رات کو جب میڈم ممتاز کے ٹیرس کے ساتھ والے کمرے سے عجیب و غریب آوازیں آتیں تو میں فائقہ یا مینا کو زبردستی ساتھ لیے اپنے چھت کے ریلنگ سے لٹک لٹک کے صورت حال کا جائزہ لینے کی کوشش کرتی۔ ایسے میں ایک بار میرو اور عمر نے چھاپہ مارا اور ہمیں ریلنگ سے لٹکتے یعنی رنگے ہاتھوں گرفتار کر لیا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟"

از میر بٹ حیران ہی اتنا تھا کہ اپنے سوال کو غصے کا تڑکا نہ لگا سکا۔

اس کی اچانک آواز میری اور مینا کی سماعتوں پر کروز میزائل کی طرح گری۔

"وہ... میں... مطلب ہم دونوں... چچ... چچاند... دیکھ رہے تھے۔" میں نے کچھ زیادہ ہی لنگڑا بہانہ بنایا۔

"ہیں؟ کس کے چچا کو دیکھ رہی تھیں؟" عمر نے مجھے گھورا۔

"اچھا..." میرو نے طنز کیا۔

"آج سے پہلے تو آسمان پہ ہی چاند دکھائی دیتا تھا۔ یہ کون سا چاند ہے جو ریلنگ سے لٹک کے دیکھا جا رہا تھا؟"

"تم بتاؤ مینا! کیا ہو رہا تھا یہ؟" میرو نے بہن پہ رعب ڈالا۔

میں نے لاکھ گھورا' اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر اس کی پسلی میں کہنی رسید کی' دانت کچکچائے۔

مگر میرو کی دہشت نے اس کی زبان کی قینچی تیزی سے چلا دی۔

"قسم لے لیں بھائی! میں تو سونے کے لیے لیٹ چکی تھی۔ یہ روی کی بچی زبردستی مجھے ساتھ لے آئی۔ کہہ رہی تھی میڈم ممتاز اور ان کے شوہر کا لیٹ نائٹ شو دیکھتے ہیں۔ بلکہ موبائل سے مووی بنا کر کسی چینل کو بھیجنے کا ارادہ بھی تھا اس کا۔"

"ستیاناس ہو تیرا مینا کی بچی۔" میں نے دانت پیستے ہوئے دل ہی دل میں تہیہ کر لیا کہ بھابھی بنتے ہی اس نند گلی کا گند کی میں درگت بنا کے رکھ دوں گی۔

"مگر فی الحال تو از میر بٹ سے جان چھڑانے کا مرحلہ تھا۔" میں فوراً "ملکہ جذبات" بنی۔

"ہاں تو... میں تم لوگوں کی طرح بے حس اور مردہ ضمیر کی مالک نہیں ہوں۔ میڈم ممتاز کو مار پڑتی ہے تو چوٹ میرے دل کو لگتی ہے۔ کیونکہ میں بھی ایک عورت... میرا مطلب ہے کہ لڑکی ہوں اور اس معاشرے میں عورت کا حق ہمیشہ ہی سے غصب ہوتا آیا ہے۔ مگر نہیں... اب اور برداشت نہیں کیا جائے گا۔ سو دن شوہر کے پورے ہوں گے اور اب میڈم ممتاز کا ایک دن آئے گا۔ مگر وہ بھی تم لوگ آنے نہیں دو گے۔ کیونکہ تم لوگ بھی مرد ہو۔"

تقریر کے آخر تک آتے آتے مجھے واقعی رونا آنے لگا۔

عمر اپنی ہنسی چھپانے کی کوشش کر رہا تھا اور میرو سینے پہ بازو لپیٹے طنزیہ نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"بس... اتنی ہی یاد کی تھی؟"

اف... یہ اس کے طنز۔

اسی وقت میڈم ممتاز کے گھر سے شور و غل کی آوازیں آنے لگیں۔ سامنے والی لین میں دو گھر چھوڑ کے نکڑ والا گھر ان کا تھا۔ جس کا ٹیرس ہمارے ٹیرس سے صاف دکھائی دیتا تھا۔

"دیکھا... سنا تم لوگوں نے... یا خدا... میڈم ممتاز کا ایک دن کب آئے گا؟" میں پھر سے جذباتی ہوئی۔

"ہاتھ کنگن کو آرسی کیا' پڑھے لکھے کو فارسی کیا۔ آؤ ذرا تمہیں اصلیت دکھا ہی دوں۔ آج تو ہنگامہ ہو بھی ٹیرس پر ہی رہا ہے۔"

میرو نے میرے کچھ سمجھ میں آنے سے پہلے ہی میرا ہاتھ تھاما اور ریلنگ کی طرف بڑھا۔ ہمارے ٹیرس پہ لائٹ بند ہونے کی وجہ سے اندھیرا تھا۔ جبکہ میڈم ممتاز کا ٹیرس انرجی سیور سے جگمگا رہا تھا۔

تب ہی شور و غل کے ساتھ میں نے میڈم ممتاز اور ان کے منحنی سے شوہر کو بہ دست و گریباں دیکھا۔

میرا دل اچھل کر حلق میں آن ٹکا۔ ٹانگوں پہ لرزا طاری ہو گیا اور سارا وجود ٹھنڈا پڑ گیا۔

جب میں نے میڈم ممتاز کو... جی ہاں... میڈم ممتاز کو اپنے منحنی سے شوہر کو اٹھا کر دھوبی پٹڑا مارتے دیکھا۔

"تمہاری تو ایسی کی تیسی۔ مجھ پہ رعب ڈالتے ہو' اپنے گھر والوں کا۔ ارے میں تو نمک لگا کے کھا جاؤں ان سب کو۔" میڈم ممتاز کی کراری آواز۔

اور بکرا بنے ان کے شوہر۔ "بیگم... مم... میں... میں تو..."

"عادل... ادھر آؤ جلدی۔" میڈم ممتاز نے اپنے دس سالہ بیٹے کو آواز دی تو وہ بھاگتا ہوا آیا۔

"چلو... پاپا کے اوپر بیٹھو ذرا... ان کی عقل ٹھکانے آئے۔"

اور عادل میاں فٹ سے بکرا بنے پاپا جی کے اوپر سوار ہو گئے۔

"بیگم... کچھ تو خیال کرو۔ لوگ دیکھ رہے ہوں گے۔" شوہر جی کی گھگھیائی آواز۔

"ارے دیکھنے دو لوگوں کو... ان کو بھی تو پتا چلے میری مظلومیت کا کہ تمہارے جیسے شوہر نے مجھے کتنا تنگ کر رکھا ہے۔ ابھی پچھلے زخم بھرتے نہیں تمہارے کہ پھر سے میرا پارہ چڑھا دیتے ہو۔"

میڈم ممتاز گرجیں۔ تو میرو کے ہاتھ میں دبا میرا ہاتھ ٹھنڈا پڑ گیا۔

"اب بتاؤ... دیکھ لیا میڈم ممتاز کا ایک دن؟" میرو نے دانت پیستے ہوئے کہا تو مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

☼ ☼ ☼

اگلے روز گلی میں ریڑھی والے سے بجکم دادو میں اور مینا ٹماٹر خرید رہے تھے۔ جب میڈم ممتاز بھی سبزی خریدنے چلی آئیں۔

مینا کے لاکھ کہنیاں مارنے کے باوجود میں نے انہیں سلام کیا اور حال چال پوچھا۔ میرا ارادہ ان کی برین واشنگ کا تھا۔ مگر وہ شاید زیادہ بے تکلفی کے موڈ میں نہیں تھیں۔ سبزی خریدتے ہی بولیں۔

"میں اب چلوں۔ آپ کو تو پتا ہی ہے عادل کا پاپا کتنے غصیلے ہیں۔ ذرا ٹائم پہ ہانڈی نہ چڑھائی تو کھال کھینچ لیں گے۔"

وہ تو چلی گئیں۔ ہمارے حیرت سے کھلے منہ بمشکل بند ہوئے۔

"حد ہوتی ہے ڈھٹائی کی۔"

ہم میڈم ممتاز کی ڈھٹائی پر اش اش کر رہے تھے۔

تب ہی میڈم ممتاز کے شوہر نامدار پاس سے گزرے تو ماتھے پہ نیل اور گومڑ' ہونٹوں پہ جھینپی سی مسکراہٹ اور ہاتھوں میں لنگڑے آموں کا شاپر۔ میری اور مینا کی جو ہنسی چھوٹی ہے تو پھر میڈم ممتاز کے شوہر کو وہاں سے تیزی سے کھسکتے ہی بنی۔

☼

صبا سحر

نئے جوڑوں کی عید

"آج عید ہے اماں۔۔۔! حلف اٹھا کر کہو کہ اگلی عید تک میری شادی کر دو گی۔"

وہ اماں کے پاس باورچی خانے کی چوکھٹ پہ پیڑھی پہ بیٹھا شیر خرما کھا رہا تھا۔ اماں بریانی کا دم دیکھنے کے لیے چمٹے سے دیگچی کا ڈھکن اٹھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس کی فرمائش پہ انہوں نے وہی چمٹا اس کے گھٹنے پہ ایسے بجایا جیسے عارف لوہار اپنا چمٹا بجاتا ہے۔

"الا۔۔۔" وہ ذرا سا اچھلا۔ شیر خرمے کا پیالا گرتے گرتے بچا۔ "ذرا سا تو لحاظ کر لیا کرو اماں! بڑا ہو گیا ہوں قسم سے عید کے دن بھی عزت نہیں کرتی ہو میری۔"

وہ منہ بسور کر بولا۔

"حرکتیں جو ایسی ہیں تیری۔" اماں نے ڈپٹا۔

"میں کچھ نہیں جانتا۔ اگلی عید پہ میں تمہارے ہاتھ کا شیر خرما نہیں کھاؤں گا۔ میں نے کہہ دیا بس۔" اس نے خفگی کے باوجود دوبارہ پیالا بھرا۔

"ٹھیک ہے۔ میں حمیرا سے بنوالاؤں گی اگلی عید پر۔" اماں نے اپنی مسکین بھتیجی کا نام لیا۔ "بلکہ اسے ہی لے آؤں گی عید تک۔"

"اماں! میری بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرو۔" وہ سٹپٹا کر بولا۔ "میرے دوستوں کے دو دو بچے ہو گئے ہیں۔ میں نے آج تک جتنی بھی مائیں دیکھی ہیں انہیں اپنے بیٹوں کی شادی کرنے کے بڑے ارمان ہوتے ہیں۔ ایک تم ہو۔ قسم سے بالکل سوتیلی لگتی ہو۔"

باورچی خانے کی دیوار کے ساتھ لگے نواڑ کے پلنگ پہ بیٹھے ریڈیو اور حقے سے بیک وقت شغل فرماتے ابا کی سماعتوں تک ان ماں بیٹے کی گفتگو با آسانی پہنچ رہی تھی۔ منظر کی آخری بات پہ انہوں نے با آواز بلند آہ بھری۔ "کاش! تیری کوئی سوتیلی ماں بھی ہوتی۔"

اماں نے ان کی حسرت ناتمام پہ اور منظر نے بجائے حمایت لینے کے اتنی اہم بات کو مذاق میں اڑا دینے پہ ایک ساتھ "ہونہہ" کی۔

"چھوڑو اماں! تم بس وعدہ کرو۔" وہ جھنجلایا۔

"لڑکی کون دے گا تجھے۔ یہ تو بتا۔" اماں نے کہتے ہوئے نظریں چرائی تھیں۔ بھلا کون تھا جو ان کے منظر کو اپنی لڑکی نہیں دے رہا تھا۔ لمبا چوڑا، گورا چٹا، گبھرو کاٹن کی سفید شلوار اور براؤن کڑکڑاتا کرتا پہنے وہ ان کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ بالوں کو جیل سے چکنا کر کے تازہ شیو بنائے وہ ہمیشہ کی طرح نکھرا نکھرا سا لگ رہا تھا۔ اماں نے دم کے قیمے کے لیے رکھے کوئلے پر انگلی گھس کر اس کی پشاوری چپل سے جھانکتی ایڑی پر برابر نے سے مل دی۔ مبادا ان ہی کی نظر نہ لگ جائے۔

"کیوں؟" وہ ایک بار پھر اچھلا۔ "جوان اور تندرست ہوں۔ پڑھا لکھا ہوں۔ ماشاءاللہ سے خوب صورت بھی ہوں۔" اس نے چمچہ چھوڑ کر بال سنوارے۔

"ہاں ہاں جانتی ہوں۔ پورا ٹارزن ہے تو۔" اماں



نے لاپروائی سے سر ہلایا۔ اس نے بھنویں سکیڑ کر اماں کو گھورا۔

"دراصل تم ریسبو کہنا چاہ رہی تھیں نا اماں!" اس نے کچھ دن پہلے اماں کو انگلش فلم دکھائی تھی۔ اماں کو بہت اچھی لگی تھی۔

"ارے ہاں وہی۔" اماں جھلائیں۔ "مگر تو اپنی سب سے بڑی خوبی گنوانا تو بھول ہی گیا۔۔۔ تو سب سے بڑا نکما بھی تو ہے۔"

"زمینوں کا سارا حساب کتاب سنبھالتا ہوں۔ نکما کیسے ہو گیا؟" تنک کر بولا۔

"اپنے ہاتھ پاؤں تو نہیں چلاتا نا تو۔ کھڑے کھڑے زمینوں کا چکر لگا لیتا ہے۔ بوائی پہ دو دفعہ کٹائی پہ چار دفعہ اللہ اللہ خیر صلا۔ باقی وقت تو دوستوں کے ساتھ ہلا گلا کرتے گزار دیتا ہے۔" انہوں نے بریانی والا چولہا بند کیا۔

"یہ تم نے کیسی غیر دشمنوں والی بات کر دی اماں!" وہ ناراض ہوا۔

"اوئے منظر! یہ دشمنوں کی کون سی قسم ہوتی ہے۔" ابا حقے کی گڑگڑ بیچ میں چھوڑ کر للکارے۔ انہیں بات پکڑنے کی عادت تھی۔ منظر پھر جھنجلایا۔

"اور سب سے زیادہ ٹائم تو میرے آگے پیچھے پھر کر شادی کی عرضیاں دینے میں ضائع کرتا ہے۔ لے۔۔۔ گزر گیا تیرا دن۔" اماں دوپہر کے کھانے کے لیے برتن نکالنے لگیں۔

"تو تم مجھے جدی پشتی رئیس زادہ سمجھ لو نا جو منہ میں سونے کا چمچہ لے کے پیدا ہوتے ہیں۔" اس نے اٹھلا کر کہا اور پیالا چھوڑ کر شیر خرمے کا ڈونگا ہی اٹھا لیا۔ اماں کے ہاتھ کی بنی کسی بھی چیز سے اس کا دل نہیں بھرتا تھا۔

"حق ہا۔۔۔" باورچی خانے کے باہر سے پھر آہ بلند ہوئی۔ "کوثر کا ابا مان جاتا تو تو خود ہی پورا سونے کا پیدا ہوتا۔" ابا کو اپنی ناکام محبت یاد آگئی۔ اماں نے صرف برتن پٹخ کر اپنے غصے کا اظہار کیا۔ وہ اپنا ڈونگا اٹھا کر ابا کو جواب دینے باہر نکلا مگر ابا جیت گئے۔

"میری مان تو فرحانہ سے شادی کر لے۔"

"تاکہ تم اس کی اماں سے دوبارہ چکر چلا سکو۔" وہ جل بھن کر بولا۔

"دیکھ لے! دونوں باپ بیٹے کا فائدہ ہو جائے گا۔" ابا بے شرمی سے بولے۔

"ابھی کوثر خالہ کے شوہر زندہ ہیں ابا!" اس نے یاد کروایا۔

"تو فرحانہ سے شادی کر لے، وہ جیتے جی مر جائے گا۔" ابا نے بے غیرتی کی حد کرنے کی کوشش کی۔

"السلام علیکم۔۔۔ عید مبارک۔" سویوں کا پیالا لیے بالکل پڑوس میں رہنے والی شبنم کی آواز آئی۔ منظر پر نظر پڑی تو چہرہ چمک اٹھا۔

"چچا جان عید مبارک!" خوشی سے کھلکھلاتے ہوئے اس نے ابا کے سامنے سر جھکا کر پیار لیا۔ اماں اس کی آواز سن کر باہر آئیں تو وہ پیالے سمیت ان کے گلے لگ گئی۔ اماں نے عید مل کے اس کے ہاتھ سے ڈونگا لیا اور دوبارہ باورچی خانے میں چلی گئیں۔

"منظر عید مبارک!" وہ جس رفتار سے اس کی طرف بڑھی تھی، منظر ڈر گیا مگر اس نے صرف عید مبارک کہنے پر اکتفا کیا تو اس کی سانس بحال ہوئی۔

"تمہاری ہی کمی تھی۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

"سچ۔۔۔ میری کمی محسوس ہو رہی تھی؟" وہ جھوم گئی۔ منظر نے منہ ہی گھما لیا۔

"منظر۔۔۔ تم بھی عیدی دو نا مجھے۔" اس نے چھوٹے بالوں میں بڑے سے پراندے والی چوٹی سے کھیلتے ہوئے اٹھلا کر کہا۔

"کیوں۔۔۔ تم میری چھوٹی بہن لگتی ہو؟" منظر نے اسے گھور کر دیکھا۔ ساتھ ہی شبنم کی بھی جان جلادی۔ باریک مہین سی آواز، نہایت دبلی پتلی اور زردی مائل رنگت والی شبنم دیوار پار رہتی تھی اور ہر وقت دیوار پہ ہی چپکی نظر آتی تھی۔ منظر اسے چھپکلی کہتا تھا۔ وہ ذرا برا نہ مانتی۔

"منظر!" اماں نے پیالے کے ساتھ شبنم کو عیدی تھمائی اور چادر اوڑھتے ہوئے بولیں۔ "میں ذرا شبنم کی ماں سے عید مل کے آتی ہوں۔ پھر کھانا لگاتی ہوں۔ جانا نہیں کہیں۔" انہوں نے جلی بھنی کھڑی شبنم کا ہاتھ پکڑا اور چل پڑیں۔

"اماں۔۔۔ اور میری شادی کا وعدہ۔۔۔؟" منظر نے روہانسا ہو کر اماں کو پکارا۔ کئی سالوں سے وہ اماں کے پیچھے پڑا ہوا تھا اور اماں تھیں کہ مان کے ہی نہیں دے رہی تھیں۔

اماں نے بے پروائی سے ہاتھ ہلا دیا۔ ابا نے حقہ ایک طرف رکھ کر ریڈیو کان سے لگا لیا۔ شبنم بغیر سمجھے شادی کا لفظ سن کے کھل اٹھی اور منظر۔۔۔ شیر خرمے کا ڈونگا ہاتھ میں لیے کھڑا رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

وہ اسے دیکھ کر منہ بناتی اندر چلی گئی۔

"اتنے جتن کر کے اسے ایک نظر دیکھنے کو آتا ہوں اوپر سے اس کے نخرے۔ اتنی خوب صورت ہے نہیں جتنا سمجھتی ہے خود کو۔ ہونہہ!" منظر اس کی بے اعتنائی پر جل کر بڑبڑایا۔

"میں تو آپ کے پاس مزے دار سی چائے پینے آیا تھا چاچا!" اس نے نیلم کو ایک بار پھر دیکھنے کے بہانے

اس کے ابا سے کہا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں بیٹا! ابھی منگواتا ہوں چائے۔" انہوں نے پیار سے کہا، پھر دکان پہ کام کرنے والے بچے کو آواز دی۔ "گڈو! اندر جا اور نیلم باجی سے کہہ، دو مزے دار دودھ پتی بنا دو۔ منظر بیٹا آیا ہے۔" وہ اچھا کہہ کر اندرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

شفیق چاچا نے اپنی بیٹھک میں ہی دکان کھولی ہوئی تھی اور منظر سمیت قریب کے تقریباً سب گھروں کا سارا راشن ان ہی کی دکان سے جاتا تھا۔ ان کی بیٹی نیلم بی اے کر رہی تھی۔ چھوٹی سی ناک، بھرے بھرے ہونٹ، سرمئی آنکھیں۔۔۔ تین بل کی چھوٹی سی چٹیا جو اس کے کالر پہ ہی ختم ہو جاتی تھی۔ چہرے کے اطراف سے نکلتی خوب ساری لٹیں۔ ایک چھوٹی سی لٹ پیشانی پہ بھی ہمہ وقت رہتی تھی۔ منظر کو بہت اچھی لگتی تھی مگر اماں کہتی تھیں "نک چڑھی ہے" اور اس کا کہنا تھا کہ "نزاکت تو آ ہی جاتی ہے۔" ویسے تو وہ منظر کو بھی لفٹ نہیں کرواتی تھی مگر اس کا کہنا تھا کہ دنیا کی سب ہی محبوبائیں جفاجو ہوتی ہیں، سو کوئی بات نہیں۔ ٹھیک ہو جائے گی۔ ابا مخالفت نہیں کرتے تھے مگر حمایت بھی نہیں لیتے تھے۔

اس نے اندازہ لگایا چائے بن گئی ہوگی۔ شفیق چاچا چائے لینے گڈو کو بھیج دیں گے۔ سو اس سے پہلے ہی اسے غائب کر دیا جائے تاکہ چائے نیلم لے کے آجائے۔

"اوئے گڈو! میں تیرے لیے کتابیں لایا تھا مگر گھر پہ ہی بھول گیا۔ میرے گھر جا اور اماں کو بول، وہ میرے کمرے سے دے دیں گی۔" گڈو نے ایک نظر شفیق چاچا کو دیکھا اور ان کا اشارہ پا کر چلا گیا۔

"چاچا! وہ۔۔۔ چائے نہیں آئی ابھی تک۔" گڈو کے جانے کے بیس منٹ بعد بھی چائے نہیں آئی تو اسے "مجبوراً" کہنا پڑا۔

"ارے ہاں!" وہ شاید بھول گئے تھے۔ سر ہلاتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھے۔ منظر کا منہ لٹک گیا۔ اب چاچا خود ہی چائے لے آئیں گے مگر دو منٹ بعد شفیق چاچا بھی مسکراتے ہوئے خالی ہاتھ باہر آگئے۔

"بیٹا! وہ۔۔۔ اس کے پیپرز ہو رہے ہیں۔ مصروف ہے۔ کہہ رہی ہے ہوٹل سے منگوا کے پلا دیں۔ تو بیٹھ بیٹا! میں ابھی منگواتا ہوں۔ اکرم کی چائے بھی بہت اچھی ہوتی ہے۔" وہ شرمندہ شرمندہ سے بول رہے تھے۔ منظر ان سے زیادہ شرمندہ ہو گیا۔ وہ تو نیلم کو دیکھنے کے چکر میں آتا تھا، چائے کا تو بہانہ تھا۔

"ارے نہیں چاچا! آپ پریشان نہ ہوں، پھر کبھی سہی۔" وہ ٹوٹے دل کے ساتھ اٹھ گیا۔

☼ ☼ ☼

"بقر عید میں دس دن رہ گئے ہیں منظر! مجھے صحیح طرح سے جواب دے تاکہ میں سجاد کے گھر بکرا لے کے جاؤں جب حمیرا کا رشتہ ڈالنے جاؤں تو۔" دو ماہ بعد ہی اماں اس سے پوچھ رہی تھیں۔

"اماں۔۔۔ بکرا بے شک ماموں کے گھر لے جاؤ مگر رشتہ شفیق چاچا کے گھر لے کے جاؤ۔" وہ مزے سے بولا۔

"ایسا کر منظر کی ماں! بکرا سجاد کے گھر لے جا۔ رشتہ شفیق کے گھر لے جا اور بارات کوثر کے گھر لے جا۔" ابا نے بلاوجہ مخول کرنے کی کوشش کی۔ حسب روایت اماں نے سر جھٹک کے ابا کی بات چٹکیوں میں اڑائی۔

"اماں! مجھے نیلم اچھی لگتی ہے۔" اس نے بھی ابا کی بات نظر انداز کر کے لاڈ سے کہا۔

"بری مجھے بھی نہیں لگتی، مگر اس کے جو تور ہیں نا وہ میرے گھر میں آنے والے نہیں۔ ادب تہذیب ہے نہیں اس میں اور سلیقہ بھی کوئی نہیں۔"

"ابا بتا رہے تھے شادی سے پہلے تم بھی ایسی ہی تھیں اماں! مگر اب دیکھو کتنی اچھی۔۔۔" اماں کریلے چھیل رہی تھیں۔ ایک کریلا اسے کھینچ کے دے مارا۔

"وہ کالج میں پڑھتی ہے۔ فیشن والی ہے۔ اس کے بڑے اونچے اونچے خواب ہیں۔ تو پورے نہیں کر سکتا۔"

"خواب کس کے اونچے نہیں ہوتے اماں! میں کر سکتا ہوں پورے۔" وہ اٹل لہجے میں بولا۔

"او بس کر۔ بجلی کا بل تو پورا بھر نہیں سکا۔ خواب پورے کرے گا۔ ہونہہ!"

لوڈشیڈنگ سے تنگ آکر منظر نے جنریٹر خرید لیا تھا۔ کے ای ایس سی والوں نے تین ماہ پہلے ایک لاکھ کا بل بھیج دیا۔ منظر نے اس کی پانچ قسطیں کروائیں اور تین بھر دیں، دو باقی تھیں۔ اس وقت اس بات کو طعنہ بنا کر ابا نے بلاوجہ ٹانگ اڑائی۔ وہ حیران ہو کر ابا کی شکل دیکھنے لگا۔

"دیکھ منظر! میری بات سن اور کان کھول کے سن! مجھے اور اس گھر کو بہو کی ضرورت ہے، کسی شوپیس کی نہیں۔ میری ہڈیوں میں اب اتنا دم نہیں کہ پہلے تجھ جیسے آفت بچے کو پال پوس کے اتنا بڑا کیا۔ پھر تیری بیوی کو سر پہ بٹھا کے رکھوں اور پھر بعد میں تیرے شیطان کے چیلوں کو سنبھالوں۔" وہ جو ابھی تک ابا کی بات پر حیرانی سے نہیں نکل سکا تھا، اماں کی بات پہ اس کی حیرانی دوچند ہو گئی۔ گویا انہیں ابھی سے یقین تھا کہ اس کے بچے شیطان سے کم نہیں ہوں گے۔

"بہو ایسی لاؤں گی جو گھر سنبھالے۔ یہ نہیں کہ بس روٹی زیادہ پکنے لگے۔"

"اماں۔۔۔ تمہیں میرے سر پہ سہرا دیکھنے کا ارمان نہیں ہے۔۔۔ تم محض گھر کے کام کاج کے لیے بہو لانا چاہتی ہو۔۔۔" منظر کو انتہائی صدمہ ہوا مگر اماں کے گھورنے پہ دکھ کا زیادہ اظہار نہیں کر پایا۔

"او کم عقل! کام کا یہ مطلب نہیں کہ میں اسے ملازمہ بنا کر رکھوں گی۔ مطلب یہ ہے کہ وہ گھر کا انتظام انصرام سنبھالے۔ معاملات سنبھالے۔ ذمے داری اٹھائے۔ اس گھر کو اپنا گھر سمجھے۔ کیا پکانا ہے، کیا سودا سلف منگوانا ہے۔ آئے گئے کو کس طرح دیکھنا ہے۔ لڑکیاں یہ سارے کام کرتی ہیں مگر ساس سسر کے مرنے کے بعد میں چاہتی ہوں مرنے سے پہلے میرے سامنے ہی اس گھر کو سنبھال لے اور حمیرا ایسی ہی ہے۔"

"اماں! مگر مجھے نہیں اچھی لگتیں حمیرا جیسی لڑکیاں۔ ڈرپوک، سہمی ہوئی۔ ذرا جو زور سے اسے پکار لو تو اس کا دل تیز تیز دھڑکنے لگتا ہے۔ نظر بھر کے دیکھ لو تو زمین میں ہی گڑ جاتی ہے۔ پیار سے پکار لو تو فوراً شمیم آرا بن کر لمبے لمبے سانس لینے لگتی ہے۔" منظر نے باقاعدہ نقل اتار کے دکھائی۔ پتا نہیں شمیم آرا کی یا حمیرا کی۔ ابا تو قہقہہ مار کے ہنسے ہی، اماں بھی منہ نیچے کر کے ہنس دیں۔

"منظر! بس بیٹا میں سمجھ گیا۔ تیرا آئیڈیل فرحانہ ہی ہے۔ جس طرح میرا آئیڈیل کوثر تھی۔ ایسے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بات کرتی تھی کہ اف۔۔۔ انگریز مجھ پہ گیا ہی نہیں ورنہ شیر ہوتا شیر۔" ابا نے اپنا سینہ ٹھونکا۔

"رہنے دو ابا! ایسا ہوتا تو فرحانہ آج بہن ہوتی میری۔ فرحانہ کے نانا کی ایک دھاڑ کے بعد ہی میرے نانا کے پاس نہیں آجاتے۔ اماں بتا رہی تھیں۔۔۔" منظر کی خوش قسمتی کہ ابا کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

"اوئے منظر! کہاں جا رہے ہو؟" وہ ایک دم ڈرامائی انداز میں اس کی جیپ کے سامنے آئی۔ پتا نہیں کب سے تاک میں بیٹھی تھی۔ منظر کو تو ایسے ہی لگا۔

"ایک دوست کی طرف۔ کیوں خیریت؟" اس نے گاڑی روک کر حیرت سے پوچھا۔

"کبھی ہمارے غریب خانے بھی تشریف لے آیا کرو۔" وہ پتا نہیں کس موڈ میں تھی۔

"فرصت ملے گی تو آؤں گا۔" منظر مسکرایا۔

"فرصت۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔ چار سو ایکڑ زمین ہے تمہاری بس۔ اس پہ تمہیں فرصت نہیں ملتی۔ بڑا اچھا مذاق کر لیتے ہو۔" اس نے باقاعدہ چار انگلیاں اٹھا کر دکھائیں۔ "ہماری زمینیں تم سے دس گنا زیادہ ہیں، پھر بھی سب سے ملنا جلنا رکھتے ہیں ہم۔" اب کی بار اس نے دونوں ہاتھوں کی پانچوں انگلیاں اس کے منہ کے سامنے تان کر کہا۔

"بات دراصل یہ ہے فرحانہ بیگم! میری زمینیں جتنی بھی ہیں، میں ان کو بھرپور ٹائم دیتا ہوں۔ مجھے اپنی زمین کے ایک ایک کونے کا پورا پورا حال معلوم ہے۔ اس وقت میری زمین کتنی نم ہے، میں ابھی بتا سکتا ہوں۔ اس وقت میری زمین پہ کھڑی فصل کتنے انچ کی ہے، میں یہیں کھڑے کھڑے بتا سکتا ہوں۔ سب کچھ تمہاری طرح کیوں پہ نہیں چھوڑا ہوا میں نے۔ اپنے مزارعوں کے ساتھ مل کر کام کرواتا ہوں۔ مٹی، پانی، بیج سب اپنے ہاتھ سے کرتا ہوں اور جب ہی تمہاری دس گنا زیادہ زمین سے بھی زیادہ منافع کماتا ہوں۔" منظر نے مسکرا کر کہا۔

"میں تو یوں کہہ رہی تھی کہ ابا جی نے شہر سے لوگوں کو بلوا کر کوٹھی ڈیکوریٹ کروائی ہے، خاص طور پہ میرا کمرا۔ سب ہی لوگ آکر دیکھ گئے۔ بس ایک تم ہی نہیں آئے۔"

اسے پتا تھا چوہدریوں کی بیٹی ایسے ہی منہ نہیں لگاتی تھی۔ یقیناً "کوئی بات ہوگی سو وہ کھل گئی۔ چوہدری صاحب کی بیٹی کو اپنی کوٹھی دکھا کر منظر کو مرعوب کرنا تھا۔

"اچھا تو وہ اس دن تم ہی نے منادی کروائی تھی؟ سوری یار! میں سمجھا نہیں۔ اب آؤں گا ضرور۔۔۔ ویسے کیا جڑوا لیا کوٹھی میں۔" منظر نے مسکرا کر پوچھا۔

"اب پوری کوٹھی کا کیسے بتاؤں۔ صرف اپنے کمرے کا بتا دیتی ہوں۔" اس نے جیسے منظر پہ احسان کیا۔ "وہ جو بیٹھک تھی نا۔ ابا جی نے اس میں باتھ روم بنوا کر اسے میرا کمرا بنا دیا۔"

"بیٹھک۔۔۔ وہ جس میں پنچایت لگتی تھی۔" منظر صحیح معنوں میں حیران ہو گیا۔ "تمہیں اتنا بڑا کمرا لینے کی کیا ضرورت تھی۔"

"بس ایسے ہی۔ ابا جی نے اس میں میری ضرورت اور آسائش کی ہر چیز ڈلوا دی۔ بڑی سی مسہری، چھ دروازوں والی الماری، بڑی سی ڈریسنگ ٹیبل، اتنا نرم صوفہ کہ بندہ بیٹھے تو نظر ہی نہ آئے۔ اندر ہی دھنس جائے۔" وہ سر پیچھے لڑھکا کر زور سے ہنسی۔ "سارا فرنیچر ابا جی نے چنیوٹ کی لکڑی کا اپنے سامنے ہی بنوایا ہے۔ منقش جھولا بھی لگوا دیا ہے اور پتا ہے لان کی طرف جو دیوار ہے نا، اس طرف کونے میں ایک چھوٹا سا فوارہ بھی لگایا ہے۔" چندھی چندھی آنکھوں اور سفید پھولے پھولے گالوں والی موٹی سی چوہدری کی بیٹی اپنی امارت کا قصہ سناتے ہوئے ہانپ گئی۔

"فوارہ؟" وہ مزید حیران ہوا۔ "اس کی کیا ضرورت تھی۔"

"افوہ! ایسے ہی شو کے لیے نا بھئی۔ ڈراموں اور فلموں میں بھی تو ہوتے ہیں۔ تم نے نہیں دیکھے کبھی؟" اس نے منظر کی جیپ کے بونٹ سے ٹیک لگاتے ہوئے نخوت سے کہا۔

"ہاں ہاں دیکھے ہیں۔ چوہدری صاحب سے کہنا گھوڑا بھی منگوا دیں تمہیں۔ تاکہ تم اپنے کمرے میں ہی گھڑ سواری کر لیا کرو۔ شہابی رنگت کملا جاتی ہے تمہاری۔" اس نے اگنیشن میں چابی گھما کر جیپ اسٹارٹ کی۔

"مطلب؟" اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ منظر نے مذاق اڑایا ہے یا وہ واقعی مرعوب ہو گیا ہے۔

"کچھ نہیں۔ میں کہہ رہا تھا، تم آؤ نا کبھی میرے گھر۔ تم تو سب سے ملنا جلنا رکھتی ہو۔" اس نے ہاتھ سے اسے پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ فرحانہ نے ماتھے پہ بل ڈال کر سر ہلا دیا۔ منظر نے گاڑی آگے بڑھالی۔

"چوہدری نہیں ہے۔۔۔ مگر کم بھی نہیں ہے۔" اس نے ہاتھ سے اڑتی دھول جھاڑی۔

☼ ☼ ☼

"منظر! ربیع الاول میں دو دن رہ گئے ہیں۔ مجھے صحیح سے جواب دے تاکہ میں سجاد کے گھر جاؤں تو کچھ میٹھا لے کے جاؤں۔"

شام کو وہ نہا کر نکلا تو اماں نے آرام سے کہا۔ تولیہ کاندھے پہ ڈال کے وہ اماں کے پاس بیٹھ گیا۔ "لاہور سے حمیرا کا ماموں بھی آیا ہوا ہے اپنی بیوی بچوں سمیت۔"

"زردے کی دیگ منگوا دوں یا کھیر کے تھال؟ جو حکم کرو۔ بس یہ سارے میٹھے شفیق چاچا کے گھر لے

"جاؤ اماں!"

"منظر!" اماں دلار سے کہتے ہوئے اس کے نزدیک ہوئیں اور اس کا گیلا گیلا منہ تھام کر بولیں۔ "دیکھ میرے چاند! ضد نہ کر۔ حمیرا بہت اچھی بچی ہے۔ وہ ہر لحاظ سے تیرے لیے بہتر ہے۔"

"دیکھو اماں!" منظر نے بھی جواباً" اماں کا چہرہ ہاتھوں میں تھاما۔ "مجھے نیلم اچھی لگتی ہے۔ مجھے لگتا ہے وہ میرے ساتھ چل سکتی ہے۔ حمیرا اچھی ہے مگر مجھے سمجھ دار، بولنے والی، اپنی بات منوانے والی با اعتماد اور خوب صورت لڑکیاں اچھی لگتی ہیں، پڑھی لکھی اماں!"

"زندگی سیدھی سادی اور نیک شریف لڑکی کے ساتھ اچھی گزرتی ہے منظر! اس لیے حمیرا صحیح ہے۔" اماں کا موڈ ٹھنک گیا۔

"زندگی پڑھی لکھی اور میچور لڑکی کے ساتھ اچھی گزرتی ہے اماں! اس لیے نیلم بیسٹ ہے۔" وہ دوبدو بولا۔

"زندگی امیر لڑکی کے ساتھ اچھی گزرتی ہے پاگلو! اس لیے کوثر کی بیٹی چنگی ہے۔" ابا پیچھے نہیں رہ سکتے تھے۔

"زندگی محبت کے ساتھ اچھی گزرتی ہے چاچی! اس لیے میں... اس لیے میں بریانی لے کے آئی ہوں۔" تینوں نے چونک کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ شبنم درمیانی دیوار پھاند کر بریانی کی بڑی سی پلیٹ لیے کھڑی تھی۔

"لے بھئی منظر! تیرا تو کام ہو گیا۔ بڑا ہی خوش قسمت نکلا ہے تو یار! چار ہی کی تو اجازت ہے۔" ابا قہقہہ لگا کر ہنسے۔ اماں منہ بناتے ہوئے شبنم کو بیٹھنے کا کہہ کر باورچی خانے کی طرف بڑھ گئیں۔ وہ متذبذب سی کھڑی رہی کہ کہاں بیٹھے۔ منظر نے اسے جگہ دینے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی۔ وہ پلنگ پہ بالکل درمیان میں بیٹھا ہوا تھا۔ ابا اسے کھڑے دیکھ کر اٹھنے لگے مگر وہ تیزی سے منظر کے پاس ہی کنارے پر ٹک گئی۔ ابا نے پھر پاؤں پھیلا کر ریڈیو اٹھا لیا۔ اس کے ماتھے پہ بھیلے گیلے بالوں کی لٹیں اور سفید بنیان سے جھانکتے تندرست بازوؤں کو دیکھ کر وہ بلاوجہ ہی دوپٹے کا پلو مروڑنے لگی۔

"چائے کا تو پوچھ لو بے مروت!" اس نے پیار سے اسے شرمندہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے "بے مروت بلما" کہنے سے بمشکل خود کو روکا۔

"اماں نے تین کپ ہی بنائے تھے۔" اس نے خود کو بے مروت ثابت بھی کر دیا۔

"تو اپنی جھوٹی دے دو نا۔" وہ بالکل غیر ضروری طور پہ لجا رہی تھی۔

"جھوٹی چائے پینے سے محبت ہو جاتی ہے پاگل!" اس نے چائے کا لمبا سا گھونٹ بھر کے کہا۔

"ہاں تو..." شبنم نے اپنے دل کے تاروں کو بجنے سے بڑی دقت سے روکا۔

"شبنم! تمہارے ماموں آئے ہیں چکوال سے؟" اماں باورچی خانے سے بریانی کے برتن لے کے پلٹیں، اس کا منہ لٹک گیا۔ ایک تو محبت والی بات ادھوری رہ گئی، دوسرا ماموں کا ذکر۔ وہ اس کا رشتہ لے کر آئے تھے۔ اماں نے اعلانیہ یہ بات ابا اور منظر کو بتائی۔

"اوئے ہوئے! جب ہی اتنا تیار شیار نظر آرہی ہو۔ فہیم ان ہی کا بیٹا ہے نا۔ بڑا اسمارٹ ہے یار!" منظر نے اسے چھیڑا۔ وہ جل گئی۔ جانتی تھی کہ منظر مذاق اڑا رہا ہے۔



اماں کی طبیعت خراب تھی۔ انہوں نے حمیرا کو بلوا لیا۔ گھر کی صبح شام میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ کھانا اسی طرح وقت پہ پک رہا تھا۔ حمیرا کے ہاتھ میں اسے اماں کی طرح ہی ذائقہ محسوس ہوا تھا۔ منظر کو کپڑے روزانہ دھلے ہوئے اور استری شدہ مل رہے تھے۔ ابا کو حقے کی چلم تیار ملتی۔ گھر بھی چم چم کر رہا تھا مگر گھر میں کسی نئے فرد کا احساس اسے نہیں ہو رہا تھا۔ وہ کام کرتے ہوئے یہاں وہاں نظر آتی تھی مگر جیسے کوئی ملازمہ ہو اور اس کو بس یہی کام کرنا ہو۔ منظر سے کوئی

اضافی بات چیت نہیں۔ ایسا نہیں تھا کہ اس کے گھر میں کوئی نہیں تھا تو اسے عادت نہیں تھی۔ اس سے بڑے بہن بھائی بھی تھے، چھوٹے بھی تھے۔ گھر میں ایک ہنگامہ رہتا تھا مگر اس رونق میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہوتا تھا کبھی۔ متناسب جسامت اور مناسب خدوخال والی سیدھی سادی حمیرا اپنی موجودگی کا احساس دلائے بغیر ایک ہفتے سے اس کے گھر میں تھی۔

منظر شام کو برآمدے میں پلنگ پہ سر کے نیچے ہاتھ رکھے لیٹا تھا۔ حمیرا تھوڑی دیر قبل خاموشی سے اس کے پاس چائے کا کپ رکھ کر گئی تو وہ بے اختیار اسے سوچنے لگا۔ ابھی کل ہی اسے جلدی تھی تو وہ باورچی خانے میں اسی کے پاس بیٹھ کر کھانا کھانے لگا۔ اس سے مزید روٹی پکانا دوبھر ہو گیا۔ حالانکہ وہ خاموشی سے کھانا کھا رہا تھا۔ کانپتے ہاتھوں سے ایک روٹی توے سے اتار کے ہاٹ پاٹ میں رکھی۔ اسی وقت منظر نے بھی روٹی لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس کے ہاتھ سے ٹکرا گیا۔ وہ ایسے گھبرا کے اچھلی کہ اس سے زیادہ منظر گھبرا گیا کہ پتا نہیں جلتے توے پہ ہاتھ پڑ گیا یا پھر گرم ہی چمٹا پکڑ لیا۔ وہ ایسے بدحواس ہو کے باورچی خانے سے نکلی کہ اسے غصہ ہی آگیا۔ منظر کھانا چھوڑ کے چلا گیا۔

وہ اس کی پھوپھی کا بیٹا تھا، غیر نہیں تھا کہ طریقے سے بات ہی نہ کی جائے اس سے۔ اسے بے اختیار نیلم یاد آئی۔ کیسی چہیل چھبیلی سی اٹھلاتی ہوئی وہ کتنی ہی دفعہ دکان میں بے مقصد آتی اور پٹر پٹر بولتے ہوئے ڈبوں میں ہاتھ ڈال کر اپنے مطلب کی چیزیں نکال کر چلتی بنتی۔ وہ اس کی شوخی ہی دیکھے جاتا۔

وہ چائے پینے اٹھ رہا تھا۔ کل والی بات یاد آئی تو بدمزا ہو کے دوبارہ لیٹ گیا اور ابھی لیٹا بھی نہیں تھا کہ دھم کی آواز پہ صحن میں جھانکا تو پتا چلا۔ شبنم صاحبہ نے دیوار کے ساتھ لگے پلنگ پہ چھلانگ لگائی۔ اس کے بعد بھی اس نے انسانوں کی طرح اترنے کی کوشش نہیں کی۔ لمبا قدم بڑھا کر کھڑے کھڑے زمین پہ اتری۔ منظر نے اس کی اٹھکھیلیوں پہ عجیب سا منہ بناتے ہوئے کپ اٹھا لیا۔

"ہائے منظر! تم گھر میں ہو؟" وہ اچھلتی کودتی برآمدے میں داخل ہوئی تو منظر کو دیکھ کر خوش گوار حیرت سے تقریباً چیخی۔ منظر نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"تمہاری کزن آئی ہوئی ہے۔ اسی خوشی میں ہمیں اپنی جیب میں بوتل پلاؤ لاؤ نا باہر سے۔" اس نے حمیرا کو دیکھ کر کہا۔ دوسری طرف منظر نے اس بات پہ بغور حمیرا کا منہ سرخ پڑتے دیکھا۔ اس کا حلق کڑوا ہو گیا۔ جل کر بولا۔ "منہ دھو کے آؤ پہلے۔"

"ہیں... پھر لے کے چلو گے؟" منظر کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیوں اس قدر خوشی کا اظہار کر رہی ہے۔

"ایک بات بتاؤ۔ نام تمہارا شبنم ہے۔ ڈائیلاگ بابرہ شریف کے بولتی ہو۔ چھلانگیں انجمن کی طرح لگاتی ہو... ابا اداکار تھے تمہارے؟" وہ سڑا ہوا منہ بناتا وہاں سے اٹھ گیا۔

"اسے کیا ہوا؟" شبنم نے تعجب سے پوچھا۔ حمیرا کو کہاں اندازہ ہو سکتا تھا۔



"منظر! یکم رمضان کو سجاد کے پوتے کی روزہ کشائی ہے۔ میں..."

"اماں! تمہارا دل نہیں چاہتا اپنے پوتے کی روزہ کشائی کرنے کو؟" وہ ناخن کاٹ رہا تھا۔ سر اٹھا کر انہیں دیکھنے لگا۔ پھر ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔

"اماں! تم جب کہو گی، میں ایک من پکوڑے لا دوں گا۔ بس تم اس عید پہ شفیق چاچا کے..."

"دیکھ منظر میرے بیٹے! تو جذباتی ہو رہا ہے۔" اماں بھی جواباً" پیار سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیر کے بولیں۔ "تو دور اندیشی سے نہیں سوچ رہا۔ تیری پسند وقتی ہے۔ بیٹا! اللہ نے نکاح کے بولوں میں بڑی طاقت رکھی ہے۔ نکاح کے بعد دلہن خود بخود اچھی لگنے لگتی ہے۔ تجھے بھی حمیرا اچھی لگنے لگے گی۔"

"سولہ آنے درست بات کی منظر! تیری ماں نے۔" ابا اسی وقت کمرے میں داخل ہوئے۔ منظر نے سر

اٹھا کر دیکھا پھر جھکا لیا۔ "مجھے بھی کوثر سے کیا غضب کا عشق تھا مگر تیری ماں سے شادی کے بعد اب کوئی دوسرا نظر ہی نہیں آتا۔" ابا نے پیار سے اماں کی طرف دیکھا۔

"بیٹا! وہ اپنی ہے۔ مارے گی بھی تو چھاؤں میں ڈالے گی۔" اماں نے ابا کے التفات کو نظر انداز کر کے اپنی بات جاری رکھی۔

"یعنی مارے گی ضرور؟" منظر نے معصومیت سے پوچھا۔

"کلثوم آپا کی بڑی بہو یاد نہیں تجھے ... غیر لائی تھیں، کیسا تگنی کا ناچ نچایا انہیں۔ پھر چھوٹے کی اپنوں میں سے لائیں تو سکھ نصیب ہوا۔ میرا تو تو اکلوتا بیٹا ہے۔ مجھے کیسے سکھ مل سکے گا۔ مجھے اپنی بڑی بہن کا تجربہ کافی ہے۔ انہوں نے بھی مجھے یہی مشورہ دیا تھا کہ اپنی لانا۔ بیٹا! دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔" اماں نے دانش مندانہ انداز میں کہا۔

"مگر اماں! پیتا ضرور ہے۔" اس نے ذرا سا احتجاج کیا۔ اماں خاموش ہو گئیں۔ منظر نے بھی سر جھکا لیا۔ وہ ناخن کاٹنا بھول گیا۔ بس ناخن کٹر سے کھیل رہا تھا۔

"مگر ایک بات ہے منظر کی ماں!" ابا نے منظر کی سنجیدگی پہ دھیان دیے بغیر اپنی بات جاری رکھی۔ "ایک چیز چھین کر دوسری اپنی مرضی سے دے رہی ہو تو پہلے سے اچھی دو تاکہ پہلی محبت بھلائی جا سکے۔ جیسے میں نے بھلا دی۔" اماں چونکیں۔

"کیا تو نیلم سے محبت کرتا ہے منظر؟" اماں کا لہجہ سراسیمہ تھا۔

"محبت ...؟" منظر نے اماں سے زیادہ چونک کر سر اٹھایا۔

☼ ☼ ☼

چوہدری صاحب نے پورے گاؤں کو افطار پہ مدعو کیا تھا۔ کوٹھی دکھانے کا اس سے زیادہ ثواب پرور موقع کوئی اور ہو نہیں سکتا تھا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کوٹھی کی آرائش پہ آنے والے خرچے کے بل کی ایک ایک کاپی کروا کے سب کے ہاتھ میں تھما دیں تاکہ لوگوں کو ان کی امارت کا پتا چل سکے۔

"اوئے منظر پتر! کوٹھی دیکھی تو نے؟" انہوں نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر بے تکلفی سے پوچھا۔ "کیسی لگی؟"

"جی چوہدری صاحب! بہت شان دار۔"

"میرا کمرا دیکھا ... کیسا لگا ... اور فوارے دیکھے سب کمروں میں لگوائے ہیں میں نے۔"

"کمروں میں فوارے ... آپ کا مطلب ہے ہر باتھ روم میں شاور لگوائے ہیں آپ نے؟" چوہدری صاحب قہقہہ لگا کر ہنسے۔

"گاؤں کے سارے جوانوں میں مجھے تو اسی لیے بہت اچھا لگتا ہے کہ بہت مخولیا ہے تو۔" بات پوری کر کے وہ پھر زور سے ہنسے۔ "بیٹا جی! بڑا دل کھول کے خرچ کیا ہے میں نے۔ دور دور سے چیزیں منگوائی ہیں۔ صرف لکڑی ہی دیکھ لے، چنیوٹ سے منگوائی ہے۔ سارے قالین ایران سے منگوائے ہیں۔ جھولے، پردے، پودے، تصویریں اور بہت سارا دوسرا سامان الگ الگ شہروں سے منگوایا ہے۔ کاریگر تک میں نے باہر سے بلوائے اور ..."

"ماشاء اللہ چوہدری صاحب!" منظر نے ان کی قصیدہ خوانی میں ٹانگ اڑا دی۔ "میں نے ایک ایک چیز دیکھی ہے۔ بہت خوب ہے۔" چوہدری صاحب کھل گئے۔

"بس بیٹا جی! اب تو نے دو کام کرنے ہیں۔" انہوں نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے اسے اپنے قریب کیا۔ "ایک تو یہ کہ تو سب کو باری باری پوری کوٹھی دکھا۔ کوئی رہ نہ جائے مگر بس دور دور سے دکھانا۔ بہت قیمتی چیزیں ہیں ساری ... اور دوسرا زنانے میں کھانے کا سارا انتظام تو دیکھ لے۔ میں کسی اور پہ بھروسا نہیں کر سکتا۔"

"ٹھیک ہے چوہدری صاحب! مگر کوٹھی دکھانے کا کام آپ مراد کے سپرد کر دیں۔" اس نے چوہدری صاحب کے بیٹے کا نام لیا۔ "اسے صحیح پتا ہے کہ فرنیچر کہاں سے منگوایا ہے تو فوارے کتنے مہنگے ہیں اور بھینسیں کتنی کالی ہیں ... میں زنانے میں کھانے کا دیکھ لوں گا۔" چوہدری صاحب نے بھینسوں کے ذکر پہ بھنویں سکیڑیں مگر سر ہلا دیا۔

"میں نے کھانے میں بھی تین قسمیں رکھوائی ہیں۔" چوہدری صاحب جوش سے بولے۔ افطار کے بعد تین کھانے ... منظر نے ان کی سخاوت پہ سر دھنا۔

"تین قسم کی بریانی بنوائی ہے۔" انہوں نے منظر کو متاثر ہوتے دیکھ کر کہا۔

"تین قسم کی بریانی؟" اس نے متاثر ہونا چھوڑ کر حیران ہونا شروع کر دیا۔

"آہو بیٹا جی! ایک ہلکے مسالے والی، ایک درمیانے مسالے والی اور ایک تیز مسالے والی۔" انہوں نے مدبرانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کمر پہ ہاتھ جمائے۔

"یہ مشورہ کس نے دیا آپ کو؟" منظر نے جل کر پوچھا۔

"اپنے مراد بیٹے نے۔ بڑا ہوشیار ہے۔" اسی وقت مراد وہاں سے گزرا تو انہوں نے آواز دے کے اسے بھی بلا لیا۔ "پتر! منظر بیٹے کو بتا، ہم نے تین قسم کی بریانی کیوں بنوائی ہے۔ منظر بڑا حیران ہو رہا ہے اس نئے انداز پہ۔ بتا شاباش، منظر کو بتا۔" انہوں نے مونچھوں پہ ہاتھ پھیرا۔

"اوئے یار منظر! تو بھی بڑا جھلّا ہے قسم سے۔ اتنی سی بات نہیں سمجھ سکا۔ اب کوئی ہلکی مرچیں کھاتا ہے۔ کوئی درمیانہ مرچ مسالا پسند کرتا اور کوئی تیز چٹخنا ..." آخر میں بولتے ہوئے وہ بلاوجہ خوش ہوا تھا۔ منظر کو یہ منطق سمجھ میں تو نہیں آئی مگر اس نے ٹالنے والے انداز میں سر ہلا دیا۔ چوہدری صاحب اور مراد ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس پڑے کہ یہ آئیڈیا تو ان کے سوا کسی کو نہیں آ سکتا تھا۔

منظر تین مختلف قسم کی بریانیوں کی دیگیں زنانے میں بھجوانے کے بعد سوچ میں پڑ گیا کہ انہیں کس طرح تقسیم کرے۔ اسے کیسے پتا چلے گا کہ کون سے

مسالے والی بریانی کس کو کھلانی ہے اور دیگیں بھی بھول گیا کہ کون سی سادی بریانی ہے کون سی چٹپٹی۔ وہ ایسے ہی پریشان کھڑا تھا کہ مراد آگیا۔

"مراد صاحب! کیا آپ بتانا پسند کریں گے کہ کون سی دیگ میں کون سی بریانی ہے۔"

"ہوہوہو یار!" مراد اس کے کندھے پہ ہاتھ مار کر ہنسا۔ "میں نے ڈھکنوں پہ چٹ لگوا دی ہے۔ تو پریشان نہ ہو۔"

"اور اگر ڈھکن بدل گئے تو...؟" اب منظر نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ "نیز یہ بھی بتا دیں کہ ان تین قسم کی بریانیوں کی تقسیم کس طرح ہو سکے گی؟"

مراد نے تیسرے نمبر والی دیگ پہ بیٹھے ملازم کو تیز مسالے والی بریانی نکالنے کو کہا۔ پھر اس کے ہاتھ سے ڈش لے کے ایک طرف چل دیا۔ جہاں رکا منظر کے ماتھے پہ بل آ گئے۔ نیلم نے بہت خوش اخلاقی سے مسکراتے ہوئے مراد کے ہاتھ سے ڈش تھامی۔ ایک ڈش تھما کے مراد پھر وہیں جم گیا۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑا کر اماں کو ڈھونڈنا چاہا۔ ایک کونے میں اماں نظر آ گئیں۔ ان کے ساتھ ہی حمیرا بیٹھی تھی۔ وہ زنانے میں بھی دیوار کی طرف منہ موڑے بیٹھی تھی۔ اس نے ہونٹ بھینچ لیے۔ منظر نے گردن دوسری طرف موڑتے ہوئے قمیص کا اوپر والا بٹن کھولا۔ گھٹن اچانک ہی بڑھ گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے رخ پھیر کے دوبارہ اس طرف دیکھا۔ مراد ابھی تک وہیں تھا اور نیلم بڑی رغبت سے بریانی کھا رہی تھی۔ اس کے چہرے پہ ہمیشہ کی طرح لاپروائیں بکھری ہوئی تھیں۔ خاصے اہتمام سے تیار ہوئی نظر آ رہی تھی۔ ساتھ ساتھ اس سے باتیں بھی کیے جا رہی تھی۔

"مجھ سے تو کبھی اس طرح باتیں نہیں کیں۔" اس نے جل کر دانت پیسے پھر اماں کے پاس پہنچا تو ایسے لگا جیسے وہ اسی کی منتظر تھیں۔

"منظر! انہیں پہچانا؟" انہوں نے اپنے ساتھ بیٹھی اپنی ہم عمر خاتون کی طرف اشارہ کیا۔ منظر نے نفی میں سر ہلایا تو انہوں نے بتایا۔

"ثمینہ ممانی ہیں تیری۔ میں نے بتایا تھا نا لاہور سے حمیرا کے ماموں آئے ہوئے ہیں۔" اس نے ادب سے انہیں سلام کیا۔

"اتنا بڑا ہو گیا ہے ماشاء اللہ۔ شبانہ کے انتقال پہ دیکھا تھا، چھوٹا سا تھا۔" ثمینہ ممانی نے پیار سے کہا۔ وہ ہلکے سے مسکرا دیا۔

"ممانی! آپ کے لیے کیسی بریانی لاؤں؟" اس نے بریانی کی کہانی سنا کر پوچھا۔

"تینوں مکس کر کے لا دیں۔ ہم نارمل مرچ کھاتے ہیں۔" ممانی کے بجائے ان کے ساتھ بیٹھی لڑکی نے خوش مزاجی سے جواب دیا۔ وہ مسکرا دیا۔ اسے آئیڈیا مل گیا تھا۔ اس نے ہلکے اور تیز مسالے والی بریانی مکس کروا کے کھانا لگوا دیا۔

اس طرف فرحانہ کو بیچ میں بٹھا کر مراد نے زنانے میں اپنے بیٹھنے کا جواز بنا لیا تھا۔ نیلم کی مسکراہٹیں مترنم ہنسی میں بدل گئی تھیں۔ وہ کھانا کھائے بغیر آگیا۔

☼ ☼ ☼

"بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہیں بھئی!" ابا نے لاپروائی سے کہا۔

"سنا ہے لان میں لگی گھاس بھی باہر سے منگوائی ہے۔"

"اچھا؟ یہ تو چوہدری نے بلاوجہ کا خرچہ کیا۔ باجرہ ڈال کے خود ہی اگا لیتا۔" ابا ہنسے۔ وہ کمرے میں داخل ہوا تو اماں اور ابا کوٹھی کی افطار پارٹی کا ذکر کر رہے تھے۔ منظر چپ چاپ آ کر لیٹ گیا۔

"پچاس نہیں، دس لاکھ تو ہم بھی لگا سکتے ہیں۔ تم کہو تو..." ابا نے اماں کو پیشکش کی۔

"نہیں۔ مجھے کوئی شوق نہیں پیسہ برباد کرنے کا۔ میرے گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ دس مرلے کا مکان، گاڑی، زمینیں، مویشی، ملازم... گاؤں میں کوٹھی کے بعد میرا ہی گھر سب سے اچھا ہے۔ مجھے مقابلے کا کوئی شوق نہیں۔ ہاں! اگر آپ کو کسی کو کچھ جتانا ہے تو آپ کی مرضی۔" اماں نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے آخر میں ابا کو چھیڑا۔ ابا زور سے ہنس پڑے۔

"مجھے کچھ جتانے کی ضرورت نہیں نیک بخت! میری پرسکون خوش حال زندگی سب سے بڑی گواہی ہے۔" ابا کے لہجے میں طمانیت تھی۔

"مراد باہر جا رہا ہے کیا؟" اماں نے پوچھا۔

"ہاں چوہدری بتا رہا تھا۔ اگلے ماہ دبئی جا رہا ہے۔ رمضان سے پہلے ہی اس کا ویزا آیا ہے۔" ابا نے اماں کے سوال کی تائید کر دی۔ منظر چونکا۔

"اونچے اونچے خواب..." اس کے کان میں اماں کی آواز گونجی۔ اسے یکدم یاد آیا۔ افطار پارٹی میں شفیق چاچا چوہدری صاحب کے ساتھ جڑے بیٹھے خوب ہی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اس نے آنکھوں پہ بازو رکھ لیے۔

"میں عصر پڑھنے جا رہا ہوں۔ منظر! تو نے نہیں جانا مسجد؟" ابا نے جاتے جاتے رک کر اس سے پوچھا۔ انہیں اس کی خاموشی محسوس ہوئی تھی مگر وہ بولے کچھ نہیں۔

"آتا ہوں ابا! آپ چلیں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"کیا ہوا منظر! ایسے چپ کیوں لیٹا ہے؟" اماں نے پیار سے اس کے ماتھے سے بال ہٹائے۔

"کچھ نہیں اماں! بس روزہ لگ رہا ہے شاید۔" اس نے بازو ہٹائے بغیر جواب دیا۔ منظر کی آواز میں کچھ تھا جو اماں اور ابا دونوں کو محسوس ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ کیا ہے اماں!" وہ باورچی خانے سے شیر خرمے کا ڈونگا لیے آیا تو اماں کے کمرے میں مختلف رنگین پیکنگ میں رکھے پانچ ٹوکروں کو دیکھ کر منظر نے پوچھا۔

"سجاد کے گھر لے کے جا رہی ہوں۔" وہ سمجھ تو گیا تھا پھر بھی اماں کی تائید پہ اس کا دل ڈوب سا گیا۔ اماں مسکراتے ہوئے شیشے میں دیکھ کر کاجل لگا رہی تھیں۔ ان کی خوشی اور اطمینان ان کے ہر انداز سے چھلک رہا تھا۔

"آخر اماں کی ضد پوری ہو کر ہی رہی۔" اس نے دل میں سوچا۔ ساتھ ہی حمیرا کا سراپا تصور میں آگیا۔ پچھلے دنوں جب وہ اس کے گھر میں رہ رہی تھی۔ عادت کے مطابق ایسے ہی اچانک وہ اماں کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ شیشے کے آگے کھڑی کاجل لگا رہی تھی۔ اس کا عکس شیشے میں نظر آیا تو ہڑبڑا کر ایک آنکھ کا کاجل چھوڑ کر کمرے سے بھاگ گئی۔ منظر نے کتنا مذاق اڑایا تھا مگر نہ تو اس نے اس کے مذاق کا جواب دیا نہ ہی دوسری آنکھ میں کاجل لگایا۔ حتیٰ کہ ایک آنکھ کا کاجل بھی نہ مٹایا۔ "ہونہہ جاہل!" اس نے بے خیالی میں سر جھٹکا۔

"تو ابھی تک ایسے ہی بیٹھا ہے؟" اماں نے اسے چپ چاپ سر جھکائے بیٹھے دیکھ کر ٹوکا۔ "چل جلدی سے تیار ہو جا۔ ماموں کے گھر تو بھی جائے گا۔"

"اماں..." وہ منمنایا۔

"بس بس۔ گاڑی تو تو نے ہی چلائی ہے نا۔ ہم کیسے جائیں گے؟" اماں اس کی طرف دیکھے بغیر باورچی خانے کی طرف چل دیں۔ وہ بادل نخواستہ تیار ہو کے نکلا تو شبنم سامنے ہی کھڑی تھی۔

"عید مبارک منظر!" وہ پچھلی عید کی ہی طرح لجا کر بولی۔ حالانکہ اب اس کی منگنی ہو چکی تھی۔ منظر نے غور سے اسے دیکھا۔

"شبنم! تم خوش ہو؟" وہ بے اختیار پوچھ بیٹھا۔

"محسوس کرنے کی بات ہے۔ دل کو راضی کر لو تو تکلیف کا احساس ختم ہو جاتا ہے پھر ظاہر ہے، خوشی ہی بچتی ہے زندگی میں۔ میں نے تو یہی سمجھا ہے۔" اس نے حسب عادت اپنے چھوٹے بالوں میں بڑے سے پراندے والی چوٹی سے کھیلتے ہوئے کہا۔ اس بار چہرے پہ پرانی شوخی کی جگہ نم سی مسکان تھی۔

"میرا بیٹا تو پورا اتارزن لگ رہا ہے ماشاء اللہ۔" اماں باورچی خانے سے نکلیں تو اسے سفید کاٹن کے سوٹ میں دیکھ کر پیار سے بولیں۔

"اماں! ریمبو..." اس نے دل گرفتی سے اماں کی تصحیح کی۔

"ارے ہاں وہی۔" اماں نے حسب عادت لاپروائی سے ہاتھ ہلایا اور ایک بڑی ڈش شیر خرمے کی ٹوکروں کے ساتھ لاکر رکھی۔

"اماں! سارا نہ لے کر جاؤنا۔ میرے لیے بھی بچا کر رکھو تھوڑا۔" اس کا دل سخت اداس تھا مگر اماں کے ہاتھ کے بنے شیر خرمے سے دستبرداری کیسے ممکن تھی۔

"رکھا ہے تیرے لیے۔ چل شبنم۔۔۔ منظر! ابا کو بلا اپنے۔" انہوں نے چادر اوڑھتے ہوئے عجلت سے کہا۔

راستے میں اس کی جیپ شفیق چاچا کے گھر کی طرف سے گزری تو ان کی دکان کے سامنے مراد کی گاڑی کھڑی تھی۔

"اونچے اونچے خواب۔۔۔" اس نے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے اور رفتار بڑھادی۔

☼ ☼ ☼

ان کے پہنچنے پر سجاد ماموں کے گھر خوب رونق ہوئی۔ ثمینہ ممانی اور ابرار ماموں بھی موجود تھے۔ منظر خاموش خاموش سا ایک طرف بیٹھا تھا۔ حمیرا نے اس کے پاس مختلف کاموں سے چار چکر لگائے تھے۔ وہ جی جان سے جل گیا۔ "اب کیسے منڈلا رہی ہے آس پاس۔ لالچی!"

"بس آپا! جس طرح ارسہ میری بیٹی ہے۔ اسی طرح آپ کی ہے۔ مجھے تو خوشی ہے کہ میری بیٹی اپنوں میں جارہی ہے۔" ثمینہ ممانی کی بات پہ منظر نے چونک کر سر اٹھایا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ عید کی وجہ سے ہر کسی کا چہرہ خوشی سے مسکرا رہا تھا۔ ابا اسے پریشان دیکھ کر اس کے قریب آبیٹھے۔ وہ تو منتظر ہی تھا۔ "ابا! یہ کیا معاملہ ہے؟"

"بس بیٹا!" انہوں نے لمبی آہ بھری۔ "جس طرح تیری ماں میرے سر منڈھ دی گئی۔ اسی طرح یہ لڑکی تیرے سر منڈھ دی گئی ہے۔ تیرے میرے غم ایک ہیں۔"

ابا اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ بول رہے تھے۔ "مگر یار! غم نہ کر۔ میری بھی اچھی گزر گئی۔ تیری بھی ان شاء اللہ اچھی گزر جائے گی۔ ایک بات طے ہے میرے پیارے پتر جی!" ابا اس کے کان میں گھسے سرگوشی میں بول رہے تھے۔ منظر کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ ڈر کس سے رہے ہیں۔ ساری عمر تو اماں کو بہانگ دہل چھیڑتے رہے ہیں۔

"تو اور تیری اماں۔۔۔ دونوں کے فیصلے ماٹھے تھے۔ ایک تجھے پسند نہیں تھی۔ ایک اسے پسند نہیں تھی۔ لیکن میرے دونوں فیصلے درست تھے۔ ایک تیری ماں کو پسند کیا اور ایک اپنی بہو کو۔" ابا نے اپنی سر منڈھنے والی بات کی خود ہی تردید کردی۔ ابا کے مبہم مکالمے اسے ہرگز سمجھ میں نہیں آتے اگر وہ سامنے نہ دیکھتا۔

حمیرا اور اس کی دونوں بڑی بہنیں گلابی بناری فراک پاجامے میں ملبوس اس لڑکی کو پکڑ کر لارہی تھیں جسے اس نے چوہدری صاحب کی افطار پارٹی میں دیکھا تھا۔ وہ حیران ہوا۔ اب جبکہ وہ حمیرا کو۔۔۔ تو اچانک۔ اس نے اچنبھے سے ابا کی طرف دیکھا۔

"بہت اچھی بچی ہے۔ سجاد کے سالے کی بیٹی ہے۔ کالج میں پڑھتی ہے۔ لاہور میں انگریزی اسکول میں پڑھاتی تھی۔ یہاں آکر بھی اسکول میں پڑھانے لگ گئی ہے۔ تیری ماں جیسی ہے بالکل۔ سمجھ دار، سلیقہ مند اور عزت کرنے والی۔۔۔"

منظر ہونقوں کی طرح یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اسے یاد آیا۔ افطار پارٹی سے ثمینہ ممانی اور وہ اماں کے ساتھ ہی آگئی تھیں۔ رات رکی تھیں۔ اس نے سحری بنانے میں اماں کی مدد بھی کی تھی۔ دوسرے دن روزہ کھول کے وہ سجاد ماموں کے گھر واپس گئی تھیں۔ منظر ہی انہیں چھوڑنے گیا تھا۔ فیروزی کاٹن کے سوٹ میں ہلکے ہلکے ہنستی بولتی وہ لڑکی واقعی بہت پیاری تھی۔ وہ اپنے لباس انداز میں نہایت نفیس نظر آرہی تھی۔ اس کی گفتگو میں بھی متانت تھی۔ اس دن وہ بہت دلبرداشتہ تھا ورنہ ارسہ سے ضرور متاثر ہوتا۔

اسے افسوس ہوا کہ اس نے اماں کی پسند کو مسترد کیا

تھا۔ ارسہ کو بھی تو اماں نے ہی پسند کیا تھا۔ ابا نے ابھی اس کے کان میں بتایا تھا کہ اس کی طرف ابا نے اشارہ کیا تھا۔ باقی کام اماں نے پورا کردیا۔

ارسہ کو بالکل اس کے سامنے بٹھایا گیا تھا۔ اس نے پہلی بار غور سے اسے دیکھا اور شاید استحقاق سے بھی اسے بہت اچھا لگا۔ کچھ الگ سا محسوس ہوا تھا جو شاید نیلم کو دیکھ کر بھی نہیں ہوا تھا کبھی۔ اس کے اونچے اونچے خواب وہ پورے کرسکتا تھا مگر اماں نے کہا تھا اس میں ادب سلیقہ نہیں ہے۔ صحیح کہا تھا۔

ارسہ ایک دن اس کے گھر میں رہی تھی۔ اس نے بے توجہی سے اسے دیکھا تھا۔ دل سے دیکھتا تو اس کو پتا چلتا کہ ارسہ اس کی اور اماں کی دونوں کی پسند پہ پوری اترتی ہے۔

"اماں! میں خود پہناؤں انگوٹھی؟" اس نے اپنے دل کو راضی پا کر اماں کے کان میں سرگوشی کی۔

"شرم کر اور چپ کر کے بیٹھا رہ۔" اماں نے بھی سرگوشی میں گھر کا۔

"اماں! قسم سے ذرا عزت نہیں کرتی ہو میری۔ تم ایسا سلوک کرو گی تو وہ کیسے کرے گی میری عزت۔" وہ پھر اماں کے کان میں منمنایا۔

"پھپھو! ان سے کہیں۔ غم نہ کریں۔ میں کرلیا کروں گی ان کی عزت۔" اس نے بھی اماں کے کان میں چپکے سے کہا۔ منظر قریب تھا، سن لیا۔

"پھر ٹھیک ہے۔" وہ اس کی خوش مزاجی پہ خوش ہوا۔

اماں نے کہا تھا زندگی فرمانبردار لڑکی کے ساتھ اچھی گزرتی ہے۔ اس کا اپنا خیال تھا کہ پڑھی لکھی میچور لڑکی کے ساتھ اچھی گزرتی ہے۔ مگر۔۔۔ شبنم نے کہا تھا کہ زندگی محبت کے ساتھ اچھی گزرتی ہے۔۔۔

"ارسہ میں دونوں خصوصیات ہیں۔ محبت بھی سمجھو ہونے ہی لگی ہے بس۔۔۔ یعنی میری زندگی بہت اچھی گزرے گی۔" منظر نے طمانیت سے سوچا۔

"آج عید ہے اماں۔۔۔! حلف اٹھا کر کہو کہ اگلی عید تک میری رخصتی کردو گی۔"

"اگلی عید۔۔۔؟" اماں نے حیرانی سے پوچھا۔ "چل ٹھیک ہے جیسے تیری مرضی۔ ورنہ میں نے تو دو ماہ بعد بقر عید پہ رخصتی مانگی تھی۔" اماں نے آرام سے کہا۔

"نہیں نہیں اماں! ٹھیک ہے۔ جیسا آپ۔۔۔" منظر بوکھلایا۔

"نہیں بیٹا جی! اب تو حلف اٹھالیا گیا ہے۔ اب تو اگلی عید تک آرام سے بیٹھ۔" ابا ظالم سماج بننے لگے اور منظر کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس نے خاموشی سے سر جھکالیا۔

"قاضی صاحب آئیے!" اچانک ابا کی آواز آئی۔ اس نے سر اٹھایا۔ ابا مسکرا رہے تھے۔ وہ اٹھ کے ان کے گلے لگ گیا۔

☼

رشکِ حبیبہ

زنگ آلود آئینے

دنیا ایک امتحان گاہ۔۔۔ زندگی پرچہ امتحان۔
کسی کا پرچہ آسان۔۔۔ کسی کا مشکل۔۔۔ بے حد مشکل۔
کوئی بے حساب نعمتوں کی آزمائش میں گھرا ہے۔
کوئی بے حساب محرومیوں سے نبرد آزما ہے۔
آزمائش تو سب کے لیے ہے اور اللہ کا وعدہ ہے
"جب ہم قیامت کے روز انصاف کا ترازو کھڑا کریں گے تو کسی شخص کی ذرا بھی حق تلفی نہ کی جائے گی۔"

مکمل ناول

☼ ☼ ☼

رات اپنے آخری پڑاؤ میں پاؤں دھرے اس کے لان کی بڑی سی گلاس ونڈو سے ناک چپکائے اس کے گھر میں جھانک رہی تھی۔ جہاں وہ لونگ روم میں صوفے پر نیم دراز کوئی انگلش مووی دیکھنے میں محو تھا۔ اس نے سیاہ ٹراؤزر پر عادتاً" کچھ بھی پہننے کا تکلف نہ کیا تھا۔ اس کا کسرتی بدن نمایاں تھا۔ پیشانی پر بے ترتیبی سے بال بکھرائے وہ اچھا خاصا خوبرو دکھائی دے



رہا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں ٹن تھا اور دائیں ہاتھ کی پہلی دو انگلیوں کے درمیان سلگتا سگریٹ۔۔۔۔

فلم ختم ہونے لگی تھی۔ ساری ٹریجڈی، سارا سسپنس ختم، ہیرو ہیروئن کا رومانٹک سین۔

صوفے پر دراز وجود کی رنگت متغیر ہونے لگی۔ کن کنپٹیوں پر لہو جوش سے ٹکریں مارنے لگا۔ اس نے بائیں ہاتھ میں پکڑا ٹن پوری قوت سے کھینچ کر ٹی وی اسکرین پر دے مارا۔ انگلیوں میں دبا سگریٹ انگلیوں سے ہی مسل کر کارپٹ پر پھینک دیا۔

شدید اشتعال کے سبب اس شخص کا تنفس تیز ہونے لگا۔ اس کی حالت ایسی تھی جیسے سمجھ نہ پا رہا ہو کہ کرے کیا اور کرے کیسے؟

وہ جوش غضب سے بے قابو ہو کر اٹھا اور جھپٹ کر ٹی وی اٹھانے لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ ٹی وی اٹھا کر پٹخ دیتا۔ اس کا موبائل بجنے لگا اور یوں جیسے کسی نے اس پر پانی انڈیل دیا ہو۔ وہ ہڑبڑا کر حواسوں میں لوٹا لمحہ بھر حیرانی سے اپنی حالت پر غور کیا جیسے محو حیرت ہو۔۔۔۔ وہ وہاں کیوں کھڑا تھا؟

موبائل فون کی بجتی بیل اسے اپنے پاس بلا رہی تھی۔

"مایا کالنگ۔۔۔۔" اس نے فون آن کر کے کان سے لگا لیا۔

"یس۔۔۔۔" کان سے لگے فون کو ایک ہاتھ سے پکڑے پکڑے اس نے جھک کر کارپٹ سے سگریٹ کا مسلا ہوا ٹکڑا اٹھایا۔

"کہاں تھے تم۔۔۔۔ میں نے سارا دن تمہارا نمبر ٹرائی کیا۔ اٹھایا کیوں نہیں تم نے؟" وہ چھوٹتے ہی شروع ہو گئی۔ اس کی آواز رندھی ہوئی تھی جیسے روتی رہی ہو۔

"مصروف تھا۔" اس نے سپاٹ سا جواب دیتے ہوئے آگے بڑھ کر تھوڑی دور پڑا ٹن بھی اٹھا لیا۔

"تم مصروف تھے؟ اتنے مصروف کہ تمہیں میرا خیال بھی نہیں آیا؟" وہ جیسے صدمے کے زیر اثر آ گئی۔

"کیوں فون کیا ہے؟" اس نے خالی ٹن اور سگریٹ کے مسلے ہوئے ٹکڑے ڈسٹ بن برد کیے۔ لہجہ ایسا تھا جیسے کہہ رہا ہو۔۔۔۔ "فون بند کرو۔"

"تم میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔ میں تمہارے بغیر۔۔۔۔" اس کا ضبط یہیں تک تھا۔ اس کی دیوانگی اسے خود کو جذباتی ہونے سے روک نہیں پائی تھی۔

"او کم آن مایا! تمہارا رونے دھونے کا ڈراما مجھے سخت بور کر رہا ہے۔ کوئی اور بات ہے یا بس یہی گھسا پٹا راگ سنانے کے لیے فون کیا ہے؟" وہ ہنوز بے نیاز اور لاتعلق سا تھا۔ حالانکہ اندر کہیں درون دل بڑا خوب صورت سرور پھیلنے لگا تھا۔

"میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں۔" وہ تڑپ اٹھی گئی تھی۔

"تمہارا ہیڈک ہے۔ جو چاہو شوق سے کرو۔"

"میں مر جاؤں گی تمہارے بغیر۔۔۔۔ پلیز۔" وہ سسکنے لگی۔

"ابھی ہی مر جاؤ تو بہتر ہے۔۔۔۔ میرے ساتھ رہ کر بھی مرنا ہی ہے۔" اس کا لہجہ زہر خند تھا۔

"تم نے میرے ساتھ بہت وعدے کیے تھے قسمیں کھائی تھیں۔ تم اب نہیں مکر سکتے! تم ایسا نہیں کر سکتے۔" وہ زارو قطار رو رہی تھی۔

"ہاں میں نے کیے تھے وعدے۔ کھائی تھی قسمیں اب مکر رہا ہوں۔ میں تمہارے آرڈرز کا پابند نہیں ہوں۔ جو چاہوں گا کروں گا۔ سمجھیں!"

"تم سب بھول گئے ہو۔ تمہیں کچھ بھی یاد نہیں۔" مایا کی بھیگی آواز ایک بار پھر ابھری۔

"ہاں مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔۔۔۔ کیونکہ میں کچھ یاد رکھنا بھی نہیں چاہتا۔ کیا کر لو گی تم؟" اس کی وحشت بیدار ہونے لگی۔

"پلیز۔۔۔۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اس کی گردان اس بچے کی طرح تھی جو من پسند کھلونا نہ ملنے پر ضد کرنے لگتا ہے۔

اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکان ابھری۔ جیسے رگ و پے میں کچھ تسکین سی سرائیت کر گئی ہو۔ وہ یہی چاہ رہا تھا۔

"تم بہت برے ہو۔" یہ آخری بات کہہ کر مایا نے فون بند کر دیا۔

اس کی ہلکی سی مسکان گہری ہوئی۔۔۔۔ بہت گہری۔۔۔۔ پھر وہ ہنسنے لگا۔ بہت زور زور سے۔ بہت دیر تک ہنستا رہا۔ اتنا کہ ہنستے ہنستے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس نے دونوں ہتھیلیاں آنکھوں پر جما کر زور سے آنکھیں مسلیں۔

نمی خشک نہ ہوئی تھی بلکہ بڑھ گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ ہتھیلیوں سے آنکھیں مسلتا جا رہا تھا۔۔۔۔ اور اس کی ہتھیلیوں سمیت چہرہ بھی بھیگتا جا رہا تھا۔ وہ لمبا چوڑا بھرپور وجیہہ و شکیل مرد وہیں دیوار سے لگ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ گھٹنوں میں منہ چھپائے وہ کسی ننھے بچے کی طرح بلک رہا تھا مگر اس کے اندر پھیلتا اضطراب کم ہونے کے بجائے بڑھتا جا رہا تھا۔ نجانے کتنی دیر وہ اس حالت میں بیٹھا روتا رہا، پھر ہاتھ سے بھیگا چہرہ پونچھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ کچن میں آیا۔ فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کر گلاس بھرا۔۔۔۔ پھر دل میں کیا سمائی۔۔۔۔ کہ بوتل میں بھرے باقی ماندہ یخ پانی کو سر پہ انڈیلنے لگا۔

وہ وہیں کھڑا خود کو ٹھنڈے پانی سے بجھانے کی کوشش کر رہا تھا مگر جلن کسی طور کم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ اس کی جنونی کیفیت میں قطعاً" فرق نہ آیا۔ بوتل خالی کرنے کے بعد فرش پر دے ماری۔ پھر گلاس بھی دیوار پہ دے مارا۔

تیز قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ بے پروائی سے کانچ کے اوپر سے گزر گیا۔ اس کے تلوے میں کانچ کے کئی چھوٹے بڑے ٹکڑے چبھے تھے۔

کمرے میں پہنچ کر اس نے سائیڈ ٹیبل کی دراز سے سرنج نکالی اور بھر کر نس میں اتارنے لگا۔ اس کے روم روم میں سکون اترنے لگا۔ ذرا سی دیر بعد اس نے خالی سرنج پھینک دی۔

اب وہ اپنے پاؤں گود میں رکھے کانچ کے ٹکڑے نکال رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ اوندھے منہ بیڈ پر دراز تھا۔

اس کا ذہن ہر تکلیف، ہر پریشانی، ہر اضطراب سے آزاد ہونے لگا۔



سورج نے زمین سے اپنی شعاعیں سمیٹنی شروع کیں تو شام کے سایوں نے قد نکال لیا اور بڑھتی شام کی چادر سے جھانکتی رات میں وہ دونوں تیز تیز قدموں سے چلتی گھر کی طرف گامزن تھیں۔ صوفیہ پاؤں کے لنگ کی وجہ سے تھوڑا رک رک کر چل رہی تھی اور ناہید کا کوفت سے برا حال تھا۔ اپنا موبائل وہ گھر بھول آئی تھی اور نبیل نے ساڑھے سات بجے کال کرنے کا کہا ہوا تھا۔ اب جو وہ فون نہ اٹھاتی تو وہ ناراض ہو جاتا اور ناہید اس کی ناراضی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

پہلے ہی انہوں نے بازار میں ضرورت سے زیادہ

وقت لگا دیا تھا۔ روڈ سے رخ بدلتے ہوئے جب وہ دوسری طرف نکلیں۔ حالانکہ ہارن کی آواز آئی تھی مگر صوفیہ کو غصے میں کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا تو سنائی کیا دیتا۔ سامنے سے آتی کار بری طرح بے قابو ہوئی۔ غالباً" صوفیہ کے اچانک سامنے آجانے کی وجہ سے ڈرائیور حواس باختہ ہو گیا تھا۔ بریک لگانے کے ساتھ ساتھ اس نے کار کو دائیں طرف موڑا مگر بد قسمتی سے صوفیہ بھی ہڑبڑا کر دائیں طرف ہی ہٹی تھی۔ ناہید تو پہلے ہی کنارے ہو گئی تھی۔ کار کی ڈگمگاتی حالت اور صوفیہ کی حواس باختگی رنگ لائی۔

ایک لمحے میں یہ سب ہوا تھا۔ کار ڈرائیور کی بھی اور صوفیہ کی بھی' بچانے اور بچنے کی دونوں کوششیں ناکام ہوئیں۔ بے قابو ہوتی کار نے صوفیہ کو ہٹ کیا۔ وہ روڈ پر گری کراہ رہی تھی۔ ناہید بھاگ کر اس تک پہنچی۔ کار والا بھی کار روک کر باہر نکل آیا۔

"آپ کو دکھائی نہیں دیتا۔ اندھے ہیں گاڑی چلا رہے ہیں یا اڑا رہے ہیں۔ گاڑی میں بیٹھتے ہیں تو کیا پیدل چلنے والوں کو روند کر گزریں گے؟" ناہید کار والے کی صورت نظر آتے ہی برس پڑی۔ مگر جواب دینے کا موقع نہ ملا۔

"دیکھیے مس ۔۔۔۔! یہ خود میرے سامنے آئی تھیں۔ میرا کوئی قصور نہیں۔" اس نے ناہید کو صفائی دینے کی کوشش کی۔

"ہاں ہاں! یہ آج گھر سے پلان بنا کر آئی تھی کہ آپ کی گاڑی سے ٹکرا کر روڈ پہ ضرور گرنا ہے۔" ناہید نے بیچ سڑک پر بیٹھی منہ چھپا کر روتی صوفیہ کی پشت سہلا کر دلاسا دیا۔

ایک تو رات کا بڑھتا اندھیرا' اوپر سے اس طرح کا حادثہ۔ صوفیہ خوفزدہ سی ہو گئی ۔۔۔۔ بظاہر تو کوئی خاص چوٹ دکھائی نہ دے رہی تھی مگر وہ پھر بھی رو رہی تھی۔ دو منٹ میں فارغ لوگوں کا مجمع اکٹھا ہو کر تماشا دیکھنے لگا۔

"صوفی! تم ٹھیک ہو؟" ناہید تشویش سے اس کے نزدیک بیٹھی جو گھٹنوں سے سر ہی نہیں اٹھا رہی تھی۔

خجالت اتنی شدید تھی۔ اتنے لوگوں کے سامنے گری تھی۔ گو کہ اندھیرا ہو گیا تھا مگر اسٹریٹ لائٹ کی روشنی اندھیرے کو نگلنے میں اچھی خاصی کامیاب ہو رہی تھی۔

"صوفی!" ناہید نے زبردستی اس کا سر اٹھایا۔

"کھڑے ہو کر دیکھو بیٹا! بظاہر تو نظر نہیں آ رہی پھر بھی ہو سکتا ہے چوٹ لگی ہو۔" ایک خاتون حلاوت سے بولیں۔

نرم مہربان آواز ۔۔۔۔ صوفیہ نے خود کو سنبھالتے ہوئے سر اٹھایا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"کیا ہوا؟" ناہید نے اس کی خوفزدہ صورت دیکھ استفسار کیا۔ اس نے آہستگی سے نفی میں سر ہلایا اور بھیگے چہرے کو چادر سے خشک کرنے لگی۔

وہ کار والا بار بار اپنی کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر فکرمندی کے آثار تھے۔

"اٹھو شاباش!" اسی معمر خاتون نے صوفیہ کو سہارا دے کر کھڑا کیا۔ اسے چوٹ لگی تھی۔ پنڈلی کے ساتھ گوشت میں اٹھتے درد نے اس کے سارے پاؤں کو لپیٹ میں لیا۔ صوفیہ کے چہرے پر بڑھتی تکلیف کے آثار ناہید اور معمر خاتون کے ساتھ ساتھ کار والے سے بھی مخفی نہ رہ سکے۔

"کہاں چوٹ لگی ہے؟" ناہید نے اس کے پیروں کو دیکھا۔ جیسے اندازہ کر رہی ہو۔

صوفیہ نے درد کے شدید احساس کو دبانے کی کوشش میں اپنے لب دانتوں تلے چبا لیے۔ ہاتھ سے پاؤں کی طرف اشارہ بھی کیا۔

گاڑی والے نے ایک بار پھر کلائی الٹ کر گھڑی دیکھی۔ وہ غالباً" جلدی میں تھا اور اس حادثہ کے سبب وہاں رکا ہوا تھا' ورنہ اس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ ایک منٹ میں رسی تڑا کر بھاگے گا۔

"دو چار قدم چلو"

"پاؤں کو جھٹکے دو"

"سیدھی کھڑی ہو"

طرح طرح کے مشورے ملنے لگے۔

صوفیہ نے پاؤں کو زور زور سے جھٹکا بھی' پوری طرح سیدھی کھڑی بھی ہوئی۔ مگر دو چار قدم چلنا محال ہو گیا۔

"کیا ہوا؟ چلا نہیں جا رہا؟" ناہید کے چہرے پر اچھی خاصی پریشانی ابھر آئی۔ صوفیہ دوبارہ بیٹھ گئی۔ اس سے کھڑے رہنا دوبھر ہو گیا تھا۔

"او ہو۔ اتنی بری طرح چوٹ لگی ہے۔"

"فریکچر تو نہیں؟"

"اف! لڑکی معذور نہ ہو جائے کہیں۔"

جتنے منہ اتنی باتیں ۔۔۔۔

وہ دونوں اسی آدمی کی کار میں بیٹھ کر اسپتال تک آئیں۔

وہ شخص سارا راستہ ان دونوں کو تسلیاں دیتا آیا تھا۔ وہی معمر خاتون جو صوفیہ کو پچکار رہی تھیں' ان دونوں کے ساتھ ہو لیں۔

☆ ☆ ☆

اسپتال آ کر جب ڈاکٹر صوفیہ کی ٹریٹمنٹ کرنے لگا تو وہ ناہید کے نزدیک آیا۔

"آپ کی سہیلی کا ٹریٹمنٹ ہو رہا ہے۔ آپ اپنے گھر انفارم کر دیں تاکہ وہ آجائیں یہاں۔ مجھے کہیں ارجنٹ پہنچنا ہے' میں آل ریڈی پندرہ منٹ لیٹ ہو چکا ہوں۔" ناہید نے گھبراہٹ سے اپنی پیشانی سے پھوٹتا پسینہ خشک کرتے ہوئے اسے دیکھا۔

"مس! پلیز ان کے گھر انفارم کر دیں۔" وہ اس کی غائب دماغی محسوس کر کے دوبارہ بولا۔

"میں نے انفارم کر دیا ہے۔" اس نے گھڑی دیکھی۔ پونے آٹھ ہو رہے تھے۔

"دیکھیے! آپ پریشان نہ ہوں وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔" اس شخص نے غالباً" ازراہ ہمدردی کہا مگر ناہید کی پریشانی ناراضی میں ڈھل کر اس شخص کو مہنگی پڑ گئی۔

"آپ کہیں نہیں جا سکتے۔" ناہید تڑخ ہی گئی۔ بس گریبان دبوچنے کی کسر رہ گئی تھی۔

"دیکھیے مس! بات سمجھیے میں پہلے ہی بہت جلدی میں ہوں اور اچھا خاصا وقت برباد کر چکا ہوں۔" وہ بے زاری سے پھر وضاحت دینے لگا۔

"آپ اس طرح نہیں جا سکتے۔ آپ کو ٹریٹمنٹ کے اخراجات ادا کرنے پڑیں گے۔ اتنی آسانی سے جان نہیں چھوٹے گی آپ کی۔" ناہید نے اسے ڈرایا۔

"اس وقت میں نہیں رک سکتا۔ ہاں کچھ دیر بعد میں واپس آجاؤں گا تو اخراجات اور پولیس دونوں کو دیکھ لوں گا۔ اب پلیز میرا دماغ مت خراب کریں۔"

"واپس آجائیں گے اور میری تو عقل پہ موٹے پردے پڑے ہیں ناکہ میں آپ کو جانے دوں گی۔" صوفیہ نے طنزیہ کہا۔ جواباً" وہ کچھ بولا نہیں بس اپنا والٹ نکالنے لگا۔

"میری واپسی تک ہو سکتا ہے ضرورت پڑے یہ رکھیے۔" اس نے نجانے کتنے نوٹ بڑھائے تھے۔

"اور یہ! میری واپسی تک کے لیے میری گارنٹی۔" اب اس نے اپنا آئی ڈی کارڈ بڑھایا تھا۔

"نہ آؤں تو پولیس کو دے دیجیے گا۔ مجھے وہ خود ڈھونڈ نکالیں گے۔"

اس شخص نے نوٹوں پر اپنا آئی ڈی کارڈ رکھ کر ناہید کے پیچھے رکھی کرسی پر رکھا اور یہ جا وہ جا ۔۔۔۔

ناہید نے متذبذب کیفیت میں وہ دونوں چیزیں اٹھائیں۔ کارڈ پلٹ کر دیکھا۔

"نوید عثمان ۔۔۔۔" زیر لب نام پڑھا اور کارڈ بیگ میں ڈال لیا۔

☆ ☆ ☆

اس شخص کے جانے کے کچھ دیر بعد ہی نفیسہ ناہید کے والدین کے ساتھ اسپتال پہنچی۔ وہ خاصی پریشان تھی۔ پہلے ہی صوفیہ کے پاؤں کا نقص اس کے لیے مسئلہ بنا ہوا تھا لوگ اس کی سوہنی صورت نظر انداز کر کے اس کے لنگ کو وجہ بنا کر صفا چٹ انکار کر جاتے تھے۔ اب یہ نئی افتاد ۔۔۔۔

صوفیہ کو روم میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ اس کے پاؤں میں بظاہر نہ کوئی زخم تھا نہ ہی فریکچر مگر دائیں پیر کی پنڈلی کا گوشت نیلا پڑ گیا تھا۔

وہ شخص، جو اس سب کا ذمہ دار تھا ابھی تک نہ لوٹا تھا۔ حادثے کی تفصیل سننے کے بعد ناہید کی ماں گہری سوچ میں تھیں۔ نفیسہ کی صوفیہ کے حوالے سے پریشانی اس سے کچھ ڈھکی چھپی نہ تھی۔ نفیسہ نے رشتہ کرانے والیوں کی اور صوفیہ نے لڑکوں سے دوستی کر کے انہیں خود سے ملتفت کرنے والی ہر طرح کی تدبیر آزما دیکھی تھی۔ مگر نتیجہ صفر تھا۔

کسی بھی لڑکے کی ماں بہنیں اس کے پاؤں کا نقص دیکھتے ہی توبہ توبہ کرتی اٹھ جاتیں اور جن سے صوفیہ خود راہ و رسم بڑھاتی وہ ملنے کے لیے تو صوفیہ کو بصد شوق بلاتے مگر جب صوفیہ کو مجسم دیکھتے تو سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگتے۔۔۔۔ معذور لڑکی کو گلے کا ہار کون بنائے بھلا۔

"کیا سوچنے لگیں تم؟" نفیسہ نے ناہید کی ماں کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں دیکھتے استفسار کیا۔

"ناہید! وہ شخص دیکھنے میں کیسا تھا۔" ناہید کی ماں نے جیسے نفیسہ کا سوال سنا ہی نہیں۔

"کیا مطلب کیسا تھا؟ جیسے لڑکے ہوتے ہیں ویسا ہی تھا۔" ناہید الجھ سی گئی۔

"عمر کتنی ہوگی؟ شادی شدہ تو نہیں ہوگا۔" وہ جیسے سوچ بچار میں تھی۔

"عمر تو ستائیس، اٹھائیس کے آس پاس لگ رہی تھی اور شادی شدہ لگتا تو نہیں تھا مگر ہو بھی سکتا ہے۔" ناہید نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ صوفیہ بھی ناسمجھی سے یہ سب سن رہی تھی۔

"آخر کیا چل رہا ہے تمہارے دماغ میں؟" ناہید کا باپ تنگ آ کر بول ہی پڑا تھا۔

"سنیے جی! نفیسہ تم بھی سنو۔۔۔۔" ناہید کی ماں آہستگی سے انہیں سمجھانے لگی۔ ناہید اور صوفیہ تک بھی اس کی آواز با آسانی پہنچ رہی تھی۔ بات ختم ہوئی تو نفیسہ غور و فکر میں ڈوب گئی۔

"مگر پتا نہیں کون ہے؟ کیسا ہے؟ بغیر کچھ جانے بوجھے، دیکھے بنے اس طرح تو مشکل ہے۔" ناہید کا باپ بھی متذبذب تھا۔

"ارے دیکھنے کی طرف سے تو مطمئن ہو جاؤ۔ دونوں نے دیکھ لیا ہے، کافی ہے۔ ویسے بھی ابھی تو صرف اس کے گلے پڑنا ہے۔ بعد میں صوفیہ خود اس کی تفصیل معلوم کر لے گی۔ اگر مناسب ہوا تو پکڑ کر کھونٹے سے باندھ دیں گے۔۔۔۔ اگر نہیں۔۔۔۔ تو نہ سہی۔ کوشش کرنے میں حرج ہی کیا ہے۔" ناہید کی ماں اچھا خاصا سوچ بیٹھی تھی۔

"بات تو تمہاری بھی ٹھیک ہے۔ جہاں ہر ایک تدبیر آزمائی وہاں ایک یہ بھی سہی۔ کیا پتا قسمت مہربان ہو ہی جائے۔" نفیسہ نے بھی نیم رضامندی دے دی تھی۔ ناہید کے باپ نے بھی اثبات میں سر ہلا کر ان کے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کی منظوری دے دی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ ڈاکٹر کے مقابل بیٹھے مدعا بیان کر رہے تھے۔

"میں نے آمدنی کے لیے ہی یہ ہاسپٹل کھولا ہے۔ پھر پیسے کسی بھی ذریعے سے آئیں، مجھے اس سے کیا غرض۔ میرا ہر طرح کا تعاون آپ کے ساتھ ہے۔ مگر اس شرط پر کہ پیمنٹ میری مرضی کی ہوگی۔"

ڈاکٹر نے بے ضمیری کا اعلا نمونہ پیش کرتے ہوئے خباثت کا مظاہرہ کیا۔

معاملات طے کرنے کے بعد وہ تینوں مطمئن ہو کر صوفیہ کے کمرے تک آئے۔ جہاں اب ایک نرس اور ڈاکٹر مل کر اس کے بائیں پیر پر پلستر چڑھا رہے تھے۔



"پیشنٹ کے بائیں پیر میں فریکچر ہے۔ دائیں پیر میں بھی اندرونی چوٹ ہے۔ کور ہونے میں ٹائم لگے گا۔ چلنے پھرنے کے قابل تو ہو جائیں گی مگر پلستر کھلنے کے بعد کی کنڈیشن کے متعلق کچھ حتمی طور پہ کہنا قبل از وقت مشکل ہے۔ ان کا بے حد خیال رکھیے گا۔ مکمل طور پر بیڈ ریسٹ بے حد ضروری ہے۔"

ڈاکٹر پیشہ ورانہ انداز میں تفصیلات بتا رہا تھا اور نوید

عثمان جیسے جیسے اس کی بات سنتا گیا اس کی پریشانی بڑھتی گئی۔

نجانے اب اس کے گھر والوں کے کتنے لعن طعن برداشت کرنے تھے۔ پیسوں کا تو مسئلہ نہ تھا مگر اس معاملے میں خوامخواہ پھنسنے پر وہ اچھی خاصی کوفت کا شکار تھا۔

"آئی ایم رئیلی سوری! میری وجہ سے آپ سب کو اتنی تکلیف اٹھانی پڑی۔ یقین کریں میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا۔ میں ایکچوئیلی بہت جلدی میں تھا بہرحال جو نقصان آپ کا ہوا میں اس کی بھرپائی تو نہیں کرسکتا مگر جو آپ کہیں میں ہرجانہ ادا کرنے کو تیار ہوں۔"

نوید عثمان نے پشیمان لہجے میں ان لوگوں سے معذرت کی تھی جسے نفیسہ نے تو شاید سنا بھی نہیں تھا۔ وہ تو نوید عثمان کو ایسی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی جیسے شکاری اپنے شکار کو دیکھتا ہے۔

"نہیں نہیں ـــ ہرجانے کی کیا بات ہے بیٹا۔ قدرت کے کام ہیں سب' اس طرح ہونا تھا سو ہوا ہم کوئی کرسکتا ہے اس کی مرضی کے بغیر کچھ۔ اسپتال کے ڈیوز بھی ہم خود ادا کردیں گے۔ یہ ناہید پریشانی میں کچھ بول گئی ہو الٹا سیدھا تو درگزر کردینا۔"

ناہید کی ماں نے خوش اخلاقی کے سارے ریکارڈ توڑ ڈالے۔ نوید عثمان حیران ہونے کے ساتھ ساتھ خوش بھی ہوا کہ چلو گلو خلاصی ہوئی۔ مگر کچھ اخلاقی تقاضے اسے ابھی نبھانے تھے۔

"نہیں آنٹی! پلیز شرمندہ نہ کریں۔ غلطی ہو گئی۔ آپ نے معاف کیا۔ آپ کا ظرف بڑا ہے۔ مگر اسپتال بلز میں ہی کلیئر کروں گا ڈونٹ وری۔ میں ان سے مل لوں۔ دراصل معذرت کرنا چاہ رہا تھا۔" نوید عثمان نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"ضرور' ضرور ـــ" نفیسہ اور ناہید کی ماں کی باچھیں ہی کھل اٹھیں۔

وہ اس کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ سامنے ہی بیڈ پر نیم دراز تھی اور ناہید اس کے قریب بیٹھی تھی۔ ناہید اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اوہ! آپ آگئے۔ بڑی جلدی چلے آئے۔ میں تو بس اب آپ کا آئی ڈی کارڈ پولیس کے حوالے کرنے ہی والی تھی۔" ناہید اسے دیکھ کر قدرے شوخی سے بولی تھی خاص ہدایت جو تھی۔ نوید عثمان ہولے سے ہنسا۔

"اپنی کمزوری آپ کے ہاتھ میں دے کر گیا تھا۔ واپس کیسے نہ آتا محترمہ!" وہ اب مطمئن تھا۔ تب ہی اس کی شرارت پر ہلکے پھلکے انداز میں جواب دیا۔

"ناہید نام ہے میرا۔" ناہید نے بے تکلفی سے ٹوک دیا۔

"بہت پیارا نام ہے تمہارا ناہید۔" وہ مسکرا کر ناہید والی ہی بے تکلفی سے بولا۔ وہ گھاس ڈال رہی تھی اور وہ گدھا بن گیا تھا۔

"نام تو واقعی اچھا ہے۔ مگر میری سہیلی کے ساتھ آپ نے اچھا نہیں کیا۔ بے چاری معصوم کو لاچار کر دیا۔" درحقیقت اس کی توجہ صوفیہ کی طرف مبذول کروانی تھی۔

"معافی کا خواستگار ہوں' عنایت کردیں۔"

نوید عثمان نے گہری نظروں سے صوفیہ کو دیکھا اور اس کی حسن پرست نگاہوں نے پہلی نظر میں ہی صوفیہ کو پسندیدگی کی سند دے دی۔

صوفیہ نے اس کی پرشوق نگاہوں سے گھبرا کر یکبارگی پلکیں جھکالیں۔ ادائیں دکھانے میں تو یوں بھی وہ ماہر تھی۔

"لیکن مجھے تو کسی سے کوئی گلہ نہیں ہے۔ دکھ تکلیف اللہ کی طرف سے آتی ہیں۔ یہ سب تو طے تھا شکایت کس بات کی ـــ ناحق کسی کو شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔" اس نے نظریں جھکائے جھکائے بڑا ہی معصومانہ لب و لہجہ اختیار کیا۔ نوید عثمان نے دلچسپی سے اس کے انداز ملاحظہ کیے۔

"آپ کی سہیلی تو بڑا خوب صورت اور نرم دل رکھتی ہیں۔ میں تو گرویدہ ہو گیا ان کی نرم دلی کا۔" وہ بڑی دلکشی سے مسکرایا۔

"میری سہیلی کا نام صوفیہ ہے اور پیار سے اسے صوفی بلاتے ہیں۔" ناہید نے اس کے بار بار آپ کی سہیلی کہنے پر ٹوکا۔ وہ اس کے شوخی بھرے انداز پر محظوظ ہوا۔

"تو پھر میرے لیے کیا حکم ہے ناہید!" وہ بات ناہید سے کررہا تھا مگر دیکھ صوفیہ کو رہا تھا۔ جو اس کے سوال پر حیرانی سے سر اٹھائے اسے دیکھ رہی تھی۔ ناہید بھی ناسمجھی سے اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"صوفیہ کہوں؟ یا پیار سے صوفی کہہ کر بلاؤں؟"

اس کی اگلی بات پر ناہید کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ صوفی بھی سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ مسکراتے ہوئے سر جھکا گئی۔

"پیار کا نام تو بہت قریبی لوگ لیتے ہیں اور صد حیف افسوس کہ آپ کا نام فی الحال قریب رہنے والوں کی فہرست میں کہیں نہیں ہے۔" ناہید کا جواب شرارت سے بھرپور تھا۔

"اسے میری کم نصیبی کے علاوہ کیا کہا جاسکتا ہے۔ ویسے یہ آپ کی منشا کہ اسے میری خواہش سمجھیں یا التجا ـــ مگر میں اس فہرست میں اپنا نام سب سے اوپر دیکھنا چاہتا ہوں۔" تیر بالکل نشانے پہ لگا تھا۔ ناہید اور صوفیہ دونوں کے دل میں لڈو پھوٹنے لگے۔

"آپ کی استدعا پر غور کیا جائے گا۔"

اسی وقت نفیسہ کے اندر آجانے سے گفتگو میں خلل پڑ گیا۔ ناہید نے مؤدب ہونے کی بھرپور اداکاری کی تھی۔

نوید عثمان نے انہیں اپنا رابطہ نمبر دیا تھا۔

"کبھی میری ضرورت ہو تو مجھے بلا جھجک کال کیجیے گا۔ آپ کے کام آکر مجھے خوشی ہوگی۔" شائستگی سے کہتا وہ ان لوگوں سے رخصت ہوا۔

کامیابی سے اپنے منصوبے کا پہلا مرحلہ مکمل ہو جانے پر وہ پانچوں بڑے مسرور تھے خاص کر نفیسہ اور صوفیہ۔



ہلکے ہلکے خنک موسم میں لہلہاتے پیڑ پودوں اور ہریالی کے درمیان بھی ایک عجیب سا حبس اسے محسوس ہو رہا تھا۔ ایک گھٹن سی مستقل طور پہ اس کے اندر ڈیرہ جمائے ہوئے تھی۔

لان میں ہلکی ہلکی نم گھاس پر "پش اپس" لگاتے ہوئے خنکی کے باوجود وہ پسینے سے بھیگ چکا تھا۔

سیدھے ہوتے اور مڑتے ہوئے اس کے دونوں بازوؤں کی سبز سبز رگیں ابھر آئی تھیں۔ اس کے جبڑے سختی سے ایک دوسرے پر جمے تھے۔ اس کی آنکھیں لہو رنگ ہو رہی تھیں۔ اس نے درد کی شدت ضبط کرنے کے لیے نچلا لب دانتوں میں دبایا۔ غالباً اس کے بازوؤں میں تکلیف بڑھتی جارہی تھی۔

لمبے چوڑے اوندھے وجود کو ہتھیلیوں اور پیروں کے پنجوں کے سہارے اوپر آسمان کی طرف دھکیلتے وہ اس بار شدید کرب سے گزرا اور اگلے ہی پل دھپ سے سینے کے بل گرا۔

اس کے بازو شل ہو گئے۔ اس نے حرکت کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا ـــ اسی وقت ڈور بیل بجنے لگی۔ وہ حیران ہوتا خاصی دقتوں سے اٹھا۔ بازوؤں میں درد شدید تھا۔

دروازہ کھلا تو سامنے رومیصہ کھڑی تھی۔ اس کی رگیں تن گئیں اور تاثرات برف ہو گئے۔

"ہائے!" وہ ہولے سے مسکرائی۔ اس کی آنکھوں میں یاسیت تھی۔

"کیوں آئی ہو؟" اس کا ازلی اکھڑ پن۔

"آئی کب ہوں؟" دروازے پر ایستادہ اس کے لمبے چوڑے وجود کو دیکھتے ہوئے جتا کر بولی تو وہ لمحہ بھر کے توقف سے پیچھے ہٹا۔

"میں کل بھی آئی تھی اور اس سے پہلے بھی، مگر تم نہیں تھے۔" وہ اس کے پیچھے پیچھے چلتی لان سے گزر کر اندر جانے تک بالکل عام سے انداز میں بات کررہی تھی۔ جیسے ان دونوں کے درمیان کوئی تلخ کلامی نہیں ہوئی۔ حالانکہ ابھی دو دن پہلے کی بات ہے جب اس شخص کے ہاتھوں وہ اچھی خاصی بے عزتی کروا چکی تھی۔ وہ اس سے اپنا ہر تعلق ختم کرچکا تھا۔ اس کے

باوجود وہ صبح صبح ہی اس کے گھر چلی آئی تھی تو کہنا پڑے گا کہ..... بہت بے غیرت تھی۔

ایک وحشت زدہ سی خاموشی اس پورے گھر میں رقصاں تھی۔ مگر رومیصہ کو پروانہ تھی۔

"آئی کیوں ہو؟" سوال دوبارہ اسی انداز میں آیا۔

"تمہیں پتا ہے میں کیوں آئی ہوں۔" وہ سر جھکا کر ہتھیلیاں مسلنے لگی۔

"تم کیوں میرے پیچھے پڑی ہو۔" وہ کٹھور پن سے بولا تھا۔ رومیصہ سن سی اسے دیکھنے لگی۔

کیا یہ وہی شخص تھا جو سارا سارا دن اس کے ساتھ بِتایا کرتا تھا۔ کئی کئی بار اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اظہار و اعتراف کر کے اسے اپنی محبت کا اعتبار دلایا کرتا تھا۔

"آئی لو یو۔" رومیصہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

"کافی پیو گی؟" اسے آداب میزبانی کا خیال آگیا۔

رومیصہ آنسوؤں بھری آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ لاپروائی سے کندھے اچکاتا کچن کی طرف چلا آیا۔

"میں نے کیا کیا ہے، جو تم اس طرح کر رہے ہو۔" وہ چیخ کر تیز آواز میں بولی۔

وہ کچن کی طرف جاتے ہوئے بھرپور انداز میں مسکرایا۔ یہی وہ چاہ رہا تھا شاید..... اس کی تڑپتی آواز اسے پرسکون کر رہی تھی۔

کچھ دیر بعد غالباً" وہ اس کی بے نیازی سے جھنجلا کر اس کے سر پہ آکھڑی ہوئی۔

"میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔" وہ اسے کنوینس کرنا چاہ رہی تھی۔

"مگر میں نہیں چاہتا۔" وہ کافی نکالنے لگا۔

"کیوں کیا کمی ہے مجھ میں؟ بولو۔" رومیصہ نے اس کا بازو پکڑ کر جھٹکے سے اس کا رخ اپنی طرف موڑا۔

"تم میں کوئی کمی نہیں ہے رومی!" وہ اس کے قریب کھڑی تھی۔ اس نے بہت عجیب سے لہجے میں کہا تھا۔ رومیصہ ایک لمحے کے لیے تھم سی گئی۔

"پھر کیا وجہ؟"

"تمہیں مجھ سے ڈر نہیں لگ رہا؟" گرم گرم بھاپ اڑاتی کافی کا مگ اس کے سامنے رکھتے ہوئے وہ عام سے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"نہیں۔ ہم دونوں پہلی بار تو تنہا اکیلے گھر میں نہیں ہیں۔ تم نے اکیلے میں کبھی خود سے میرے نزدیک آنے کی کوشش نہیں کی تو مجھے کیوں ڈر لگے گا۔"

"تمہارے پیرنٹس کو معلوم ہے کہ تم میرے گھر میں اس وقت....." اس نے گرم گرم کافی کا ایک گھونٹ لیا۔ کافی بہت بدمزا تھی، وہ اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکا۔

"ہاں! ان فیکٹ میں انہیں صاف صاف بتا چکی ہوں کہ تمہارے علاوہ کسی اور کو اپنا آپ سونپنے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتی۔" وہی ترغیبانہ، بے باکانہ انداز و اطوار سے آراستہ لب و لہجہ..... اور اس کا ضبط یہیں تک تھا۔ اگلے ہی پل اس نے گرم گرم بھاپ اڑاتی کافی رومیصہ کے منہ پر پھینک دی۔

"بے غیرت، بے حیا....." اس پر جنون اتر آیا۔

اس کے منہ سے گندے القابات کا طوفان امڈ آیا۔

رومیصہ کی دلدوز چیخ سارے گھر میں گونج گئی۔

اس کے بعد اس نے دونوں کپ اسے کھینچ مارے تھے اگر وہ بروقت پیچھے نہ ہٹتی تو ضرور بری طرح زخمی ہوتی۔ اس کا اشتعال کم ہونے میں ہی نہ آرہا تھا۔ وہ ادھر ادھر متلاشی نظریں دوڑانے لگا تھا، جیسے کچھ مل نہ رہا ہو اس کی منشا کے مطابق..... اس کی زبان مسلسل گالیاں اگل رہی تھی۔

"ادائیں دکھا کر لڑکوں کو رجھاتی ہے..... بے غیرت کمینی..... عزت تک کی پروا نہیں..... اکیلے گھر میں مردوں سے ملنے آجاتی ہے۔"

وہ ہر جملے کے آخر میں ایک موٹی سی گالی نتھی کر دیتا۔ اسی دم اس کی نظر کونے میں رکھے بڑے سے ڈیکوریشن پیس پر پڑی۔ میٹل کی ایک صراحی تھی۔

ایک گندی سی گالی دیتا اس کی طرف لپکا۔ رومیصہ دہشت زدہ ہو کر بھاگ کھڑی ہوئی اور وہ زمین پر بیٹھ کر اپنے پاؤں دیکھنے لگا۔ جہاں کافی کے مگ کے ٹوٹے کانچ

پیچھے تھے۔

☆ ☆ ☆

"پہلے اس مصیبت سے میری جان چھڑاؤ کسی طرح۔" صوفیہ نے ناہید اور نفیسہ کے سہارے اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ اشارہ اپنے پاؤں کے پلستر کی جانب تھا۔

"صبر کرو۔ ابھی کرتے ہیں کچھ اس کا بھی۔" نفیسہ نے احتیاط سے اسے بیڈ پر لٹایا۔

"دیکھو بیٹا! اب یہ تمہارے اوپر ہے کہ تم کیا کچھ کر سکتی ہو۔"

ناہید کی ماں ناصحانہ انداز میں کہتے ہوئے صوفیہ کے نزدیک آبیٹھی۔

"آج کل تو وہی لڑکیاں فائدے میں ہیں جو خود اپنے لیے ہاتھ پاؤں مارتی ہیں۔ ماں باپ بچارے کہاں تلاش کریں۔ لڑکے لڑکیوں کو ہی موقع دے دو..... اپنے لیے بہتر ڈھونڈ لیتے ہیں۔ آخر کو زندگی تو انہیں ہی گزارنی ہے نا..... میں نے تو ناہید کو اجازت دے دی اب دیکھو..... دو سال سے نبیل اس کے پیچھے دیوانہ ہوا پھر رہا ہے۔ اگلے ہفتے ماں بہنیں آنا چاہ رہی ہیں اس کی۔"

ناہید کی ماں نے جیسے خود ہی اپنی پیٹھ ٹھونکی۔ ناہید بھی مسکرائی آخر کار کارنامہ تو اسی نے انجام دیا تھا نا

—

"مگر ہر کوئی تمہاری اور ناہید کی طرح خوش قسمت تو نہیں ہوتا نا۔ تم جانتی ہو۔ صوفیہ کی ہر کوشش بے کار گئی اب تک..... میں تو مایوس ہونے لگی ہوں۔" نفیسہ کا لہجہ بہت تھکا ہوا تھا۔

"ارے نہیں....." ناہید کی ماں نفیسہ کے نزدیک کھسک آئی۔

"ناہید کو بھی کب پہلی بار میں ہی کامیابی ملی تھی۔ آٹھ، نو بار کوشش کے بعد نبیل ہاتھ آیا ہے۔" وہ بھرپور رہنمائی کر رہی تھی۔

"اور تم سنو!" ناہید کی ماں اب صوفیہ سے مخاطب تھی۔

"ایڑی چوٹی کا زور لگا دو۔ اتنا گھیراتنگ کرو کہ بچ کر کسی صورت نہ نکلے۔ مگر اس سے پہلے اس کے بارے میں اچھی طرح معلوم کر لینا۔ یہ نہ ہو کہ پہاڑ کھودو لو تو چوہا نکل آئے۔" صوفیہ نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

اور شب ڈھلے اپنے بستر پر دراز صوفیہ تصور کی آنکھ میں اپنے خوشگوار مستقبل کی جھلک دیکھتی مسکرا رہی تھی۔ اسے نوید عثمان کو اپنا اسیر کرنا تھا، اس طرح کہ وہ ادھر ادھر دیکھنے کے قابل ہی نہ رہے۔

☆ ☆ ☆

بیڈ پر نیم دراز صوفیہ کے سامنے ناہید بیٹھی موبائل ہاتھ میں لیے نمبر ملا رہی تھی۔

"ہیلو السلام علیکم....." ناہید نے بڑے جوش سے سلام جھاڑا۔

"وعلیکم السلام.....!" اگلی طرف سے بھی بڑا پرجوش جواب آیا۔

"نوید صاحب سے بات ہو سکے گی؟" ناہید نے احتیاطاً" تصدیق چاہی تھی۔

"زہے نصیب..... "غالباً" وہ مسکرا رہا تھا۔ ناہید کو سمجھنے میں دقت نہ ہوئی کہ وہ اسے پہچان چکا ہے۔

"کیسے ہیں جناب؟..... حال چال کیسے ہیں؟" ناہید مسکرائی۔

صوفیہ کی تمام حسیات بیدار ہو چکی تھیں۔ وہ سانس روکے ناہید کے ساتھ جڑ کر بیٹھی تھی۔

"اس خوشی کا حساب کیسے ہو؟
وہ جو پوچھیں جناب کیسے ہو؟"

اس کا کھنکتا لہجہ صوفیہ کو باغ باغ کر گیا۔

"یہ بتائیے کہ آپ کے یہاں عیادت کا رواج ہے کہ نہیں؟" بڑا لطیف سا طنز تھا۔

"بالکل ہے۔" نوید عثمان اچھی طرح محظوظ ہوا۔

"تو پھر کیوں ہفتہ بھر بعد بھی خبر نہ لی؟"

"میں نے سوچا عرض تمنا پر قبولیت کے دستخط ہوں گے تو مشیر خاص مجھے مطلع تو کر ہی دے گی..... یہی

سوچ کر صبر کے کڑوے گھونٹ بھرتا رہا۔"
"مزید ایک حماقت مجھ سے بھی سرزد ہوئی۔ آپ کا نمبر تو لیا نہیں تھا۔" نوید عثمان کی آخری بات پہ ناہید نے یوں ہونٹ سکیڑے جیسے بات سمجھ میں آگئی ہو۔
"ویسے کیسی ہیں وہ۔۔۔ آپ کی سہیلی؟" اپنے ذکر پر صوفیہ کے گال گلال ہوئے۔
"یہ تو آپ اسی سے پوچھیں۔۔۔" ناہید نے شرارت سے کھلکھلاتے ہوئے موبائل صوفیہ کے کان سے لگا دیا۔
صوفیہ خاموش رہی۔ وہ خاموشی سے بھانپ گیا تھا کہ اب لائن پر ناہید نہیں، صوفیہ تھی۔
"صوفیہ! یہ تم ہو نا؟" اس کے پوچھنے پر بھی صوفیہ نے کچھ کہا نہیں۔ اس کی بے چینی صوفیہ کو لطف سے دوچار کر رہی تھی۔

"کتنی دلکش ہے اس کی خاموشی
ساری باتیں فضول لگتی ہیں"

نوید عثمان کا گمبھیر لہجہ صوفیہ کے دل کے تار چھیڑ گیا۔ وہ بے اختیار مدھر سی ہنسی ہنس دی۔
آدھے گھنٹے بعد نوید عثمان نے یہ کہہ کر فون بند کیا کہ "میں رات میں کال کروں گا۔ ویٹ کرنا۔۔۔" اور صوفیہ کی آنکھوں میں رنگین خوابوں کی بارات اتر آئی۔
پھر نوید عثمان کے نزدیک ہونے میں صوفیہ کو زیادہ وقت نہ لگا۔
پندرہ دن میں کوئی رات ایسی نہ گزری ہو گی جب دونوں بنا ہم کلام ہوئے سوئے ہوں۔ کوئی ایسی صبح نہ ہوئی جس میں دونوں نے ایک دوسرے کو صبح بخیر نہ کہا ہو۔ کوئی ایسی دوپہر نہ گئی جس میں صوفیہ کو "مس یو" کا سندیسہ نہ ملا ہو۔ غرض کوئی ایسی ساعت نہ بیتی جس میں دونوں نے ایک دوسرے کو فراموش کیا ہو۔۔۔
اپنے مقصد کی تکمیل پر صوفیہ کے پاؤں زمین پہ نہ پڑتے تھے۔ وہ نوید عثمان کو ملتفت کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ نفیسہ کو بھی یک گونہ اطمینان ہو چلا تھا کہ اس بار تو صوفیہ کے ناؤ کنارے لگی ہی لگی۔

نوید عثمان دو ایک بار ان کے گھر بھی آیا تھا فقط تھوڑی دیر کو، اور اس تھوڑی دیر میں بھی وہ ایک زبردست تاثر چھوڑ گیا تھا۔ اپنے ساتھ تکلفاً لائے سامان سے اس کی مالی حیثیت کا بھی اندازہ خوب ہو رہا تھا۔
نوید عثمان نے اپنے بارے میں فقط اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ بہاول پور کا رہنے والا ہے۔ چند سال قبل وہ اپنی ماں کے ساتھ کراچی آیا ہے۔ اس کے والدین وفات پا چکے تھے۔ ایم بی اے کرنے کے بعد اب ایک بہت اچھی کمپنی میں زبردست پوسٹ پر کام کر رہا ہے۔ تنہا ہے۔ بہاول پور میں اس کے باپ کی زمین اور جائیداد ہے جسے آج کل وہ فروخت کرنے کی کوشش میں ہے۔ نوید عثمان کا ذاتی مکان کراچی کے مہنگے علاقے میں تھا۔ وہ واقعی بہت مالدار اور صوفیہ کے لیے بہت آسان شکار ثابت ہوا تھا۔
صوفیہ کی حاصل شدہ معلومات کی تصدیق ناہید کے ابا نے کروالی۔
"کیسی طبیعت ہے؟" نوید عثمان نے احتیاط سے موڑ کاٹا تھا۔
"پتا نہیں۔۔۔" وہ سو کر اٹھی تھی شاید۔ ایک تو آواز بوجھل اس پر اس کا بے زار انداز۔
"کیا ہوا خیریت ہے نا۔۔۔ چیک اپ کے لیے گئی تھیں؟" وہ فکر مند ہوا۔
"ہاں گئی تھی۔" ویسا ہی منہ پر مارا جواب۔
"ناراض ہو؟" بڑے پیار سے پوچھا گیا۔
"نہیں ہونا چاہیے؟" جواب بھی سوال میں آیا۔
"میری جان! اتنا ناراض ہو گی تو پیار کا اظہار کیسے کرو گی؟" نوید عثمان بے باک ہوا۔
"نوید۔۔۔!" تنبیہا" پکار میں شرمیلی سی مسکان کی آمیزش تھی۔
"اچھا، فائن! بولو ناراض کیوں ہو۔" نوید عثمان نے بات بدلی۔
"میں بتاتی ہوں۔" ناہید، صوفیہ کے ہاتھ سے موبائل اچک چکی تھی۔

"میں ہمہ تن گوش ہوں۔" وہ گاڑی کی رفتار دھیمی کیے پر سکون سا باتوں میں مصروف تھا۔
"آپ گزشتہ دو مہینوں میں فقط دو مرتبہ گھر آئے، وہ بھی ذرا سی دیر کو۔ حال چال پوچھ کر چل دیے۔ یہ کوئی بات ہے بھلا؟" ناہید نے سہولت سے بات اس کے گوش گزار کی۔
"تو پھر کیا کرتا۔ انکل آنٹی کے سامنے بات ہی نہیں ہو پاتی۔" انداز بے چارگی سے بھرپور تھا۔
"تو جناب! ہم آخر کس مرض کی دوا ہیں۔ آپ وقت نکالیے۔ ہم موقع تراشتے ہیں۔ اتنا تو ہمارے بس میں ہے۔" ناہید بھی شریر ہوئی۔
آدھے گھنٹے بعد وہ دونوں پزا اڑا رہی تھیں، جو نوید عثمان نے ان کے گھر بھجوایا تھا۔



آج اس کی بے چینی کا حساب ہی نہ تھا۔ نہ جانے کیا جنون اندر ابل رہا تھا کہ دنیا بھر کو تہس نہس کر دینے کی شدید خواہش اسے بے قرار کیے دے رہی تھی۔ تھک کر وہ سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ چاروں سمت دہشت زدہ خاموشی تھی مگر سیڑھیوں پر سر ہاتھوں میں گرائے بیٹھے وجود کا ذہن آوازوں کی بازگشت سے چیخنے لگا تھا۔
وہی آوازیں جو دن بھر اس کے اعصاب سے کسی آسیب کی طرح چمٹی رہی تھیں۔ مگر دن تو مصروفیت کی آغوش میں منہ چھپائے جیسے تیسے گزار ہی لیا کرتا تھا لیکن رات ہوتے ہی وحشتوں کے گدھ اس کے بے جان جذبات کو احساسات کو نوچنے کھسوٹنے لگتے اور وہ انتہائی غیظ و غضب میں آکر خود کو اذیت دینے لگتا سکون تو اس میں بھی نہ تھا مگر اس کی قنوطیت کو تھوڑا بہت قرار ضرور آنے لگتا۔
وہ مٹھیوں میں اپنے گھنے سیاہ بالوں کو بھینچتا شدید مضطرب تھا۔ اس کے اطراف آوازوں کا دھواں پھیلتا ہی جا رہا تھا۔
"میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں۔" ماما کی آواز رندھی ہوئی تھی۔
"تم حکم تو کرو۔ تمہارے ایک اشارے پر میں کیا نہیں کر سکتی۔" الوینہ کی آنکھیں مخمور تھیں۔
"تمہاری کوئی اور ڈیمانڈ ہو تو بتاؤ۔" رومیصہ اس کے بہت نزدیک کھڑی تھی۔
اور بہت ساری آوازوں میں وہ آواز خاصی واضح تھی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی کان لگا کر توجہ سے سننے لگا۔
"تم نے ابھی مجھے انگیجمنٹ رنگ پہنائی، وہ بھی ایسے کہ میرا ہاتھ پکڑا تک نہیں۔"
"تو تم کیا چاہ رہی تھیں۔" وہ مسکرایا تھا۔
"تم اچھی طرح جانتے ہو۔" اس کی مدھر سی ہنسی ارد گرد بکھر گئی۔
"نہیں میں نہیں جانتا۔" وہ غالباً" اسے چھیڑ رہا تھا۔
"تو پھر انجان ہی رہو۔" وہ ہلکی سی خفگی کے ساتھ ذرا سا رخ موڑ گئی۔ وہ بے اختیار ہنس پڑا۔
"اچھا، بات سنو۔۔۔" اس نے اس کی کلائی تھام لی۔
اور شاید ایسا پہلی اور آخری بار ہوا تھا کہ وہ کسی بھی لڑکی کے از خود اس قدر نزدیک ہوا تھا۔
وہ ایک جھٹکے سے اٹھا۔ اس کی سانس بے ربط ہو رہی تھی۔ اس کے بازوؤں پر نرم و نازک پر حدت وجود کا لمس دہکنے لگا تھا۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر آئے اور اس کی آنکھیں لہو رنگ ہو گئیں۔ اس نے جبڑے اتنی سختی سے بھینچے کہ کنپٹی کی رگ ابھر آئی۔ وہ قدموں میں زور دار دھمک پیدا کرتا اپنے کمرے میں گیا تھا۔
بیڈ کی سائیڈ دراز سے سرنج نکالی اور کلائی سے اوپر گوشت میں چبھو دی۔ دھیرے دھیرے اس کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑنے لگے۔



شام کے سات بجے کا وقت ہو گا جب نوید عثمان

صوفیہ کے گھر کے باہر کھڑا گھنٹی بجا رہا تھا۔ بلو جینز پر سیاہ آدھے بازوؤں کی شرٹ پہنے وہ بہت نکھرا اور بہت مسرور سالگ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ شاپرز تھے۔

کچھ دیر انتظار کے بعد دروازہ وا ہوا تو ناہید کی صورت دکھائی دی۔ صاحب سلامت کے بعد اندر آتے ہوئے اس نے وہ سارے شاپرز ناہید کو تھمائے اور دائیں بازو پہ دھرا سرخ گلابوں کا گلدستہ دوسرے بازو پر منتقل کیا۔

"اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔" ناہید نے رسمی سی شرمندگی کا اظہار کیا تھا۔ وہ مسکرا دیا۔

آج نفیسہ، اور ناہید کی ماں کو کسی سے ملنے جانا تھا اور ناہید کا باپ حسب معمول اسٹور پر گیا تھا۔ اس لیے ناہید نے نوید عثمان کو ان تینوں کی غیر موجودگی میں بلایا تھا۔

ایسا نہیں تھا کہ نوید عثمان کے گھر آنے کی خبر ان تینوں غیر موجود اشخاص کو نہ تھی۔ بلکہ ان تینوں نے خود ہی صوفیہ کو موقع فراہم کیا تھا۔ نوید عثمان کو یہی بتایا گیا تھا کہ وہ تینوں اس کی آمد سے لاعلم ہیں۔

صوفیہ کافی ٹھیک ہو چکی تھی۔ اس کا زخم مندمل ہو چکا تھا۔ لیکن پھر بھی نوید عثمان کی وجہ سے وہ اپنے بیڈ پر یوں بیٹھی تھی جیسے ابھی تک بیڈ ریسٹ پر ہو۔ نقلی پلستر تو وہ دوسرے دن ہی کھلوا چکی تھی۔ اب نوید عثمان کی وجہ سے وہ اپنے پیر پر کپڑوں کی بہت ساری تہیں لپیٹ کر بیٹھی تھی۔ اوپر سے چادر ڈال دینے کے بعد یوں محسوس ہوتا جیسے پلستر چڑھا ہوا ہو۔ کمر تک چادر ڈالے، تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھی صوفیہ نے سیاہ اور آسمانی امتزاج کا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ ہلکی سی گلابی لپ اسٹک سے مزین اس کے لب اور کلائیوں میں کھنکتی چوڑیاں... خصوصی اہتمام نوید عثمان کے لیے تھا۔ سر پہ دوپٹا یوں تھا کہ آدھے سے زیادہ بال دکھائی دے رہے تھے۔ گلابی رخسار پر جھولتی لٹ کو انگلی سے لپیٹ لپیٹ کر بل دے رکھا تھا۔

کمرے میں داخل ہوا تو پہلی نگاہ صوفیہ پر ہی پڑی اور ظاہر ہے پھر وارفتگی عود کر آئی۔ اس کی نظروں کا ارتکاز محسوس کر کے وہ سر جھکانے لگی تھی۔

"میرا خیال ہے میں کباب میں ہڈی نہ بنوں۔" ناہید نے کھنکھارتے ہوئے اپنی موجودگی کا احساس دلایا تھا۔ گلدستہ صوفیہ کے ہاتھ میں تھماتا نوید عثمان کھل کر مسکرایا تھا۔

"تمہارا خیال بالکل درست ہے۔" ناہید بڑے زور سے ہنسی تھی۔ صوفیہ نے محجوب نگاہ اٹھائی وہ ہنوز بے خود سا اسے دیکھے جا رہا تھا۔

"کیسے ہیں آپ؟" اس کی نظروں کا ارتکاز توڑنے کی موہوم سی کوشش میں سوال داغ دیا۔

"بہت خوش۔" وہ اس کے نزدیک رکھی کرسی پہ بیٹھا ہوا تھا۔ صوفیہ اس کے دیے گلابوں کی مہک سانسوں میں اتارنے لگی۔

"لوگ ناراض تھے ہم سے کیسے... گلے دور ہوئے یا نہیں؟" وہ شرارت سے کہتا اپنے ہی گھٹنوں پر اپنی ہی کہنیاں جما کر اس کے قریب جھکا۔

"آپ گلے دور کرنے آئے ہیں؟" صوفیہ نے پلکوں کی گھنی جھالر ایک ادا سے اٹھائی پھر گرائی۔ نوید عثمان کی نگاہیں نثار ہو گئیں۔

"نہیں۔ تمہیں دیکھنے۔" وہ لگاوٹ سے بولا۔

"کیسی ہو تم!" وہ اس کی حالت پہ محظوظ ہو رہا تھا۔

"نظر نہیں آ رہی؟" وہ ادائے نخوت سے ناک سکیڑ کر بولی۔ نوید عثمان کا قہقہہ بہت بے ساختہ تھا۔ وہ اس کے مسلسل دیکھنے پر طنز کر رہی تھی۔

کھٹی میٹھی باتوں میں وقت گزرنے کا احساس نہ ہوا خاصی دیر شربت دید مع گفت و شنید سے سیراب ہونے کے بعد نوید عثمان بڑا مسرور و سرشار سا لوٹا تھا۔ اس دن صوفیہ کا دل سچ مچ مدہوش ہو رہا تھا۔ اس نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ وہ کبھی نوید عثمان جیسے لڑکے کی منظور نظر ٹھہرے گی۔ کون سی ایسی خوبی تھی جو اس میں نہ تھی۔ پڑھا لکھا، برسر روزگار، مردانہ وجاہت کا شاہکار، اچھی خاصی قابل قدر جائیداد کا تنہا وارث... یہ اضافی خوبی تھی کہ نوید عثمان کے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ صوفیہ کو ہمیشہ لڑکے کی ماں تو کبھی بہن یا بھابھی نے مسترد کیا تھا۔ اب بہت اچھا تھا کہ نوید

عثمان کا کوئی رشتہ دار خاص کر خاتون رشتہ دار اس کے قریب نہ تھیں، ورنہ ضرور صوفیہ کے لیے مشکلات کھڑی ہوتیں۔

نوید عثمان کو ملتفت کرتے کرتے وہ خود اس کے دام میں گرفتار ہو چکی تھی۔ اتنا تو وہ جان ہی چکی تھی کہ نوید عثمان بہت نرم فطرت، خوش مزاج اور محبت کرنے والا شخص ہے۔

اس دن کے بعد بھی وہ اکثر اوقات نفیسہ وغیرہ کی (دانستہ) غیر موجودگی میں صوفیہ سے ملنے آتا رہا تھا۔ مگر کبھی اس نے موقع کا فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کی تھی۔ یہی چیز صوفیہ کی نظروں میں اس کا مقام بلند کرتی تھی۔ آخری مرتبہ وہ صوفیہ سے ملنے آیا تو ایک خوب صورت سا لباس تحفتاً لے کر آیا تھا۔ آتشی گلابی رنگ کا وہ لباس صوفیہ کو بے حد بھایا۔ نوید عثمان نے کہا تھا۔

"جب تم اس بستر سے اٹھ کر اپنے پیروں پر چلنے لگو تو یہ لباس زیب تن کرنا۔ میں تمہیں ایک بھرپور لڑکی کی طرح دیکھنا چاہتا ہوں۔"

اور وہ منتظر تھی کہ کب وہ دن، وہ لمحہ اس کی زندگی میں آئے گا جب وہ اس لباس کو زیب تن کرے گی۔ کب نوید عثمان کی بھرپور سراہتی نگاہ پورے حقوق کے ساتھ اس کے وجود سے لپٹ کر اسے محجوب کرے گی۔

دن رات خوش رنگ خوابوں کے اوڑھنے بچھونے میں سر منہ لپیٹے پڑی صوفیہ کے لیے جن دنوں نوید عثمان کے علاوہ کوئی اور چیز قابل توجہ نہ رہی تھی۔ انہی دنوں ایک قدرے مناسب پروپوزل کا ذکر نفیسہ نے اس کے سامنے کیا مگر اس نے پوری بات سنی تک نہیں۔

"ہے تو کم عمر مگر دو بچوں کا باپ ہے۔ بیوی کا انتقال دوسری بچی کی پیدائش پر کچھ پیچیدگیوں کے سبب ہوا۔ تمہاری خواہش مند ہیں صولت بھابھی۔ اچھے خاصے کھاتے پیتے لوگ ہیں اور سب سے بڑی بات لڑکا ——"

"امی! خدا کے لیے۔ آپ اب کسی اور کی بات نہیں کریں، انکار کر دیں۔"

صوفیہ نے تنک کر ان کی بات کاٹ دی تھی۔ اس کی اڑان آج کل بہت اونچی تھی اور اونچائی سے جھک کر نیچے دیکھنا اب اسے مشکل لگنے لگا تھا۔

"مگر صوفی...... مجھے بہت مناسب لگ رہا ہے۔ دیکھ لیتے ہیں ادھر بات بنتی نظر آ رہی ہے۔ صولت بھابھی تمہیں اچھی طرح جانتی ہیں۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں۔" نفیسہ نے اسے رضامند کرنے کی کوشش کی تھی۔

"جب ایک بہترین آپشن میرے پاس ہے تو پھر میں مناسب کے چکر میں کیوں پڑوں، جانے دیں مجھے نہیں دلچسپی اس پروپوزل میں۔ آپ انکار کہلوا دیں۔" صوفیہ نے نخوت سے سر جھٹکا۔

نفیسہ اچھی طرح سمجھ رہی تھی کہ نوید عثمان تک پہنچنے کے راستے میں کئی "کٹھنائیاں"، کئی مشکلات اور کئی مفروضے ہیں جو غلط بھی ہو سکتے ہیں۔ پھر ضروری بھی نہیں کہ جیسا وہ سب سوچے بیٹھے ہیں ویسا ہو بھی جائے۔ مگر صوفیہ کو کس طرح سمجھایا جائے......؟

نفیسہ چپکی ہو رہی۔ وہ چاہتی تو صوفیہ کو سمجھا سکتی تھی مگر جس راستے پر چلنے کی ترغیب اسے نفیسہ نے دی اور حتی الامکان اس پر چلنے میں مدد بھی کی اب بھلا کیسے اس راستے سے اسے پلٹنے کا کہتی۔

☼ ☼ ☼

"آپ کے کیا ارادے ہیں بھئی! کب تک تنہا، کنوارے اور بے چارے رہیں گے۔ کہیں تو میں تلاش کر دوں کوئی گوہر نایاب۔"

عاصم کی بیوی نے "مذاقاً" کہا تھا مگر اسے مذاق میں کہی بات گویا تازیانہ بن کر لگی تھی۔ وہ ضبط کر گیا۔ ورنہ دل تو چاہ رہا تھا کہ ہاتھ میں پکڑی کھانے کی پلیٹ سامنے کھڑی بجی سنوری لڑکی کے منہ پر دے مارے۔

عاصم اس کے ساتھ کام کرتا تھا۔ ابھی چند ماہ قبل ہی اس کی لو میرج ہوئی تھی وہ اتنا قریب کسی سے نہ تھا۔ مگر عاصم زبردستی اس کے گریز کی پروا نہ کرتے

ہوئے اس کے سر پہ سوار رہتا تھا۔ ابھی بھی وہ بار بار اصرار کے بعد عاصم کی بیوی کی برتھ ڈے پارٹی پر آنے کے لیے تیار ہوا تھا اور یوں بھی وہ قطعی اپنے کسی رد عمل سے کسی کو اپنی دگرگوں حالت کا ادراک نہ ہونے دیتا کہہ سکتے ہیں کہ وہ بہت اچھا اداکار تھا جب ہی ضبط کر کے بڑی خوب صورتی سے مسکرانے لگا۔

"ارے ارے زری! اسے تلاش کرنے کی خاص ضرورت نہیں ہے۔ کم از کم بھی بارہ تیرہ گرل فرینڈز محترم کی لسٹ میں ہیں۔"

عاصم بھی اس کی مسکراہٹ دیکھ کر چھیڑنے سے باز نہ رہ سکا۔ وہ ہنوز بے نیازی سے مسکرا کر اپنی پلیٹ پر توجہ دینے لگا۔ ان دونوں کی باتوں کا کوئی نوٹس بظاہر نہ لینے کے باوجود اس کا موڈ سخت خراب ہو چکا تھا۔ وہ کس طرح اپنے خراب موڈ پر ناسازی طبع کا پردہ ڈالتے وہاں سے نکل آنے میں کامیاب ہوا یہ الگ بیان...... مگر وہاں سے آنے کے بعد جو اس کی حالت ہوئی ہے وہ ضرور قابل رحم تھی۔

عاصم نے غلط نہیں کہا تھا۔ گرل فرینڈز تو اس کی نہ جانے کتنی تھیں مگر شادی کے نام سے وہ کوسوں دور بھاگتا تھا۔

یہ ذکر سنتے ہی وہ حواس کھونے لگتا۔ اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی تھی۔ دل چاہتا دنیا الٹ پلٹ کر دے۔

ایسا ادھورا پن تھا اس کی ذات میں، جس نے اس کے اندر کے انسان کو موت کی نیند سلا دیا تھا اور اس انسان کے ساتھ ہی اس کی ساری حسیات بھی مر چکی تھی۔

اس کے بازوؤں میں، سینے پہ، سامنے کی طرف بے تحاشا کٹ لگے تھے۔ وہ واقعی جنونی تھا۔

اس کا چہرہ بالکل سرد تھا۔ اس کے تاثرات برف تھے۔ کوئی اضطراب، کوئی پریشانی، کوئی تکلیف وہ احساس اس کے کسی عمل سے ظاہر نہ ہو رہا تھا۔

وہ اپنے بدن کو یوں کاٹ رہا تھا جیسے کٹنگ بورڈ پہ رکھی کوئی سبزی ہو...... جب کاٹتے کاٹتے اس کا ضبط جواب دینے لگا تو وہ بلیڈ وہیں پھینک کر کچن میں چلا آیا۔

کیبنٹ کھول کر نمک کا جار نکالتے ہوئے اس کے ہاتھوں سے رستا خون کچن کے سفید ماربل پر سرخ سرخ قطروں کی صورت داغ بنا رہا تھا۔ مٹھیوں میں نمک بھرتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اگلے ہی پل وہ سارے زخموں پہ نمک ملتا دیوانوں کی طرح تڑپ رہا تھا۔

انتہائی تکلیف کے بعد وہ مسرور ہونے لگا تھا۔ اس کے اندر کے وحشی کو قرار آنے لگا تھا۔ وقتی ہی سہی سکون آمیز کیفیت اس کے لیے سہارا بننے لگی تھی۔ وہ بے دم سا ہو کر لاؤنج کے صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

وہ ابھی ابھی نہا کر نکلی تھی۔ گیلے بالوں کی لٹوں کے سرے پر ننھے ننھے پانی کے قطرے شفاف موتیوں سے مشابہ تھے۔ وہ ہولے ہولے گنگنا رہی تھی۔ اس کے ستھرے نکھرے دلنشیں چہرے پر رت جگے کا خمار ہلکورے لے رہا تھا۔

اس نے وہی آتشی گلابی لباس زیب تن کر رکھا تھا جو نوید عثمان کا اس کے لیے لایا گیا اولین تحفہ تھا۔

اس کے بھرے بھرے لبوں پر چمکیلی آتشی لپ اسٹک بہت اٹھ رہی تھی۔ اس پر اس کا حجاب آمیز انداز میں مسکرانا، لجانا...... وہ واقعی خوب صورت تھی یا شاید چاہے جانے کے احساس نے اس کے حسن کو مزید نکھار دیا تھا...... جو بھی تھا مگر آئینہ کہہ رہا تھا نوید عثمان اس کی موہنی صورت دیکھ کر اس کی لنگڑاہٹ نظر انداز کر دے گا۔

وہ آنے والا تھا۔ نوید عثمان کی اطلاع کے مطابق چند دن قبل صوفیہ کا پلستر کھلا تھا۔ وہ چل پھر رہی تھی کسی حد ٹھیک تھی۔ نوید عثمان صوفیہ سے ملنے آنے والا تھا۔ اس کو یہی بتایا گیا تھا کہ حسب توقع ناہید کی ماں اور نفیسہ دونوں گھر پہ نہیں ہیں اور ناہید کا باپ اپنے اسٹور پر ہے لہٰذا گھر میں اس وقت صرف ناہید اور

صوفیہ ہی موجود تھیں۔

نوید عثمان کے بیل بجانے پر آج دروازہ صوفیہ نے کھولا تھا۔ براؤن رنگ کے شلوار قمیص میں وہ بہت شاندار، ترو تازہ سا کھڑا مسکرا رہا تھا۔

صوفیہ کی دھڑکن تیز ہوئی۔ اب نجانے کیا ہونے والا تھا۔ اس کا دل سہم سہم کر سکڑ رہا تھا۔ وہ اندر آچکا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں حسب معمول صوفیہ کے لیے گلابی پھولوں کا ترو تازہ گلدستہ تھا۔ اس کے اندر آنے پر وہ پلٹ کر دروازہ بند کرنے لگی وہ دانستہ وقت لگا رہی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ آتے ہی نوید عثمان کو یہ دردناک خبر دے دے۔

اس نے تھوڑی سی ہمت کی اور خود کو تسلی دی۔

اسی اثنا میں ناہید بھی وہیں آگئی۔ اس نے ہمیشہ کی طرح ناہید کے ہاتھ میں بہت سارے شاپرز تھمائے۔ جو اس نے خوش دلی سے شکریہ ادا کرتے ہوئے تھام لیے۔ وہ دونوں آپس میں باتیں کرتے آگے پیچھے چلتے اندر چلے گئے۔

نوید عثمان نے پلٹ کر صوفیہ کو دیکھنے کی کوشش نہ کی تھی۔ وہ مطمئن تھا غالباً" کہ صوفیہ سے تنہائی میں ملاقات کا بھرپور موقع ملے گا" پھر اتاؤلے پن کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے بھلا... گھبرائی گھبرائی سی صوفیہ وہیں کھڑی شش و پنج کی کیفیت میں تھی۔

"ابھی تک ادھر کھڑی ہو۔ جلدی سے اندر آجاؤ۔" ناہید نے اس کے ہاتھ تھپتھپا کر ہوش کی دنیا میں کھینچا۔

ناہید کے اشارے پر وہ لنگڑاتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔

نوید عثمان یک بیک اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں حد درجہ استعجاب سے بھر گئیں۔ صوفیہ کی لنگڑاہٹ بالکل واضح تھی۔ نوید عثمان حیران سا معلوم ہو رہا تھا۔

"یہ کیا ہوا ہے۔ تمہارے پاؤں میں ابھی تکلیف ہے کیا؟" اس نے بے ساختگی سے پوچھا تھا۔

وہ گھبراہٹ میں بول ہی نہیں پا رہی تھی۔ حالانکہ کئی دن سے خود کو اس وقت کے لیے تیار کر رہی تھی مگر اس وقت تو جیسے سب ذہن سے محو ہونے لگا تھا۔

صوفیہ نے گہری سانس بھری... جیسے حوصلہ و ہمت کشید کیا ہو۔

وہ جانتا تھا اس کا پلستر کچھ دن پہلے کھلا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ پلستر یا میں پیر میں ہی تھا۔ وہ نادان نہیں تھا کہ پلستر کھلنے کے بعد لنگڑاہٹ کا مطلب نہ سمجھتا... مگر پھر بھی وہ اپنے اندازے کی تصدیق چاہ رہا تھا۔

"پلیز، کچھ بولو تو؟"

"نوید! آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں نا؟" وہ سہمی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے گلے میں آنسوؤں کا پھندا پڑا تھا۔ اس کا دل سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ نجانے وہ آگے کیا بولے؟

دوسروں کو فریب دینے والی صوفیہ کو اس کے دل نے ہی دغا دیا تھا اور اب دل کے ہاتھوں فریب کھا کر صوفیہ کسی اور کو فریب دینے کے قابل نہ رہی تھی۔

آج اسے نوید عثمان کے سامنے خود کو دانستہ آبدیدہ نہ کرنا پڑا۔ آج سب کچھ خود بخود ہو رہا تھا۔

"یہ کیسا سوال ہے صوفی... مجھے بتاؤ یہ ہوا کیا ہے؟ پلستر کھلنے کے بعد یہ سب... تم نے پہلے تو نہیں بتایا تھا۔" وہ اچنبھے سے پوچھ رہا تھا۔

صوفیہ کی آنکھوں میں پانی در آیا۔ بڑی بے ساختگی سے پلکیں جھپکتی وہ بہت معصوم لگی تھی۔

"پہلے ڈاکٹر نے کہا تھا فزیکل تھراپی سے ٹھیک ہو جائے گا... مگر آج ڈاکٹر نے مکمل مایوسی ظاہر کر دی نوید... یہ نقص اب ساری زندگی میرے پیروں سے لپٹا رہے گا مم، میں..." وہ بولتے بولتے پھر گلا رندھ جانے کی وجہ سے بات مکمل نہ کر پائی تھی۔

نوید عثمان سمجھ رہا تھا کہ وہ اپنے پیر کے نقص کے باعث سراسیمہ ہے۔ مگر صوفیہ کسی اور ہی سوچ میں تھی کہ اگر وہ سب کچھ نہ ہو سکا جو سب نے سوچ رکھا ہے۔ تو وہ کیا کرے گی۔ نوید عثمان سے دوری کا خیال اسے رلانے لگا۔

"تم پریشان کیوں ہو رہی ہو؟ ریلیکس یار! میں تمہیں کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس لے چلوں گا۔ تمہارا ٹھیک سے علاج ہو گا اینڈ یو ول بی فائن۔" وہ اس کے تھوڑا نزدیک آیا تھا۔

"نوید!" وہ بے اختیار اس کے سینے سے لگی تھی۔

نوید عثمان کے چہرے پر سایہ سا لہرایا۔

"صوفی!" نوید عثمان نے اس کے گرد حصار باندھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ ہنوز بے خودی سی روئے جا رہی تھی۔

"صوفی!" نوید عثمان نے اس کے شانوں پر ہتھیلیاں یوں بچھائیں گویا اسے خود سے الگ کرنے کا ارادہ ہو۔ روتی ہوئی صوفیہ نے اسی لمحے اس کے اردگرد اپنی نازک بانہوں کا گھیرا بنا دیا۔ پتا نہیں وہ کس جذبے کے زیر اثر تھی۔ نوید عثمان کی رنگت متغیر ہونے لگی۔

"ہوش میں آؤ صوفی!" اس نے ہولے سے پکارتے ہوئے اسے کاندھے سے پکڑ کر ہلکا سا جھنجھوڑا مگر وہ ہچکیاں بھرتی سابقہ حالت میں اس سے لگی ہوئی تھی۔

وہ جانتی تھی اس کا پاؤں کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ اس کے پیر کا نقص پیدائشی تھا۔ اب وہ کوئی بڑا سرجن کنسلٹ کر لیتے تو نوید عثمان کے سامنے بھانڈا پھوٹ جاتا اور وہ ایسا کبھی نہیں ہونے دیتی۔

"یہ نقص اب کبھی ٹھیک نہیں ہو گا نوید! یہ ٹھیک نہیں ہو گا۔ مجھے اب ساری عمر اسی طرح رہنا ہے۔ ڈاکٹر نے قطعی جواب دے دیا ہے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا... اگر اس وقت ہی کوئی بڑا سرجن کنسلٹ کر لیتے تو یہ نوبت ہی نہ آتی۔ اس ڈاکٹر کی ناتجربہ کاری نے مجھے اس حال میں پہنچا دیا... نوید! آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں نا... بولیے نا۔ آپ میری اس خامی کے ساتھ بھی مجھے ایکسیپٹ کریں گے نا؟ آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں نا۔ مجھ سے شادی کریں گے نا؟"

وہ بلکتی ہوئی نہ جانے کیا کیا بولنے جا رہی تھی اور نوید عثمان کے تو حواس گم ہونے لگے۔ وہ سن رہ گیا۔ وہ اس کی کوئی بات نہیں سن رہا تھا۔ دو مہینے کی نومولود محبت آخری ہچکیاں بھر رہی تھی، وہ اسے خود سے دور کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ کسی طرح الگ ہونے کو تیار نہ تھی۔

"صوفی! یہ کیا بچپنا ہے؟ ہٹو پیچھے!" اس کے ضبط کا پیمانہ چھلک گیا تھا۔

"پہلے آپ کہیں۔ آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں نا۔ مجھ سے شادی کریں گے نا؟" وہ اس سے علیحدہ ضرور ہوئی تھی مگر دور نہیں۔ نوید عثمان کے چہرے پر سختی ابھر آئی۔ صوفیہ کی پرامید نگاہوں نے اس کے چہرے کا احاطہ کر رکھا تھا۔

"میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔" وہ اسے پیچھے دھکیلتے ہوئے خود بھی دو قدم پیچھے ہٹا تھا۔ صوفیہ دھک سے رہ گئی۔

"کیوں؟ مجھ سے محبت نہیں رہی اب؟" وہ متحیر سی بول رہی تھی۔ حالانکہ صورت حال متوقع تھی مگر یہ خوش فہم دل...

"محبت شادی سے مشروط ہوتی ہے؟"

"ہاں! میں آپ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی مگر میں مرنا نہیں چاہتی۔" وہ تڑپ ہی گئی تھی۔

"اس سب کے باوجود میرے پاس تمہارے سوال کا جواب منفی ہے۔" وہ اس کی طرف دیکھنے سے احتراز برت رہا تھا۔

"کیوں؟" وہ زور دیتی اس کے بالکل سامنے آئی۔

نوید عثمان کے اعصاب تن گئے۔

"وجہ...؟" اس نے دو چار گہری گہری سانسیں بھری تھیں۔ صوفیہ ہنوز سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"ابھی بھی تمہیں "وجہ" بتانے کی ضرورت ہے؟" نوید عثمان نے اوپر سے نیچے تک اسے بغور دیکھا تھا۔ انداز تمسخرانہ تھا۔

"نوید! مم... میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں آپ سے محبت کرتی ہوں پلیز۔" وہ بے قراری ہو کر پھر اس کے نزدیک آئی تھی۔

"اسٹاپ اٹ صوفیہ...!" وہ ہاتھ اٹھا کر روکتے ہوئے بولا تھا۔ صوفیہ تھوڑی دور ہی تھم گئی۔ اس کی

آنکھوں میں کیسی اجنبیت در آئی تھی۔
"میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔ تم جانتی ہو کیوں، ڈیٹس انف!" نوید عثمان دروازے کی طرف بڑھا تھا۔
"نوید، نوید۔۔۔ پلیز یوں نہیں کریں نوید!" وہ لنگڑاتے ہوئے اس کے پیچھے لپکی مگر وہ اس سے پہلے ہی دروازہ پار کر چکا تھا۔
صحن عبور کر کے وہ گھر کا مرکزی دروازہ کھول کر باہر نکل رہا تھا مگر اسے رکنا پڑا۔ دروازہ کھولنے پر ناہید کے باپ کی صورت دکھائی دی تھی۔ وہ بالکل سامنے کھڑا تھا نوید عثمان ٹھٹک کر رکا۔
"نوید بیٹا! کیسے ہو؟" اس کے جملے میں جتنی چاشنی تھی، انداز اتنا ہی کھردرا تھا۔
نوید عثمان نے تعجب سے ناہید کے باپ کے پیچھے چار پانچ لمبے تڑنگے بھرپور ڈیل ڈول رکھنے والے مردوں کو گھر میں داخل ہوتے دیکھا۔ ان میں سے ایک نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ نوید عثمان متحیر سا صحن میں کھڑا تھا۔
اس کے سامنے ناہید کا باپ اور چار پانچ پہلوان نما مرد کھڑے تھے۔ نوید عثمان نے بے ساختہ پلٹ کر پیچھے کوئی راہ فرار ڈھونڈنی چاہی۔ مگر پلٹتے ہی اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔
نفیسہ، ناہید کی ماں، ناہید سب ہی تو وہاں تھے۔ نوید عثمان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ہو کیا رہا ہے؟ اس کی اطلاع کے مطابق گھر پہ کوئی نہیں تھا اور نہ آنے والا تھا پھر یہ سب۔۔۔؟
"تم شادی کرو گے صوفیہ سے کہ نہیں؟" ناہید کے باپ کی دبنگ آواز پر وہ ہوائیاں اڑاتے چہرے سمیت اس کی طرف رخ موڑ گیا۔
"یہ سب کیا ہے؟" وہ گھبرا رہا تھا۔ صورت حال سنگین معلوم ہو رہی تھی۔
"سوال کا جواب چاہیے۔۔۔ سوال نہیں کرو۔" صوفیہ بھی کمرے کے دروازے سے آ لگی۔ صحن کا منظر اس کی نظروں میں تھا۔ ناہید کا باپ تو جیسے کچھ سننے کو تیار ہی نہ تھا۔

نوید عثمان نے اس کے پیچھے کھڑے مردوں کو بغور دیکھا۔ اس کی پیشانی نم ہو رہی تھی۔
"میں شادی نہیں کر سکتا۔" وہ گھبرانے کے باوجود ٹھوس لہجے میں بولا تھا۔
"وجہ؟" ناہید کے باپ نے کڑک کر پوچھا تھا۔ نوید عثمان کے چہرے پر سایہ سا گزرا۔
"میری مرضی! میں بتانے کا پابند نہیں ہوں۔" لمحہ بھر کے توقف سے وہ ہمت کر کے بولا۔
"نہ بتاؤ پر شادی تو تمہیں کرنی پڑے گی۔" ناہید کا باپ دو قدم چل کر اس کے نزدیک آیا۔
"مجھے کوئی شادی وادی نہیں کرنی۔ سمجھ رہے ہیں آپ لوگ؟" وہ طیش سے کہتا ہوا تیزی سے اس کے برابر سے نکلتا چلا گیا۔ مگر دروازے اور اس کے درمیان ان پہلوان نما مردوں میں سے ایک حائل ہو گیا۔ نوید عثمان نے پلٹ کر ناہید کے باپ کو دیکھا، وہ تمسخر سے مسکرایا۔
"تمہاری وجہ سے لڑکی کے پاؤں میں نقص آیا ہے۔ اصولاً" وہ تمہاری ذمہ داری بنتی ہے۔ تم نے اتنا بڑا عیب لگا دیا ہے۔ تم ہی اس عیب داری کا خمیازہ بھگتو گے۔ شادی تو تمہیں کرنی پڑے گی۔ زبردستی یا خوشی سے۔۔۔ اس کا فیصلہ تم پر ہے۔"
ناہید کا باپ بہت سختی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ نوید عثمان کی گھبراہٹ بڑھ گئی۔ نفیسہ بھی اس کے نزدیک آئی۔
"دیکھو بیٹا! میری بیٹی کی زندگی برباد ہو جائے گی۔ کون بیاہے گا اب اس کو۔ تم تو اسے پسند کرتے لگے ہو نا۔ صوفیہ نے مجھ سے کچھ نہیں چھپایا۔ تم بہت اچھے ہو۔ معمولی سے پاؤں کا لنگ اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ مان جاؤ بیٹا!" نفیسہ نے اسے جذباتی طور پر دباؤ ڈالا۔
"مگر میں نہیں کر سکتا۔ پلیز میری بات سمجھیں۔" وہ بہت بے چارگی سے گویا ہوا۔
"پھر ٹھیک ہے۔ اس کی ہڈی پسلی توڑ دو اوئے! خود معذور ہو جائے گا تو معمولی سے لنگ کو جواز بنا کر انکار کرنے کی ہمت اپنے آپ ختم ہو جائے گی اس کی۔"

ناہید کا باپ گرجا تھا اور نوید عثمان کو لگا اس کے ہاتھ پاؤں کٹ گئے ہوں۔
وہ چاروں لمبے تڑنگے نوجوان آستینیں اوپر لپیٹے ہوئے اس کی طرف بڑھے۔
"رک جاؤ۔" وہ دونوں ہاتھ کھڑے کر کے انہیں روکتا ہوا چلایا تھا۔ اسے اپنا بچ نکلنا ناممکن لگ رہا تھا۔ جو کام اسے مار پیٹ کھا کر بھی کرنا ہی تھا۔ وہ پہلے کر لینے میں کیا مضائقہ۔۔۔ اب تو جو ہو سو ہو۔ اس نے بہت کوشش کی تھی انکار کی۔۔۔ مگر اس بار شاید قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اسی وقت نکاح پڑھایا گیا۔
نکاح کے کاغذات پر دستخط کرتے ہوئے نوید عثمان کا چہرہ بے تاثر تھا۔
"مجھے صوفیہ کو ابھی ساتھ لے کر جانا ہے۔"
"اگر صوفیہ کو کسی قسم کا کوئی نقصان پہنچایا، تم نے کچھ غلط کرنے کی کوشش کی اس کے ساتھ تو یاد رکھنا ہم ابھی زندہ ہیں۔۔۔"
ناہید کے باپ نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے گویا باور کروایا تھا۔
"فکر مت کیجیے۔ صوفیہ اب چاہے بھی تو میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔" تھوڑے سے صلاح مشورے کے بعد صوفیہ کو نفیسہ نے نوید عثمان کے ہمراہ کر دیا تھا۔ کچھ زیورات جو صوفیہ کے لیے رکھے تھے اور کچھ جوڑے دے دلا کر نفیسہ اپنی طرف سے بری الذمہ ہو گئی۔
"ارے ہم نے پوری معلومات کر رکھی ہیں تم فکر نہ کرو۔ آج جانے دو کل آئے گی تو ہفتہ بھر کو روک لینا اپنے پاس یا ہم خود جا کر رخصت کروا لائیں گے۔" ناہید کی ماں نے نفیسہ کی ڈھارس بندھائی۔
ادھر کار کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھی صوفیہ خود کو اڑن کھٹولے میں اڑتا محسوس کر رہی تھی۔ اس کا محبوب، اس کا شوہر اس کے پہلو میں بیٹھا تھا اور وہ اپنی مرادوں کے بر آنے پر بے پناہ مسرور و شادمان تھی۔ شرگیں پلکیں جھکائے، لبوں پر دھیمی سی مسکان سجائے بیٹھی صوفیہ کو نوید عثمان نے ترچھی نگاہوں سے دیکھا اور

ایک تمسخر اڑاتی مسکان اس کے لبوں پر سج گئی۔



کار ایک جھٹکے سے رکی تھی۔ صوفیہ نے ڈیش بورڈ پر دونوں ہاتھوں کا سہارا لے کر خود کو سنبھالا تھا ورنہ ضرور بری طرح ٹکراتی۔ اس نے سر گھما کر نوید عثمان کو دیکھا۔ وہ پتھریلے تاثرات چہرے پر سجائے کار سے اتر رہا تھا۔
صوفیہ پھر اندیشوں میں گھر گئی۔ نجانے وہ کس طرح پیش آئے؟
وہ ہتھیلیاں مسلتی، لب چباتی ابھی کشمکش میں تھی کہ اسے احساس ہی نہ ہوا اور کسی نے اس کی طرف کا دروازہ کھولا اور کلائی دبوچ کر گھسیٹتے ہوئے کار سے باہر نکالا۔ وہ اس افتاد کے لیے ہرگز تیار نہ تھی جب ہی لڑکھڑا کر گر پڑی۔ مگر سامنے والے نے اسے اٹھنے کا موقع نہ دیا۔ یونہی اس کو کلائی سے پکڑے گھسیٹتا ہوا وہ اسے اندر لے کر جا رہا تھا۔ وہ کمر کے بل پر گری اس کے پیچھے پیچھے گھسٹنے لگی۔۔۔
"نوید۔۔۔ نوید!" صوفیہ حواس باختہ سی گھسٹتی ہوئی چیخیں مار رہی تھی۔ مگر اسے درندگی سے گھسیٹتا ہوا نوید عثمان جیسے اس کی پکار سن ہی نہیں رہا تھا۔
لان کے درمیان سے اندر جاتی کھردری روش پر گھسٹتے ہوئے صوفیہ کا لباس بے ترتیب ہوا۔ دوپٹا سرک کر کاندھے اور گردن میں بری طرح لپٹا، قمیص کا دامن کھینچاؤ کے باعث پھٹنے کے قریب ہوا۔
وہی لباس اپنی بے وقعتی پر رو رہا تھا جو نوید عثمان کا اس کے لیے لایا گیا اولین تحفہ تھا اور جو صوفیہ کو بہت عزیز تھا۔
اپنی بے وقعتی پر تو صوفیہ بھی رو رہی تھی، اس کی ساری خوش فہمیاں ہوا ہو گئی تھیں۔ وہ اپنے ساتھ ہونے والے سلوک سے زیادہ اپنے خوابوں کا محل زمیں بوس ہونے پر گریہ کناں تھی۔
اس کی ہتھیلی پر جابجا خراشیں آئی تھیں۔ اس کی کمر پر کئی بار چوٹ لگی تھی اور اس کا وہ بازو جس کے

زور پر اس کا سارا وجود بری طرح گھسیٹا جا رہا تھا شاید اب کہ تب جسم سے الگ ہو جاتا۔ درد و کرب کی کیفیت میں گھری صوفیہ بے طرح ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ وہ کھڑی ہونا چاہتی تھی مگر اس کے پاؤں کا نقص اس کی بے بسی کا سامان کیے دے رہا تھا۔

اسی حالت میں وہ اسے لاؤنج کے فرش پر لا کر پھینک چکا تھا۔ صوفیہ نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ جس طرح اس گھر میں اس کا استقبال ہوا تھا صوفیہ کو وہ آٹھ آٹھ آنسو رلا رہا تھا۔ اس کے بدن کے جوڑ جوڑ سے آہ نکل رہی تھی۔ وہ یونہی دائیں پہلو کے بل لیٹی سفید ماربلز پر اپنی پیشانی ٹکا کر بے تحاشا روئے جائے تھی۔ نجانے کتنے لمحے دبے پاؤں بے آواز سرک گئے تھے۔

"مجھ سے محبت کرتی ہو؟" نوید عثمان کی نرم آواز بہت قریب سے ابھری تھی۔ صوفیہ نے سر اٹھا کر دیکھا۔

وہ پنجوں کے بل اس کے نزدیک بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر ملائمت تھی۔ صوفیہ کے آنسو تھم گئے۔ اس کے آتشی گلابی خوب صورت لبوں پر ایک بے آواز التجا تھی۔ نوید عثمان نے نظر بھر کر اسے دیکھا۔

"بولو۔ کرتی ہو ناں مجھ سے محبت؟" وہ بہت پیار سے اس کے بال سہلا رہا تھا۔

کالی سیاہ لٹیں اس کے خوفزدہ چہرے سے لپٹ گئی تھیں۔ نوید عثمان نے اس کے چہرے اور گردن سے اس کے بال سمیٹ کر کنارے کیے۔ صوفیہ ابھی بھی خاموش تھی۔

اگلے ہی پل صوفیہ کی جان نکل گئی۔ اس نے بالوں کو بہت زور سے دبوچا تھا اور جھٹکا اتنا شدید تھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی صوفیہ کی دلخراش چیخ سارے گھر میں گونج گئی۔

"بولو۔۔۔ بولو نا اب بھی کرتی ہو؟" اس نے دو تین جھٹکے اور دیے اور ہر بار پہلے سے زیادہ شدید جھٹکا تھا۔ صوفیہ کی چیخیں تھمنے میں نہ آ رہی تھیں۔

"خاموش۔۔۔" الٹے ہاتھ کا بھرپور تھپڑ صوفیہ کی آواز حلق میں ہی گھونٹ گیا۔

"اس گھر کی دیواروں سے آوازیں باہر نہیں نکلتیں اس لیے کوشش بے کار ہے۔ تم مکمل طور پر میرے رحم و کرم پر ہو۔ تمہاری مدد کو اب کوئی نہیں آئے گا۔ سمجھیں۔" وہ بہت بے رحمی سے بولا۔

"مجھ سے شادی کرنا چاہتی تھیں نا۔۔۔" اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑے وہ زہرخند لہجے میں پوچھتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور بالوں سے پکڑے پکڑے اسے بھی کھڑا کر دیا۔

صوفیہ سفید پڑ گئی۔ اس کا دماغ سن ہونے لگا۔ نوید عثمان جسے وہ بہت نرم دل، ٹھنڈے مزاج کا محبت کرنے والا شخص سمجھتی تھی۔۔۔ یہ اس کا کون سا روپ تھا؟ وہ تو کہیں سے بھی اس شبیہ سے مماثلت نہیں رکھتا تھا جو صوفیہ اپنے ذہن میں تراشے بیٹھے تھی۔

"نوید مم۔۔۔ مجھے معاف کر دیں پلیز مجھے چھوڑ دیں۔"

اس کی حالت قابل رحم تھی مگر نوید عثمان آج بخشنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ وہ ہنسنے لگا۔ بے ساختہ، بہت زور سے۔۔۔

روح فنا ہونا کسے کہتے ہیں کوئی صوفیہ سے پوچھتا۔۔۔ جو جان بوجھ کر کھائی میں گرنے آئی تھی۔

وہ ابھی تک ہنس رہا تھا۔ "چھوڑ دوں؟"

"نوید پلیز۔۔۔ پلیز!" صوفیہ اس کے ہاتھوں سے اپنے بال چھڑانا چاہ رہی تھی مگر اس کی گرفت بہت جارحانہ تھی۔

"کیوں چھوڑ دوں اب۔۔۔ زبردستی نکاح کروایا ہے اس حرام زادے نے۔ زبردستی تمہیں میرے سر تھتھی کر دیا۔۔۔ چھوڑ دوں گا تو وہ پھر ان کتے کے پلوں کے ساتھ آ جائے گا۔" وہ گالیاں دے رہا تھا اور صوفیہ پر یکے بعد دیگرے انکشافات ہو رہے تھے۔ نوید عثمان تو بہت خوش مزاج، بہت تمیز، تہذیب رکھنے والا شخص تھا۔ پھر یہ کون ہے؟ جو اس کے سامنے اتنی گندی زبان استعمال کر رہا تھا؟

"مجھے معاف کر دیں۔ مم مجھے معاف۔۔۔ چھوڑ دیں۔ اللہ کے لیے۔۔۔ پلیز!" وہ تڑپ رہی تھی۔ یہ جہنم تو اس نے خود اپنے لیے منتخب کیا تھا اور اس کے حصول کے لیے ہر جائز ناجائز طریقہ کار بھی اس کا اپنا ہی انتخاب تھے۔ پھر اب اتنی بے بسی ——————— کیا شہہ پہ مات اسی طرح ہوتی ہے؟

نوید عثمان نے اس کے بال چھوڑ دیے۔ وہ ابھی سکھ کا سانس بھی نہ لے پائی تھی جب یکایک وہ اس کے بازوؤں میں قید ہوئی۔ ایک نئی افتاد۔۔۔

"صوفی۔۔۔ میں تو تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں تمہیں کیسے چھوڑ سکتا ہوں اور دیکھو! تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو نا۔۔۔ بولو۔۔۔ کرتی ہو نا؟"

صوفیہ کو کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ وہ ایک نفسیاتی طور پر بیمار شخص ہے۔ وہ اس کے بازوؤں میں قید حیران، پریشان ہونے کے ساتھ ساتھ بے بس اور لاچار بھی تھی، ورنہ شاید ایک پل میں بھاگ نکلتی۔

"بولو نا۔۔۔ کرتی ہو مجھ سے محبت؟" وہ اب سخت لہجے میں اس کے اقرار کے لیے مصر تھا۔

اس کی کمر کے گرد اس کے بازوؤں کا گھیرا تنگ پڑتے پڑتے اب اس کی پسلی میں تکلیف دینے لگا تھا۔ وہ شدت کرب سے گزرتی فقط سر ہی ہلا سکی تھی۔

"میں نے جتنی مہربانیاں کر دیں تم پر وہ ہی کافی ہے اب کسی اور خوش گمانی میں نہ رہنا۔۔۔ اب تو میں تمہیں اس وقت بھی نہیں چھوڑوں گا جب تم گڑگڑا گڑگڑا کر مجھ سے اپنی آزادی کی بھیک مانگو گی۔۔۔ تم زبردستی میری زندگی میں شامل ہوئی ہو۔ میں زبردستی ہی تمہیں خود سے باندھ کر رکھوں گا۔"

صوفیہ کو لگا اس کی سانس رک جائے گی۔ وہ اس کے تنگ گھیرے سے کبھی نہ نکل سکے گی۔ وہ اس کے بازو نہیں کوئی پتھر کی دیوار تھی جو اس کے اردگرد چن دی گئی تھی۔

"جانتی ہو میں تم سے شادی کیوں نہیں کرنا چاہ رہا تھا؟" صوفیہ نے ہراساں نگاہیں اٹھائیں۔ اس کے منجمد احساس اسے کچھ کرنے کی تدبیر نہ سجھا رہے تھے۔

"وجہ۔۔۔ تم نہیں تھیں، نہ تمہارے پاؤں کا نقص تھا۔" صوفیہ کی پلکیں جھپکنا بھول گئی تھیں۔ "اس کی وجہ میں خود تھا۔"

نوید عثمان نے اپنے سینے پر انگلی رکھی۔

"مطلب۔۔۔" صوفیہ کے لب بے آواز ہلے تھے۔

"مطلب۔۔۔ میں تم سے کیا، کسی بھی لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا تھا۔" نوید عثمان کے لہجے میں رنج گھل گیا۔

"میں اس قابل نہیں ہوں۔ میں وہ ہوں جسے۔۔۔"

صوفیہ کو لگا جیسے وہ بہری ہو گئی ہو۔ حس سماعت دغا دے گئی ہو مگر اس کے باوجود اس کے کانوں میں ایک لفظ کی بازگشت شدید تھی۔ اعصاب شل ہونا کسے کہتے ہیں صوفیہ کو اب سمجھ میں آیا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے کان ڈھانپ لیے مگر وہ آواز بند نہ ہوئی۔

ہوش و حواس کا دامن چھوڑتے ہوئے بھی وہ آواز ہتھوڑے کی طرح اس کے اعصاب پر برس رہی تھی اور اس کی آخری ضرب شدید تھی۔

"نامرد۔"

وہ اس کے بازوؤں میں جھول گئی۔



صوفیہ کا باپ ایک سرکاری ملازم تھا۔ سفید پوش طبقہ سے تعلق رکھنے والا نفیسہ کا چھوٹا سا گھرانہ ہی اس کی کل کائنات تھا اور اس کی کائنات کے تمام رنگ جس خوب صورت تتلی کے دم سے تھے وہ نفیسہ اور اقبال کی جان، اکلوتی پھولوں جیسی بیٹی صوفیہ تھی۔

دونوں صوفیہ کو حد سے زیادہ لاڈ پیار سے پروان چڑھا رہے تھے تو اس کی وجہ محض یہ نہیں کہ وہ ان کی اکلوتی اولاد تھی بلکہ ان کے لاڈ پیار کی اصل وجہ صوفیہ کے پاؤں کا پیدائشی نقص تھا۔ سرجری سے یہ نقص ٹھیک ہو سکتا تھا مگر اس کے لیے صوفیہ کی دس بارہ برس کی عمر ضروری تھی۔ کم عمری میں یہ آپریشن مکمل طور

پر کامیاب ہونے کی ضمانت نہ تھی۔ یہ صوفیہ کے لیے تو امتحان تھا ہی مگر سب سے بڑی آزمائش اس کے والدین کی تھی۔ ایک معصوم کم سن نادان بچی کو اس پیدائشی نقص کے ساتھ دیکھنا اس کے والدین کے لیے بہت ضبط آزما مرحلہ تھا۔ علاوہ ازیں اس آپریشن کے لیے ایک موٹی رقم درکار تھی' جو صوفیہ کے باپ کی استطاعت سے کہیں زیادہ تھی مگر پھر بھی وہ بہت پُرامید تھے کہ ایک دن ضرور صوفیہ کی شخصیت کا یہ ادھورا پن تمام ہو جائے گا۔

لیکن امید کی ڈھیروں کرنیں آنکھوں میں سجالینے کے باوجود صوفیہ کے والدین صوفیہ کی اس کمزوری پر بے حد مغموم رہتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ صوفیہ کسی احساس کمتری کا شکار نہ ہو اس لیے دونوں میاں بیوی اسے خوب محبت اور نازو نعم میں پال رہے تھے مگر شاید صوفیہ کا یہ ادھورا پن اس کی ساری عمر کا روگ تھا۔

جب ہی ادھر صوفیہ نے عمر کی نویں منزل پہ پاؤں دھرا اور ادھر اس کے باپ کو کینسر جیسے موذی مرض نے آلیا۔ گو کہ کینسر کا یہ مرض آخری مرحلے پر نہ تھا اور علاج سے ٹھیک ہو سکتا تھا مگر علاج خاصا مہنگا تھا۔ اب معمولی سا سرکاری ملازم اقبال کیا کیا کرتا اور کیسے کرتا؟

یہی سب فکریں اندر ہی اندر اقبال کو کھوکھلا کرتی گئیں اور بالآخر وہ ساری فکروں سے آزاد ہو کر مٹی میں جا سویا۔

چھوٹی سی عمر میں صوفیہ کو باپ کی شفقت' اس کی سرپرستی سے محرومی سہنا پڑی اور نفیسہ ان سارے جھمیلوں کے بیچ تنہا رہ گئی جنہوں نے اقبال کو وقت سے پہلے موت کی آغوش میں سوجانے پر مجبور کر دیا تھا۔

ناہید کی ماں یعنی نفیسہ کی نند اپنے بھائی کی موت کے بعد اقبال کے ذاتی مکان میں آکر رہنے لگی۔ اس طرح نفیسہ کی دو سراہٹ کا بھی انتظام ہو گیا اور ناہید کی ماں کو کرائے کے گھروں میں ٹھوکر کھانے سے نجات مل گئی۔

اقبال کے ذاتی مکان اور ملازمت کے عوض ملنے والی سرکاری پنشن نے نفیسہ اور صوفیہ کی زندگی کو مشکلات سے دوچار نہ ہونے دیا تھا مگر پھر بھی صوفیہ کے پاؤں کا آپریشن نہ ہو سکا تھا۔ پس انداز کی گئی تھوڑی بہت رقم اقبال کے بعد سرکاری پنشن جاری ہونے سے قبل کے عرصے میں کام آگئی۔ کمیٹیاں ٹوٹ گئیں..... اور نفیسہ کے اختیار میں کچھ بھی نہ رہا۔

صوفیہ کو نفیسہ نے کبھی کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہونے دی مگر وہ ایک چیز جو وہ چاہ کر بھی صوفیہ کو دینے سے محروم تھی اور وہ تھی اس کے وجود کی کاملیت.....

صوفیہ زندگی کی بیس بہاریں دیکھ لینے کے باوجود بھی کبھی احساس کمتری کا شکار نہ ہوئی تھی اور نہ ہوتی اگر اس کی شادی کے سلسلے میں رشتہ کرانے والیوں کے ہمراہ آنے والے لڑکے کی ماں' بہنوں نے طرح طرح سے اس کی ذات کو تضحیک کا نشانہ نہ بنایا ہوتا۔

وہ پاؤں میں موجود نقص کے باعث بری طرح سے رد کر دی جاتی اور اس رد کیے جانے کے تکلیف دہ عمل نے اسے "نام نہاد شرافت سے متنفر سا کر دیا تھا اور اس پر گرم لوہے کی ضرب کی مانند ناہید اور اس کی ماں کی باتیں بھی اسے باغیانہ خیالات کے حوالے کر گئیں۔

پھر اس نے ہر طرح سے کوشش کر کے دیکھی مگر نصیب کی سیاہی دور ہونا تو دور کی بات' مدھم بھی نہ پڑی۔

انہیں دنوں نوید عثمان اس کی زندگی میں آیا۔ خیر خواہوں کی خیر خواہی کام آگئی اور صحیح غلط کی پروا کیے بغیر ایک ایسے راستے پر چلتی چلی گئی جو بظاہر پھولوں سے لدا نظر آتا تھا۔

انہی دنوں جب وہ نوید عثمان کی ہمراہی کے حسین خوابوں میں گم خود فریبی کے ہنڈولے میں جھول رہی تھی' ایک دن صولت بیگم چلی آئیں۔

نفیسہ کے مرحوم کزن ابراہیم کی بیوہ صولت بھابھی اپنے بیٹے کے لیے صوفیہ کی خواہش مند تھیں۔ انہیں صوفیہ کے نامکمل وجود پر کوئی اعتراض نہ تھا مگر صوفیہ نے نوید کی وجہ سے اس رشتے کو در خور اعتنا نہ

جانا۔

اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس خوب صورت رستے میں رنگین پھولوں کے جھنڈ کے بیچ ایک ایسی آنکھوں سے اوجھل کھائی پوشیدہ ہے۔ جہاں سے بچ نکلنا شاید خوش قسمتی سے کسی صورت ممکن ہو مگر صحیح سلامت نکلنا قطعی ناممکن ہو گا۔



گہری تاریکی' حبس' گھٹن اور ہوا میں معلق وجود۔ اندھیرے کے باعث کچھ دکھائی بھی نہ دے رہا تھا۔

معاً" اس کے شانے پر دباؤ بڑھا اور پٹ سے اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ شاید وہ بے ہوش رہی تھی۔

نوید عثمان اس کے چہرے پہ جھکا ہوا تھا۔ اس نے بے ساختہ اپنی دونوں ہتھیلیاں لبوں پہ جما کر اپنی چیخ روکی۔

اس کی آنکھوں سے آنسو بھل بھل گرنے لگے۔

"ارے ارے..... رومت پلیز..... رومت!" وہ اس کے آنسو صاف کرنے لگا۔ بے آواز بہتے صوفیہ کے آنسوؤں میں کوئی کمی نہ آئی۔

"اچھا رکو..... میں پانی لے کر آتا ہوں۔" وہ اسے چھوڑ کر کچن کی طرف بڑھا۔

وہ صوفے پر دراز تھی' اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اپنے بکھرے بالوں کو ایک ہاتھ سے سمیٹتے ہوئے اس کے دماغ نے فوراً" راہ فرار سجھائی۔ وہ تیزی سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی۔

لپک کر دروازے کا لاک گھماتے ہی اس کی خوش امیدی' ہوا ہو گئی۔ دروازہ مقفل تھا۔ وہ مایوس سی ہو کر اسی دروازے سے ٹیک لگائے زمین پر بیٹھی اور گھٹنوں میں منہ دیے آنسو بہانے لگی۔

"ارے تم یہاں کیوں آگئیں؟ کیا ہوا دروازہ لاکڈ ہے' اس لیے رو رہی ہو۔" وہ تھوڑی ہی دیر میں پانی سے بھرا گلاس لیے اس کے قریب آیا۔ صوفیہ نے چہرہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"اور کتنا روؤ گی۔ بس کرو آنسو پونچھو شاباش۔ اب تو واپسی کا ہر دروازہ بند ہے۔ چلو پانی پی لو ریلیکس کرو۔"

وہ اسے پچکار رہا تھا۔

"پی لو۔" وہ گلاس اس کے لبوں سے لگا رہا تھا صوفیہ نے ہاتھ سے گلاس پرے کر دیا۔ دو تین مرتبہ کی یہ حرکت نوید عثمان کو مشتعل کرنے کے لیے کافی تھی۔

"پیو۔ ورنہ یہی گلاس تمہارے منہ پر ماردوں گا۔"

وہ دھاڑا اور صوفیہ سوجان سے کانپنے لگی۔

اگلے ہی پل وہ گلاس لبوں سے لگائے ایک ہی سانس میں سارا پانی غٹاغٹ چڑھا گئی۔

"تم بہت اچھی ہو۔" وہ اس کے ہاتھ سے گلاس لیتے ہوئے مسکرایا۔

اس وقت وہ بالکل وہی نوید عثمان لگ رہا تھا' جو آشنائی کے ابتدائی دنوں میں صوفیہ کو پیار بھری میٹھی نظروں سے دیکھا کرتا تھا۔ یقیناً" میرے لیے بہت اچھی بیوی بھی ثابت ہو گی۔ ہے نا؟" وہ مزے سے کہہ رہا تھا۔

"ارے بیوی سے یاد آیا۔ ہماری تو شادی ہو چکی ہے۔" وہ بڑے ہی دوستانہ انداز میں کہتا ہوا اس کے برابر میں اسی انداز میں دروازے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ صوفیہ بے اختیار ہی تھوڑا پیچھے ہوئی تھی۔ اس نے محسوس نہ کیا وہ اپنی ہی دھن میں تھا۔

"شادی کے بعد تو ہنی مون ہوتا ہے نا..... تم چلوگی میرے ساتھ میں تمہیں ایسی جگہ لے جاؤں گا جہاں تم کبھی نہیں گئی ہو گی۔ وہ بہت اچھی جگہ ہے جہاں صرف میں اور تم ہوں گے..... میں تمہارے اور اپنے درمیان کسی کو برداشت نہیں کروں گا..... سمجھ رہی ہو میری بات۔" نوید عثمان نے اس کا ہاتھ اپنی گرفت میں لے لیا۔ صوفیہ نے چاہنے کے باوجود مزاحمت نہ کی۔

"چلو گی نا..... اس بھاگتی دوڑتی دنیا سے دور....." وہ ذرا سا رخ موڑے اس سے پوچھ رہا تھا اور صوفیہ کی نظریں زمین میں گڑی تھیں۔

"بولو۔" وہ دھاڑا۔ صوفیہ نے سہم کر جلدی جلدی سر ہلایا مبادا پھر کوئی تکلیف نہ پہنچا دے۔ نوید عثمان بڑی پیار بھری مسکان اس کی طرف اچھالتا اٹھ کھڑا

ہوا۔

"تم فریش ہو جاؤ۔ ہم ابھی نکلیں گے۔" گھڑی رات کے گیارہ بجا رہی تھی جب وہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر کھڑے ہونے میں مدد دیتا بہت کیئرنگ ہسبینڈ ظاہر کر رہا تھا خود کو۔

صوفیہ کے پاس اس کی بات ماننے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ جس ذہنی و جسمانی تکلیف و اذیت سے گزر رہی تھی وہ اس کے اعصاب مفلوج کرنے کے لیے کافی تھے۔

☼ ☼ ☼

نفیسہ کی آنکھوں سے اشک رواں تھے۔ ناہید کی ماں اس کے برابر میں بیٹھی اس کے شانوں کے گرد بازو پھیلائے اسے دلاسے دے رہی تھی۔ مگر نفیسہ کی ہچکیاں، آہ و زاریاں اور اشک۔۔۔ تواتر سے برس رہے تھے۔

صبر آتا بھی تو کیسے؟ دو ہفتوں سے اس کی حالت قابل رحم تھی۔ ناہید نوید عثمان کے موبائل پر کال کر کر کے تھک ہاری۔ موبائل بند تھا۔ ناہید کا باپ نوید عثمان کے گھر کے کئی چکر لگا آیا۔ صبح شام وہاں پہرے تک بٹھا کر دیکھ لیا۔۔۔ مگر سب بے سود۔

وہ گھر میں نہیں تھا۔ وہ آفس بھی نہ آ رہا تھا۔ وہ کہیں نہیں تھا۔

صوفیہ دو ہفتوں سے لاپتا تھی۔ ناہید کا باپ ہر طرح سے انہیں تلاش کر چکا تھا۔ پولیس میں بھی رپورٹ کروا دی گئی تھی مگر اب تک کوئی قابل ذکر کارروائی عمل میں نہ لائی گئی تھی۔ نہ ہی ان دونوں کا کوئی سراغ ملا تھا۔

☼ ☼ ☼

"صوفیہ!" نوید عثمان کی پکار پر وہ جو بے جان سی پڑی تھی، ایک دم دہل کر اٹھی۔

اس نے اپنے خشک سیاہی مائل لبوں پر زبان پھیری۔۔۔ ایک درد کی شدید ٹیس لبوں کے کنارے سے اٹھی جہاں نیل پڑا تھا۔

"صوفی۔۔۔!" اس کی پیار بھری پکار قریب آگئی تھی۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے ڈر و خوف سے پیچھا چھڑا پا رہی تھی۔

اسی پل دروازے پر کھٹکا ہوا تھا۔ وہ لاک کھول رہا تھا شاید۔ صوفیہ بے اختیار پلنگ کے نیچے گھس گئی۔ بچاؤ کی اور کوئی صورت بھی تو نہ تھی۔ اس کا چہرہ کسی بیمار بوسیدہ۔۔۔ مدقوق زدہ ضعیفہ سے مشابہہ تھا۔

دروازہ کھل چکا تھا۔ صوفیہ کی نگاہیں دو مردانہ پیروں پر مرکوز ہوئیں۔ جواب کمرے میں موجود تھے، وہ پورا وجود دیکھنے سے قاصر تھی۔

نوید عثمان اپنے پیچھے دروازہ بند کر رہا تھا۔ صوفیہ کی سانس رکنے لگی۔

"صوفی میری جان!" وہ بڑی لگاوٹ سے پکار رہا تھا۔ صوفیہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

نوید عثمان کے پاؤں اب واش روم کی طرف جاتے دکھائی دیے۔ پھر وہ کمرے کے وسط میں آ ٹھہرا۔

اس لمبی اور نیچی دیواروں اور ٹین کے چھت والے کمرے میں کوئی کھڑکی، کوئی روشن دان۔۔۔ حتیٰ کہ سوراخ بھی شاید ہی ہو۔ اس لیے نوید عثمان کو یہ اطمینان تھا کہ صوفیہ یہاں سے باہر تو نہیں نکل سکتی۔

"صوفی جانو۔۔۔ مذاق مت کرو۔ دیکھو میں ہار مان رہا ہوں۔ میں تمہیں نہیں ڈھونڈ سکتا۔ باہر آؤ نا پلیز۔"

وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ صوفیہ کہیں نہیں تھی تو یقیناً" بیڈ کے نیچے ہو گی۔۔۔ وہ ایسا پہلے بھی تو کر چکی تھی۔

صوفیہ نے زور سے آنکھیں میچ کر مرنے کی پوری شدت سے دعا مانگی۔

وہ سہمی ہوئی نظروں سے اس کے ٹراؤزر میں ملبوس پیروں کو دیکھ رہی تھی جب اچانک۔۔۔ ایک دم نوید عثمان نیچے بیٹھا۔

خوف سے صوفیہ کی چیخ نکل گئی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے مد مقابل تھے۔

"ہاہاہا۔۔۔" نوید عثمان اس کے دہشت زدہ ہونے پر بے اختیار ہنسنے لگا۔

صوفیہ نے اپنے ہی بدن پر اپنے بازوؤں یوں لپیٹے جیسے خود کو اس کی نگاہوں سے دور کرنا چاہ رہی ہو مگر یہ ممکن تھا بھلا۔

"باہر آؤ۔" وہ گھٹنوں کے بل رینگتا بیڈ کے قریب آیا۔ اس کے تحکم بھرے لہجے کے باوجود صوفیہ نے سر نفی میں ہلایا تھا۔

"میں نے کہا۔ باہر آؤ۔" اس بار نوید عثمان کا لہجہ پتھروں سا سخت تھا۔ صوفیہ کے آنسو بے اختیار اُمڈ آئے۔ وہ جانتی تھی اگر وہ اس کے ہاتھ آگئی تو وہ وحشی درندہ اپنی ساری وحشت اس پر انڈیلے گا۔ مہینے بھر سے وہ یہی تو کر رہا تھا۔

اس کے دریدہ کپڑوں سے جھلکتا اس کا فگار وجود نوید عثمان کی درندگی کا ثبوت تھا۔ اس کے زرد چہرے پر نیل اور سرخ انگلیوں کے نشانات جابجا اس پر ٹوٹے ستم کی کہانی اپنے آپ سنا رہے تھے۔

گردن کے پاس سگریٹ سے جلایا گیا حصہ ابتدائی طبی امداد نہ ملنے کے باعث زرد پیپ سے بھرنے لگا تھا۔ اس کے جوڑ جوڑ سے آہ نکل رہی تھی۔

"نہیں آؤ گی؟" وہ دھمکی آمیز انداز میں پوچھ رہا تھا۔

وہ حرکت بھی نہ کر سکی۔ البتہ اس کے وجود کے گرد لپٹی اس کی کلائیاں کچھ اور مضبوطی سے لپٹ گئیں۔ وہ جیسے اس کے ستم سے بچنے کے لیے۔ اپنی ہی پناہوں میں چھپ جانا چاہتی تھی۔

نوید عثمان کا دماغ الٹنے میں لمحہ لگا تھا۔

"اچھا۔۔۔" وہ دھمکاتے ہوئے سیدھا ہوا۔ اس کے ہاتھ اپنی شرٹ کے پاکٹ ٹٹول رہے تھے۔ چند لمحوں کے توقف سے وہ دوبارہ گھٹنوں کے بل جھکا۔ صوفیہ نے خوف سے آنکھیں میچ لیں مگر اپنی چیخیں نہیں روک پائی۔

صوفیہ کے آنچل سے لپٹا شعلہ آگ کی صورت اختیار کر گیا۔

وہ متواتر چیخیں مارتی تڑپ کر باہر نکلی تھی۔ تیزی سے دوپٹا اپنے وجود سے الگ کرتی وہ بری طرح خوفزدہ تھی۔

اس کی دلدوز چیخ سارے میں گونج رہی تھی۔ نوید عثمان نے لائٹر واپس اپنی پاکٹ میں ڈالا اور اس کی طرف گھوما۔

معاً" زوردار تھپڑ پر توازن قائم نہ رکھتے ہوئے وہ اوندھے منہ زمین پر گری۔ نوید عثمان کی آنکھیں سرخ انگارے جیسی ہونے لگی تھیں اور یقیناً" اس کے غیظ و غضب کا لاوا صوفیہ کے وجود کو خاکستر کرنے والا تھا۔

☼ ☼ ☼

چلو اس خواب کو ہم ترک کر دیں
اور آنکھوں کو یہ سمجھا دیں
کہ ہر تصویر میں ہلکا گلابی رنگ
چاہنے سے نہیں آتا
بہت سے نقش
نقاشِ ازل ایسے بناتا ہے
کہ جن کا حاشیہ گہرا سیاہ
اور رنگ ہلکا سرمئی ہوتا ہے
اور جن پہ
کسی بھی زاویے سے چاند اترے
وہ کبھی روشن نہیں ہوتے۔۔۔

میں ایک فرماں بردار بیٹے کی طرح تعلیم حاصل کر رہا تھا، جب میرے باپ کا انتقال ہو گیا۔ بابا کے انتقال کے بعد میں نے ذمہ دار بیٹے کی طرح ماں کو سہارا دیا۔ ہم بہاول پور سے کراچی آ گئے۔ یہاں آ کر میں نے مزید تعلیم حاصل کی۔

پھر بہترین جاب مل گئی۔ گھر خرید لیا۔ گاڑی لے لی۔ بابا کی جائیداد فروخت کر کے شیئرز خرید لیے۔ حال کو بہتر بنا لیا۔۔۔ مستقبل کی پلاننگ کر لی۔ مگر پھر بھی میں عام مردوں کی طرح نہیں بن سکا۔ کیونکہ میں ان جیسا تھا ہی نہیں۔۔۔

اب وہ مرحلہ آیا جہاں میری ماں مجھ پر شادی کے لیے دباؤ ڈالنے لگی۔ وہ مجھے احساس دلانے لگی کہ

میرے باپ کی نسل آگے بڑھانے کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔ میں نے انکار کیا تو وہ مجھ سے ناراض ہو گئی۔ بھلا میں اسے کیا بتاتا کہ میں یہ ذمہ داری اٹھانے کے قابل ہی نہیں۔۔۔ مگر ماں کی ناراضی دور کرنے کے لیے میں نے اسے تلخ حقیقت کا کڑوا زہر پلا دیا۔۔۔ اور زہر پینے کے بعد کوئی بچ جائے تو وہ خوش نصیب ہوتا ہے مگر میری ماں خوش نصیب نہ تھی۔ وہ جانبر نہ ہو سکی۔

باپ تو پہلے ہی تنہا کر چکا تھا۔ ماں بھی اکیلا چھوڑ گئی۔ مجھے لگا کچھ ایسا ہے مجھ میں، جو عام مردوں جیسا نہیں۔۔۔ کیا؟

جواب زیادہ مشکل نہ تھا۔

میرا برتاؤ، میرا رویہ، میرا سلوک۔۔۔

میں نے سب کچھ کیا مگر میرے مزاج کا اکھڑ پن نہ جا سکا۔ میں اپنے اردگرد کے لوگوں کو فوکس کرنے لگا۔ اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ دوستی کرنے لگا۔۔۔ تب مجھے احساس ہوا کہ لڑکیوں میں میری دلچسپی صفر ہے۔ مجھے لڑکیاں بالکل بھی اٹریکٹ نہیں کرتیں۔

میں نے نارمل مرد بننے کے لیے یہ کوشش بھی شروع کر دی۔ لڑکیوں میں دانستہ دلچسپی لینے لگا۔ ان کے ساتھ افیئرز چلانے لگا۔ مگر میں اپنے اندر کنڈلی مار کے بیٹھے احساس کمتری کا کیا کرتا۔

محبت کے نام پر جو بھی لڑکی میرے نزدیک آئی۔ اس کی دعوت دیتی نظریں مجھے کھولا کر رکھ دیتیں۔ جس چیز سے میں معذور تھا وہ مجھ سے وہی مطالبہ کرتیں۔۔۔ میری قنوطیت عروج پر پہنچنے میں زیادہ وقت نہ لیتی۔ نتیجتاً میں ان سے کنارہ کشی اختیار کر لیتا۔ اس کی وجہ میں اپنی معذوری کو نہیں، ان کے کردار کی کمزوری کو گردانتا۔ اس کے باوجود میرے اندر کا شخص مجھے چین نہ لینے دیتا۔ مجھے مجھ میں چھپا ہمراز رات بھر کچوکے لگاتا۔ میری خود فریبی کا گریبان چاک کر کے مجھے میری کمزوری کے طعنے دیتا اور میں اس کیفیت سے بے قرار خود کو اذیت پہنچانے لگتا۔

رات کے برعکس صبح میں اپنے آپ کو بہت نارمل اور فریش محسوس کرتا۔ خود کو دیے گئے زخموں کی مرہم پٹی کرتا۔ گھر کی حالت درست کرتا اور بالکل نا[rmal] مردوں کی طرح آفس جاتا۔ کولیگ کے ساتھ [بھی] دوستانہ تعلقات تھے۔۔۔ غرض روٹین کا سارا [کام] معمول کے مطابق سرانجام دیتا۔ کبھی کوئی کسی [لڑکی] کے بارے میں پوچھ لیتا تو صفائی سے جھوٹ بول کرتا۔

اس سب کے باوجود میں نے کسی کی زندگی خراب کرنے کی کوشش کبھی نہیں کی تھی۔ میں چاہتا تو بھی لڑکی سے باآسانی شادی کر سکتا تھا مگر ہر اس لڑکی جو مجھ سے محبت کی دعوے دار تھی میں نے شادی انکار کر دیا۔۔۔ شاید خوف کی وجہ سے۔۔۔ میں چاہتا تھا کہ میری کمزوری کسی کے بھی علم میں آئے۔

ان ہی دنوں مجھ سے تم ٹکرائیں۔۔۔ اور تمہارے ساتھ بھی "محبت محبت" کھیلنے لگا۔ کسی کو خود میں انوالو کر کے مجھے بڑی تسکین ملتی تھی لگتا جیسے میں "مکمل" ہوں۔ میں کسی بھی لڑکی آئیڈیل ہو سکتا ہوں۔۔۔ مگر یہاں وہ کچھ ہو گیا جو قطعی نہیں چاہتا تھا۔

میرے نہ چاہنے کے باوجود تم میری زندگی شامل ہو گئیں۔ کہیں نہ کہیں یہ امر بھی میرے تسکین کا باعث ہے۔ اب کم از کم کوئی مجھے ادھورا پن کا طعنہ تو نہ دے سکے گا۔ میں ایک مکمل بھرپور ہوں۔۔۔ یہ خیال مجھے مسرور کر دیتا ہے۔ میری وحشتوں کا، میری تنہائیوں کا حصہ دار۔۔۔ کوئی ہے۔

مگر جب جب میری تم پر نگاہ پڑتی ہے۔ مجھے احساس کمتری عود کر آتا ہے۔۔۔ مجھے ہول اٹھنے لگتے ہیں۔

جب تم روتی سہمی نظروں سے مجھے دیکھتی ہو، مجھے لگتا ہے تم مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہو۔

مجھ سے چھپنا چاہتی ہو۔ مجھ سے دور جانا چاہتی ہو۔

جب میں خود سے سوال کرتا ہوں تو جواب اتنا کڑوا ملتا ہے کہ میرے روم روم میں زہر اتر جاتا ہے۔ میرے حواس ساتھ چھوڑ جاتے ہیں اور میری دیوانگی جنون بننے لگتی ہے۔

میرا دل چاہتا ہے کہ تم مجھ سے ڈرنا چھوڑ دو۔ میرے ساتھ مسکراؤ۔ مجھ سے باتیں کرو جیسے پہلے کرتی تھیں۔ مگر تم کچھ نہیں کرتیں۔

"زبردستی تو تم نے کی تھی صوفی۔۔۔!"

نوید عثمان کی دیوانگی بھری نظروں سے آج وہ خائف نہ ہوئی تھی۔ آج وہ اس کے سامنے بیٹھی اس کی روداد سنتی، اپنی بے وقوفی پر رو رہی تھی۔

جس محبت سے مغلوب ہو کر وہ نوید عثمان کی چاہ کر رہی تھی۔ نوید عثمان کی حقیقت عیاں ہوتے ہی وہ محبت غائب ہو گئی تھی۔

اب صوفیہ کے جذبات کے کشکول میں محض چند پشیمانی کے سکے تھے۔



آخرت کے ابدی جہنم سے واپسی کا راستہ نہیں ہے۔ مگر جب دنیا میں کسی کو جہنم سے مشابہہ جگہ پر پھینکا جاتا ہے تو وہاں سے واپسی کا راستہ ضرور نکلتا ہے۔ اور وہ راستہ ہے۔ معافی کا، توبہ کا، نجات کا۔۔۔ صوفیہ کو "نجات" درکار تھی۔

نجات تک رسائی توبہ کے توسط سے ہوتی۔ اور توبہ کی قبولیت کے لیے معافی کا حصول ضروری تھا۔

صوفیہ، نوید عثمان کی پہنچائی جانے والی تکلیفوں سے سمجھوتا کر چکی تھی۔ بے رونق چہرے، زخمی وجود اور منجمد احساسات کے ساتھ۔۔۔ خوف زدہ ہونا، ڈرنا، گھبرانا، نوید عثمان سے سراسیمہ و خائف ہونا، وہ ترک کر چکی تھی۔

ان ڈھیر سارے کوہ گراں جیسے دنوں میں ایک چیز جو اس نے بہت شدت سے طلب کی تھی۔ وہ معافی تھی۔

اس کے اعصاب پر ایک بوجھ سا دھرا تھا۔ اس کی زندگی کا بوجھل پن دور نہ ہوتا۔ کوئی قرض تھا شاید اس کی ذات پر۔

اور یہ قرض نوید عثمان کا تھا۔ نوید عثمان کے سامنے اپنی دھوکا دہی کا اعتراف کر کے ہی اس قرض کی ادائی کا سامان ہو پاتا۔ مگر بارہا ہمت کے باوجود وہ یہ کر نہیں پاتی جو غیر ارادی طور پر اس سے حقیقت آشکار نہ ہو جاتی۔

اس روز وہ اسے جی بھر کر ٹھوکروں، گھونسوں اور تھپڑوں سے زدوکوب کرنے کے بعد اس کی پیشانی پر نکل آنے والے گومڑ پر سینکائی کر رہا تھا۔

بہت پیار بھرے لہجے میں دھیمے دھیمے اسے تسلیاں دیتا وہ ظالم شخص صوفیہ کو نجانے کیوں بہت معصوم لگا۔ حالانکہ صوفیہ کا پور پور اس شخص کے مظالم کی داستان چیخ چیخ کے سنا رہا تھا۔ مگر خود اپنا احتساب کرنے کے بعد صوفیہ اسے بری الذمہ قرار دے چکی تھی۔ جب صوفیہ خود اتنی معمولی سی کمزوری کے باعث کیا کیا نہ کر گزرتی تھی تو وہ اپنی ذات کی اتنی بڑی محرومی کے ساتھ کچھ بھی کر گزرتا کم تھا۔

آج پھر نوید عثمان صوفیہ سے اس کی محبت کا اقرار مانگ رہا تھا اور صوفیہ کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا۔ وہ اب اور اس شخص کو بیوقوف نہیں بنا سکتی تھی۔ وہ مزید کچھ جھوٹ بولنے کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔ وہ سسک کر رو پڑی۔

"مجھے معاف کر دو۔۔۔ مجھے معاف کر دو۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔۔۔ میں تم سے محبت نہیں کرتی میں کبھی بھی تم سے محبت نہیں کرتی تھی۔" اس نے نوید عثمان کے آگے اپنے ہاتھ جوڑ دیے۔

"پہلے جسے محبت گردانتی رہی۔۔۔ وہ محض دل لگی تھی، محبت نہیں۔ رفتہ رفتہ دل لگی خود غرضی میں تبدیل ہوئی، جذبات نے رخ بدلا تو مجھے لگا اب محبت ہو گئی۔ مگر تم سے منسوب ہونے کے بعد جب حقیقت سے آنکھیں چار ہوئیں تو اس محبت کا بھی سارا خمار ہرن ہو گیا۔ باقی رہی تو صرف بے بسی، لاچاری اور میری کم نصیبی۔ میں قسم کھاتی ہوں۔ محبت کبھی نہیں تھی۔ محبت کہیں نہیں تھی۔ مجھے معاف کر دو۔"

صوفیہ اپنے جڑے ہاتھوں پر اپنی پیشانی ٹکا کر رو رہی تھی۔ نوید عثمان جیسے سناٹے میں آ گیا۔ اس کی

آنکھیں بے یقینی سے صوفیہ پر ٹکی تھیں۔

"مجھ سے کیا غرض تھی تمہاری؟" اس کے ہونٹوں سے سرسراتی آواز نکلی۔ صوفیہ نے نگاہیں اٹھائیں نہیں۔ شرمساری سے جھکی نظروں کے ساتھ اسے الف تا ے سارا قصہ سنانے لگی۔

اپنی محرومی کا درد۔ اپنی خوش گمانی کا خمار۔۔۔ اور اپنی بدنصیبی کا رونا

سارا کچھ اس کے گوش گزار کر کے نگاہ اٹھائی تو وہ غیظ و غضب سے اسے گھور رہا تھا۔ صوفیہ سوجان سے لرز کر رہ گئی۔ اگلے ہی پل وہ پھر اس کی ٹھوکروں پر تھی۔

مارتے مارتے جب وہ تھک کر ہانپتا ہوا پیچھے ہٹا تو صوفیہ ہزار دقتوں سے اٹھتی' گرتی' کسی نہ کسی طرح سنبھلتی اس کے نزدیک آکھڑی ہوئی تھی۔

"مارو مجھے۔۔۔ اور مارو مجھے۔ جان لے لو میری۔" نوید عثمان کے پہلو میں گرے اس کے دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنی گردن پر رکھتے ہوئے وہ جارحیت سے چلائی تھی۔ نوید عثمان نے حرکت نہیں کی۔ اس نے تنفر سے رخ موڑ لیا۔

"اس جہنم میں پل پل مرنے سے بہتر ہے۔ مجھے ایک ہی مرتبہ جان سے مار دو۔ تمہیں ٹریپ کیا تھا نا میں نے۔۔۔ تمہارا حق بنتا ہے کہ مجھ سے بدلہ لو۔۔۔ مارو مجھے؟" وہ اس کے ہاتھ جھنجھوڑ رہی تھی۔ نوید عثمان نے بے تاثر نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ حال سے بے حال ہو رہی تھی۔

"مار دو مجھے۔۔۔ اللہ کے لیے مار دو۔" وہ نڈھال سی ہو کر اس کے پیروں میں گر گئی۔ دونوں ہاتھ سے اس کے پاؤں پکڑے وہ اس کے پیروں پہ پیشانی ٹکائے رو رہی تھی۔ نوید عثمان سے زیادہ دیر اس کی آہ و زاریاں برداشت نہ ہوئیں۔ وہ پاؤں سے ایک زوردار ٹھوکر مارتا وہاں سے نکل آیا۔

صوفیہ بے دم سی ہو کر ایک طرف گری۔ شاید نقاہت کے سبب بے ہوش ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

چار مہینے بیت گئے تھے صوفیہ کو لاپتا ہوئے۔ نفیسہ رو پیٹ کر بظاہر صبر کر چکی تھی مگر اندر ہی اندر ایک احساس ندامت اسے کھائے جا رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر جامد چپ جمی تھی مگر دکھے دل کی نوحہ بیانیاں صبح شام ایوان خرد میں حشر بپا کیے رکھتیں۔

ناہید کی شادی تھی۔ وہ بظاہر اس کی شادی کی تقریب میں شریک تھی مگر جیسے کسی شے سے اسے کوئی سروکار نہ تھا۔

ناہید کا باپ اب تک ہر جگہ سے خواری اٹھانے کے بعد صوفیہ کو ڈھونڈنے کی کوشش ترک کر چکا تھا اور جب وہ سب صبر کر کے بیٹھ گئے تو ایک غیر متوقع بات ہو گئی۔

نفیسہ کو کوریئر سروس سے ایک رجسٹری موصول ہوئی۔

وہ قانونی کاغذات تھے۔

اور نفیسہ کے ضبط پر بندھا سرد مہری کا پل برف کی طرح ٹوٹ پھوٹ گیا۔ اس کے زخموں سے کھرنڈ اتر گئی۔ خون پھر رسنے لگا۔ جلن پھر شدت پکڑنے لگی۔ نفیسہ کے پاس پچھتاوا تھا' آنسو تھے' پشیمانی تھی ۔۔۔ مگر صوفیہ نہیں تھی ۔۔۔ اور وہ کہاں تھی یہ کسی کو نہیں معلوم؟

اسی رات ناہید کے باپ کو تھانے طلب کیا گیا۔ کراچی کے ساحل سے ایک لاش ملی تھی۔ اس لاش کی شناخت کرنا ناہید کے باپ کے لیے زیادہ مشکل نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کی آنکھ کھلی تو اس قید خانے کے دروازے سے چمکتی سنہری دھوپ اندر آکر اس کے رخسار پر پڑ رہی تھی۔ سینک رہی تھی۔ اس نے سوئے سوئے اعصاب کے ساتھ آنکھوں میں چبھتی دھوپ سے رخ موڑ لیا۔

مگر پھر جیسے ہی خوابیدہ ذہن نے بیداری کے سمندر سے سر اٹھانا شروع کیا وہ بے یقین سی ہوتی رخ دوبارہ موڑ کر دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔

ادھ کھلا دروازہ۔۔۔

قید سے رہائی کا خیال ہی اس کے بدن میں پھرتی بھر دینے کے لیے کافی تھا۔ اس نے فوراً اٹھ کر وہاں سے بھاگنے کی ٹھانی تھی۔

الماری سے ایک گندی' بدرنگ اور پرانی سی بیڈ شیٹ اس کے ہاتھ آئی۔ وہ اسے ہی غنیمت جانتے ہوئے بدن پر لپیٹتی وہاں سے نکل آئی۔

صوفیہ نے علاقے پر زیادہ غور نہ کیا تھا۔ اس کی بے قرار نظریں مرکزی سڑک تلاشتی محو سفر ہوئی اور اس کے لنگڑے پاؤں بھی نجات کی طرف قدم بہ قدم سفر کرنے لگے۔ چلتے چلتے اس کے پیروں میں چھالے پڑ گئے۔

سڑک کنارے بنے ایک چھوٹے سے ڈھابے نما دکان پر کھڑی وہ پانی مانگ رہی تھی۔ جب ظفریاب کی اس پر نگاہ پڑی۔ دکان دار کے چہرے پر کیسی کمینی سی چمک اٹھی تھی۔

اس نے اپنے وجود کے گرد لپٹی چادر کسی۔ شاید اس نے دکان دار کی ذلیل نظروں کو محسوس کر لیا تھا۔

ظفریاب لاکھ نہ چاہنے کے باوجود اس کے نزدیک آ گیا۔ وہ کچھ پیسے وغیرہ دینا چاہ رہا تھا۔

وہ لڑکی پیاس سے خشک لبوں پر زبان پھیر رہی تھی ۔۔۔ اس کی حالت ابتر تھی۔ ڈگمگاتے پیروں کے ساتھ وہ لڑکی مزید کھڑی نہ رہ سکی۔

ادھر وہ بے دم سی ہو کر زمین پر گری ادھر دکان دار فوراً اپنی دکان سے باہر نکل آیا۔۔۔ جیسے بے دم ہوئی کبوتری پر کوئی گدھ آبیٹھے۔

لیکن اس سے پہلے ہی ظفریاب اس کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ گھٹنوں کے بل اس کے نزدیک بیٹھا وہ اس کی نبض دیکھ رہا تھا۔

"او شہری باؤ ۔۔۔ جاؤ اپنا کام کرو۔ یہ ہمارا مال ہے۔"

ظفریاب کے الٹے ہاتھ کا بھرپور تھپڑ دکان دار کو واپس اپنی دکان میں پلٹ جانے پر مجبور کر گیا۔

ظفریاب اس لڑکی کو اپنی کار کے پچھلے حصے میں لٹا

چکا تھا۔
وانیہ اور زریاب۔۔۔ اس کے دونوں بچے آگے کی سیٹ پر اس کے ساتھ آکر بیٹھ گئے تھے۔
وہ پورے ڈیڑھ مہینے اسپتال میں داخل رہی۔ اس کے ہوش میں آنے کے بعد ظفریاب کے دریافت کرنے پر اس نے اس سے کچھ نہیں چھپایا تھا۔ وہ اسے ہر بات بتاتی گئی اور اشک بہاتی گئی۔
ظفریاب کسی طبیب کی طرح ہی اس کے اندر کا حبس کم کرنا چاہتا تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال دے۔
وہ تیزی سے صحت یابی کی طرف گامزن تھی۔ ظفریاب نے اس کی مسیحائی میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ اس کے دونوں بچے کبھی کبھی ظفریاب کے ساتھ اس کے کلینک آتے تو صوفیہ سے بطور خاص ملتے۔
پھر ایک دن صوفیہ نے اسے اپنی واپسی کا کہا تھا۔
پورے چھ ماہ بعد وہ اپنے گھر لوٹی۔ نفیسہ ان چھ ماہ میں اتنا نہ روئی ہوگی۔۔۔ جتنا ان چھ گھنٹوں میں روئی جب صوفیہ اس کے سامنے بیٹھی تھی۔

☼ ☼ ☼

کپڑا بُنتے جولاہے سے جب بُنتے بُنتے کوئی دھاگا ٹوٹ جاتا ہے تو وہ آدھ بُنا کپڑا پھینک نہیں دیتا۔ بلکہ ٹوٹنے والے دھاگے کو ایک مضبوط گرہ لگا کر پھر جوڑتا ہے اور آگے کی بُنائی وہیں سے شروع کر دیتا ہے۔ پوری بُنائی کے بعد وہ گرہ تو کہیں نظر نہیں آتی۔ بظاہر تو یہ اس دھاگا کا عیب ہے۔ مگر جولاہا جانتا ہے کہ باقی سارے دھاگوں میں ٹوٹنے کا خدشہ موجود ہے مگر جس دھاگے میں دوبارہ گرہ لگی ہے' نسبتاً" تمام دھاگوں کے اس کی مضبوطی زیادہ ہو گئی۔
صوفیہ بھی اسی دوبارہ گرہ لگے دھاگے کی طرح تھی۔
نفیسہ نے وہ قانونی کاغذات صوفیہ کے حوالے کیے جو اسے رجسٹری کی صورت موصول ہوئے تھے۔ ان کاغذات میں نوید عثمان کی تمام جائیداد صوفیہ کے نام کردی گئی۔
نوید عثمان کی دریا برد موت صوفیہ کو غم سے دوچار کر گئی۔
وہ بے اختیار اس کی مغفرت کی طلب گار ہوئی۔ بارگاہ الٰہی میں اس نے نوید عثمان کی تمام جائیداد خیراتی ادارے میں خیرات کردی۔۔۔ نوید عثمان کے ایصال ثواب کے لیے اٹھائے گئے قدم نے ثابت کیا کہ صوفیہ کو نوید عثمان سے شکایت نہیں تھی۔
ہفتہ بھر بعد ہی صوفیہ سے اس کی عزیز از جان دوست ناہید ملنے آئی تھی ناہید کی یاسیت بھری ہنسی صوفیہ سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ اس نے صوفیہ سے کوئی پردہ رکھنا بھی نہیں چاہا۔ نبیل شادی کے بعد بھی اپنی آوارہ مزاجی سے باز نہ آیا تھا۔ وہ شاید واقعی ناہید سے محبت کرتا تھا۔ جب ہی ناہید کے واویلا کرنے پر وہ طیش میں آکر اسے طلاق دے دیتا اور جب غصہ ٹھنڈا ہو جاتا تو معافی مانگ کر دوبارہ تعلق قائم کر لیتا۔ ایسا کئی بار ہو چکا تھا اور نجانے کتنی بار مزید ہونے والا تھا۔
نبیل کی تمام جائز ناجائز حرکت کو برداشت کرتی اسے اپنے گناہ کی دلدل میں دھنستے چلے جانے کا احساس تھا بھی یا نہیں۔۔۔ صوفیہ کو بے اختیار ناہید کے وجود سے کراہیت ہوئی۔
شاید دنیاوی جہنم سے بھی ہر کسی کو واپسی کا راستہ نہیں ملا کرتا۔
توبہ کی توفیق ان کو ہوتی ہے جن کو خدا معاف کرنا چاہتا ہے۔
صوفیہ کو توبہ کی توفیق ملی تو بخشش زیادہ دور نہ تھی۔ ہاں یہ ہے کہ اپنے کیے کا عذاب بھگتنے کے بعد ہی وہ چھاؤں میں بیٹھنے کی حق دار ٹھہری تھی۔
صولت آنٹی ایک بار پھر صوفیہ کی خواہش مند ہوئیں۔
فرق یہ تھا کہ پہلے وہ ظفریاب پر دباؤ ڈال کر اسے صوفیہ سے منسوب کرنا چاہ رہی تھیں۔ اور اب ظفریاب از خود صوفیہ کو اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا تھا۔

نفیسہ نے انکار نہ کیا مگر صوفیہ، ظفریاب سے پوچھے بنا نہ رہ سکی۔
"اپنے متعلق ہر ایک بات میں خود اپنی زبانی آپ کو بتا چکی ہوں۔ میں کیسی ہوں؟ میری کوتاہیاں؟ میری کمزوریاں۔۔۔ سب کچھ جان لینے کے بعد بھی آپ کا سوال مجھے الجھن میں ڈال رہا ہے۔ خدا کے لیے ظفریاب! میں بہت ٹوٹ چکی ہوں۔۔۔ اب کسی اور آزمائش یا عذاب سے گزرنے کی سکت نہیں۔۔۔ میں اتنی صابر نہیں ہوں۔ اب اگر کوئی پہاڑ ٹوٹا مجھ پہ تو میں جڑ نہیں سکوں گی۔ خدا کے لیے! اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرلیں۔۔۔ میں ہمدردی کے بھی قابل نہیں ہوں آپ بہت اچھے ہیں۔ آپ کے مجھ پہ بہت احسانات ہیں۔ مگر مجھے اور زیربار نہ کیجیے۔"
ظفریاب سامنے صوفے پر بیٹھا تھا۔
"تم نے ٹھیک کہا۔ تم ہمدردی کے قابل نہیں ہو۔ تمہاری خامیاں' تمہاری کوتاہیاں۔۔۔ تمہاری کمزوریاں میں خوب جانتا ہوں۔ مگر تم میرے بارے میں کوئی رائے کس طرح قائم کر سکتی ہو؟ میرے پاس بھی میری کمزوریاں' کوتاہیاں اور خامیاں محفوظ ہیں۔ میں تم سے سب کچھ شیئر کروں گا۔ اگر تم رضا مندی دے دو۔" اس کی بات ذومعنویت سے بھرپور تھی۔
"میں نہیں کہوں گا مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ میں یہ بھی نہیں کہوں گا مجھے تم سے محبت ہے۔ مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ نائمہ کے بعد سے میری زندگی میں مزید کی کوئی گنجائش نہ رہی تھی۔ مگر تم سے مل کر میں نے اپنی زندگی میں گنجائش پیدا کی ہے۔ میری بیٹی وانیہ کا دایاں پاؤں ٹھیک نہیں ہے۔" ظفریاب کی بات پر صوفیہ کو حیرانی نہیں ہوئی۔ وہ یہ بات جانتی تھی۔
"میں نہیں چاہتا کل کو میری بیٹی بھی زندگی سے سبق لے۔ تم میری بیٹی کے لڑکھڑاتے قدموں کو سہارا دے دو۔ اسے صبر کرنا سکھا دو۔ قانع رہنا سکھا دو اسے بتاؤ کہ زندگی میں نصیب سے زیادہ کوئی لے نہیں سکتا اور جو کچھ ملنا ہے۔ وہ ہر صورت مل ہی جاتا ہے۔"
صوفیہ نے بغور اسے دیکھا۔
وہ کہہ رہا تھا کہ اسے صوفیہ سے محبت نہیں ہے۔ مگر صوفیہ نے اس بار خود میں ابھرتے "جذبہ محبت" کی پہچان میں غلطی نہیں کی تھی۔ وہ واقعی ظفریاب کی رحم دلی کی اسیر ہو گئی تھی۔ وہ ہلکے سے مسکرا دی۔
وہ ہزار دشواری و خواری کے بعد بالآخر اپنے حصے کی چھاؤں سمیٹنے سکون کی گھنیری شام کے نیچے آبیٹھی۔

ہر سبق سکھاتی ہے تجربے کے ہاتھوں سے
زندگی کا اپنا ہی اک نصاب ہوتا ہے

☼ ☼ ☼

صوفیہ تو اپنا بویا کاشت کرنے کے بعد ٹھنڈی چھاؤں میں ستانے بیٹھ گئی۔ مگر نوید عثمان کے ساتھ انصافی ہو گئی شاید؟
نوید عثمان ایسا تھا تو قصور دراصل کس کا تھا؟ وہ زندگی کی خوشیوں سے محروم کیوں رہا؟ وہ کیوں تڑپ تڑپ کے بمشکل زندگی گزارتا بالآخر موت کی گود میں جا سویا۔۔۔ یقیناً "ایسے لوگوں کے لیے ہی اللہ کا وعدہ ہے۔ "اور جب ہم قیامت کے روز انصاف کا ترازو کھڑا کریں گے تو کسی شخص کی ذرا بھی حق تلفی نہ کی جائے گی۔"

☼

صدف آصف



"ارے میرے اللہ۔۔۔ یہ لڑکی باؤلی تو نہیں ہو گئی ہے۔ بھلا بتاؤ۔۔۔ ہم نے اتنے ارمانوں سے عیدی بھیجی اور اس نے ایسی بدشگونی کر ڈالی کہ توبہ ہی بھلی، میں تو بتول بی بی سے صاف صاف بات کروں گی۔"

صفیہ بی بی نے سامنے دھرے چاندی کے نقشین پاندان پر اپنا سارا غصہ اتارا۔ اس کا ڈھکن یوں زور سے بند کیا کہ خیالوں میں کھوئی فاتاں مائی بھی اچھل پڑی۔

"ارے۔۔۔ چھوٹو بی بی! بچی ہے، آج کل کے بچوں کو ریت رواج کا کیا پتا، یہ تو آپ جیسی بیبیوں کے دم کا ظہور ہے کہ "سید گھرانے" کا نام بھی عزت سے لیا جاتا ہے۔"

بتول بی بی کا نام سن کر فاتاں مائی کی سٹی گم ہو گئی۔ لگیں صفیہ بی بی کی منتھی چاپی کرنے۔ وہ بڑی محتاط عورت تھی۔ دونوں گھرانوں کی مشترکہ نوکرانی، مگر مجال ہے کہ کبھی ایک گھرانے کی بابت دوسرے گھر میں بھاپ بھی منہ سے نکالی ہو۔ یہ ہی وجہ تھی کہ دونوں جٹھانی دیورانی ان پر آنکھ بند کر کے اعتماد کرتی تھیں۔ وہ باتیں بھی ان سے کر جاتیں، جو گھر کے مردوں سے چھپانا مقصود ہوتیں۔ ان میں سرفہرست ایک دوسرے کے خلاف وہ شکایات ہوتیں، جن کا کوئی وجود نہ تھا، مگر انسان جب کسی سے کد باندھ لیتا ہے تو اس کی اچھی نیت میں بھی فتور ٹٹول لیتا ہے۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی حال تھا، ایسے وقتوں میں فاتاں ایسے بن جاتی جیسے اسے اللہ نے سننے کی صلاحیتوں سے محروم رکھا ہو۔ وہ جانتی تھی اسی میں فلاح ہے، ورنہ بڑی خرابیاں ہو سکتی ہیں۔

اس کا تعلق اس گھرانے سے اس وقت سے تھا، جب سولہ سال کی فاطمہ کو خدیجہ بی بی۔ نے اوپر کے کاموں کے لیے رکھا وہ دن اور آج کا دن وہ یہیں کی ہو گئیں۔ اس وقت سید ہاؤس دو حصوں میں تقسیم نہیں ہوا تھا اور یہاں ان دونوں کی ساس جنت مکانی خدیجہ بی بی کی حکومت تھی۔ وہ بڑے کھلے دل کی تھیں کبھی کوئی سوالی یہاں سے خالی ہاتھ نہ گیا۔

"جانے کیسی بری گھڑی تھی جو زبان پھسل گئی ورنہ میری مجال تھی جو سفینہ بٹیا کی بات یہاں کرتی۔" فاتاں مائی توبہ تلا کرتی سید ہاؤس کے دوسرے حصے کی طرف بڑھ گئی۔ جہاں اب بتول بی بی کا راج تھا۔



"ارے لڑکی! میں کہتی ہوں ہوش کے ناخن لو۔۔۔ تم صفیہ بی بی کو ابھی جانتی نہیں ہو۔ وہ تو بدشگونی۔۔۔ بدشگونی کر کے! اس بات پر اتنا واویلا مچائیں گی کہ تمہارا جینا حرام کر دیں گی۔" بتول بی بی سر پکڑے بیٹھی سفینہ کو دیکھ رہی تھیں، جو لمبے بالوں کو سلجھا کر اب انہیں چوٹی کی شکل میں گوندھ رہی تھی۔

"اماں۔۔۔ ایک بات تو بتائیے، کیا کسی غریب کی مدد کرنا ہمارے دین اور روایات کے خلاف ہے؟ یہ تو دادی جان کے زمانے سے ہمارا معمول رہا ہے کہ اس در سے کوئی سوالی خالی ہاتھ نہ جائے۔ اسی پر تو سید گھرانہ فخر کرتا ہے نا۔" سفینہ نے سنجیدگی سے ماں سے پوچھا۔ وہ دادی کا پرتو تھی ان ہی کی طرح موم کی گڑیا جیسی نرم و نازک اور سب سے نرم و ملائم تو اس کا دل تھا جو ہر لاچار کی آواز پر مدد کے لیے ہمک اٹھتا۔

"نہیں۔۔۔ میں نے کب منع کیا کہ غریب کی مدد نہ کرو۔۔۔ تم بھول گئیں کہ میں نے پچھلے دنوں کتنے سارے کپڑے نکال کر برکت خالہ کو دیے تھے اور اوپر سے پورے پانچ سو روپے بھی دیے تھے۔" انہوں نے فخر سے بیٹی کی طرف دیکھ کر اسے یاد دلایا۔

"اب میں کچھ بولوں گی تو بدتہذیبی میں شمار ہو گا۔ میری بھولی اماں۔۔۔ ایمان داری سے بتائیے گا کہ وہ اتنی دفعہ کے استعمال شدہ گھسے ہوئے کپڑے اس قابل تھے کہ وہ اپنی بیٹی کے جہیز میں رکھ پاتیں۔ آپ نے اپنی نیکی کے زعم میں ان کے چہرے پر پھیلی ہوئی مایوسی دیکھی ہی نہیں، مگر میرا دل ان کی مایوس نگاہوں پر بھر آیا، وہ بڑی آس لے کر ہمارے پاس آئی تھیں۔ ان کی یتیم بیٹی کے لیے محلے کے ہر گھر سے ایسا ہی سامان نکلا، جو فالتو، سمجھ کر پھینکنے کے لیے کہیں باندھ کر رکھ دیا گیا تھا۔

اماں۔۔۔ مجھے اپنے فیصلے پر کوئی دکھ نہیں، میری وارڈ روب کپڑوں سے بھری ہوتی ہے۔ اگر اس عید پر تائی جان کے "عیدی" میں بھیجے ہوئے دس جوڑے میں نہیں سلواؤں گی تو کوئی بھونچال نہیں آجائے گا، مگر یہ بات میرے دل کو سکون پہنچاتی رہے گی کہ ان جوڑوں کی وجہ سے برکت خالہ کے کاندھوں سے بیٹی کے جہیز کے کپڑوں کا بوجھ کم ہو گیا ہے۔" سفینہ کا چہرہ اندرونی خوشی سے دمک رہا تھا۔

"ارے اسی دن کے لیے میں تمہارے بابا سے کہتی تھی کہ لڑکی کو اتنا نہ پڑھاؤ، سر پر ناچے گی۔۔۔ مگر کہاں جی، انہوں نے کبھی میری کوئی بات مانی ہے، جو یہ بات مانتے، اوپر سے آفاق میاں بھی تمہاری ہر بات سن کر سر دھننے لگتے ہیں۔ فوراً چاچا جان سے سفارش کر بیٹھے کہ جب تک سفینہ ماسٹرز نہیں کرے گی وہ رخصتی نہیں کرائیں گے۔ ان کے بھی کان مروڑنے پڑیں گے کہ میاں، جی ابھی سے بی بی کو اتنا سر پر نہ چڑھاؤ کہ بعد میں اتارنا مشکل ہو جائے۔"

صفیہ بی بی سے ان کی ناراضی اپنی جگہ، مگر وہ اب اپنے داماد کو بیٹی سے بھی زیادہ چاہنے لگی تھیں۔ اس میں آفاق کی تین سالہ محنت شامل تھی، جو چچی کم ساس کا دل جیتنے کے لیے اس نے صرف کی ماں کے انداز بیاں پر سفینہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔



سفینہ کی آفاق علی سے بات چیت نہیں تھی۔ وہ حجاب کرتی تھی۔ اس نے "کانا پردہ" نہیں اپنایا تھا، بلکہ وہ ہر جگہ حجاب میں جاتی تھی۔ کالج سے یونیورسٹی تک کسی نے اس کی شکل نہیں دیکھی۔ وہ تایا کے گھر جانے میں بھی احتیاط برتتی تھی۔ نکاح سے قبل وہ آفاق اور اس کے چھوٹے بھائی شاداب کے سامنے بھی نہیں آتی تھی۔ نکاح کے بعد بھی آفاق کے سامنے آنے میں اس کی شرم و حیا مانع تھی۔ کچھ اپنے گھرانے کی روایات کی پاسداری کرتے ہوئے وہ رخصتی سے قبل آفاق سے بے تکلف ہونا نہیں چاہتی تھی۔

آفاق اس دل کا کیا کرتا جو صرف سفینہ کے لیے ہمکتا تھا، مگر وہ بیوی کی خواہش کی پاس داری میں اپنے دل کو سمجھا لیتا۔ پھر بھی اس کے کان سفینہ کی بابت ہر بات جاننا چاہتے تھے۔ بیوی تو ہاتھ آتی نہ تھی اسی لیے اس نے بہن کا سہارا ڈھونڈ لیا۔

سلمیٰ جو سفینہ کی تایا زاد بہن ہونے کے ساتھ رازدار سہیلی بھی تھی، کے ذریعے وہ سفینہ کے بارے میں تمام باتوں سے باخبر رہتا اور دادی جان کو دعائیں دیتا جن کے وسیلے سے اس کے دل کی مراد بر آئی اور



خاندان کا یہ ہیرا اس کی زوجیت میں آگیا۔ ورنہ ان دونوں کی ماؤں نے تو اس رشتہ پر کبھی ہامی نہیں بھری تھی۔ بہوؤں کے بارے میں دادی کے خدشات بے جا نہ تھے۔ وہ دیکھتی تھیں کہ دونوں میں کبھی نہ بنی۔ وہ دونوں چھوٹے دل کی کنجوس عورتیں سسرالی رشتوں کے لیے اپنا دل وسیع نہ کر سکیں۔ وہ تو بھائیوں میں مثالی یگانگت تھی تو وہ بیویوں کو دبا کر رکھتے' ورنہ زمانے بھر میں بنی بنائی ساکھ خاک میں مل جاتی۔

خدیجہ بی بی کی دور رس نگاہوں میں مستقبل کا نقشہ کھنچا چلا آرہا تھا۔ اسی لیے جب وہ شدید بیمار پڑیں تو اپنے فرماں بردار بیٹوں کو بٹھا کر آخری خواہش کا اظہار کیا اور دل پر پتھر رکھ کر ایک وصیت بھی کی۔ وہ جانتی تھیں کہ ان کے آنکھ بند ہونے کی دیر ہے' "سید ہاؤس" تتر بتر ہو جائے گا۔ بیٹے ماں کا ہاتھ تھام کر رو پڑے۔ انہیں یہ فیصلہ منظور نہ تھا مگر ماں کو اپنے خاندان کی جگ ہنسائی کی فکر تھی' انہوں نے بیٹوں کو منا ہی لیا۔

ماں کی آخری خواہش کا احترام کرتے ہوئے بیویوں کے مچلنے کے باوجود پانچ سال قبل سفینہ اور آفاق کا نکاح دھوم دھام سے کیا گیا' جس میں دونوں ماؤں نے بجھے دل کے ساتھ شرکت کی۔ اماں کے انتقال کے بعد ان کا فیصلہ وصیت کی شکل میں یوں سامنے آیا کہ ایک ہزار گز پر پھیلے ہوئے "سید ہاؤس" کو دو حصوں میں بانٹ کر بیچ میں ایک دیوار کھڑی کر دی گئی۔ سب اداس تھے' سوائے بتول اور صفیہ کے' انہوں نے ہاتھ پھیلا پھیلا کر ساس کو پہلی بار دعاؤں سے نوازا۔

☼ ☼ ☼

"بھائی۔۔۔ آپ تو جانتے ہیں نا سفینہ تو پھر سفینہ ہے' اس نے چچی جان سے بارہا کہا کہ وہ برکت خالہ کی بیٹی کے لیے اس کے جہیز کے لیے رکھے ہوئے کپڑوں میں سے کچھ جوڑے نکال دیں۔۔۔ مگر وہ شگونی۔۔۔ بدشگونی کرتی رہیں' اس نے کہا بھی کہ ایک مسلمان گھرانے میں شگن' بدشگونی کا کیا کام۔ اس کا کہنا تھا کہ اسلام میں کسی بھی عمل کو بدشگونی کے مترادف قرار دینے کی ممانعت ہے اور جہاں کسی یتیم کی مدد کا سوال آجائے تو وہاں تو دین میں بہت وسعت ہے۔ مگر چچی جان کچھ سننے کو تیار نہ تھیں۔ بس سفینہ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' یہاں سے عیدی میں جو کام والے دس جوڑے گئے تھے' باقی کے لوازمات کے ساتھ برکت خالہ کے یہاں دے آئی۔ چچی جان نے تو جو غدر مچایا وہ الگ مگر جب سے یہ بات اماں کے علم میں آئی ہے' وہ الگ سفینہ سے ناراض بیٹھی ہیں۔" سلمٰی نے ہنستے ہنستے سارا واقعہ بھائی کے گوش گزار کیا۔

آفاق کا دل خوشگوار انداز میں دھڑکا' وہ سفینہ کی نیک طبیعت کا دل سے قائل ہوا۔

"جب بیوی نے انسانیت کے حوالے سے اپنا فرض ادا کر دیا تو شوہر ہونے کی حیثیت سے میرا بھی کچھ فرض ہے۔" آفاق بہن کی طرف دیکھ کر سوچتے ہوئے گویا ہوا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ سلمٰی نا سمجھی کے عالم میں بھائی کی چوڑی پشت گھورتی رہی۔

☼ ☼ ☼

"ہائے۔۔۔ میرے اللہ جی۔۔۔ میں کیا کروں؟ یک نہ شد دو شد میں تو یہاں بہو کو ہی کوس رہی تھی یہ بیٹے صاحب ان سے بھی دو ہاتھ آگے نکلے۔" صفیہ بی بی ہاتھ مل کر غصے کا اظہار کر رہی تھیں۔

"ارے بیگم صاحبہ کیا ہوا؟ کچھ بتاؤ گی بھی کہ ایسے ہی واویلا کر کے میرا روزہ خراب کرو گی۔" ثاقب علی نے بدمزہ ہو کر بیوی کو گھورا اور جوتے پر کپڑا پھیرنے لگے۔ وہ دکان جانے کی تیاری کر رہے تھے' ان کا سونے کا خاندانی کاروبار تھا' دونوں بھائی سنار تھے۔ چار دکانیں شہر کے بڑے صرافہ بازار میں واقع تھیں۔ ان کی ایمانداری کی وجہ سے جو ایک بار ان کے یہاں سے زیور بنواتا' یہیں کا ہو جاتا' باپ کی چھوڑی ہوئی ایک دکان ان دونوں بھائیوں کی محنت سے اب چار دکانوں میں تبدیل ہو چکی تھی۔

"ارے چھوڑیے۔۔۔ بس وہ ایسے ہی۔۔۔ آپ دکان جائیں۔ دیر ہو رہی ہوگی۔" صفیہ بی بی ایسی باتیں

میاں سے چھپاتی تھیں' مگر اب جوش و جذبات میں شوہر کے سامنے ہی بین کر کے پھنس گئیں۔ لگیں ٹالنے۔

"نہیں۔۔۔ آپ بتائیے' آج ویسے بھی بھائی جان کو دکان پر کچھ کام تھا' وہ جلدی پہنچ گئے ہیں۔" ثاقب علی کچھ سوچ کر فرصت سے بیوی کے سامنے بیٹھ کر ہمہ تن گوش تھے۔ "مرتا کیا نہ کرتا" کے مصداق وہ شروع ہو گئیں۔

"پچھلی گلی میں۔۔۔ جو وہ برکت خالہ رہتی ہیں نا۔۔۔ جو ہماری بیٹیوں کے کپڑے سیتی ہیں' ان کی بیٹی کی عید کے بعد شادی ہے۔" انہوں نے رک رک کر بات شروع کی۔ شوہر کے مزاج سے ڈر بھی لگتا تھا۔

"وہی نا۔۔۔ جن کے شوہر ابا جی کے ڈرائیور تھے اور ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں جاں بحق ہو گئے تھے۔" ثاقب علی نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

"جی وہی۔۔۔ برکت خالہ مدد مانگنے بتول کے پاس گئی تھیں اس نے اپنے طور پر کچھ مدد کر دی ہو گی مگر سفینہ نے ہمارے گھر سے گئی ہوئی عیدی کا سارا اسباب اٹھا کر اس لڑکی کی شادی کے لیے دان کر دیا۔" انہوں نے جلبلا کر کہا۔ ثابت علی کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔

"بٹیا نے بہت اچھا فیصلہ کیا۔۔۔ میں بھاوج اور تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس بے چاری بیوہ کی کیسی مدد ہو گی؟ جب ہی تو سفینہ بٹیا نے یہ قدم اٹھایا' تمہیں اس بات پر کیا اعتراض ہے؟" ثاقب علی نے بہو کی کارگزاری پر خوش ہوتے ہوئے کڑی نظروں سے بیوی کو گھورا اور پوچھا۔

"نہیں جی۔۔۔ وہ آفاق بھی کل برکت خالہ کو بتول کی طرف سے آنے والے عیدی کے سارے کپڑے اور ساتھ میں کچھ پیسے بھی دے آیا۔" صفیہ بی بی منمنائیں تو ثاقب علی دل کھول کر ہنسے۔

"آپ سمجھتے کیوں نہیں' کیسی بدشگونی ہو گئی ہے۔" صفیہ بی بی کا جلال لوٹ آیا۔

"توبہ توبہ بیگم صاحبہ! کیسی باتیں کر رہی ہیں' ہمارے [illegible] مند تو ہمارے بچے ہیں۔ یہاں کسی یتیم کی زندگی بن رہی ہے' آپ کو شگنوں کی پڑی ہے۔ ارے یہ نیک اعمال تو آپ کی اولادوں کی زندگی میں آنے والی بلاؤں اور مصیبتوں کو ٹالیں گے نا کہ بدشگونی لائیں گے واہ اماں! آپ کے ایک دانش مندانہ فیصلے سے میرا گھر جنت بن گیا' صحیح کہا ہے کسی نے "ایک عورت ہی گھر کو جنت بناتی ہے یا دوزخ۔"

آفاق جو کمرے میں چھپ کر ماں باپ کی گفتگو سن رہا تھا۔ مسکراتا ہوا صحن میں آکر باپ کے پہلو سے جڑ کر تخت پر بیٹھ گیا۔ صفیہ منہ بنا کر وہاں سے اٹھ گئیں۔

"بیٹے جی۔۔۔ کل دکان سے اپنے حساب میں سے پندرہ ہزار اور میرے حساب میں سے پچاس ہزار لے لینا اور خاموشی سے جا کر برکت خالہ کو دے آنا۔ شادی بیاہ کے سو خرچے ہوتے ہیں' بیٹیاں تو سب کی سانجھی ہوتی ہیں' پھر اماں خالو نے تو والد بزرگوار کی بہت خدمت کی تھی' ان کی بیٹی کا ہم پر حق بنتا ہے۔" ثاقب علی نے سکون سے آنکھیں موند لیں۔

"ٹھیک ہے ابا جی۔۔۔ میں کل سارے پیسے خالہ کو دے آؤں گا۔" آفاق بھی باپ کی بات پر کھل اٹھا۔

"اوں۔۔۔ ہوں۔۔۔ صرف پچاس ہزار خالہ کو پہنچانے ہیں۔" ثاقب علی کچھ شرارتی انداز میں بولے۔

"جی۔۔۔ باقی پندرہ ہزار کا کیا کرنا ہے؟" آفاق نے نہ سمجھنے والے انداز میں باپ کو دیکھا۔

"ارے سلمٰی کو دینا کہ وہ جا کر سفینہ کے لیے اچھا سا جوڑا اور باقی لوازمات لے آئے۔ بیوی کو عیدی نہیں بھیجو گے؟ ویسے اگلے سال سے تو یہ شگن بدشگنی کا سلسلہ ہی ختم ہو جائے گا۔ میں نے بھائی صاحب سے بات کر لی ہے بقر عید کے بعد تم دونوں کی رخصتی کروا رہا ہوں۔"

ثاقب علی نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر دباؤ ڈالا اور پیار سے بولے۔ آفاق علی نے مسکرا کر باہر کی جانب قدم بڑھا دیے کہ نیکی کرنے میں دیری کیسی؟

☼



سائرہ رضا

حکایت اصل

مکمل ناول

کلیم! کلیم! کلیم۔۔۔!" اس نے اپنے عود کر آتے شدید ترین غصے اور بے بسی کو اس کے نام کی تکرار کرتے ہوئے جیسے پرسکون رہنے کی تلقین کی۔

رونے سے آنکھیں سرخ، پلکیں نم اور ناک سے پانی بہہ رہا تھا۔ ٹشوز کا ایک ڈھیر۔ شدید ترین غصے کی حالت میں بھی اسے احساس تھا کہ ٹشو کا چڑمڑ گولا ڈسٹ بن کے اندر ہی جائے۔

کینٹین والے بوڑھے بابا اسے تنبیہہ کر گئے تھے۔

"جتنا مرضی رو لو اور جھگڑ لو۔ لیکن اگر گلاس ٹوٹا یا برتن اٹھا کر پھینکے یا گند کیا تو اسی سے صفائی کروائی جائے گی۔"

اور زرین تو ہاتھ سے اٹھا کر تنکا بھی نہیں توڑتی تھی۔

کلیم نے اس چیز کو گہری نگاہ سے جانچا یعنی پاسبان عقل ساتھ ہی تھا۔ اس نے ایک بار پھر لمبی سانس لے

کر ناک پونچھی تو اردگرد بیٹھے کئی لوگ متوجہ ہوئے۔ خبر تو خیر سب کو تھی ہی کہ ادھر کیا چل رہا ہے۔

"زرین۔۔۔ زرین۔۔۔ زرین۔۔۔! سب ادھر ہی دیکھ رہے ہیں۔ اب بس بھی کردو۔" اس نے خوامخواہ کی کوشش کی۔

"ہاں تو دیکھنے دو، میں کسی سے نہیں ڈرتی۔" وہ بھڑکی۔

"بات ڈرنے کی نہیں ہے۔ بات شرم کی ہے۔" وہ منمنایا۔

"شاباش۔۔۔ تم اب سمجھے۔ بات شرم کی ہے۔" اس نے داد دینے والے انداز میں کہا۔ "اور یہی میں تم کو کب سے بتا رہی ہوں کہ تم ایسا کیسے کرسکتے ہو۔"

"میں نہیں۔۔۔ میری امی۔۔۔!" کلیم نے تصحیح کرنا ضروری سمجھی۔

"خبردار!" زرین نے تادیبی ہاتھ ہوا میں کھڑا کیا۔ "تم کوئی منے کاکے ہو جو اماں کی گود میں چڑھ کر جاؤ گے۔ ہیں؟"

"نہیں نہیں۔ اب ایسا بھی نہیں، میں چل کر جاؤں گا۔ گود میں کیوں۔۔۔"

"اسی بات کا تو رونا ہے کہ تمہارے اپنے دل میں بال ہے تم بے وفا۔۔۔ طوطا چشم، خود غرض۔۔۔ امی کا صرف بہانہ ہے۔" وہ چلائی۔

"یہ سب میں؟" کلیم تاسف میں گھر گیا۔ اس نے بے یقینی سے انگشت شہادت اپنے سینے پر رکھ کر بہت مدہم آواز میں تصدیق چاہی۔

"ہاں ہاں۔۔۔ نہ صرف یہ بلکہ دنیا کی ہر زبان میں تم جیسوں کے لیے جتنے الفاظ لکھے گئے ہیں، وہ سب تم ہو۔"

اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرتے چہرے کو بھگوتے دوپٹے میں جذب ہونے لگے۔ رونا اور بے تحاشا رونا زرین کا بچپن کا شوق تھا۔ وہ سچا اور جھوٹا ہر طرح سے رونے میں ماہر تھی مگر بھیگا سا چہرہ، شکوہ کناں آنکھیں اور بھیگی پلکیں۔۔۔ کلیم کے دل کو کچھ ہوا۔

"تم میرا یقین کیوں نہیں کرتیں زرین۔۔۔ میں ہوں نا!" اس کے لہجے میں بھروسا اور اعتماد کھل گیا۔ زرین کے بے قرار دل کو پلک جھپکتے سکون کا سا احساس ہوا لیکن اگلے ہی پل یادداشت کے پردے میں فلم سی چلی۔ وہ ایک بار پھر بے یقین ہوئی اور بھڑک اٹھی۔ کلیم بول رہا تھا۔

"میں نے کب تمہیں مایوس کیا۔ جو جو تم نے کہا، وہ میں نے کیا۔ جیسے بھی کیا مگر تمہاری بات کبھی ٹالی نہیں اور تم اب بھی۔۔۔ یار! میرا پچھلا ریکارڈ کھنگالو۔ سب جگہ ٹک مارک لگے ہوں گے اور میں نے ہمیشہ فل مارکس لیے ہیں۔"

"تم نے ہمیشہ جگاڑ لگائے کلیم۔" اس نے یاد دلایا۔ "سمجھو نقل ماری۔"

"او یار! تمہیں مایوس تو نہیں کیا نا۔ میں تو بچپن سے تمہارے پیچھے چلنے کا عادی ہوں اور تم ہو کہ پھر بھی۔" وہ روہانسا ہی ہوگیا۔

"وہ چھوٹے موٹے ایسے ہی خوامخواہ کے معاملات تھے، حل نہ بھی ہوتے تو کوئی قیامت نہ آتی، مگر یہ۔۔۔" زرین نے ہچکی سی لی۔

"کیا؟" کلیم پہلی مرتبہ چلایا۔ "وہ سب ایسی ہی خوامخواہ کی باتیں تھیں اور اس وقت تو تم ایسے طوفان مچاتی تھیں کہ زندگی موت کا مسئلہ بن جائے گا اگر یوں اور ووں نہ ہوا اور آج کہتی ہو۔" کلیم تو جیسے دکھ سے ادھ موا ہوگیا۔

"تمہیں پتا ہے ان خوامخواہ کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے میں کن کن مراحل سے گزرتا تھا اور آج تم کہتی ہو کہ۔۔۔"

"وہ لاکھ مشکل کام ہوں گے، مگر ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا تھا؟" زرین نے الٹا سوال کردیا۔ کلیم نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ تو جیسے شدید صدمے کے زیر اثر تھا۔

"ذرا کھنگالو اپنی یادداشت۔۔۔ آؤ تاذرا ایک بار فلیش بیک میں جھانکتے ہیں۔ کب۔۔۔ کب۔۔۔ اور کیا کیا۔۔۔؟"

دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

وہ دن ان کی یادداشت میں روشن ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

"صرف سو روپے۔۔۔؟" اس نے نوٹ کو الٹ پلٹ کر حیرانی سے یوں دیکھا اور مسلا جیسے ایک چسپاں خفیہ نوٹ ابھی سامنے آجائے گا۔

"ہاں۔۔۔ صرف سو روپیہ۔۔۔" نفیسہ باقی نوٹ بٹوے میں جما کر رکھ رہی تھیں، پھر ذرا سا پہلو بدل کر بٹوہ گریبان کے غار میں غائب کردیا تو اس نے سر ہی پیٹ لیا۔ کہیں ادھر ادھر رکھ دیتیں تو وہ کچھ نہ کچھ اڑا لیتا۔

"اماں۔۔۔ میں یونیورسٹی میں پڑھتا ہوں۔" اس نے احتجاج کیا۔

"ہاں پتا ہے مجھے، یونیورسٹی میں پڑھتا ہے۔ تب ہی سو روپے دیے ہیں۔ کبھی دیکھا ہے مجھے ادیبہ، عرشیہ اور زعیم کو سو کا نوٹ دیتے؟"

"آپ کو پتا ہے نا یونیورسٹی کتنی دور ہے؟ تین تین چار چار بسیں بدل کر پہنچنا پڑتا ہے۔ اور پندرہ بیس روپے سے کرایہ کم ہو کسی ایک کا بھی تو۔۔۔"

"تو۔۔۔ تم اسٹوڈنٹ کارڈ کیوں نہیں استعمال کرتے۔۔۔" نفیسہ تیار۔

"گئے وہ زمانے جب کارڈ چلتا تھا۔ راشن کارڈ، شناختی کارڈ، اور اسٹوڈنٹ کارڈ اب ڈیبٹ کارڈ کا زمانہ ہے اور بیلنس کارڈ۔ کوئی بس یونیورسٹی کی طرف منہ نہیں کرتی۔ بس وہ پہلی والی مزدا جاتی ہے یا یونیورسٹی کے اندر چلتے ہیں پھٹ پھٹ رکشے۔۔۔ مین گیٹ سے اردو ڈپارٹمنٹ کے موڑ تک لائن سے رکشے۔۔۔ اور وہ موذی سے پٹھان کنڈیکٹر۔۔۔"

اس نے جل کر روانی سے تقریری انداز اختیار کیا تھا۔ سخت بدمزا ہوکر سانس لینے رکا۔

وہ کنڈیکٹر اسٹوڈنٹ کے نام پر اسے گھورتے ہیں کہ بندے کا دم نکل جائے۔۔۔ "خوچہ! اتنا بڑا بڑا آدمی ہو کر۔۔۔ داڑھی مونچھ رکھ کے اسٹوڈنٹ بن کر دھوکا دیتا ہے۔ خود کو بھی، ام کو بھی اور اپنے باپ کو بھی۔۔۔ سیدھا سیدھا محنت مزدوری پر لگتا، شام کو چار پیسے باپ کے ہاتھ رکھتا۔ تمہارا عمر کے آدمی کا اودر امارے گاؤں میں پانچ پانچ بچے ہوتا اور تم اودر حرام خوری کرتا۔۔۔ بنتا ہوگا تمہارا باپ الو، پر ام نہیں۔۔۔ پورا کرایہ نکالو۔۔۔ ورنہ ام بس سے باہر نکال دے گا۔ ہاں!"

نفیسہ دم بخود بیٹے کا پشتو تلفظ اور روانی دیکھ رہی تھیں۔ خاموش ہونے پر چونکیں۔ وہ امید بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا کہ شاید اب سو کا ایک نوٹ اور برآمد ہوجائے گا، مگر وہاں تو معنی خیز ہنکارا تھا۔

"ویسے کہتا تو وہ پٹھان ٹھیک ہی ہے۔" وہ اب اندر کچن کی جانب بڑھ رہی تھیں۔

"اماں۔۔۔" وہ چونکا اور پیچھے لپکا۔ "بیس، بیس روپے بھی کرایہ لگے نا۔۔۔ تو چار بسوں کے بعد بیس روپے بچتے ہیں اور اللہ۔۔۔" وہ بال نوچنے ہی لگا تھا۔ "بیس روپے میں تو پانی کی بوتل بھی نہیں آتی۔"

"تو بوتل لینے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ گھر سے پانی لے کر جاؤ۔۔۔ ابلا ہوا چھنا ہوا صاف پانی۔۔۔ اور بوتلیں بھی گھر میں ہزاروں۔۔۔"

"امی! میں یونیورسٹی میں پڑھتا ہوں۔۔۔" وہ چلایا۔

"تو یونیورسٹی والے پانی نہیں پیتے۔۔۔ خیر میں کل ہی بوتل تیار کردوں گی۔۔۔"

"وہی بوتلیں نا جو میں نرسری سے میٹرک تک استعمال کرتا تھا۔۔۔ فیتے والی۔۔۔ میرے مالک! اب میں گلے میں پانی کی بوتل ڈال کر یونیورسٹی جاؤں گا۔ ارے میری ماں پچاس کا نوٹ اور دے دیں میں آپ۔" اس نے ٹون بدلی۔ گھڑی کی سوئیاں آگے بڑھ چکی تھیں۔ اب منت سماجت کا ٹائم تھا۔

"بندے کے ساتھ سو ایمرجنسی پیسے گر بھی سکتے

ہیں۔ گھر کیسے آؤں گا؟"

"بس کرو ے کلیم۔۔۔" نفیسہ عاجز آ گئیں "گھر کیسے آؤں گا؟؟؟ لڑکے کب بسوں میں سوار ہوتے ہیں، تمہارے ماموں نے ساری زندگی لفٹ لی۔ یونیورسٹی سے ناگن۔۔۔ ناگن چورنگی سے حسن اسکوائر۔۔۔ حسن اسکوائر سے اگلی گاڑی لالو کھیت۔۔۔ لالو کھیت سے ناظم آباد۔۔۔ اور۔۔۔"

"اماں۔۔۔ اماں اماں۔۔۔ وہ اور زمانہ تھا۔ لوگ لفٹ دے دیتے تھے اسٹوڈنٹ کو۔ اب کوئی نہیں دیکھتا۔ بھلے کوئی تڑپ تڑپ کر جان دے دے۔"

اماں کی معلومات، سارے روٹ انہیں ازبر تھے اور مثال کے لیے ماموں۔۔۔ اف

"تو۔۔۔ تو چاچا کے ساتھ کیوں نہیں جاتا۔ وہ چھوڑتے ہیں نا اپنی لاڈو کو۔۔۔ تو بھی گھس جایا کر اندر۔۔۔"

وہ ایسے جھنجلایا جیسے کپڑوں میں کوئی کیڑا گھس گیا ہو۔

"میں کے جی کلاس میں نہیں پڑھتا اماں کہ چاچا پک اینڈ ڈراپ کریں گے اور پھر بھی آپ کے کہے گھس جاتا ہوں۔۔۔ مگر چاچا اپنی لاڈو کو آج کل تھرڈ پیریڈ کے حساب سے چھوڑتے ہیں۔ مجھے پہلا پیریڈ لینا ہوتا ہے۔"

نفیسہ نے رخ موڑ لیا۔ انہیں جیسے کوئی پروا نہیں تھی۔ بھلے بولتا رہے۔ وہ سو روپے دے چکی تھیں۔ برتن دھونے لگیں۔

"ٹھیک ہے نہ دیں۔ سنبھال کر رکھ لیں سو کے نوٹ۔۔۔ گنتی رہیے گا زندگی بھر۔۔۔ آپ کا اصل سرمایہ میں ہوں کہ یہ نوٹ۔۔۔ بیٹھ جاؤں گا میں بھی ماموں کی طرح کسی ایرے غیرے کی گاڑی میں۔ پہنچا دے گا وہ مجھے کہیں آگے۔۔۔ گمشدہ افراد میں کل میرا بھی نام ہوگا۔ پھر روتی رہیے گا۔ جا رہا ہوں میں۔"

وہ بے حد خطرناک اعلان کر کے تیزی سے باہر نکلا۔

نفیسہ ششدر رہ گئیں۔

"ہائے اللہ نہ کرے۔۔۔ ارے رک۔۔۔ رک۔۔۔ کلیم کلیم! صبح صبح کیسی منحوس باتیں۔۔۔ ارے لے جا سو کا نوٹ۔۔۔" وہ بے حد ہڑبونگ کے عالم میں بٹوہ نکال رہی تھیں۔ بیٹا گیٹ پار کرنے کو تھا۔ دوڑ کر آتی ماں کو دیکھا بھی نہیں۔ نفیسہ ہی نے ہمت دکھائی۔

بٹوے سے برآمد کیے نوٹ خود ہی اس کی جیب میں ٹھونسے۔

وہ نروٹھے پن سے کھڑا ہی رہا۔۔۔ نفیسہ نے ایڑیاں اٹھا کر لمبے بیٹے کی پیشانی بھی چومنے کی کوشش کی۔ بیٹا ہنوز اکڑا، سوجا، روٹھا۔

"فی امان اللہ۔۔۔ دھیان سے جانا۔"

وہ ایسے تڑلے بیل کی طرح بھاگا۔ نفیسہ تب تک دروازے پر کھڑی آیات پڑھ کر پھونکتی رہیں جب تک وہ نظر آتا گیٹ بند کر کے اندر جاتے جاتے بھی دہل کر لاحول پڑھتی رہیں۔

ادھر صاحبزادے نے گلی کا موڑ مڑنے کے بعد تسلی سے نوٹ باہر نکالے ادھر ادھر محتاط نگاہوں سے دیکھا پھر ایک خبیثانہ سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیلی۔۔۔ کنجوس اماں نے خوف زدہ ہو کر جذبات میں آ کر پورے دو سو دس روپے جیب میں ٹھونسے تھے۔ واہ۔

☼ ☼ ☼

"میں تمہارے لیے سب کچھ کر سکتا ہوں۔۔۔ اب تو تمہیں یقین آ گیا ہو گا نا؟" اسے خوب لطف اندوز ہو کر بریانی کھاتا دیکھ کر اس نے جتایا۔

اس کا مزے سے چلتا منہ رک گیا۔ "یہ صرف دو سو روپے کی بریانی اور کولڈ ڈرنک ہے کلیم! اور تم کہتے ہو کہ سب کچھ کر سکتے ہو؟"

"اور یہ صرف دو سو روپے میں نے کیسے حاصل کیے ہیں۔ یہ تو تم جانتی ہی ہو گی۔"

"ہاں وہ بات دوسری ہے۔ مجھے اندازہ ہے کہ تم نے کتنی محنت کی ہو گی۔" اس نے ڈیلے گھمائے۔

"اتنے امیر باپ کی بیٹی ہو کر تم نے مجھے پورے ایک ہفتے سے ذلیل کر رکھا تھا زرین!"

"کہاں ذلیل کر رکھا تھا۔۔۔ ایک فرمائش ہی تو کی تھی کہ بریانی کھلا دو۔ قسم سے میری زبان ترس گئی ان چٹ پٹے ذائقوں کے لیے۔۔۔ دنیا کو ہوتا رہتا ہے ہر روز ڈائریا۔۔۔ مگر میری ماں نے تو وہ ایمرجنسی لگا دی کہ توبہ توبہ۔ دل الٹ گیا میرا پرہیزی کھا کھا کے۔۔۔ اوپر سے میرے امیر والد صاحب کو بھی کڑے نتائج کی دھمکیاں دیں کہ اگر مجھے پیسے دیے گئے تو۔۔۔ نرسری کے بچوں کی طرح گھر سے لنچ اور جوس لا رہی ہوں۔ روز امید بھری نگاہوں سے ابا کو دیکھتی ہوں کہ شاید ترس آ جائے مگر وہ ایسے انجان بن جاتے ہیں جیسے جانتے نہیں پہچانتے نہیں، ہونہہ!"

وہ منہ بسور کر بولی۔

"چلو آج تو دل ٹھنڈا ہو گیا ناں۔۔۔" وہ مسکرایا۔

"ہاں شکر خدا کا۔۔۔ اور شکریہ بھی کہ اماں فقط ڈاکٹر بنی کی ماں ہیں اگر خدانخواستہ خود ڈاکٹر ہوتیں تو ہمارا کیا ہوتا۔ یہ سارا اختناس شرمین آپا ہی کا بھرا ہوا ہے۔ پہلے ہی سیر تھیں اوپر سے میاں بھی ڈاکٹر مل گیا۔۔۔ جب بات کریں گے ہائی جین کے اوپر اور بچی ان کی پیروکار۔"

وہ بھی زرین کا ہم خیال تھا۔ ایک طرف اگر اپنی اماں کی مشہور زمانہ کنجوسی سے عاجز تھا تو دوسری جانب بھتیجی کے صحت نامے پر مکمل در آمد نے سب کو آدھا پاگل کر دیا تھا۔

"امی اب پیروکار نہیں رہی ہیں صرف۔۔۔ وہ معلوماتی کتابچے پڑھ پڑھ کر ان سے زیادہ تیز ہو گئی ہیں اور جب سے انٹرنیٹ کا استعمال سیکھ لیا ہے تب سے تو قیامت۔۔۔ تم انتظار کرو چند دن جاتے ہیں کسی مارننگ شو میں ایزائے نیوٹریشن بلائی جائیں گی۔" وہ جل کر بولی۔

"تو تم کیوں جی جلاتی ہو۔۔۔ میں ہوں نا۔ یار! میں کروں گا نا تمہاری سب فرمائشیں پوری۔ اور پھر ہمارے گھر میں تمہیں پتا ہی ہے۔ اس طرح کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ہمارے گھر میں وہی سبزی اور چیز پکے گی، جو اس روز سب سے سستی ہو گی اور۔۔۔"

"اور جانے دو۔۔۔ اب تم اپنی مصیبتیں نہ بیان کرنے لگ جانا۔۔۔ میں ہوں نا۔" زرین نے بے حد جل کر نقل اتاری۔ "تمہارے ہونے کا کیا کروں۔۔۔ تم وہی آدمی ہو ناں۔ جس نے مجھے چھپا کے دستر خوان سے لنچ کروا دیا تھا۔"

کلیم نے سوچا آخر یادداشت صرف فلموں ہی میں کیوں جاتی ہے حقیقی زندگی میں کیوں نہیں۔۔۔ یا پھر کم از کم یہ زرین کی بچی اس دن کو بھول کیوں نہیں جاتی۔۔۔ اس وقت تو ذرا سا گھونگھٹ نکالے مزے سے بڑے بڑے نوالے کھا رہی تھی۔

"اب پھر تم وہی طعنے دینے لگی ہو اس وقت تو ناک کان سے دھواں نکل رہا تھا اور ایک کے بعد ایک روٹی۔۔۔ ہیں۔۔۔"

"تو بھوکی تھی نا میں۔۔۔ بھوک لگی تھی اس لیے۔ بھوک میں تو حرام بھی حلال ہوتا ہے۔" اس نے کلیم ہی کی پلیٹ سے بوٹی اچکی۔ جب سے مرغیوں کے عجیب و غریب فیڈ کا معاملہ اماں کی نظروں سے گزرا تھا۔ کچن میں چکن کا گزر ختم ہو گیا تھا۔ چکن بریانی کا ذائقہ اف!

"ہاں تو یہی اصل بات تھی کہ تم بھوکی تھیں اور بھوک میں حرام حلال سب۔۔۔ اور شور کتنا مچا رکھا تھا۔ کلیم! میرا دم نکل رہا ہے۔ میرا بی پی لو ہو رہا ہے میں نے صبح سے ایک سلائس کھایا ہے۔ پتا نہیں ہم گھر کب پہنچیں گے؟"

"ہاں تو لگ رہی تھی ناں بھوک۔۔۔ مانا مشرقی لڑکی کی خاموشی میں حسن ہے مگر زندہ ہو گی تو ری ایکشن دے گی نا۔۔۔ کیا شرما شرمی میں دم توڑ دیتی اور لوگ کہتے ہائے بھوکی مر گئی۔ میں بھوکوں مرتی اور لوگ ہفتوں میرے سوئم چہلم پر دعوت اڑاتے۔۔۔ اور تم تو رو رو کر

کھاتے۔۔۔ اور کھا کھا کے روتے اور تمہاری امی دو تین ڈونگے بھر کے فریز کردیتیں پھر چکن کباب بنتے اور دو ماہ بعد حلیم اور تازہ بگھار سے چکن کڑاہی۔"

دونوں کے جھگڑوں میں والدہ ماجداؤں کا ذکر نہ آئے یہ تو کبھی ہوا نہیں۔ کلیم بھی چمک کر بولا۔

"خیال ہے تمہارا کہ تمہارے سوئم میں مرغیاں اور بکرے پھڑکائے جاتے۔۔۔ تمہاری ہائی جین کانشس ماں نے ابلی ہوئی پالک اور ابلے لال لوبیا پر نیاز دلوادینی تھی۔ سوئم پر کوئی پھل کاٹ کر طشتریاں نہ سجتیں کہ کٹے پھل پر جراثیم کا حملہ زیادہ ہوتا۔ دعا کے بعد جاتے جاتے سب مہمانوں کو ایک ایک کیلا تھمادیتیں سمجھیں تم۔۔۔"

کلیم کا لہجہ تیز اور آواز بلند ہوگئی۔ کینٹین میں بیٹھے اکثر اسٹوڈنٹ کی گردنیں گھومیں۔

"تم مجھ سے لڑرہے ہو کلیم؟" زرین نے اچانک پلیٹ اس کی سمت کھسکادی جیسے خفا ہو کر اب ایک نوالہ نہ لے گی۔ کلیم کو بھی دفعتاً احساس ہوا۔

"جب بھی کھانا کھلاتے ہو۔۔۔ ایسے ہی لڑلڑ کر اپنی فرسٹریشن نکالتے ہو اللہ نہ کرے کہ مجھ پر کیا ہمیشہ ایسی مالی بدحالی رہے گی۔" زرین نے پلکیں یوں جھپکیں جیسے بمشکل آنسوؤں کو دھکیل رہی ہو۔

"مم۔۔۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میرا مطلب تو۔۔۔ تم پلیٹ تو پوری کرو۔ رزق ضائع جائے گا۔ کیا کرتی ہو۔" کلیم بوکھلا گیا۔ اسے منانے ہی کی خاطر تو صبح صبح اپنی اماں سے اتنی بحث کر کے آیا تھا۔ اور وہ پھر ناراض۔۔۔

"نہیں ہوگا ضائع۔ پارسل بنوا کر گھر لے جانا اور کہنا آج یونیورسٹی میں نیاز دلوائی گئی تھی۔۔۔ یونیورسٹی کا عرس تھا۔" زرین نے بھنا کر حل پیش کیا۔

بوکھلائے کلیم کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"ہی ہی ہی۔۔۔" اگلے پل زرین بھی ہنس پڑی۔ اور بڑی احسان جتاتی نگاہوں سے دوبارہ براجمان ہوئی

"تم ہمیشہ مجھے خفا کرتے ہو۔"

"میں خفا نہیں کرتا مگر تم یہ چھپا کے دسترخوان والی بات بار بار نہ کیا کرو۔ اب خود سوچو۔۔۔ دو گھنٹے سے ہم ٹریفک جام میں پھنسے تھے۔ نہ آگے جاسکتے تھے نہ پیچھے، جہاں کھڑے تھے، اسی فٹ پاتھ پر دسترخوان سجا تھا۔ کڑی دوپہر، بھوک کا وقت اور بمباسٹک خوشبوئیں۔۔۔

اور دیکھو! ہم نے قطعاً "غلط نہیں کیا تھا۔ کھانا ہی تو کھایا تھا ناں۔۔۔ گھر سے کوسوں دور۔۔۔ بھوک سے آنتیں قل ہواللہ پڑھ رہی تھیں۔ دور دور تک کوئی کھانے پینے کی چیز نہیں۔۔۔ تو ہم تو مسافر تھے نا۔۔۔ تو مسافر تو چھپا کے دسترخوان سے کھانا کھاسکتے ہیں۔ یار ہم پر جائز تھا یار قسم سے۔۔۔"

زرین کے چہرے پر قائل ہونے والے تاثرات تھے مگر۔۔۔

(یہ طعنہ تو اس نے کسی بلیک میلر کے خزانے کی طرح سنبھال کر رکھا تھا بہ وقت ضرورت وہ اسے کام میں لاتی تھی)

"تمہارا یہ پیریڈ تو آف ہے مگر مجھے کلاس لینی ہے۔ تمہیں کیا چچا جان لینے آئیں گے۔؟" مزے سے بریانی کھانے کے بعد کلیم اٹھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"ہاں۔۔۔ تم بھی ساتھ چلنا۔"

"نہیں۔۔۔ مجھے دو بجے کے بعد کچھ کام ہے۔ کسی سے ملنا ہے۔ تم چلی جانا۔۔۔ اور ہاں، بل میں دے چکا ہوں۔"

"بات سنو کلیم۔۔۔ تمہارے پاس واپسی کا کرایہ ہے نا؟" زرین کو سب خبر تھی۔

"ہاں ہاں بالکل۔۔۔" کلیم نے جیب تھپتھپائی۔

"او کے۔۔۔ بائے۔" زرین نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

☼ ☼ ☼

کینٹین میں نئے اسٹوڈنٹ کا ایک ریلا ہنستا مسکراتا داخل ہوا تو کلیم جو ماضی میں کھویا ہوا تھا بری طرح

چونک کر لوٹا۔ زرین حسب معمول اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"تم لوگوں کا پرابلم سولو نہیں ہوا اب تک؟" تینوں نے اردگرد سے کرسیاں اٹھائیں اور بیٹھ گئے۔

"اور تم روتی رہی ہو زرین؟" سلمیٰ نے اس کے سوجے پپوٹے دیکھے۔

"تو تمہارے خیال میں اس کے پاس بیٹھ کر ہنسا جاسکتا ہے۔" اس نے کھا جانے والی نگاہوں سے کلیم کو گھورا۔

"اسے ہنسنا آتا ہی نہیں ہے۔"

"روز حشر جاندار تو جاندار یہ بے جان کرسیاں میزیں بھی گواہی دیں گی کہ تم نے مجھے رلایا۔" زرین نے تڑپ کر کہا۔

"اوہ۔۔۔ پلیز اب تم لوگ دوبارہ شروع مت ہوجانا۔" کاشف نے میز پر ہاتھ لٹادیے۔ "سیز فائر۔۔۔"

"میرے خیال میں یہاں بات آنٹی کے کھانوں کی ہورہی تھی کہ ذائقہ بہت ہے۔ میں نے بھی سنا ہی ہے ٹیسٹ کبھی کیا نہیں۔" سلمیٰ نے کہا۔

"اور کبھی کر بھی نہیں سکوگی۔ وہ دنیا کی سب سے کنجوس خاتون ہیں۔" زرین نے سے کو اتنا کھینچا جتنی اس کی سانس کھینچ سکتی تھی۔

"کنجوس نہیں۔۔۔ سلیقہ شعار۔۔۔ ر۔ ر۔ ر۔" کلیم نے اسی کے سے انداز میں شعار کو سانس کی حد تک کھینچا۔

"رہنے دو بس تمہیں پتا ہے ان کے گھر میں۔ لیموں کے دو پودے ہیں اور اس پر لگتے ہیں یہ کینو کے سائز کے رسیلے لیموں۔ ان کے گھر کا سرکاری مشروب ہے سکنجبین، گرمیوں میں۔ سردیوں میں لیموں والا قہوہ اور نچوڑے ہوئے لیموں سے بنالیا جاتا ہے اچار۔۔۔ مزے کی بات سنو کہ ایسے اچار کا بھی کبھی جلوہ نہیں کرایا۔"

"پھر بھی تم اکثر اچار چوری کر لیتی ہو۔" کلیم نے بھٹ آئینہ دکھایا۔

"جتنا بڑا خزانہ اتنا ماہر چور۔" زرین نے لاپروائی سے ہاتھ ہلائے۔

اس نے زرین کو بغور دیکھا۔ رونے کے باعث سوجے منہ کے ساتھ وہ عجیب سی لگ رہی تھی۔

ایسے سوجے منہ والی زاروقطار روتی لڑکی کو دیکھ کر سب سوچتے ہوں گے۔

یہ کوئی نہیں جانتا کہ پھپھک پھپھک کر روتی یہ مظلومہ درحقیقت بہتی آنکھوں کے ساتھ بھی حشر سامنے والے کا کرتی ہے۔

کلیم تیز لہجے میں بولا۔

"تمہارے ایسے رونے کا ایک قصہ تو یادگار ہے ہی۔" کاشف نے مزا لیا۔ سلمیٰ نے بھی اثبات میں سر ہلایا۔ کلیم نے دانت پیسے اور زرین نے قہقہہ۔

"کون سا کون سا؟" قصہ آنرز کے پہلے سال کا تھا۔ نازیہ ایک سال پیچھے تھی وہ تجسس کے مارے اچھلی۔

زرین نے قہقہہ لگایا اور کلیم نے اس بار رخ ہی پھیر لیا۔ سلمیٰ نے دونوں کے چہرے دیکھے پھر کلیم کے غصے کے خیال سے ٹال گئی۔

"ویسے بائی دے وے تم لوگ آج کس بات پر تن کر بیٹھے ہو۔" سلمیٰ نے بھنویں اچکا کر پوچھا۔

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں نہ بتانے کا فیصلہ کرلیا۔

"نہیں۔۔۔ کوئی خاص نہیں۔" ایک ساتھ ہی منہ سے نکلا۔

"او کے۔۔۔ تو اب ایسا ہے کہ زرین کا رونا بند ہوچکا ہے تو کینٹین سے کچھ منگوالیا جائے۔" کاشف بولا۔

"بالکل جو کچھ ہے، سب کا آرڈر دے دو۔۔۔ بہت بھوک لگی ہے۔" نازیہ نے کہا۔ "اور کلیم! تم پلیز مجھے وہ نچوڑے ہوئے لیموں والا اچار ضرور چکھانا۔ دے دیں گی نا تمہاری امی؟" اس نے خدشے کے تحت پوچھا۔

"وہ دیں نہ دیں۔۔۔ تمہیں اچار کھانا ہے نا۔۔۔ مل جائے گا۔" زرین نے لاپروائی سے تسلی دی۔



"میں تنگ آگئی ہوں امی... یہ کھچڑیاں، دلیے، سوپ اور جوس پی پی کر۔ خدا کے لیے مجھے نارمل کھانا کھانے دیں۔" زرین نے سبزیوں کے سوپ کو انتہائی ناگواری سے دیکھا اور ڈونگا پیچھے سرکایا۔
"جب تک تم پوری طرح ٹھیک نہیں ہو گی، تمہیں یہی سب کھانے کو ملے گا۔"
"میں ٹھیک ہو چکی ہوں امی!" اس نے زور دے کر کہا۔
"تو پھر پرسوں رات کو الٹیاں کیوں کیں؟"
"جو چیز ہے ہی الٹی، میں اسے سیدھا کیسے کر سکتی ہوں۔"
"تم بہت فضول بولتی ہو زرین!" نسرین تسلی سے صوفے پر ٹکیں۔ زرین تھوڑا پیچھے سرکی۔ ماں سے کوئی بعید نہیں کہ اس کے ہاتھ پیر باندھ کر سوپ پلانا شروع کر دیتی۔
"حیران میں اس بات پر ہوں کہ اتنی احتیاط کے باوجود تمہارا پیٹ ابھی تک گڑبڑ کیوں ہے۔ تم نے کوئی بے احتیاطی تو نہیں کی۔" ان کی مشکوک نگاہیں اسے ٹٹولنے لگیں۔ اس سے پہلے کہ "آنکھیں سب کہہ دیتی ہے، جو بات ہم کہہ نہیں پاتے" کے مصداق وہ بھید جانتیں۔
زرین ذرا سا اچھلی۔ "میں نے کون سی بے احتیاطی کرنی ہے۔ بیس دن سے جیب خرچ بند ہے۔ ابو تک کو آپ نے پابند کر رکھا ہے۔ بچوں کی طرح گھر سے سیب، سینڈوچ اور ابلے ہوئے پانی کی بوتل لے کر جاتی ہوں۔ اب اور کیا کروں۔"
"تو پھر ابھی تک آرام کیوں نہیں آیا؟"
"آپ سمجھ کیوں نہیں لیتیں۔ پیدا ہونے سے اب تک ملاوٹ شدہ چیزیں کھانے کی عادت ہے۔ نہیں قبول کر رہا میرا معدہ اس انتہائی خالص خوراک کو... کیوں ظلم کرتی ہیں آپ مجھ پر... میں آپ کی بیٹی ہوں امی... مجھے تجربہ گاہ کا کیمیکل نہ سمجھیں آپ... پلیز۔"
وہ لجاجت سے کہتی کھڑی ہو گئی۔ "جا رہی ہوں میں۔"
"کدھر؟"
"تائی امی کے پاس... شاید وہاں سے مل جائے کوئی چیز کھانے کو۔"
"مل گئیں تمہیں وہاں سے چیزیں... رات کا سالن ہو گا۔ پیٹ اور درد کرے گا زرین!"
"کرتا رہے۔ میری زبان کو تو سکھ ملے گا، ترس گئی ذائقوں کو۔ آپ خود پئیں یہ سوپ... ہاں۔"
وہ دوپٹا ٹکاتی جوتیاں پھنساتی تائی کے گھر چلی، درمیانی باڑ پھلانگتے اندر بڑھی، اندر سناٹا تھا مگر میٹھی میٹھی مزے دار خوشبو آرہی تھی۔ خوشبو کے تعاقب میں اس کے قدم اسے کچن تک لے گئے۔ جالی کا سفید دروازہ بند تھا۔ اس نے ناک چپکا کر اندر جھانکا تو ایک بڑے پتیلے میں کھیر تھی۔ ڈونگے سامنے رکھ کر وہ کھیر نکالنے والی تھیں۔ یقیناً" چمچہ چلا چلا کر تھک گئی تھیں۔ جب ہی اسٹول پر ٹکی دوپٹے کے پلو سے پسینہ پونچھ رہی تھیں۔
"آج تو آپ نے بڑی محنت کی تائی جی!" وہ اتنی اچانک نفیسہ بیگم کے سامنے کھڑی ہوئی تھی کہ کچھ چھپانے کا تو چھوڑو انہیں صحیح طرح سے چونکنے کا بھی موقع نہ ملا۔
"اور آپ تو ساری پسینہ پسینہ ہو رہی ہیں۔ کھیر میں تو چمچہ بھی گھنٹوں چلانا پڑتا ہے اور پھر جب کھیر آپ بنائیں..." وہ اب خود چمچہ چلانے بڑھی۔
"اے اے رکو... چمچہ مت چلانا... تہہ ٹوٹ جائے گی۔ اب چمچہ نہیں ڈالنا، تم جاؤ میں ڈال کر دے رہی ہوں۔" تائی اچھل کر اٹھیں۔
"آپ کیوں ڈالیں گی؟ اتنی محنت تو کر چکی ہیں۔ میں ڈال کر دیتی ہوں ڈونگوں میں۔ بس آپ مجھے بتا دیں کتنی اور کیسے؟" اس کا تو لہجہ کھیر سے بھی زیادہ شیریں ہو گیا۔ اور واقعی اس نے بالکل ان کی منشا کے مطابق

کام کیا تھا۔

اب رہ گیا کھیر کا پتیلا اور زرین متوقع نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"ساری کھیر ایک طرف اور کھیر کا پتیلا ایک طرف۔" اس نے کہہ ہی دیا۔ تائی جی نے گردن ہلا کر اجازت دے دی۔

زرین کا چہرہ کھل گیا۔ واہ۔ وہ وہیں پھسکڑا مار کے بیٹھ گئی اور ہو گئی شروع۔ کھیر اتنی تھی کہ اس کا پیٹ بھی بھر گیا اور کسی حد تک دل بھی۔ مگر رات کو۔ رات کو تائی امی نے تین پیالے بھیجے۔ ایک امی کا، ایک ابا کا اور ایک شرمین کا۔

"اور میرا حصہ؟" اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

زعیم کی آنکھوں میں ہنسی اور مزا چکھانے والا انداز ابھر آیا۔

"ساری کھیر ایک طرف۔ کھیر کا پتیلا ایک طرف۔" اس نے اس کا جملہ اسے لوٹایا جو حق دق کھڑی رہ گئی تھی۔

"زرین آپی اپنا حصہ پوچھ رہی تھیں۔" زعیم نے گھر جا کر کہا۔

"کون سا حصہ۔ چار پیالوں کے برابر تو وہ کھا گئی۔ ماسی کی چھومو مجھ سے کہنے لگی۔ آپا جی! کھیر کا پتیلا آپ نے خود ہی دھو لیا۔ میرا انتظار ہی کر لیتیں۔ میں نے جب جھانک کر دیکھا تو ایسے نکھرا ستھرا جیسے ابھی دکان سے خرید لائی ہوں۔ مجھے تو پتیلے کا وزن بھی ہلکا لگا۔ دیواریں تک کھا گئی وہ۔"

"ہاں ہیں میری امی اتنی ہی کنجوس اور ہمیشہ رہیں گی۔ پھر بھی تم ان کی بہو بننے کے لیے بے تاب ہو۔ تمہیں تو راستہ بدل لینا چاہیے نا۔"

زرین حق دق رہ گئی۔ ابھی کچھ دیر پہلے تو آنکھوں ہی آنکھوں میں اصل مسئلے کو نہ بتانے کی ہدایت کی تھی اور اب خود ہی۔۔۔ وہ بے ساختہ کھڑی ہو گئی تھی۔

وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم تھے۔ ہم نوالہ و ہم پیالہ۔ مگر سو۔

اور کیا کلیم کی امی، زرین کو بہو نہیں بنانا چاہتیں۔ مگر۔ مگر کیوں۔

تینوں کے دل و دماغ میں سوال گردش کر رہے تھے۔

کاشف، سلمٰی اور نازیہ کا بری طرح حیران ہونا قطعی حیران کن نہیں تھا۔ کلیم اور زرین ایک دوسرے کا سایہ بنے رہتے تھے۔ حالانکہ کلیم کا یونی ورسٹی میں آخری سال تھا۔ دونوں کے پیریڈز اور فراغت کے اوقات مختلف تھے مگر وہ دونوں ذرا سی بھی فرصت پاتے ہی ایک ساتھ نظر آتے۔

دراصل کلیم کا انداز کچھ کچھ بھائی جان والا تھا۔ وہ جتنے تحمل اور ضبط سے زرین کو برداشت کرتا تھا۔ ان کے رشتے میں ناز و ادا کا تو دور دور تک واسطہ ہی نہ تھا۔ رونا اور لڑنا، منانے والی صورت حال کبھی سامنے آئی ہی نہیں۔ سو وہ تینوں شدید حیران تھے۔

☼ ☼ ☼

زرین کے والد اپنا چھوٹا سا بزنس کرتے تھے اور دو بچوں، شرمین اور زرین کے ساتھ گھر میں خوش حالی و بے فکری کا دور دورہ تھا۔ جبکہ کلیم کے ابا سرکاری ملازم تھے۔ اوپر سے بچے پورے پانچ۔۔۔

دونوں گھر ایک ہی نقشے پر بنائے گئے تھے۔ مگر گزرتے وقت نے زرین کے گھر کو جدیدیت سے ہم آہنگ کر رکھا تھا۔ زرین کی امی گھر کو سجانے بنانے کی شوقین بھی تھیں اور اس سلسلے میں نہ تو کوئی زبانی کلامی اعتراض تھا اور نہ ہی روپے پیسے کے حوالے سے۔

سو وہ جی بھر کے اپنے ارمان پورے کرتیں۔ ہر برس پورے گھر کا کلر بدل دیا جاتا یا پورے گھر کے پردے نئے خریدے جاتے۔ کبھی کچن کو از سر نو ترتیب دیا جاتے اور میچنگ برتن تک خرید لیے جاتے۔ لباس و طرز زندگی پر بھی یہی میلان چھایا ہوا تھا۔

دوسری جانب نفیسہ بیگم تھیں۔

محدود آمدنی، بڑی فیملی اور گھر کی تزئین و آرائش کا شوق، صفائی پسندی ان میں زرین کی امی سے بڑھ کر تھی۔ مگر اتنے محدود وسائل اور لامحدود مسائل میں وہ اپنا شوق کیسے پورا کریں تو یہاں سے ان کی سلیقہ مندی کا آغاز ہوتا تھا۔

وہ زرین کی امی کی سلیقہ مندی اور نفاست کو پیسے کا ترکا کہتیں اور سینہ ٹھونک کر اعلان کرتیں۔ "جس طرح وہ ہر شے کو لے کر چلتی ہیں، اگر نسرین اس طور ایک ہفتہ بھی گزار کر دکھا دیں تو وہ مان لیں گی۔"

نفیسہ بیگم کے ہاں دس سال پرانا وائٹ واش یوں چمکتا تھا جیسے ابھی کل ہی کروایا ہو۔ نسرین کی صفائی ماسیوں کی مرہون منت تھی تو نفیسہ شروع سے اور اب تک اپنے زور بازو پر بھروسا کرتیں۔

بچوں کی تربیت میں اپنی احتیاط پسندی، چیزوں کی قدر، وقت کی قدر، اہمیت سب کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔ بچے اس عمر میں آکر زمانے کے نئے چلن دیکھ کر کبھی کبھار انگڑائی لے کر بیدار ہوتے تو وہ بخوبی جانتی تھیں کہ کیسے انہیں تھپک کر سلانا ہے۔

نفیسہ کی زندگی جہد مسلسل تھی۔ جس کا پہلا اور آخری مقصد یہی تھا کہ کم خرچ بالا فیشن کیسے کیا جاسکتا ہے۔

چھوٹی چھوٹی معمولی چیزوں سے آغاز کرتی تھیں اور انتہا تک جاتیں۔

ریڑھی سے وہ سب سے سستی والی سبزی خریدتیں۔ وہ بھی بڑی ردوکد کے بعد کہ گھر میں ہر موسم کا پھل، سبزی اگا رہی تھی۔ گملوں میں ہری مرچیں، دھنیا، پودینہ بہار دکھاتا۔ آم کی خالی پیٹی میں مٹی بھر کے تو کبھی تک کے پھول اگا لیے، کریلے، بھنڈیاں، ٹماٹر، بینگن، توری تو جیسے دائیں ہاتھ کا کمال تھا۔ آلو تک نکال چکی تھیں۔ رنگین شملہ مرچ بھی اگا لی۔

چیکو، امرود، انار، پپیتا کے پیڑ لگا رکھے تھے۔ دوسرے ان کا مشہور زمانہ لیموں کا پیڑ۔۔۔ جو درحقیقت ان کا دکھ درد اور ہر مسئلے کا ساتھی تھا۔ لیموں سے وہ کام لے چکی تھیں کہ۔۔۔ تنہائی میں بیٹھ کر لیموں بھی کسر نفسی سے سوچتا۔ "میں اور اتنے کام کا۔"

پیتل کے برتن چما کر رکھتیں۔ دروازہ کے ہینڈل لش لش کرتے۔ اپنے منہ اور ہاتھوں پیروں پر ملتیں اور بیٹیوں کو بھی یہی تلقین کرتیں۔

مرغیاں پالنے کا شوق تھا اور ضرورت بھی۔ باغبانی اور باورچی خانے تک ہی سلیقہ مندی کا ٹھپہ نہیں تھا۔

چھ ماہ پہلے کلیم سے بڑی بیٹی کو بیاہا تو اپنے نکاح کا جوڑا سبز و سرخ اسے پہننے کو دیا۔ جس نے دیکھنے والوں کی انگلیاں دانتوں میں دے دیں۔

وہ اتنے سلیقے طریقے سے لپیٹ لپاٹ کر رکھا گیا تھا اور یوں چھب مارتا تھا۔ جیسے ابھی ابھی کسی اعلا پائے کی ڈیزائنر نے اپنی بوتیک سے بھیجا ہو۔

ادیبہ کے کچھ اعتراضات تھے۔ اپنی مہندی مایوں پلس نکاح کے روز وہ چھبیس سال پرانا جوڑا پہننے کی اور کیا اس کی وہ خوب صورتی اور پائیداری برقرار رہی ہو گی اور آوٹ آف فیشن جوڑا۔

لیکن ادیبہ کے سارے سوال بے کار گئے۔ وہ قطعا" آوٹ آف فیشن نہیں تھا اور نہ ہی بوسیدہ۔ اس کی خوب صورتی نگاہوں کو خیرہ کرتی تھی۔

"امی! لوگ نہ کہیں گے کہ نیا نہیں پہنا، سالوں پرانا، اپنی اماں کی شادی کا۔" ادیبہ نے اب دل کی بات کہی۔

نفیسہ بیگم کو بیٹی کے دل کی ساری خبریں تھیں۔

"لوگوں نے تب تو کچھ نہ کہا۔ بڑی واہ واہ کی۔ 24 گھنٹے کے 48 نیوز بلیٹن میں خبر چلی تھی۔ ثانیہ مرزا نے اپنے نکاح کے روز اپنی ماں کے نکاح کا جوڑا پہنا۔ ساتھ کانچ کی ہاتھوں بھر بھر چوڑیاں۔۔۔

"اور یہ جو۔۔۔ وہ اس نواب کی دلہن بنی ہے۔ وہ جو زیرو نمبر کی اداکارہ ہے۔" وہ یادداشت پر زور دینے لگیں۔

"کرینہ۔۔۔ کرینہ کپور۔" عرشیہ نے تصحیح کی۔

"ہاں وہ کرینہ، شمینہ، جو بھی۔۔۔ اب خود بھی اتنی نمبر ون اداکارہ، اس کے پاس کون سی پیسے کی کمی تھی یا اس موئے نواب کے پاس خالی پیپا تھا۔ مگر پہنا نا اس نے بھی اپنی ساس کا شادی کے روز والا مہنگا۔" ان کے

پاس مثالوں کی کمی نہیں تھی۔

نفیسہ بیگم اور نسرین بیگم کے درمیان وہی روایتی چپقلش اور کشمکش تھی جو دیورانی جٹھانی کے رشتے میں عام طور پر ہوتی ہے۔

نسرین جب بیاہ کر آئیں تو سارا گھر ایک ہی تھا اور گھر میں اور سارے خاندان میں نفیسہ کے طور طریقوں' سلیقہ مندی (کنجوسی) کا طوطی بولتا تھا۔ بلکہ نسرین تو شادی سے پہلے ہی نفیسہ کے چلن سے بہت حد تک واقف ہو چکی تھی۔ اس لیے بڑے ہی داؤ پیچ کھیل کر کہلوا دیا کہ وہ اپنے لیے بری کی تمام چیزیں خود ہی خریدے گی۔

نفیسہ کی شادی کو چار سال ہو چکے تھے اور وہ ہنوز بے اولاد تھیں۔ دیور چونکہ سگا خالہ زاد تھا' سو اس سے لگاؤ قدرتی تھا۔ اس کی شادی پر وہ اپنی سلیقہ مندی کی دھاک بٹھانا چاہتی تھیں' مگر یہ موقع مل نہ سکا۔

انہیں اس طرح منہ پھاڑ کے بری کے لیے دلہن کی مرضی والی بات بھائی ہی نہیں۔۔۔ پیغام رساں کو کہلوا دیا کہ بری تو لڑکے والوں کا ارمان ہوتی ہے۔ پیغام رساں بھی کچھ فتنہ پرور تھا۔ اس نے جوابی پیغام منہ پھاڑ کے کہلوا دیا۔

"تو لڑکی کے ارمان کہاں گئے اور جس نے پہننا ہے اسے ہی پسند نہ ہوئے تو۔۔۔ اور دوسرے جہاں تک ماں بہنوں کے ارمانوں کی بات ہے تو فہیم کی نہ ماں حیات ہیں اور اکلوتی بہن ملک سے باہر۔۔۔ سو بھابھی کو ارمان نکالنے کی اتنی حسرت کیوں ہے؟؟"

نفیسہ کے دل میں جملہ انی کی طرح گڑ گیا۔ وہ بھابھی تھیں اور سگی خالہ زاد بھی تو۔۔۔ دکھ میں گھر کے ہاتھ بالکل ہی پیچھے کر لیے۔

فہیم نے بالا ہی بالا منہ مانگے پیسے نسرین کے لیے بھجوا دیے۔ شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی۔ سب کچھ اچھا تھا۔ مگر نفیسہ نے یہ جان لیا کہ دیورانی کے ساتھ ان کی نبھ جائے۔ یہ بہت مشکل ہے۔ ابھی تو گھر بھی ایک تھا اور کچن بھی۔

نسرین ایک کھاتے پیتے خوش حال گھرانے سے آئی تھیں۔ جبکہ نفیسہ نے یتیمی کی گود میں آنکھ کھولی تھی۔ نانا' نانی کے گھر گزارا ہوا بچپن' لڑکپن اور جوانی۔۔۔ ابتدا میں سب ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ نانا' نانی ضعیف ہو چکے تھے۔ نفیسہ کی یادداشت میں وضاحت کے ساتھ تو کچھ نہیں تھا۔ مگر ماموؤں کی شادی کے بعد گھر میں ایک تناؤ اور کھچاؤ سا آگیا تھا۔

اور پھر اس گھر میں دیوار اٹھا دی گئی اور ان کی والدہ کو تینوں ماموں کچھ مخصوص رقم دینے لگے اور کچھ خشک اجناس اور گھر کے اندر بندھی بھینسوں کے ڈھیروں دودھ سے فقط دو کلو دودھ۔۔۔

نفیسہ کو یاد تھا ان کی والدہ ان سارے پیسوں کا کھلا کروا لیتیں اور ٹکڑیوں کی صورت گن گن کر علیحدہ رکھتیں۔ خلاؤں میں گھور گھور کے رقم کو خرچ کے مختلف خانوں میں رکھتیں اور ہر بار خرچ زیادہ رقم کم کے باعث ٹکڑیوں کی تقسیم بدل دیتیں۔

انہیں اپنے بچے پڑھانے تھے اور ان کا پیٹ بھرنا تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ رقم جمع کرنا چاہتی تھیں اور کم سے کم خرچ۔

نفیسہ بڑی اولاد تھیں۔ بچت' تقسیم' اصول' سب نفیسہ کی گھٹی میں وہیں سے پڑا۔

پیسے جمع ہوئے تو ماں نے کمیٹیاں ڈال لیں۔ ماں ایک بھینس خریدنا چاہتی تھی۔ تاکہ اس کے دودھ سے کاروبار کرے اور اپنے یتیم بچوں کے لیے ایک مستقل آسرا بن جائے۔

اور پھر نفیسہ نے دیکھا' ماں کی بچتیں رنگ لائیں۔ بھینس آگئی اور کام شروع ہو گیا۔ بھائی پڑھنے لگ گئے اور کتابیں مانگ تانگ کر پڑھنے کے بجائے خریدنے کے قابل ہو گئے۔

باورچی خانے کی خالی گھڑولیاں بھر گئیں۔

مگر نفیسہ جنہوں نے تنگی کے دنوں میں چٹکی سے چیزوں کو پکڑا تھا۔ وہ کبھی مٹھی تک نہ جا سکی۔

انہوں نے سیکھا کہ محنت اور ارادے سے سب ہو سکتا ہے۔ اور قطرہ قطرہ سے دریا بن جاتا ہے۔

اور صفر کو کبھی حقیر مت جانو۔۔۔ سنبھال کر رکھو' زندگی میں جب کبھی ایک (ONE) ملے گا تو صفر کے آگے لگا دینا' دس بن جائے گا۔

شادی ہو کر سسرال پہنچیں تو یہاں خوشحالی تھی۔ میاں سرکاری ملازم تھے اور دیور کا رجحان بزنس کی طرف تھا۔ نفیسہ کے میاں نعیم اور دیور فہیم۔۔۔ اپنی اکلوتی بہن کے بیاہے جانے کے بعد چھڑوں والی زندگی گزار رہے تھے۔

نفیسہ دونوں کی زندگی میں انقلاب بن کر آئی تھیں۔

دونوں بھائی اچھا کھانا کھانے کے لیے دل کھول کر پیسے خرچ کرتے تھے۔

نفیسہ انتہائی قلیل رقم میں بھی بے حد لذیذ خوش رنگ و خوش ذائقہ کھانا تیار کر دیتیں۔

گھر سلیقہ مندی کا آئینہ بن گیا۔ لش پش کرتا' ہرا بھرا۔

نفیسہ کی زندگی میں پہلی بار سکون آیا۔ ادھر گاؤں میں بہن' بھائی اپنی اپنی راہوں پر کامیابی سے گامزن تھے۔ ایک بہن اور بھائی گاؤں کے سرکاری اسکول کے ٹیچر بن گئے۔ ایک بھائی کسی اچھی کمپنی میں ملازم ہو گیا۔ چھوٹی بہن نے نرسنگ کر لی۔ مگر وہ گاؤں میں ڈاکٹر صاحب بن کر مشہور ہو چکی تھی۔ چھوٹے دو ابھی زیر تعلیم تھے۔

ادھر شوہر کے گھر میں مالی حوالے سے قطعاً" تنگی نہیں تھی۔ مگر نفیسہ کی عادتیں فطرت بن کر رگ و پے کا حصہ بن چکی تھیں اور یہاں کوئی روک ٹوک بھی نہ تھی۔

ہاں پانچ سال سے اولاد کی کمی محسوس ہوئی تھی۔

پھر نسرین جب فہیم کی دلہن بن کر آئیں۔

روک ٹوک۔۔۔ کا آغاز۔۔۔ ناگواری' نکتہ چینی اور حیرت۔

نفیسہ کا ہر عمل نسرین کے لیے اول حیرت دوئم ناگواری اور سوئم انکار تھا۔ نسرین کو اپنے شہری اور تعلیم یافتہ ہونے پر فخر تھا جو نفیسہ کے سامنے جا کر گھمنڈ کی صورت اختیار کر گیا۔

گھر علیحدہ کرنے یعنی اپنی اپنی گرہستی آپ چلانے کے معاملے میں کسی حد تک نسرین درست بھی تھیں۔ نفیسہ اپنے طرز زندگی اور سوچ و عمل میں انتہا پسندی کی سرحد کو چھو ہی لیتی تھیں۔

دونوں کی ایک دوسرے سے پہلو تہی کرنا۔۔۔ دونوں اس بات سے واقف تھیں کہ دونوں کی عادتوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

جٹھانی ہفتے میں چار روز دال چڑھاتیں۔ نسرین رات کو بمشکل زہر مار کرتیں کہ غم کی رات ہے۔ کتنی ہی طویل ہو گی۔ آخر ختم ہو ہی جائے گی۔ صبح انڈا پراٹھا' سلائس' مکھن۔

مگر۔۔۔ جٹھانی صاحبہ نے رات کی بچی دال آٹے میں گوندھ لی۔ کدوکش کی ہوئی پیاز' ہری مرچ' دھنیا' پودینہ' بے حد لذیذ اشتہا انگیز پراٹھے تیار' ساتھ اچار یا ٹماٹر کی چٹنی یا گھر کا بنا مکھن۔

نسرین کو لذت سے انکار نہ تھا۔ مگر تھی تو وہی دال نا۔

دونوں بھائی سر ہلا ہلا کر گنتی کیے بغیر لقمے حلق سے اتارتے جاتے۔

آٹے میں نہیں گوندھی تو دوپہر کو تازہ بگھار کے ساتھ چاول ابال لیتیں۔ چکن کا سالن اول بنتا ہی حساب سے' لیکن اگر جو شوربا ختم ہو جاتا اور دو' چار بوٹیاں رہ جاتیں۔

اس کی نئی ڈش تیار۔

بوٹیوں کے ریشے میں آلو کا ملیدہ ملایا۔ ہرا مسالا' پیاز وغیرہ شامل کر کے چکن کباب فرائی کر لیے۔

یہی انجام گائے کے گوشت کی بوٹیوں کا ہوتا۔ چار بوٹیاں بھی پتیلی میں ذرا سے شوربے کے ساتھ رہ جاتیں تو دو مٹھی دال ڈال کر پیس لی۔ لذیذ شامی کباب تیار۔

اور اگر ایک بوٹی چکن بچ جاتی تو بوٹی کے ریشے کر کے پیاز والے آملیٹ میں مکس کر لیتیں۔

نسرین کو ہمہ وقت کچھ نہ کچھ ٹونگنے کی عادت تھی۔ جبکہ یہاں ناشتے دوپہر کے کھانے اور رات کے کھانے

کے بعد کچن یوں سناٹے میں آجاتا جیسے کسی ذی روح نے کبھی وہاں قدم بھی نہ رکھا ہو۔

چار ماہ کے عرصے میں ہی نسرین اوب گئیں۔ دوسری طرف جب شرمین کی آمد کی اطلاع ملی تو وہ سب کچھ کھانا بھول گئیں۔ اب عجیب و غریب خواہشیں اسے تنگ کرتیں۔

کبھی چینی کے پھکے مارتیں، کبھی آلو ابال لیتیں اور خوب چاٹ مسالا ڈال کر کھاتی چلی جاتیں۔ کچے ٹماٹر پر خوب نمک لگا کر تین، چار بیک وقت کھا جاتیں۔

نفیسہ ابھی تک ماں بننے کے مرحلے سے گزری نہیں تھیں۔ وہ اس وقت کی نزاکتوں اور ضروریات کی اہمیت سے ناواقف تھیں سو ایک، دو بار برملا ٹوک بھی دیا۔

نسرین کی والدہ نے آکر خوب بول جھک کر کچن الگ کروایا۔ گھر کے بیچ بھی ایک دیوار اٹھوا دی گئی۔

نفیسہ کی پھلواری اس وقت پورے لان پر پھیلی ہوئی تھی۔ وہ جب صبح کے کاموں کے فارغ ہو کر پورے استحقاق سے کھرپی لے کر لان میں کھو جتیں، پتے چھانٹیں، گوڈی کرتیں، کھاد ڈالتیں تو نسرین کے سینے پر مونگ دلتیں۔

"تم نی بھابھی سے کہیے اپنا کھیت اپنے حصے تک محدود رکھیں۔ نہ جانے کون کون سے کچرے اکٹھے کر کے ڈرم میں رکھتی ہیں۔ بائیو کھاد بناتی ہیں۔ ڈرم میں ہفتوں پھلوں، سبزیوں کے چھلکے بند رکھتی ہیں۔ پھر جب اسے کھولتی ہیں تو کھاد تو نہیں نہ جانے کون سا کیمیکل باہر نکل آتا۔ اسے ہاتھوں پر تھیلی چڑھا کر کیاریوں میں ٹھونستی جاتی ہیں۔ ایسی بدبو ہوتی ہے کہ۔"

"نسرین! یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ تم کہہ لو یا برداشت کرلو، گھر الگ کردیے، تم یہ بھی دیکھو ان کی محنت کی بدولت کتنا تازہ ماحول ہے۔ لگتا ہی نہیں ہم کراچی جیسے آلودگی والے ماحول میں رہتے ہیں۔ تازگی کا احساس۔"

"اسے آپ تازگی کہتے ہیں۔ دراصل آپ بھی پانچ سال سے ساتھ رہ رہ کر ویسے ہی ہو گئے ہیں۔ سڑاند کو تازگی کہہ رہے ہیں۔"

"یار وہ دو چار دن رہے گی پھر مٹی میں جذب ہو جاتا ہے۔"

"دو چار دن میں، میں نے بھی مٹی میں جذب ہو جانا ہے۔" وہ دل گیر لہجے میں بولیں۔ آنکھوں میں آنسو بھی بھر آئے اور ان ہی آنکھوں کے پیچھے پاگل ہو کر تو محبت کی شادی کی تھی۔

گھر میں کچن کا کام کرنے کے لیے لکڑی والے آئے ہی ہوئے تھے۔ کچن الگ ہو گیا۔

فہیم نے آرائش کی تمام چیزیں اس وقت ایک جیسی ہی خریدی تھیں کہ دونوں جانب تفریق نہ دکھائی دے مگر بعد میں جب وقت گزرا۔ فہیم اپنی کاروباری مصروفیات میں گھر گئے۔ شرمین پیدا ہوئی۔ ادھر سال بعد نفیسہ اور نعیم کے ہاں بھی اریبہ نے جنم لیا اور سال بعد کلیم اور پھر باقی تین بچے۔ اور ادھر شرمین کے پانچ سال بعد زرین۔ وقت بھی تقسیم ہو گیا۔ میل ملاقات بھی محدود۔ شاید جوش و جذبہ۔ نفیسہ کی فطری کفایت شعاری، احتیاط پسندی پانچ بچوں کے بعد اتنی مستحکم ہوئی کہ اب دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے۔ وہ باز نہیں آسکتی تھیں۔

فہیم کے کاروبار نے دن دگنی رات چوگنی ترقی کی۔ انہوں نے پڑوس کے گھر کو خرید کے اپنا گھر مزید بڑا کرلیا۔

اب دونوں اپنی اپنی گرہستی کی خود ذمہ دار تھیں۔ سیاہ و سفید کی مالک جو جیسا چاہتی تھیں کر گزرتی تھیں۔

جٹھانی کی سلیقہ مندی کو نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ تو نفیسہ دیورانی کے گھر پیسے کے ضیاع کو قبول نہیں کر سکتی تھیں۔

دونوں نے اپنے بچوں کی تربیت اپنے اندازے کی تھی۔ مگر زرین کے ساتھ معاملہ کچھ اور تھا۔ شرمین طویل عرصہ اکلوتی اولاد رہی تھی۔ قدرتی طور پر نسرین کو شرمین بہت پیاری تھی۔ پہلی اولاد تھی شاید ہر ماں کو پہلا بچہ زیادہ پیارا ہوتا ہے۔ زرین کی پیدائش کے وقت شرمین کے اسکول کا پہلا سال تھا۔ وہ بے حد ذہین بچی تھی۔ اس نے تین ماہ ہی میں سارا کورس فر فر سنا کر جپ کرلیا تھا۔ اتنی اضافی ذہانت کی حامل بچی۔ نسرین کی ساری توجہ اس جانب تھی۔ زرین جیسے بے وقت آئی تھی۔ شیر خوارگی کے ڈھائی تین سال آیا کے ساتھ گزر گئے۔

شرمین کی ذہانت جیسے ہر روز بڑھتی تھی اور نسرین کو اسے ہر وقت کھاد پانی دینا پڑتا۔ ایسے میں زرین نے خود ہی اپنے لیے راستے ڈھونڈ لیے۔ وہ اپنی چھوٹی سی گڑیا تھامے سارے گھر میں گھومتی، جہاں دل چاہتا وہاں گھس جاتی۔ الماری کے اندر، پردوں کے پیچھے، میز کے نیچے کیاریوں کے پنجرے اور پھر دوست کے نام پر۔ کلیم۔

ایک ہی والدین کی اولاد ہونے کے باوجود۔ دونوں بہنیں ایک دوسرے کا الٹ تھیں۔ صبح و شام جیسا فرق تھا گویا۔

زرین ایک بے حد لاپروا بچی تھی۔ اسے ماں کے طے شدہ اصول کبھی نہیں بھائے۔ شرمین اس کی بالکل الٹ ایک اچھی بچی تھی۔

زرین کو اپنے کزنز کے ساتھ مل کر کھیلنے کودنے میں بے حد مزا آتا۔ اور سب سے بڑھ کر کلیم کے ساتھ۔ بہت بچپن ہی سے کلیم اس کے لیے ایک سایہ سا تھا۔ زرین نسرین کے لاکھ جتن پر شرمین کے اسکول کا ایڈمیشن ٹیسٹ پاس نہ کرسکی۔ ناچار اسے کلیم وغیرہ کے ساتھ داخلہ لینا پڑا۔

اریبہ بڑی تھی اور عرشیہ کافی چھوٹی۔ زرین کی سب سے زیادہ کلیم ہی سے بنتی۔ دونوں کی ماؤں کے اختلافات وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتے ہی گئے۔

شرمین کے ڈاکٹر بن جانے اور بعد میں ڈاکٹر داماد مل جانے نے نسرین کے مزاج و غرور کو ساتویں آسمان پر پہنچا دیا۔

زرین نے کبھی بھی ان کے کسی خواب کو پورا نہیں کیا تھا۔ پڑھائی کے لیے اس نے جرنلزم چن رکھا تھا۔ وہ انہیں اپنی کم نفیسہ بیگم کی بیٹی زیادہ لگی۔ کلیم کے پیچھے بھاگتی دوڑتی۔ اور یہ سچ تھا کہ زرین میں نفیسہ بیگم کے سے انداز جھلکتے تھے۔

اور نفیسہ اکثر دل میں مسکراتیں کہ نسرین نے شرمین سے توجہ ہٹا کر دیکھا ہی نہیں کہ دو اولادیں اور یکسر مختلف۔ ان کے پانچ بچے ایک دوسرے کا پرتو تھے۔

انہیں زرین سے کوئی پرخاش نہیں تھی۔

زرین کو اپنی تائی سے کوئی عداوت نہیں تھی۔

تاوقتیکہ ایک روز۔

دونوں پر دونوں کے عزائم منکشف ہوئے۔

زرین کا کلیم کے پیچھے لپکنا اور کلیم کا زرین کا سرپرست بن کر گھومنا۔

زرین پر انکشاف ہوا کہ نفیسہ بیگم کیا ارادے رکھتی ہیں کلیم کے لیے۔

اور کلیم کہتا۔

"تم ضرب کلیم سے ناواقف ہو۔ سو سنار کی ایک لوہار کی، امی جو مرضی کہتی رہیں، کروں گا میں اپنی مرضی اور میں اپنی ماں کو منا لوں گا، تم اپنی امی کی فکر کرو۔ مگر یاد رکھو اس بات کو مناسب وقت تک راز میں رکھنا ہے۔"

☼ ☼ ☼

"پہلے یہ صرف دیورانی جٹھانی کی روایتی چپقلش ہوتی تھی مگر اب اس میں تمہاری امی کی سگی بھانجی کی انٹری ہو چکی ہے۔ اور دیکھ رکھی ہے میں نے وہ بھانجی کالی سوکھی پینڈو۔ کلیم! تمہاری امی کو میرے جیسی دودھ ملائی لڑکی چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہ ملے گی۔" اس نے گویا انکشاف کیا۔

"تو تمہیں کب سے وہم ہوا کہ میری امی بہوئیں ڈھونڈنے کے لیے پہلے چراغ میں تیل ڈالیں گی۔ وہ دن کے وقت بہو ڈھونڈنے جائیں گی۔"

"کیا؟" زرین چیخی۔ "ڈھونڈنے کیوں؟ میں نظر

نہیں آرہی کیا؟"

"وہ یار میرا مطلب زعیم کی دلہن بھی تو ہوگی نا۔"

"ہاں۔ ٹھیک ہے لیکن کلیم! تمہاری امی کو بھانجی کا خیال آیا ہی کیوں؟"

"وہ اپنے ساتھ مربعے لے کر آئے گی۔ زمین دار ہیں میرے خالو۔"

"مربے۔" زرین حلق کے بل چیخی۔ "تم مربوں کے لیے اپنی امی کی بھانجی سے شادی کرلوگے کلیم!" وہ جیسے غم وغصے سے دہری ہوگئی۔

"بولو تمہیں کتنے مربے چاہئیں۔ سیب کا مربہ، آم کا مربہ، گاجر کا مربہ اور تم بس بتاتے جاؤ۔ میں اپنے ابا سے کہہ کر مربوں کی فیکٹری تمہارے نام لگادوں گی۔" اسے پہلی بار اپنی محبت کی ناؤ ڈولتی محسوس ہوئی۔

"او بے وقوف" کلیم نے سر ہاتھوں پر گرالیا۔ "مربے نہیں مربعے۔ یعنی اسکوائر۔ یعنی زمینیں۔ ایکڑ۔"

ہائیں۔ اچھا وہ والا مربع۔ وہ مطمئن ہوئی۔

"لیکن۔ تم جرنلزم میں ماسٹرز کرنے کے بعد کھیتی باڑی کروگے کلیم!"

وہ فق رنگ کے ساتھ دھپ سے بیٹھی تھی۔ پہلی بار کلیم کے چہرے کا رنگ اڑا۔ اس کی امی سے کچھ بعید نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

لیکن دونوں کے درمیان چلنے والی جنگ، جو دن بدن شدت اختیار کرگئی تھی اس روز بے دھیانی میں یونیورسٹی میں کاشف، سلمیٰ اور نازیہ کے سامنے سارے راز کھل گئے اور یہ سچ تھا کہ بے حد قربت کے باوجود کسی کا دھیان کبھی غلطی سے بھی اس طرف نہ گیا کہ یہ قربت چاچے تائے کے بچوں والی نہیں ہے۔ اس سے کچھ بڑھ کر ہے۔

جس دن سے زرین کو نفیسہ بیگم کے عزائم کی خبر ملی تھی وہ صبح و شام کلیم کو باتیں سناتی اور مثالوں سے ثابت کرتی کہ وہ اپنی کنجوس لماں کے آگے کچھ نہیں کرسکے گا۔ کلیم اسے یقین دلاتا اور یاد کرواتا کہ وہ اپنی اب تک کی زندگی کو خوب اچھی طرح ٹٹولے۔ وہ ہمیشہ اس کی امیدوں پر پورا اترا ہے۔

"او یار! میں منالوں گا اپنی امی کو۔ تم یہ سوچو تمہاری امی ابھی تک بے خبر ہیں اگر انہیں خبر ہوگئی تو؟" کلیم نے ایک اور تاریک پہلو دکھایا۔

"میری جانب صرف ایک میری امی ہی ہیں۔" کتنے سکون اور بے فکری سے اس روز کلیم سے کہا تھا۔

اسے صرف اپنی امی ہی کو منانا ہے۔ ان کی طرف کوئی "تیسرا" نہیں ہے۔ لیکن اب وہ ڈائننگ ٹیبل کے پاس چیئر پر براجمان ان چاروں کو دیکھ رہی تھی جن میں وہ "تیسرا" بھی موجود تھا۔

گورا چٹا۔ کھرچ کھرچ کے کی شیو۔ گرے پینٹ پر نیلی نئی نکور شرٹ۔ جس کے کف اور کالر اکڑے ہوئے تھے کف لنکس اور اسٹائلش ٹائی لگائے نکھرا ستھرا۔ تیسرا۔ سامنے لاؤنج میں شرمین ہمراہ ڈاکٹر میاں، درمیان میں ممی۔ اخلاق کی انتہائی سرحدوں پر تھیں اور ساتھ ایک اور ڈاکٹر جناب بہزاد۔ جو بہنوئی موصوف کے کزن کم دوست تھے اور ممی اور شرمین کے ارادوں کے مطابق رشتے کو مزید مضبوط کیا جاسکتا تھا۔ ممی کی باچھیں چری ہوئی تھیں۔

اتنا شان دار کوالیفائڈ ڈاکٹر داماد واہ۔

مگر یہ زرین کی بچی وہ معذرت کرکے اٹھیں اور زرین تک آئیں۔

"تم یہاں کیا کررہی ہو؟" وہ غرائیں۔

زرین چھ سات سرخ سیب پلیٹ میں ڈال کر بیٹھی تھی ایک ہاتھ میں چھری تھی قاشیں بنا بنا کر بڑے انہماک سے منہ میں رکھتی تھی۔

"آپ نے سنا نہیں روزانہ ایک سیب کھائیے ڈاکٹر کو بھگائیے۔ میں چیک کررہی ہوں۔ اگر ایک گھنٹے میں یہ سب سیب کھالوں تو ڈاکٹروں کی یہ فوج بیٹھے بٹھائے اچانک غائب ہوجائے گی۔ یوں فشوں۔" اس نے انگلی سے چٹکی بجائی۔

"شرافت سے آکر سب کے درمیان بیٹھو اور مزید کوئی بہانہ نہیں۔" ان کے لہجے میں قطعیت آگئی۔

"میں بیٹھ تو جاؤں گی مگر شرافت کی گارنٹی نہیں ہے۔" اس نے ہاتھ ہوا میں لہرائے۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں نہیں سن سکتی کہ نزلے کی دوا بس دس سال میں آنے والی ہے اور کون کون سی چیزیں ہائی جینک ہیں اور کون سی نہیں۔ اور ملاوٹ کی کون کون سی قسمیں ہیں اور یہ ڈاکٹر بہزاد۔ یہ تو مجھے بڑا ہی زہر لگتا ہے۔"

اس نے کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا۔ جو حسب معمول کسی ایسی ہی نئی تحقیق پر گفتگو کررہا تھا۔ شرمین اور اس کے ڈاکٹر میاں کا اشتیاق اور کھلا منہ دیدنی تھا۔

"ممی! آپ لوگ کیا ڈسکشن کررہے ہیں، اب آ بھی جائیں اور زرین تم بھی۔" شرمین نے ہانک لگائی۔

"جی آپی! میں آئی۔" وہ ایسے اٹھی جیسے اسی آواز کی تو منتظر تھی۔

"دراصل میں ممی سے کہہ رہی تھی آپ نے کولڈ ڈرنک کیوں نہیں سرو کیں تو ممی نے کہا کولڈ ڈرنک بہت ہارم فل ہیں انسان کے لیے۔ تو میں یہ سوچ رہی ہوں، ساری زندگی پی پی کر ہم پہلے ہی اتنا نقصان کرچکے ہیں اپنا اب کیا ہوگا۔"

"دیکھیے غلطی کو جتنی جلدی درست کرلیا جائے۔" بہزاد ہی نے جواب دیا اور ساتھ ہی چھوٹی سی ایک تقریر کرڈالی۔

زرین نے دل سے مسکرا کر بہزاد کو دیکھا۔

"آپ صحیح کہتے ہیں۔ اب آپ میری تائی جان ہی کو دیکھ لیں زندگی میں کبھی انہوں نے باہر کی ڈرنکس پی ہی نہیں کیں۔ ہر موسم میں گھریلو شربت۔ آپ میری تائی سے نہیں ملے۔ دراصل وہ بہت جینئس خاتون ہیں انہوں نے کبھی بازار سے سبزی نہیں خریدی ان کا پورا لان ان کا کھیت ہے۔"

"تو وہ کہاں رہتی ہیں کسی گاؤں میں؟" بہزاد کے چہرے پر اشتیاق سا پھیلا۔

"ارے۔" زرین نے مصنوعی حیرت سے اپنا ماتھا چھوا۔ "گاؤں کیوں۔ یہی تو کمال ہے میری تائی جان کا۔ وہ ہمارے گھر کے ساتھ ہی رہتی ہیں یہ اس طرف آپ کبھی آیئے گا میں ملاؤں گی آپ کو ان سے اور ان کے کارنامے دکھاؤں گی۔"

"کبھی کیوں؟ ابھی چلتے ہیں۔" وہ کھڑا ہی ہوگیا۔ زرین پہلے ہی تیار تھی فوراً لپکی۔

ممی کے چہرے پر ایک رنگ آئے ایک جائے۔ زرین کو دانت پیس کر اور بہزاد کو ہاں ہاں بیٹا جاؤ۔

☼ ☼ ☼

"آپ کی بھاوج نے دوسرا داماد بھی ڈھونڈ لیا۔" بے حد خوشگوار ماحول میں رات نو بجے کی خبریں دیکھتے ہوئے کھانا کھایا جارہا تھا۔ کلیم کو اچھو لگ گیا۔ نعیم صاحب نے حیرت سے بیوی کو دیکھا اور کلیم نے خوف کے عالم باپ کی صورت دیکھی۔ باقی سب بھی نفیسہ بیگم کو دیکھنے لگے جو انکشاف کے بعد اب یوں برتن اٹھانے میں لگی تھیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

"آپ سے کس نے کہہ دیا۔" نعیم صاحب ہی نے سوال کیا۔

"اب ہر بات کہی تھوڑی جاتی ہے۔"

"پھر بھی کوئی سورس آف انفارمیشن تو ہوگا نا۔"

"اب آپ لوگ میری عقل کو چیلنج کریں گے۔" ان کا لہجہ اور سرسری ہوگیا تھا۔

"پھر بھی؟"

"آپ پھر پھر کو جانے دیں۔ میں تو بس حیران ہوں کہ نسرین کو ڈاکٹر اتنے ہی پسند تھے۔ تو پھر اپنے لیے بھی ڈاکٹر کیوں نہ چنا۔ تب تو نعیم دو جمع چار کرنے والے سے بیاہ رچالیا۔ اب نکل رہی ہیں حسرتیں۔"

"نہیں اب ایسی بھی بات نہیں۔ ویسے تھا کون؟ کیا تھا؟ اور آپ کیسے مل لیں؟"

زرین کے ہمراہ ہی بھیج دیا۔ بہانہ بھی خواب گھڑا کہ ڈاکٹر صاحب کو میرے لان سے دلچسپی ہے۔ لیکن خیر وہ تو لگ بھی رہی تھی۔ اچھا سلجھا نوجوان تھا۔"

"تو پھر کوئی خاطر تواضع کیا یا ایسے ہی۔" نعیم صاحب نے کسی قدر خوف میں گھر کے پوچھا۔

"تو کیا نہ کرتی۔ اس کے سامنے لیموں توڑ کر سکنجبین بنادی۔ بعد میں پکوڑے' چائے اور کباب تھے۔ میٹھے کے لیے اس نے منع کردیا۔"

"کچھ اور اہتمام بھی کرلیتیں۔"

"ارے وہ تو اسی پر لوٹ پوٹ ہوگیا۔ دراصل وہ کسی ایسی تنظیم میں کام کرتا ہے۔ جو لوگوں کو غذائیت سے بھرپور سادہ خوراک کھانے پر مائل کرنے کے لیے کام کرتی ہے۔ پتا نہیں مجھے کون سے کلب کی ممبر شپ دلوانے کی بات کر رہا تھا۔ ایک جملے میں اگر سو لفظ بولے ہوں گے نا تو ستر انگلش کے۔ اور وہ بھی خلائی مخلوق والی انگلش۔۔۔ ورنہ زمینی انگلش کی شدھ بدھ تو مجھے بھی ہے۔"

"امی! وہ چیزوں کے سائنٹفک نام لے کر بات کررہے تھے۔ آپ سے تو بہت متاثر ہوئے۔" زعیم کو ڈاکٹر بہزاد بہت پسند آئے تھے۔

کلیم کا دل اچانک ہر شے سے اچاٹ ہوگیا۔ جیسے ہنستی بستی۔۔۔ بستی دیکھتے دیکھتے اجڑ جائے۔ جیسے پانی میں آگ لگ جائے۔ ہاں یہی تو ہوا تھا نا۔

اس نے زرین سے کہا تھا۔ وہ اپنی طرف کے تیسرے سے نپٹ لے گا۔ وہ اپنی امی کا دھیان رکھے۔ بس۔۔۔ اور زرین نے کہا تھا اس کی طرف کوئی تیسرا نہیں ہے۔

لیکن اب آچکا تھا۔

زرین کے ہمراہ ہر روز ہی آجاتا' کلیم سے محبت اور عزت واحترام سے ملتا۔ نفیسہ کا تو وہ فین ہی ہوگیا تھا۔ اماں کو بھی پسند آیا تھا اس دن بھی وہ ڈاکٹر بہزاد کے ہمراہ بڑے دھڑلے سے آئی تھی۔

امی کی پیش کردہ شام کی چائے سے لطف اندوز ہوتی اور اسے تو یوں نظر انداز کرتی جیسے جانتے نہیں۔ پہچانتے نہیں۔

اور اس دن بھی تو۔۔۔

وہ فالسے کھا رہی تھی۔ امی ڈاکٹر بہزاد سے محو گفتگو تھیں۔ بڑے کام کی باتیں ہوتی تھیں ان کے بیچ۔

"فاصلے ایسے بھی ہوں گے۔۔۔ یہ کبھی سوچا نہ تھا۔" کلیم بری طرح چونکا وہ اسے ہی سنا رہی تھی۔

"سامنے بیٹھا تھا میرے اور وہ میرا نہ تھا۔"

"زرین! میں اور یہ سب برداشت نہیں کرسکتا۔" وہ ہار ہی گیا۔

"یہی تو میں تمہیں اتنے عرصے سے رو رو کر سمجھا رہی تھی کہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ جب تائی جی گھنٹوں پیکیج پر اپنی بہن اور بھانجی سے باتیں کرتی ہیں اور تم بھی کرتے ہو۔"

"وہ تو صرف باتیں ہیں زرین!"

"لیکن اس طرح روز روز کی ملاقاتوں سے خیال بدل بھی جاتے ہیں۔" کلیم نے بہزاد کے روز آجانے پر چوٹ کی۔

"تو میں بھی تو یہی کہہ رہی تھی۔" زرین کے انداز میں ہٹ دھرمی آگئی۔

"تو میں کیا کروں۔۔۔" کلیم نے ہتھیار ڈال دیے۔

"اب کیا یہ بھی میں بتاؤں گی۔۔۔" زرین خفا ہی ہوگئی۔ کلیم اسے دیکھ کر رہ گیا اور وہ گنگناتے ہوئے واپس پلٹ گئی۔

☼ ☼ ☼

"یہ شہزادہ چارلس کی بہو بننے کی فرمائش جڑ دیتی نا تو مجھے تب بھی اتنی حیرانی اور صدمہ نہ ہوتا۔ اس نے کس کا نام لیا۔۔۔ غضب خدا کا۔۔۔"

شرمین نے تھوڑی دیر پہلے بلڈ پریشر کنٹرول کی گولی پھانکی تھی اور وہ کبھی ٹہلنے لگتیں کبھی بیٹھ جاتیں۔ مگر بہلنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔

شرمین دکھ آمیز تاثر سے ماں کو اور غصے آمیز تاثر سے زرین کو دیکھ رہی تھی۔

"اس نے آخر ایسا سوچا بھی تو کیسے۔۔۔ سب سے پہلے تو مجھے یہی سوال چین نہیں لینے دے رہا۔" نسرین نے دہائی دی۔ گردن تبھی ڈھلکا دی۔ زرین بڑے انہماک سے کتاب پڑھنے میں مصروف تھی۔

"تمہیں پتا ہے یہ وہ عورت ہے جب ایک بار پانی کی تنگی ہوگئی اور سارے ایریا میں لوگ ٹینک ڈلوانے لگے تو بارش کے دنوں میں جنابہ نے سب کے سروں پر شیمپو مل دیا اور کہا آسمان سے تازہ صاف پانی ٹپک رہا ہے۔ سر مل مل کے دھو کرلینا۔

اگر کبھی جاکر غسل خانے میں موجود صابن کو چیک کرو نا تو اس میں بیس سال پرانے صابن کی باقیات بھی مل جائیں گی۔ جہاں صابن ختم ہو کر چپٹا سا بنا وہیں نئے صابن سے چپکا دیا۔

"زندگی بھر گولڈ کی جیولری پہنی نہیں کہ گھس جائے گی۔ اور اگر کبھی پہنی تو گولڈ کی چوڑیوں کے آگے پیچھے کانچ کی چار پانچ چوڑیاں لگا کر رکھیں کہ برتن کپڑے دھوتے وقت سامنے والی چوڑی گھس نہ جائے۔۔۔ ہائے۔۔۔"

"احمق نے اس عورت کی بہو بننے کا ارادہ کیا ہے۔"

"آپ ہر بار کلیم کو کیوں بھول جاتی ہیں۔" زرین نے پہلی بار لب کھول کر اصل مجرم کا نام لیا۔

"ارے جہنم میں گیا کلیم۔۔۔ وہ سونے کا بھی بن کر آجائے تو تب بھی میں اسے کبھی نہ دیکھوں۔"

"اللہ نہ کرے کہ وہ سونے کا بن کر آئے۔۔۔ مجھے اس سے شادی کرنی ہے یا اس کی مورتی کی پوجا۔۔۔" زرین کو صدمہ سا ہوا۔

"میں پیار کی پجارن۔۔۔" وہ دانت پیستے ہوئے گنگنائی۔

"اس کی حیثیت ہی کیا۔ بس خواب ہی خواب ہیں کہ کل کو بہت بڑا صحافی بنے گا کیا خاک بنے گا۔۔۔؟ ابھی تک اماں سے کرائے کے پیسے لے کر جاتا ہے۔" نسرین بالکل بھنا گئیں۔

"تمہیں آخر کلیم میں نظر کیا آیا زرین؟" شرمین کو بھی حیرت تھی۔

"وہی جو آپ کو خاور بھائی میں نظر آیا تھا۔"

"وہ میرے کولیگ تھے۔ ہم نے ساتھ پڑھا۔ ہر وقت کا ملنا جلنا تھا اور پھر ہم دونوں کا مزاج۔۔۔" زرین نے تیزی سے جملہ کاٹا۔

"تو میرے پاس بھی کلیم کے لیے یہی جواز ہیں۔ آپ نے کالج جانے کے بعد ان کی شکل دیکھی تھی تو بچپن سے اسے دیکھ رہی ہوں۔ اور مجھے کوئی اعتراض نہیں پہنا دیں اپنی بری جہیز کے بکسوں سے نکال کر بوسیدہ جوڑے۔"

"ہائے۔۔۔" نسرین کو غش آگیا۔ "مجھے کبھی اندازہ بھی نہیں ہوا کہ نفیسہ بیگم ایسی گھات لگائیں گی۔ ہائے پلاننگ کرکے پہلے میری بچی کو اپنے ہاتھوں لگایا۔۔۔ پھر بیٹا آگے کردیا۔۔۔ ہائے۔"

زرین نے کتاب دھپ سے بند کی۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی اور کسی حد تک دکھ سا لہرایا۔

"غلط فہمی ہے آپ کی۔۔۔ وہ ان سب چیزوں سے بے خبر ہیں۔ وہ تو اپنی بھانجی کلسوچ چکی ہیں۔ میں تو انہیں کبھی بھی پسند نہیں آسکتی۔۔۔ میں ان کے طے شدہ کسی معیار پر پورا اتر ہی نہیں سکتی۔ انہیں پتا لگا تو جو طوفان آئے گا۔۔۔ وہ آپ کی سوچ ہے۔"

وہ یکدم کمرے سے نکل گئی۔

شرمین اور نسرین بے یقینی سے ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔



"دیکھیں جی! چھٹیاں بھی ہیں اوپر سے عید ہے۔ میرا دل ہے کہ چھوٹی موٹی سی تقریب کرلوں۔ یا چلیں ہم دونوں جاکر کان میں بات ہی ڈال دیں۔" نفیسہ بیگم نے افطاری کے بعد چائے کے کپ رکھتے ہوئے نعیم صاحب سے رائے طلب کی۔

"تو وہ جو گھنٹہ پیکیج پر تم دونوں بہنیں دن رات بات کرتی ہو۔۔۔ ابھی تک کان میں بات بھی نہ ڈال سکیں؟" چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے انہوں نے الٹا سوال جڑ دیا۔

"اوہو۔۔۔ وہ تو میں نے محاورتاً کہا تھا۔ لیکن رسمی چیزیں بھی تو ضروری ہوتی ہیں۔"

"آج کل تو فون پر نکاح ہوجاتے ہیں۔۔۔" نعیم صاحب نے کلیم کو دیکھا جس کے حلق میں دل اٹک

چکا تھا۔ "اور پھر اتنا کرایہ بھی خرچ ہوگا خوامخواہ۔۔۔" فہیم صاحب نے ایک مضبوط سرا پکڑا۔

"ہاں تو ہو جائے خرچ۔۔۔ اب ایسے موقعوں پر تو خرچ کرنا ہی پڑے گا ناں۔۔۔" نفیسہ بیگم نے سب کو حیران کیا۔

"جب شادی کلیم کے پیروں پر کھڑا ہونے کے بعد کرنی ہے تو اتنے سال پہلے یہ کھڑاگ پھیلانے کی کیا ضرورت ہے۔" ایک اور نقطہ۔۔۔

"اور امی! پھر ہر بار عید شب برأت پر اور سالگرہ پر اور امتحانوں میں پاس ہونے پر آپ کو بلاوجہ تحائف بھیجنے پڑیں گے۔" عرشیہ نے نکتہ رسی میں کمال دکھایا۔ پہلی بار نفیسہ بیگم کے ماتھے پر سوچ کی لکیریں پھیلیں تو سب نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ شاید کچھ کامیابی مل جائے۔ کلیم نے اپنے ابا کو اور ابا نے پدرانہ شفقت اور پدرانہ سورس کا استعمال کرتے ہوئے باقی اولاد کو بھی قائل کیا۔۔۔ زرین کی طرف مائل تو سب پہلے سے ہی تھے۔

"میرے خیال میں تو مناسب وقت کا انتظار کرنا چاہیے۔ وہ بچی بھی زیر تعلیم ہے۔"

"فقرے گاؤں کا ماحول ہے۔ آئے دن لوگ سوال اٹھائے آجاتے ہیں۔ کب تک ٹالے۔ اب میں کچھ شگن کروں گی تو بیچاری بہن جواب دینے والی تو ہوگی ناں۔۔۔"

"ایک بات کہوں اگر برداشت کرنے کا حوصلہ ہو تو۔۔۔" فہیم صاحب سے کلیم کی ملتجی نگاہیں اب اور برداشت نہ ہو رہی تھیں۔

"چلو اٹھو۔۔۔ نماز کے لیے نکلنا ہے۔" بیگم کو مخاطب کرنے کے ساتھ ہی بیٹوں کو اشارہ کیا۔

"میں کہہ رہا تھا کہ بھانجیاں، بھتیجیاں واقعی بہت پیاری ہوتی ہیں۔ جتنا پیار بہن بھائی سے اتنا ہی ان کی اولاد سے۔۔۔ اب جیسے۔۔۔ دروازے کے قریب پہنچ چکے تھے۔ "اب جیسے تمہیں ساری دنیا سے پیاری ہے اپنی بھانجی۔۔۔ ویسے ہی مجھے اپنی بھتیجی۔"

"ہاں تو میں نے کب منع کیا ہے آپ پیار نہ کریں۔۔۔ کرتے رہیں۔"

نفیسہ بیگم نے چائے کا آخری گھونٹ بھرا مگر جی بھر کے بدمزا ہو گئیں۔

"ابا! صاف بات کریں۔" کلیم نے دبی آواز میں کہا۔

"دراصل۔۔۔ دراصل میں چاہتا ہوں۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ تمہاری ساری کفایت شعاری دھری کی دھری رہ جائے گی۔ شادی کے برابر کا خرچا تو ٹرین کے کرایوں میں لگ جائے گا۔ اور پھر بعد میں رسمیں۔ خوشیاں غم، عید شب برأت پر آنا جانا۔۔۔ مہینے کے بجٹ میں کرائے کا اضافی خرچ رکھنا پڑے گا تم کوئی آس پاس کا رشتہ کیوں نہیں دیکھ لیتیں؟"

"مطلب کیا ہے ان سب باتوں کا۔۔۔؟" نفیسہ بیگم بری طرح چونکیں۔

"وہ۔۔۔" فہیم صاحب گڑبڑائے مگر سامنے بیٹھی دونوں صاحبزادیاں آنکھوں کے اشارے سے بول دینے کا مشورہ دے رہی تھیں۔ کلیم نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ رکھے تھے۔

"میں دراصل یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ تمہاری نزدیک کی نظر کمزور تو کبھی نہیں تھی پھر تو تمہیں زرین کیوں نہ نظر آئی۔"

"آپ نے یہ بات کہی بھی کیسے۔۔۔ زرین کا یہاں کیا ذکر۔۔۔"

"میں نے تو خالی سوچا۔۔۔ مگر مجھ سے پہلے کسی اور نے سوچا اور۔۔۔ یہ میرے الفاظ سے زیادہ تمہارے اپنے بیٹے کے الفاظ ہیں۔"

وہ صوفے پر جیسے غش کھا کر گری تھیں۔

"ساری زندگی اس عورت نے میرا ناک میں دم کیے رکھا ایک مسلسل امتحان۔۔۔ شوبازی۔۔۔ نمود نمائش کی ماری۔ پیسے اڑاتی عورت۔ اپنی بیٹی نہیں سنبھالی گئی۔ غضب خدا کا میری عمر بھر کی کمائی پر ہاتھ صاف کرنے کا ارادہ تھا۔۔۔ مگر کیا مجھے جانتی نہیں۔"

"امی ابھائی بھی انہیں پسند کرتے ہیں۔" نعیم بولا۔

"ہاں تو جیسے سالوں پہلے ماں نے فہیم کو الجھالیا۔ بیٹی بھی تو ماں پر ہی جائے گی ناں۔"

"امی! وہ میرے بچپن کی ساتھی ہے۔" وہ رونے والا ہو گیا۔ ماں کا ردعمل سوچوں سے بڑھ کر خطرناک تھا۔

"ہاں تو بیٹے بچپن ختم ہو گیا۔ جوانی میں جوانی کا فیصلہ کر رہی ہوں۔" نفیسہ بیگم کی طرف سے جھٹ جواب حاضر تھا۔ کلیم کے پاس جملے ختم ہو گئے۔



دبلی پتلی، دراز قد، نازک نین نقش پر بہت بڑی بڑی آنکھیں۔ ان کے بال بالکل سفید تھے۔ مگر بس وہ بالوں سے بزرگ دکھائی دیتی تھیں۔

وہ ممی سے لپٹیں تو زرین کو گمان ہوا۔ ایک بڑے سے تنے والے درخت سے نازک بیل لپٹی ہو۔

"شیرین بہت پیاری ہے مگر تم بالکل باربی ڈول لگتی ہو۔" تسلی سے بیٹھ کر بہزاد کی ممی نے زرین کے لیے دریا کو کوزے میں بند کیا۔

زرین انکساری سے مسکرائی جبکہ نسرین خوشی سے بے حال ہونے لگیں۔

وہ لاکھ ماڈرن تھیں اور پیسہ بھی تھا مگر شہر کی بیگمات کی صف میں شامل نہیں تھیں۔ اب اگر ایسی۔۔۔

"آپ کی جٹھانی کے ہاتھ میں بہت ٹیسٹ ہے۔" لوازمات سے لدی ٹرالی میں سے مسز بہلول نے بمشکل حساب کتاب سے دو تین چیزیں اٹھائیں اور پہلا لقمہ لیتے ہی واہ کا نعرہ دیا۔

ان ماں بیٹی کے منہ سے بے ساختہ نکلا "جی۔۔۔!"

اگر بہزاد کی مما اچانک اٹھ کر اپنے چوغے کو لہراتے ہوئے عربی ڈانس بھی شروع کر دیتیں تو اتنی حیرانی نہیں ہوتی۔

"سب آپ نے کب۔۔۔ آئی مین۔" نسرین کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہیں یا پوچھیں۔

"دراصل۔" مما نے نزاکت سے ہونٹوں کے پاس کو چھوا۔ "بہزاد نے گھر آکر بہت تعریف کی ان کے ٹیسٹ کی اور سلیقہ کی، اسپیشل گارڈننگ کی۔ ہماری آرگنائزیشن ایسی ہی وومنز کی تلاش میں رہتی ہے اینول ایوارڈ میں انہیں بلا کر شیلڈ دیتے ہیں۔ بہزاد ہی کے بتانے سے پھر کچھ لوگوں نے ادھر وزٹ کیا اور ایسا تو سچ بات ہے ہم سب نے پہلی بار دیکھا سو آج میں پھر ان سے ملوں گی۔"

مما اردو بولتی تھیں مگر لہجہ فارن جیسا تھا۔

"اور آنٹی! وہ جو آپ نے ذائقہ کی بات کی۔" زرین کے اپنے اندر کھدبد ہو رہی تھی۔

"وہ۔۔۔ وہ ذائقہ۔۔۔ ویری ٹیسٹی۔ مسز نعیم نے اپنے گھر کی بنی سبزیاں اور فروٹس ہماری ٹیم کو سیمپل کے طور پر دیئے تھے اور بہزاد گھر کے اگے ہوئے فروٹس اور ویجی ٹیبلز کا سیلڈ لے کر آیا تھا۔ آپ یقین کریں مسز فہیم! میں نے پوری دنیا میں وزٹ کیا ہے پر جو ذائقہ اس روز ملا وہ امیزنگ تھا۔ میں نے ابھی آتے ہوئے دیکھا آپ نے ایسا شوق نہیں رکھا۔"

"بس وہ۔" نسرین گڑبڑائیں۔ "آپ یہ سب لیں ناں۔۔۔"

"تو تو اٹس او کے۔۔۔"

انہوں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر ممی کو روکا اور ساتھ ہی پلیٹ بھی رکھ دی۔ اب وہ زرین سے مشاغل اور مستقبل کے بارے میں بات کر رہی تھیں۔ نسرین بڑی مشکل سے چہرے کے تاثرات نارمل رکھ رہی تھیں۔



ایک گیند پر ایک رن لیا جا سکتا ہے یا حد ہوئی تو چھکا مار دیا لیکن کبھی کسی نے ایک گیند پر سنچری ہوتی دیکھی ہے۔۔۔؟

نفیسہ بیگم نے کر کے دکھا دیا۔

اللہ جانے ڈاکٹر بہزاد نفیسہ بیگم سے اتنے متاثر کیسے ہوئے اور اپنی مما کو کون کون سے قصے سنائے کہ وہ نفیسہ کے گھر تک پہنچ گئیں۔

مسز بہلول کے ساتھ نسرین کو بھی مجبوراً نجانے

کتنے عرصے بعد نفیسہ کے ڈرائنگ روم میں بیٹھنا پڑا۔ سب کچھ نیا ہی لگ رہا تھا جبکہ انہوں نے تمیں سال پرانی نیلے کانچ سی آنکھوں والی پلاسٹر آف پیرس کی بلی کو بھی پہچان لیا تھا۔ جو آج بھی ایسے لگتی تھی جیسے نئی لی گئی ہو۔ صوفوں پر موجود سفید کشن وہ تھے جو نعیم صاحب کے واش اینڈ ویر سوٹ کے ناقابل استعمال ہونے پر۔۔۔ ادیبہ نے فیبرک پینٹنگ کر رکھی تھی۔

جس کراکری میں ٹرالی سرو کی گئی وہ چودہ سال پہلے نند نے سعودیہ سے بھیجی تھی۔ (قید بھی ملتی تو آج آزادی کا دن آجاتا)

نفیسہ چکن کے دودھیا سوٹ میں ملبوس تھیں۔ اور ویسے ہی دبلی پتلی جیسی تیس برس پیشتر تھیں۔ نسرین کو اپنا موٹاپا کچھ زیادہ ہی محسوس ہونے لگا۔

مسز بہلول ان کے گھر تو نپے تلے جملے بول رہی تھیں۔ اب یہاں کیوں مسلسل بول رہی ہیں۔ اور نفیسہ کیسی ہمہ تن گوش ہیں اور سب اتنے خوش کیوں ہیں۔ مسز بہلول نے ان کے گھر تو صرف ایک دو چیزیں چکھ کر چھوڑی تھیں۔ مگر یہاں وہ ہر شے کو ٹیسٹ کر رہی تھیں۔

باقی تمام لوگ روزے سے تھے۔ وہ گردوں کے مرض کے باعث روزوں میں وقفہ دیتی تھیں۔

نفیسہ بیگم کو بیس ہزار نقد انعام دیا گیا۔ شیلف۔۔۔ اعزازی ممبر شپ۔

عید کے بعد انہیں مارننگ شوز میں مدعو کیا جاتا تھا۔ نسرین خود کو ہمیشہ دوسروں سے برتر دیکھنے کی عادی تھیں۔ اب نفیسہ نے ایسا پچھاڑا۔ اب برداشت ہو تو کیسے۔

نسرین بیگم کو ڈپریشن کے دورے پڑنے لگے۔ ڈر کے مارے ٹی وی نہ لگاتیں۔ کہیں نفیسہ بیگم نہ آرہی ہوں۔

☼ ☼ ☼

کلیم نے بیڈ پر پھیلے زرق برق کپڑوں کو حیرت سے دیکھا۔ بہنوں کے چہروں پر بھی جگمگاہٹیں سی تھیں۔

"یہ ہماری بھابھی کے لیے۔۔۔ امی نے خریدے ہیں آپ کی دلہن کے کپڑے۔"

"کون!" وہ بری طرح چونکا۔۔۔ "کیا زرین۔۔۔؟" بے ساختہ اس کا منہ سے نکلا۔ اور یہی وہ پل تھا۔ جب نفیسہ بیگم واش روم سے نکلیں۔ مکالمہ ان کے کان میں بھی پڑا۔ مسکراتا چہرہ تن گیا اور اس پر قطعیت آمیز تصحیح آرکی۔

"اس کا نام صائمہ ہے۔ تمہیں اب تک نام بھی یاد نہیں ہوا؟"

"آپ اسی سے اندازہ کرلیجیے امی۔" کلیم تھکے انداز میں کرسی پر ٹکا۔ "مجھے نام تک کا علم نہیں ہے اور آپ کہاں تک کی باتیں کرتی ہیں۔"

"تو یہ تمہارا قصور ہے میرا نہیں۔" وہ دوپٹے کے کام پر انگلیاں پھیرتے ہوئے اطمینان سے بولیں۔

"زرین ٹھیک کہتی تھی۔ وہ ابا کی بھتیجی ہوتے ہوئے بھی آپ کو اور مجھے۔۔۔ مجھ سے زیادہ سمجھتی ہے۔ اس نے کہا تھا میری امی کبھی نہیں مانیں گی۔ اور اس نے کہا تھا۔ میں کبھی اپنی امی کو منا نہیں سکتا۔ وہ ہمارے بارے میں زیادہ بہتر جانتی ہے۔" کلیم کو اچانک بہنوں کی موجودگی کا احساس ہوا اس نے اپنے اگلے جملے حلق میں ہی روک لیے۔

"تو یہ زیادہ شرمناک اور افسوس ناک بات ہے کلیم۔۔۔ وہ پرائی ہو کر مجھے تم سے زیادہ سمجھی۔ اصل بات یہ ہے کہ صائمہ تمہاری جس خالہ کی بیٹی ہے اس خالہ کو میں انکار کر ہی نہیں سکتی۔ ہاں کسی اور خالہ ماموں کی بیٹی ہوتی تو شاید میں سوچ میں پڑ ہی جاتی لیکن تب بھی وہ لڑکی زرین نہ ہوتی۔ بلکہ نسرین کی اولاد سے میں کوئی رشتہ بنانے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔" ان کے لہجے میں زہریلی تلخی آگھسی۔

تینوں اولادوں کے چہرے پر اچنبھا آگیا۔ نسرین پھپھو سے اتنی خار۔۔۔ کیوں؟

"اور اب اس بے کار بحث سے کیا حاصل۔۔۔ میں سالوں پہلے اپنی بہن سے وعدہ کرچکی ہوں میں اسے خواب دکھائے ہیں۔۔۔ جیسے پہلے کبھی۔۔۔" ان کا جملہ خود کلامی میں ڈھل گیا۔

"اور ہاں اس عید پر جب تمہاری بات طے کردیں گے تب ہی زرین کی بات بھی ٹھہرائی جائے گی۔ اور یہ ٹھیک ہے کہ نسرین کو پسندیدہ داماد مل گئے۔ اللہ سب کی بیٹیوں کے نصیب کھولے۔ بہت اچھا لڑکا ہے ڈاکٹر بہزاد۔۔۔ زرین کے ساتھ اچھا لگے گا۔ اچھی جوڑی ہے۔"

"امی! زرین بھائی کے ساتھ بھی بہت اچھی لگتی ہے۔" عرشیہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ادیبہ ہاں میں ہاں ملانا چاہتی ہی تھی کہ ماں کے غضبناک چہرے پر نگاہ پڑی۔ تھپڑ لگانے کی خواہش کو جیسے انہوں نے بمشکل روکا تھا ادیبہ بے ساختہ ذرا سا پیچھے کھسکی۔

"اور کلیم! آئندہ یہ بحث مت چھیڑنا۔" انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔

"سوری امی!" کلیم یکدم کھڑا ہوگیا۔ اس نے جھلملاتے کپڑوں کے ڈھیر پر ایک نگاہ ڈالی۔

"میں نے کہا تھا۔۔۔ زرین مجھ سے زیادہ آپ کو سمجھتی ہے۔ اس نے پہلے ہی کہہ دیا تھا میں نہیں کرسکوں گا۔ آپ دوبارہ تم ذکر نہیں سنیں گی۔ مگر۔۔۔" وہ شعوری وقفہ دے کر دوبارہ گویا ہوا۔ "جب وہ سینہ ٹھونک کر دھمکا رہی تھی اور جتا رہی تھی۔ تب لڑکپن کی لفظی ... سے میں نے بھی ایک دعوا کردیا تھا۔ کہ میری امی مان جائیں گی۔ میں انہیں منالوں گا۔" اس کے لہجے میں دکھ بولنے لگا۔ "مجھے اپنے زور بازو پر یقین تھا۔۔۔ اور شاید اپنے لیے آپ کی محبت پر بھی۔۔۔ مگر ٹھیک ہے آپ دوبارہ یہ ذکر نہیں سنیں گی۔" وہ یکدم کمرے سے باہر نکل گیا۔

نفیسہ بیگم کے چہرے پر پہلی بار زلزلے کی سی کیفیت پیدا ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"مگر افطاری کرنے آئی ہوں تائی جی!" دستر خوان پر بیٹھے سبھی کی نظریں اٹھیں۔ کلیم نے بے ساختہ گردن گھمائی لیکن پھر ماں کا دھیان آتے ہی نظریں ٹی وی پر جمادیں۔

نفیسہ بیگم نے ایک بھرپور خوش آمدیدی نگاہ اس پر ڈالی۔ اب انہیں اس سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ کلیم کی نظروں کا بھٹکنا اور پھڑکنا وہ دیکھ چکی تھیں۔ مگر انہیں کوئی پروا نہیں تھی۔ ابھی کل ہی تو کلب میٹنگ میں انہیں پتا چلا تھا۔ مسز بہلول کو بھانجے ڈاکٹر خاور کی وائف ڈاکٹر شرمین کی بہن پسند آگئی ہے۔

سو اب انہیں زرین کی آمد سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ سو بار آئے۔

"یہ ہاتھ میں کیا لارہی ہیں بی پڑوسن۔۔۔؟" نعیم صاحب نے شوخی سے زرین سے پوچھا۔

"میری افطاری تایا ابا۔۔۔" وہ جست لگا کر ان تک پہنچی۔ "یہ دیکھیے ذرا۔" اس نے پلیٹ کا ڈھکن اٹھایا۔ "ایک سرخ سیب، ایک گچھا انگور، بغیر دہی والی سفید چنے کی چاٹ ایک کھجور۔۔۔ پھیکا بنا ملائی کا ٹھنڈا دودھ۔ ان میں ہے کوئی افطار کی چیز۔۔۔"

"اس میں کیا نہیں ہے؟" نعیم صاحب نے نا سمجھی سے اسے دیکھا۔

"تایا جی۔۔۔ پکوڑے، سموسے، جلیبی، چکن رول، دودھ روح افزاء کوئی کیچ اپ چٹنی۔۔۔" اس کا انداز رو دینے کا سا تھا۔

"تمہاری ماں کہاں ہے؟؟" اس نے تمہیں آتے نہیں دیکھا۔" نفیسہ بیگم کا موڈ خوشگواریت کی حد پر تھا۔

"دیکھا تھا۔ دیکھا کیوں نہیں۔۔۔ بیٹھی ہیں وہ ایک گلاس پھیکا دودھ ابلے ہوئے پھیکے چنے اور لال لوبیا مکس دو کھجور۔۔۔ انہیں اپنا آدھا وزن کم کرنا ہے۔ مجھے کوئی ایسی آفت نہیں۔۔۔ میں نے کوئی کیٹ واک کرنی ہے۔ مجھے تو سیخ سلائی ہونا ویسے ہی پسند نہیں۔ ہونہہ۔"

اس نے تایا اور زعیم کے برابر جگہ بنائی۔ "یہ دودھ تم پی لینا۔" اس نے زعیم کی جانب گلاس بڑھایا۔

"یہ چنے اس چاٹ میں مکس کردوں تائی جی۔۔۔" وہ

نفیسہ بیگم کے تمام اقدامات سے واقف تھی۔
"یہ سیب تم لے لو۔۔۔" اس نے اوبیہ کی جانب ہاتھ بڑھایا۔
"اور یہ انگور۔۔۔" اب کلیم کا نمبر تھا۔ "نہیں تم رہنے دو۔۔۔ یہ انگور کھٹے ہیں۔" اس نے اونچی آواز میں کہا۔ اور دوسرا بہت دھیرے سے۔۔۔ "تم لے لو عرشیہ! تمہیں انگور پسند ہیں ناں؟"
زرین نے کیا کہا تھا۔ اس نے اپنی نگاہیں زرین کے چہرے پر ٹکائیں۔ اسی پل اذان شروع ہو گئی۔
نماز سے واپسی پر جب کلیم کی نگاہ زرین پر گئی تو پلٹنا بھول گئی۔ نفیسہ بیگم کے اس دن لائے گلابی سنہری کام سے بوجھل دوپٹے کو عرشیہ نے اس طرح بیڈ پر ہوا میں اچھال کر اڑایا تھا کہ جب وہ بیڈ پر گرا تو۔۔۔ ایک کونے سے زرین کے شانے پر ٹک گیا۔
"اللہ زرین۔۔۔" عرشیہ بے خود سی ہو گئی۔ دوپٹے کا کنارہ میرون تھا۔ جس پر سفید مائل سنہرا کام تھا۔ عرشیہ نے کنارہ پکڑ کر گھونگھٹ کی طرح زرین کے چہرے پر ڈال دیا۔
"تم پر کتنا سجا ہے۔ اللہ! زرین۔۔۔ تم کتنی پیاری لگتی ہو۔"
اور نفیسہ بیگم کی نظر پڑ ہی گئی تھی۔ وہ مبہوت رہ گئیں۔ ان کی نگاہوں میں نجانے کیوں صائمہ کا چہرہ گھوم سا گیا۔ خوب صورت دوپٹے کے بوجھل ہالے میں دمکتے چاند نے رد عمل کی قوت کو جیسے پل بھر کے لیے سلب کر لیا تھا۔
زرین نے خود ہی دوپٹا سر سے اتار کر بیڈ پر رکھ دیا۔ اسی دم چونکتے کلیم پر نفیسہ بیگم کی نگاہ پڑی۔ وہ عورت ہو کر اور سب سے بڑھ کر مخالف ہو کر ایسے اثر میں آئی تھیں تو۔۔۔ ان کی تنبیہی ہنکار سے پہلے کلیم کا ضبط نہ رہا۔ اس نے یکدم قدم موڑے اور کمرے سے نکلتا چلا گیا۔
انہوں نے ایک لمبی طویل سانس لی تھی۔
"سنبھل جائے گا خود ہی۔"

☼ ☼ ☼

آخری عشرے میں زرین نے چھٹیاں کر لیں۔ کلیم کو بہت دنوں سے دکھائی بھی نہیں دی۔ ادھر نفیسہ بیگم کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ انہیں اب کوئی فکر نہیں تھی۔
اس نے نفیسہ بیگم کا بے فکر چہرہ دیکھا تھا۔ تو ایک جگمگاہٹ نسرین بیگم کے چہرے پر بھی تھی۔
لیکن۔۔۔ زرین نے انکار کر دیا تھا۔ صاف، برملا فیصلہ کن۔
"میں مصنوعی زندگی نہیں گزار سکتی۔" اس نے اپنے ڈیڈ سے کہا تھا۔ "جب ممی نے آپی کو اپنی مرضی کرنے دی۔ تو مجھ پر کوئی رائے کیوں مسلط کی جا رہی ہے۔"
"شرمین کی پسند بے عیب تھی بیٹا!" فہیم صاحب نے نرمی سے کہا۔
"تو کلیم کا نام کون سا تھانے میں لگا ہے۔" اس نے منہ پھاڑ کے کہہ دیا۔
"بے عیبی سے مراد وہ سب کی چاہ سے بیاہ کر گئی جبکہ بھابھی بیگم اس رشتے کو سخت ناپسند کرتی ہیں۔ ا... چاہا ہونا اتنا تکلیف دہ نہیں ہوتا، جتنا ہتک آمیز ہو... ہے۔"
"ٹھیک ہے ڈیڈ۔۔۔ لیکن مجھے ابھی ان جھمیلوں م... نہیں پڑنا۔ مجھے ابھی پڑھنا ہے اور بہت آگے جانا ہے او... رستے میں اس قسم کی رشتے کی گنجائش بہرحال نہی... ہے۔ آپ ممی کو خود سمجھا لیں۔"
زرین کے انکار کو نسرین بیگم بڑے دنوں سے ہو... کی طرح اڑا رہی تھیں لیکن جب مجازی خدا نے دو ٹوک الفاظ میں کہہ دیا۔
"اسے ابھی پڑھنے دیں۔ شادی بیاہ بعد میں د... جائے گا۔"
نسرین بیگم نے جب لہجے کی قطعیت کو جانچا تو ز... طرح چونکیں۔ ان کا انکار زرین کے انکار سے زیادہ... تھا۔
ادھر آئے زلزلے کے جھٹکے برابر والے گھر...

دیواروں میں بھی دراڑیں ڈال گئے۔ کلیم کی مردانگی پر چوٹ لگی۔ زرین کی بے فکری میں طمانیت نظر آئی تھی۔ اسے خود پر افسوس ہوا کہ وہ اسے پہچاننے میں غلطی کر گیا۔ یوں ہی خوامخواہ کے مذاق اور بحث میں دونوں نے دعوے کیے تھے۔
"میں اپنی ممی کو سنبھال لوں گی، تم اپنا معاملہ دیکھو۔"
"او یار میں بھی کر لوں گا۔ تم وقت تو آنے دو۔"
زرین کی سرکشی کلیم کی آنکھوں سے جھلکنے لگی تو نفیسہ بیگم کو ایک بار خطرہ سر پر منڈلاتا ہوا لگا۔ ان پر ادراک ہوا کہ کلیم کی فرماں برداری اور انہیں ملنے والی بے فکری دراصل زرین کے ہاتھ میں تھی۔ جب جی چاہا ڈھیل دے دی۔ جب جی چاہا طنابیں کھینچ لیں۔ یہ احساس اس قدر اذیت ناک تھا کہ جسم میں زہر بن کر دوڑنے لگا۔
یعنی زرین نے انہیں گراؤنڈ فراہم کیا کہ وہ اپنی مرضی کے اسٹروک لگائیں اور جب وہ کھلے ہاتھ سے کھیلنے لگیں تو جیسے ہاتھ جکڑ لیے۔
تو گویا اصل صاحب اختیار زرین تھی۔ زرین نے انہیں اپنی انگلیوں پر نچایا اور وہ خوش ہوتی رہیں۔ بیٹا پر بھی نہیں مار سکتا۔ بہت مشکل تھا زرین جیسی لڑکی کے ہوتے۔ صائمہ یا کسی بھی اور کو دل میں جگہ دینا۔ انہوں نے سوچا تھا۔ وہ ماں کے درجے کا فائدہ اٹھائیں گی اور کلیم کے پر قینچ کر دیں گی مگر اب انہیں لگا زرین نے انہیں ان کی حد بتائی تھی۔
زرین کی جانب سے آسرا ہوا تو کلیم کی آنکھوں میں کیا سرکشی آ گئی۔

☼ ☼ ☼

"میں ساری دنیا کو بتا چکی ہوں۔ کتنی سبکی ہو گی میری نا۔ شرمین کا بھی سسرالی معاملہ ہے۔" نسرین نے ایک موقع دیکھ کر دوبارہ بات نکالی۔
"تو اس میں بھی غلطی آپ کی ہے۔ رشتے طے ہو جانے کے بعد مٹھائیاں تقسیم کی جاتی ہیں۔ پہلے سے جھگڑے نہیں ڈالے جاتے۔ ایک لیول پیر تس ہونے اور مذہبی نقطہ نظر سے بھی لڑکی کی مناسبت سے اہم ہے۔ رہی شرمین! تو وہ ٹھیکل سسرال میں نہیں رہتی۔"
"بہزاد سے اچھا اور کون ہو گا۔" نسرین نے دہائی دی۔
"وہ جو۔۔۔ میری بیٹی کے دل کو اچھا لگے گا۔"
اور میاں کے سامنے تو بات ختم ہو گئی تھی۔ مگر زرین کو دیکھ دیکھ کر ان کے اندر غصے کی ایسی لہریں اٹھتی تھیں کہ بس۔۔۔ انہوں نے باقاعدہ اس کا بائیکاٹ کر دیا۔ دیکھنا چھوڑ دیا۔ مخاطب کرنا چھوڑ دیا۔ بلکہ مخاطب کیے جانے پر جواب دینا بھی۔۔۔ زرین نے مشکل کام کر لیا تھا۔ اب رہ گیا ماں کو منانا۔۔۔ افطاری سے کچھ دیر پہلے وہ منہ پھلا کر بیٹھی تھیں۔
زرین کے دل کو کچھ ہوا۔ چلو آج ممی کو منانے کا کام بھی کر لیا جائے۔ اس نے پیچھے سے آ کر ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ وہ بہت بری طرح چونکی تھیں۔ زرین نے پہلے ایک گال چوما، پھر دوسرا، اب گھوم کر آگے آ گئی۔ وہ خود کو چھڑانے لگیں۔ زرین کی گرفت سخت تھی۔ نسرین بری طرح جکڑی ہوئی تھیں۔ روزے کی نقاہت اور کچھ عود کر آتا غصہ۔۔۔ پتا نہیں کیسے۔۔۔ ان کا ہاتھ اٹھا اور زرین کے گال پر نشان چھوڑتا چلا گیا۔ زرین ششدر رہ گئی۔ وہ گال پر ہاتھ رکھے بے یقینی سے پیچھے ہٹتی چلی گئی۔ نسرین بھی بے ساختہ چونکیں۔ اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ انہوں نے تو کبھی بھی بچپن میں بھی۔۔۔
اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتیں یا کرتیں، زرین تیزی سے بھاگتی باہر نکل گئی۔
اس نے باہر نکل کر دھیرے سے اپنا ہاتھ گال سے ہٹایا۔ شدید ترین بے یقینی، اسے لگا اس کی آنکھیں لبریز ہو رہی ہیں۔ اسے ایک دم سناٹے اور خاموشی کا سا احساس ہوا۔ روزہ کھلنے میں بس چند منٹ ہی باقی تھے۔ اسے اندر واپس جانے میں ڈر سا لگا اور شرمندگی سی۔۔۔

اس نے لمبے سانس لیے' چہرہ تھپتھپایا۔ دوپٹے کو اپنے گرد لپیٹا۔

"میں افطاری کرنے آئی ہوں تائی جی!" کھلے دروازے سے صرف اس کا چہرہ دکھائی دیا۔ سنہری آنکھوں میں کچھ سرخی سی تھی اور چہرے پر بشاشت جو اس نے قصداً" اور جبراً" پیدا کی تھی۔

سفید دوپٹے کے ہالے میں اس کا چہرہ لش لش کر رہا تھا اور خاص طور پر آنکھیں۔۔۔

نفیسہ بیگم نے ایک سرسری نگاہ میں دروازے میں روشنیاں پھیلتی دیکھی تھیں اور دوسری نگاہ۔۔۔ کلیم کے چہرے پر روشنیوں کا عکس چراغاں بن کر جھلک رہا تھا۔ آنکھوں میں چھائی اتنے دن کی ایک مایوس ناکام کیفیت کی جگہ نیا رنگ تھا۔ محبت اور اعتماد۔۔۔

زرین اگلے قدم میں دسترخوان کے عین سامنے بیٹھ چکی تھی۔ سب دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے ہوئے تھے۔ اس نے بھی ہتھیلیاں سیدھی کیں اور آنکھیں موند کر لمبے سانس لیے تھے۔ وہ بہت ضبط کے باوجود شدید صدمے کے زیر اثر تھی۔ سو ہونٹ کچھ لرز سے گئے۔ اس کے چہرے پر معصومیت سی آرکی تھی۔ کلیم کو کچھ انہونی کا احساس ہوا۔ وہ نظریں ہٹا ہی نہ پا رہا تھا۔

"تمہارا وہ دولت مند باپ اتنا بھی نہیں کر سکا کہ تمہیں ڈھنگ کی افطاری ہی کروا سکے۔" زرین کی آنکھیں پٹ سے کھلیں۔

"ہزار مرتبہ ہمارے گھر میں بچوں کی ناپسندیدہ چیزیں بھی بنیں۔ مگر صبر شکر کر کے کھائیں۔ کبھی کسی کے گھر سالن مانگنے یا لنچ' ڈنر کرنے نہیں پہنچے۔"

"امی۔۔۔ کیا کہہ رہی ہیں۔۔۔ آپ۔۔۔" عرشیہ' ادیبہ' زعیم کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ وہ شدید ترین بے یقینی سے ماں کو دیکھ رہے تھے۔

زرین گڑبڑا گئی۔ بیٹھے بیٹھے کچھ پیچھے کھسکی۔ اس کی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔ اس نے نفیسہ بیگم کے پتھر چہرہ کو دیکھا۔ وہ کھڑی ہوگئی تھیں۔

"ممی نے مجھے تھپڑ مارا۔۔۔ ادھر۔۔۔ یہاں۔" اس نے کسی چار سالہ بچی کی طرح شکایت لگائی۔ "وہ میں اس لیے ادھر بھاگ کر آئی کہ ممی تو غصے میں تھیں۔"

"ہاں تو بہت پہلے لگا دینا چاہیے تھا یہ تھپڑ۔۔۔ دیر سے ہی سہی عقل آگئی اور ادھر کس لیے؟ کیا ہم گال سہلائیں گے۔ یا گود میں لے کر پچکاریں گے؟ چلو بھاگو ادھر سے۔۔۔ جو نافرمانیاں اور من مانیاں ادھر کرتی پھرتی ہو۔ میرے گھر میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔ میرے گھر میں میری ہی چلتی رہی ہے اور چلے گی۔" انہوں نے سینہ ٹھونک کر کہا۔

چاروں اولادیں بے یقینی اور صدمے کی انتہا پر تھیں۔

"اور تم سب کیا پتھر کے ہوگئے۔ چلو دعا مانگو۔" اپنی اولاد کو ڈپٹ کر وہ خود بھی چہرے کے آگے ہاتھ پھیلا کر بیٹھ گئیں۔

سب نے ماں کو دیکھا اور پھر زرین کو۔۔۔ جس کی سنہری آنکھیں لبالب بھری تھیں۔ وہ الٹے قدموں پیچھے ہوئی تھی۔ دروازے پر پہنچی تو منہ پر بے ساختہ ہاتھ رکھ لیے تھے۔ وہ ننگے پیر بھاگی تھی۔

کلیم ششدر رہ گیا تھا اور سب بھی۔۔۔ روزہ کھولنا تو دور کی بات۔۔۔ منہ تک نہیں کھل رہا تھا کہ اس میں کھجور ہی رکھ لی جاتی۔

تبصرے' تجزیے سے قطع نظر اس وقت سب کی قوت گویائی سلب ہوگئی تھی۔

(کسی اور نے بھی اس منظر کو بہت حیرت' بے یقینی اور شدید دکھ سے دیکھا تھا۔)



سارے گھر پر ایک موت کا سا سکوت تھا۔

نفیسہ بیگم کے اندر کیا چل رہا تھا' خبر نہیں' وہ زندگی بھر ایک کارگزار عورت رہی تھیں۔ ان کے قدم حسب معمول متحرک تھے اور آواز سارے گھر میں گونجتی رہی تھی۔

اگلے دن کی افطاری بھی حسب معمول اہتمام کے ساتھ دسترخوان پر سجی تھی اور خاموشی پچھلے روزے

بڑھ کر۔۔۔ نعیم صاحب تو کل دسترخوان پر نہیں تھے مگر وہ بھی بے حد خاموش تھے۔ روزے کی نقاہت سبب ہوگی۔

نفیسہ بیگم نے کھجور منہ میں رکھ کر پانی کا گلاس پکڑا ہی تھا۔

"نفیسہ! ذرا ایک منٹ۔۔۔ میرے ساتھ آؤ۔" نعیم صاحب کا جملہ حیران کن تھا۔ اس وقت کہاں جانا تھا۔

"اس وقت۔۔۔" نفیسہ بیگم نے ازحد حیرت سے دوبارہ سننا چاہا۔

"ہاں' ابھی اور اسی وقت۔۔۔" وہ کھڑے ہو چکے تھے۔ نفیسہ کے لیے ان کے لہجے کا ٹھہراؤ اور قطعیت حیران کن تھی۔ وہ کسی معمول کی طرح پیچھے گئی تھیں۔ وہ انہیں لیے ڈرائنگ روم کے اندر چلے گئے۔ کھڑکی کا پٹ ہلکا سا کھلا تھا اور ہوا سے پردہ ہل رہا تھا۔

"ذرا یہاں سے جھانکو۔" اپنے قریب بلا کر کہا۔ نفیسہ کسی قدر تیزی اور سہم کے ساتھ کھڑکی تک آئیں۔ باہر ہرا بھرا لان تھا۔ شام کا سناٹا۔۔۔ ایک مقدس پاکیزہ سی فضا۔۔۔ خوشبو نکھرا ستھرا گردوپیش۔۔۔ ان کی سوالیہ نگاہیں نعیم صاحب کے چہرے پر ٹھہریں۔ نگاہوں میں سوال تھا کیا دیکھوں؟ کیا ہے یہاں؟

"دوبارہ دیکھو اور غور سے دیکھو۔" انہوں نے بہلاوا دیا۔

نفیسہ چونک کر کسی قدر تجسس سے اس بار کھڑکی کی جانب گھومیں اور تب ہی انہوں نے دیکھا اور غور کرنے سے پہلے ہی دل کو کچھ ہوا تھا۔ انہوں نے نسرین اور فہیم کو کہیں جاتے دیکھا۔ آوازوں سے پتا چلا وہ کسی افطاری میں شرکت کے غرض سے روانہ ہوئے تھے۔

تو کیا زرین ہمراہ نہیں تھی۔

شام کے ملگجے اندھیرے نے ایک عجب اداسی سی پھیلا رکھی تھی۔ موسم پہلے ہی کچھ بادلوں والا تھا۔ خاموشی اداسی کو اور گہرا کر رہی تھی۔

وہ اپنے لان کی سنگی بینچ پر پیر لٹکائے بیٹھی تھی۔ گود میں ایک پلیٹ رکھی تھی۔ زمین پر پانی کی بوتل پڑی تھی۔ وہ جیسے ایک سکوت میں گھری ہوئی تھی۔

اس کی نظریں کبھی پودوں پر جا رکتیں۔ کبھی پنجروں پر ٹھہرتیں۔ اس نے ایک بار بھی پلیٹ کے اندر موجود چیزوں کو دیکھا نہیں تھا۔ منہ خالی ہو جاتا تو ہاتھ مشینی انداز میں پلیٹ پر جھک جاتا۔ منہ میں جو مرضی چلا جائے۔ پیٹ ہی تو بھرنا ہے۔

"میرا خیال تھا۔ تمہارا صرف ہاتھ تنگ ہے' مگر تمہارا دل اتنا تنگ ہوگا۔ میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا۔"

نفیسہ بیگم بری طرح چونکیں۔

"تمہاری کفایت شعاری' سلیقہ مندی' طور طریقے نے میری زندگی میں کبھی کوئی تنگی نہ رکھی۔ مگر تمہارا دل اتنی کم گنجائش رکھتا ہے۔ اس بات نے میرا دل بند کر دیا نفیسہ!"

"میں سمجھی نہیں۔"

"میں بھی نہیں سمجھا۔۔۔ کل شام سے اب تک حلق میں کچھ اٹک گیا۔ سانس تک نہیں آرہی۔ کوئی بیٹیوں کے ساتھ ایسے کرتا ہے۔" ان کا لہجہ دکھ سے چور چور ہو گیا تھا۔

"تو کیا کل شام نعیم نے سب سن لیا تھا۔" نفیسہ بیگم کی ہتھیلیوں سے پسینہ پھوٹا۔

"میں نے اسے خدانخواستہ افطاری یا کھانے پینے سے نہیں ٹوکا تھا۔ بس غصہ شدید ترین آیا۔ تو منہ سے نکل گیا۔ مجھے بہت شرمندگی ہے۔" نفیسہ کے چہرے پر سچائی تھی۔ "بس ایک دم غصہ۔۔۔"

"وہ صرف افطاری کرنے تھوڑی آئی تھی۔ اس نے بہزاد کے لیے منع کر دیا۔ کلیم کی آنکھوں میں' میں نے بغاوت دیکھی تھی۔"

"اور میرا دکھ اور بڑھ گیا۔ تم جانتی ہو کہ وہ صرف افطاری کرنے نہیں آئی تھی۔" نعیم صاحب نے جتا دیا۔

اسی پل دروازہ کھلا' کلیم اندر داخل ہوا۔ "ابا! سب

خیریت ہے نا؟" اس نے دونوں کے چہرے ٹٹولے۔
"ہاں۔۔۔ بیٹھو تم۔ فرماں برداری اچھی چیز ہے اور تمہاری ماں خوش قسمت ہے کہ تم نے فرماں برداری کی لاج رکھی لیکن تم نے تو اور بھی وعدے کیے تھے نا؟"
کلیم نے کچھ الجھ کر دیکھا۔
"میں جواب چاہتا ہوں۔"
"کچھ نہیں ابا۔۔۔ کوئی وعدہ نہیں۔" وہ ماں کی جانب دیکھ کر بولا۔
"وعدے توڑنے پر۔۔۔ جنت ہاتھ سے نہیں جاتی ابا اور اب جنت کو کون چھوڑے۔"
"بھلے زندگی جہنم میں گزرے۔" ابا نے ترنت کہا۔
"ابا۔۔۔!" وہ ہنسا تھا۔ "اتنا لمبا جہنم نہیں ہو گا۔ چالیس، پچاس سال بعد رہائی مل جائے گی۔ ابدی زندگی ماں کی اطاعت کر کے جنت مل جائے گی نا۔"
نفیسہ بیگم نے بات کو سمجھا تو دہل کر اس کی صورت دیکھی۔
"تو تم فیصلہ کر چکے ہو۔"
"فیصلہ تو امی نے کیا ہے ابا۔۔۔ میں نے تو سر ہلایا ہے۔ بس مجھے حیرت ہے کہ انہیں زرین سے اتنی سخت نفرت کیوں ہو گئی۔" اس کے انداز میں الجھن سی تھی۔
"نفرت انہیں زرین سے نہیں، نسرین سے ہے۔ انہیں اپنی بہن کو دیورانی بنانا تھا نا، فہیم نے صاف انکار کر کے نسرین کو بیاہ لیا۔ اب یہ اصل چاہتی ہیں۔"
کلیم بری طرح چونکا۔ اتنی روایتی، گھسی پٹی، بیک گراؤنڈ اسٹوری۔۔۔
"وہ بہن کی جگہ آئی۔ تعلیم اور شکل و صورت میں ان سے اور تمہاری خالہ سے ہزار گنا اچھی۔۔۔ عداوت کا دروازہ انہوں نے کھولا تھا۔ نسرین کو رستہ بنانے میں کوئی مشکل نہ ہوئی اور اب وہ رستہ اتنا خاردار ہے کہ دونوں کی انا زخمی ہوتی ہے گزرتے ہوئے۔"
کلیم صوفے پر بیٹھ گیا۔

"آؤ ذرا دیکھتے ہیں۔ وہ ایسا کون سا سونا چاندی کھا رہی ہے جو تم اسے نہیں دے سکتی تھیں۔"
نعیم صاحب نے نفیسہ کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ گھسٹتی ہوئی چلی تھیں۔
عرشیہ، ادیبہ اور زعیم نے ازحد حیرانی سے اس منظر کو دیکھا۔ نعیم صاحب نے کہا۔ "کچھ نہیں ہوا ہے۔ تم سب افطاری کرو ہم آتے ہیں۔"

☼ ☼ ☼

زرین نے نگاہ اٹھا کر فردا" فردا" دونوں کے چہرے دیکھے۔ اس کے چہرے پر حیرانی، شرمندگی اور ہلکا سا خوف آ گیا۔ اس نے اپنی بھری پلیٹ کو بغور دیکھا۔
"میری ممی نے آج مجھے ساری روزے والی چیزیں بنوا دیں۔"
اس نے کسی آٹھ، دس سال کی معصوم بچی کی طرح اپنی پلیٹ ذرا سی اٹھا کر دکھائی تھی۔ جس میں دنیا جہان کے لوازمات تھے۔ ایک دوسری پلیٹ سائیڈ پر ہی دھری تھی۔
مگر دونوں لبریز تھیں۔ تو وہ اتنی دیر سے کیا کھا رہی تھی۔ یوں ہی ٹونگیں مار رہی تھی؟
نفیسہ بیگم کا دل پکڑ گیا۔
کہتے ہیں لمحہ ہوتا ہے کسی بھی شے کا۔ دل پگھلنے کا بھی ایک وقت ہوتا ہے۔
وہ تیزی سے واپس پلٹیں۔ دسترخوان ہنوز تھا۔ کلیم نہیں تھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں آئیں تو وہ اسی طرح صوفے پر ٹکا تھا۔
"تم ابھی تک یہاں ہو۔ افطاری نہیں کی؟ آؤ جلدی۔" وہ واپس مڑیں۔
"امی۔۔۔" کلیم نے پکارا۔ وہ چونک کر مڑیں۔
"میرا خیال تھا آپ سب سے زیادہ پیار مجھ سے کرتی ہیں۔ میں نے سنا تھا بہت دعاؤں کے بعد آپ کو اولاد ملی اور پھر بیٹا یعنی میں۔۔۔ آپ نے اولاد کیوں مانگی۔۔۔ جب آپ کو اصل محبت خالہ سے تھی۔ آپ نے اس لیے مجھے مانگا تھا کہ خالہ کے دکھ کا مداوا

کر سکیں۔ میں ایسے ہی کہتا رہا۔ میں اپنی امی کا لاڈلا ہوں۔"
نفیسہ بیگم کا دل بیٹھنے لگا۔ کلیم کے لہجے کی ہار اور دکھ۔۔۔ کلیم کمرے سے نکل گیا تو وہ وہیں صوفے پر بیٹھ گئیں۔
زرین نے کتنی معصومیت سے جتایا تھا۔
"میری ممی نے میری پسند کی سب چیزیں بنا دی ہیں۔" لہجے میں مان غرور کی جھلک تھی۔
اس کی ممی اس کے لیے سب کر سکتی ہیں۔ کیا کلیم کے لہجے میں وہ یہ غرور آمیز خوشی دیکھ سکیں گی؟
کتنی نفرت کی تھی نسرین سے۔۔۔ یتیمی میں پلی بہن اگر فہیم سے بیاہ دی جاتی تو عیش کرتی۔۔۔ عیش تو وہ اب بھی کر رہی ہے۔ اسے زمیندار ملا وہ کون سی نا آسودہ رہی۔
اور وہ فون پر ہر بار کہتی تھی۔ "آپا! آپ نے رشتہ لینا ہے تو بات ڈال دیں۔ صائمہ کے چاچے، تائے اور پھپھیاں میرے منہ بیٹھی ہیں۔"
تو پھر وہ کس لیے ایک بے حد فالتو بات کو فساد بنا کر کھڑی تھیں؟
"اب آپ آ جائیں افطاری کرنے۔" کلیم انہیں لینے آ گیا۔
"تم کرو میں آتی ہوں۔"
"جب تک آپ نہیں آئیں گی، میں کچھ نہیں کھاؤں گا۔" وہ ضدی لہجے میں کھڑا تھا۔
"اپنے ابا کو بلا لو۔۔۔ انہوں نے بھی تو۔۔۔"
"نہیں آپ کی کیا فکر۔۔۔ کھا رہے ہیں اپنی بھتیجی کے ساتھ۔۔۔ مزے دار پکوان۔" کلیم نے ذرا سا آگے ہو کر جھانکا۔ نفیسہ بھی آگے ہوئیں۔
شام کے بلب روشن ہو چکے تھے۔ نعیم صاحب کا ہاتھ زرین کے شانے پر دھرا تھا۔ دونوں بہت خوش اور مطمئن نظر آ رہے تھے۔ زرین کے اداس چہرے اور نیلی آنکھوں میں چمک سی تھی۔ اللہ جانے نعیم صاحب کون سے دلفریب قصے سنا رہے تھے۔
نفیسہ نے پہلی بار نعیم صاحب کے چہرے کے رنگ بھی دیکھے تھے۔
اتنی شفقت اور اتنی۔۔۔ محبت۔۔۔ انہیں صائمہ سے اتنی محبت تو کبھی محسوس نہ ہوئی تھی۔
"میں کسی کو دسترخوان سے اٹھانے جیسا گناہ نہیں کر سکتی کبھی بھی۔۔۔ بس مجھے ایک دم ہی شدید غصہ آ گیا تھا۔"
سحری کے بعد سیپارہ پڑھنے میں ہی دھیان نہیں لگا پا رہی تھیں۔
اور زندگی میں نعیم صاحب نے کبھی انہیں ان کے کسی عمل پر ٹوکا نہیں تھا۔ اونچی آواز میں بات تو در کنار۔۔۔ ذرا سی خفگی بھری نگاہ بھی نہ ڈالی تھی۔
اور کل ان کے لہجے کا دکھ، افسوس، حیرانی۔۔۔ اور ناراضی۔۔۔ انہوں نے افطاری زرین کے ساتھ کھائی اور وہیں سے مسجد نماز کے لیے گئے۔ تو پھر تراویح کے بعد ہی لوٹے اور کسی سے بھی بات کیے بغیر سو گئے۔
سحری میں بھی ان کی چپ نے سب کی بولتی بند رکھی۔
قرآن جزدان میں لپیٹتی دبے قدموں بیڈ روم میں آئیں۔ نعیم صاحب سحری کے بعد آٹھ بجے تک سوتے تھے۔ مگر اس وقت وہ تکیوں کو پشت سے لگائے خاموش بیٹھے تھے۔ انہیں ایک سرسری نگاہ دیکھ کر دوبارہ کہیں کھو گئے۔
شوہر سے معذرت تو کرنی ہی تھی۔
"میں نے تو صرف اپنی بہن سے وعدہ کیا تھا بس۔۔۔" وہ بس یہی کہہ سکیں۔
نعیم صاحب نے نظریں ان کی جانب گھمائیں۔
"بڑھاپے میں نافرمان اولاد ایسے ہے جیسے کسی کی تیار کھڑی فصل کو آگ لگ جائے۔۔۔ اور آپ سے زیادہ کون سمجھے گا کہ فصل تیار کرنے میں کتنے دن رات لگتے ہیں۔"
ان کے سادہ سے جملے میں ساری حکایت تھی اور لہجہ اذیت سے پر۔۔۔
"آپ کو تو خوش ہونا چاہیے۔ بیٹا فرماں بردار ہے۔ وہ آپ کے کہے پر من و عن عمل کرے گا۔ مگر کیا آپ نے سوچا کہ آپ کسے شکست سے دوچار کر رہی ہیں؟"

"میں، میں۔" نفیسہ بیگم کو اپنا حلق خشک ہوتا محسوس ہوا تھا۔ "میں نسرین کو پسند نہیں کرتی مگر۔۔۔ وہ نہ ہوتی تو۔"

"نفیسہ۔۔۔!" فہیم صاحب ذرا تیزی سے بولے۔ "اگر خدانخواستہ۔۔۔ آپ کی بہن ناکام و نامراد زندگی گزار رہی ہوتی تو میں آپ کے عناد و بغض کو درست مان لیتا۔ مگر وہ تو ماشاء اللہ آپ سب بہن بھائیوں سے زیادہ خوش حال، خود کفیل زندگی گزار رہی ہے۔ سب سے اہم بات ہم نے کون سی کوئی باقاعدہ بات کر رکھی تھی۔ آپ کا ارادہ تھا بس اور وہ اپنے منہ سے کہہ رہی ہے کہ آپا کرنا ہے تو کر لو۔ میرے سسرال والے شگن ہاتھ میں لیے کھڑے ہیں۔ یا تو وہ مجبور و بے کس لڑکی ہوتی یا رشتوں کا کال ہوتا۔۔۔ جبکہ ایسا ویسا کچھ بھی نہیں۔ اور رہی نسرین۔۔۔ آپ برا مانیں یا بھلا۔۔۔ نسرین نے ہمیشہ ری ایکشن دیے ہیں۔ ابتدا آپ ہی کی جانب سے رہی ہمیشہ۔۔۔ اور آپ کیا سمجھ رہی ہیں۔ آپ نسرین کو پچھاڑ رہی ہیں اس کی بیٹی کو ریجیکٹ کر کے۔"

وہ ذرا اسارک کر استہزائیہ ہنسے۔ نفیسہ نے اچنبھے سے ان کی مسکراہٹ کو دیکھا تھا۔

"نسرین کو شکست تب ہوتی جب وہ خود کلیم کی طلب گار ہوتی۔ اس کے تو شاید فرشتے بھی لاعلم ہیں کہ آپ اسے حریف مان کر کیسی ساز باز کرتی پھر رہی ہیں۔ نسرین کو آپ کی سوچ، آپ کی نفرت محبت سے کوئی سروکار نہیں۔ اس کے پاس ڈاکٹر بہزاد جیسا اچھا بر موجود ہے۔

جیت منانے کا مزا سب کے بیچ ہوتا ہے بند کمرے میں آپ کیسا جشن منا سکتی ہیں مزا تب ہوتا۔ جب وہ دل گرفتہ ہوتی اور بیٹی کے آنسوؤں کے آگے دل پسیج جاتا بہرحال! یہ بات ہم سب جانتے ہیں اور آپ بھی جان لو کہ لاکھ کلیم میرا جگر گوشہ ہے مگر وہ بہزاد سے بہرحال بہتر نہیں ہے اس وقت۔"

نعیم صاحب اپنا تکیہ سیدھا جمانے لگے۔ وہ اب لیٹنا چاہ رہے تھے۔

"آپ گراؤنڈ میں اکیلی کھیل رہی ہیں۔ خود ہی جیت رہی ہیں۔ خود ہی تالیاں پیٹیں گی۔ خالی گراؤنڈ میں جیت کا جشن منائیے۔"

"جتنا پیار آپ کو اپنی بھتیجی پر آ رہا ہے۔ اتنا ہی مجھے اپنی بھانجی سے۔"

نفیسہ بیگم اتنے کھرے دو ٹوک جملے سن کر ششدر تھیں۔ یکدم بول اٹھیں۔

نعیم صاحب ایک بار تازہ دم ہو کر بیٹھے۔

"مجھے بھتیجی ہمیشہ کی پیاری ہے نفیسہ! آپ نے زندگی میں ہر کام میں جمع تفریق کی۔ جوڑ توڑ کی ماہر ہو ناں۔۔۔ اگر میں بھی کچھ جوڑ توڑ کروں تو۔۔۔ فہیم میرا لاڈلا چھوٹا بھائی۔۔۔ شرمین کو بیاہ چکا ہے۔ زرین شاید ملک سے باہر چلی جائے۔ بڈھا بڑھیا اکیلے گھر میں رہیں گے۔۔۔ بھاں بھاں کرتا گھر۔ زرین ہماری بہو ہو گی تو ماں باپ کے سامنے رہے گی۔ نانا، نانی، نواسوں نواسیوں سے دل بہلائیں گے۔ سچ کہوں بھائی کے اتنے بڑے گھر میں پھیل جانے والا سناٹا ابھی سے ہولاتا ہے۔ بہزاد بہت اچھا ہو گا۔۔۔ خاور اچھا ہے لیکن وہ دونوں کلیم کبھی نہیں ہو سکتے اور یہ مجھے کسی نے کہا نہیں ہے۔ یہ جوڑ توڑ میں نے خود کیا ہے۔

فہیم بیمار ہوتا ہے تو زرین بھاگتی ہوئی آتی ہے جب یہاں ہو گی نہیں تو کیسے بھاگتی آئے گی۔ ہمیں خبر ہونے تک تو بڈھا بڑھیا نے گل سڑ جانا ہے۔"

ان کا لہجہ بھر آ گیا اور نمی کی چادر آنکھ کے آگے تن گئی۔

ضبط اب محال تھا۔ وہ یکدم گرنے کے سے انداز میں لیٹ گئے۔

نفیسہ کو سکتہ ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

زرین کی منگنی عید کے دن (شام) کو رکھی گئی۔ عریشہ اریبہ زعیم کا جوش و خروش عروج پر تھا۔ چچا کے گھر سو کام تھے اور کلیم بچپن سے کام نمٹانے جایا ہی کرتا تھا۔ سو اب بھی کافی مصروف تھا۔

شام ہوتے ہی برقی قمقموں سے زرین کا گھر جگمگانے لگا۔ نسرین بیگم نے حسب عادت پیسہ پانی کی طرح بہایا تھا۔

سیکنڈ فلور سے گزرتی آرائشی بتیاں اچانک بجھ گئیں۔ کلیم کھڑکی کے چھجے پر سیڑھی لگا کر چڑھ گیا۔ وہ نیا بلب لگانے والا تھا۔ تب ہی نیم وا کھڑکی سے زرین پر نظر پڑی اس نے کتنے دنوں بعد اسے دیکھا تھا اور وہ بھی اس موہنے روپ میں۔ وہ سرخ رنگ کے کام دار سوٹ میں ہم رنگ چوڑیاں ہاتھوں میں بھر رہی تھی۔ انداز کبھی جارحانہ ہو جاتا اور کبھی بے بسی میں ڈھل جاتا۔

زرین نے یکدم نگاہ اٹھائی تو آئینے میں کلیم پر نظر پڑی۔

زرین بے ساختہ چوڑیاں چھوڑ کر کھڑکی تک آ گئی اس کی سنہری آنکھوں میں سرخی نمایاں تھی۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" اس نے اپنی حیران آواز کو مدھم رکھنے کی سعی کی۔

"میں۔۔۔ وہ۔۔۔ کچھ نہیں۔" کلیم ہکلایا۔ "تمہیں کچھ۔"

زرین کا چہرہ اتر گیا لہجے میں افسردگی گھل گئی۔

"میری مان لیتے تو آج سیدھے رستے سے اندر آتے۔ اس طرح کھڑکی سے تنک کر تو۔۔۔"

"ناں۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں تو وہ یہ قمقمے کا بلب بدلنے آیا تھا ادھر۔۔۔ تم پر نگاہ پڑی تو بس۔"

وہ ایک بار پھر وارفتگی سے اسے دیکھنے لگا۔

"یہی ہونا تھا کلیم۔۔۔ اور یہی ہونا چاہیے تھا۔ ناکام لوگ ہمیشہ محبوب کی بارات پر کرسیاں لگاتے ہیں۔ دیگیں بھرتے ہیں اور قورمے کی پیاز کاٹنے کے بہانے آنسو بہاتے ہیں۔"

"تم بھی تو جھٹ پٹ راضی ہو گئیں۔" کلیم طعنہ دینے سے نہ چوکا۔

"میرے بچے تمہیں ماموں کہیں گے کلیم!" وہ کسی اور ہی دنیا میں تھی۔ آواز دکھ سے بوجھل کلیم نے بمشکل خود کو سنبھالا۔

"نہیں تم انہیں انکل سکھانا۔" لفظ انکل سے کلیم کو ذرا ڈھارس محسوس ہوئی تھی۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے کلیم۔۔۔ تائی جی نے مجھے پھپھو کہلوانا ہے بلکہ پھپھی اماں!" وہ رونے کو ہو گئی۔ کلیم نے ہاتھ بڑھائے آنسو پونچھنے کے لیے مگر آنسو پونچھتا تو ہاتھ چھوڑتے ہی کھڑکی سے گر جاتا۔ دل مسوس کر رہ گیا۔

"میں تمہیں اس طرح روتے نہیں دیکھ سکتا زرین۔"

"تو اب تم میری طرف دیکھو بھی مت۔۔۔ بلکہ کبھی مت دیکھنا۔" زرین رو ہی دی۔ "میں اب پرائی امانت ہوں کلیم۔۔۔"

"ایسا مت کہو زرین۔"

"نہ کہنے سے حقیقت بدلتی نہیں ہے؟" اس نے رخ پھیر لیا۔

"ایسے منہ تو نہ موڑو۔۔۔" کلیم نے بے ساختہ دونوں ہاتھ بڑھائے تھے۔ یہ سوچے بنا کہ کھڑا کہاں ہے۔

اور پھر وہی ہوا جو سب سوچ سکتے ہیں۔ چاروں شانے چت۔۔۔

☼ ☼ ☼

زرین صوفے پر دولہن کے روپ میں بیٹھی تھی۔ شرمین نے جو کپڑے لا کر دیے وہ اس نے چڑھا لیے تیز پرفیوم پھول۔۔۔ مگر ایک مستقل بے چینی سی تھی نجانے کیسی۔۔۔

گھر بھر میں ایمرجنسی تو نافذ ہو گئی تھی۔ مگر پٹیاں کروا کے کلیم کو گھر لے آئے تھے شکر کہ ہڈیاں بچ گئی تھیں۔ زرین نے ممی سے التجا کی کہ اسے بس ایک نظر دیکھ آنے دیں۔ ممی نے گھورا۔

"منگنی میں کچھ ہی دیر باقی ہے اور یہ عیادت کرنے جائیں گی۔ چپکی بیٹھی رہو۔"

اس نے گھونگھٹ کی اوٹ سے ممی اور تائی کو دیکھا۔

ممی کا چہرہ کھلا ہوا تھا، تائی کا منہ دوسری طرف تھا۔

(ہاں تو اب تو خوش ہوں گی بہت سارے اعتراضات میں سے ایک یہ بھی کہ لڑکا لولا لنگڑا ہے۔ اور اسے دیکھو باپ، بھائی کا سہارا لے کر آگیا ہے۔ سچ کہتے ہیں آج کل عاشق بھی دو نمبر ہیں ورنہ اپنی محبت کو برایا ہوتے دیکھنے سے پہلے لوگ آنکھوں میں خنجر گھونپ لیا کرتے تھے)

کلیم پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ دائیں بائیں تایا اور زعیم بیساکھی بنے ہوئے تھے اور تائی کتنی خوش لگ رہی ہیں۔ ظاہر ہے بلا جو ٹل رہی ہے۔ اب جو مرضی کریں ان کے لیے میدان صاف ہو گیا ناں....

"اور یہ بو پتا نہیں کیسی ہے؟ سانس بند ہوئی جارہی ہے۔"

اس نے سب کو نشستوں پر مزے سے بیٹھے ہوئے دیکھ کر سوچا۔ اللہ جانے یہ ڈاکٹر بہزاد اور ان کی چڑیا ممی کب تک آئیں گی؟

ممی کے انداز بڑے مصروف تھے۔ وہ کسی مشہور تکے والے سے کباب منگوانا چاہتی تھیں۔ مگر نمبر مل کے ہی نہ دے رہا تھا۔ انہوں نے اونچی آواز میں فہیم صاحب کو بلایا۔ مگر فہیم صاحب کے اٹھنے سے پہلے نفیسہ بیگم نے لب کشائی کی۔

"تو ضرورت ہی کیا ہے اتنے مہنگے تکے منگوانے کی.... صبح سے یہاں، سویاں، بریانی، کڑاہی چل رہی ہے۔ اب مزید کیا پیٹ خراب کرنا، تم نے کیا بنایا تھا آج....؟"

"شیر خرما، کھیر، مٹن پلاؤ اور قورمہ.....!" نسرین نے ناسمجھی کے عالم میں عید کے دن کا مینیو بتایا۔

"تو کیا سب ختم ہو گیا؟" نفیسہ بیگم نے پوچھا۔

"نہیں سب ویسے کا ویسا ہے بلکہ فروٹ سلاد تو کسی نے چکھا تک نہیں۔"

"ہاں تو بس میں اپنے کچن سے بھی لے آتی ہوں اور تم یہاں میز لگواؤ۔ ضرورت ہی کیا ہے اتنا سب کیا ضائع کرنا ہے۔ صبح سے کھا ہی تو رہے ہیں۔ فارمیلٹی ہی پوری کرنا ہے نا۔"

نفیسہ بیگم کا انداز دو ٹوک تھا۔ نسرین نے کچھ حیرت سے فہیم صاحب کو اور نعیم صاحب کو دیکھا۔ دونوں بھائی ایک ہی صوفے پر تھے اور بڑے خوش نظر آتے تھے۔ آنکھ کے اشارے سے مان لینے کی تاکید کی۔ زرین وہ حیرت سے بے ہوش ہوتے بچی جب ممی نے فون رکھ دیا۔

نفیسہ، عرشیہ کے ہمراہ اپنے گھر روانہ ہوئیں اور تھوڑی دیر بعد ان کے لائے سامان سے ٹیبل سجنا شروع ہو گئی۔ نسرین نے بھی یہی کیا۔

ممی نے تائی جی کی بات مان لی اور وہ بھی اتنی آسانی سے اور وہ بھی اپنے گھر کے فنکشن میں.... یا اللہ یہ ماجرا کیا ہے اور وہ چڑیا آنٹی کہاں رہ گئیں۔

وہ ہر آہٹ پر دروازے کو دیکھتی تھی۔ سب کی ہنسی اور چٹکلے اسے جیسے سنائی ہی نہ دے رہے تھے۔ ایک عجیب سی بے حسی طاری تھی۔ اوپر سے بدبو نجانے کیسی تھی۔ اسے اپنے پاس ہی سے اٹھتی محسوس ہو رہی تھی۔ یا اللہ....

کلیم اس بار باپ اور چچا کا سہارا لے کر اٹھ رہا تھا۔ شاید واپس جا رہا تھا۔ ہاں اسے چلا ہی جانا چاہیے۔ بلکہ اسے آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ اس نے کڑھ کر سوچا مگر ساتھ ہی رونا آگیا۔ اس نے سر جھکا کر سختی سے آنکھیں میچ لیں۔

"سب کبوتر کو بزدلی کا طعنہ دیتے ہیں کہ بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ مگر آج پتا لگا آنکھیں بند کر لینے سے کتنا سکون، کتنی بے فکری میسر آتی ہے۔ خواہ پل بھر کی۔" اس نے آج خود کو کبوتر کی جگہ سوچا تو حکمت جانی۔ ایک بدبو سی مسلسل۔ پتا نہیں کہاں سے آرہی تھی۔

بھنبھناہٹ والا شور.... شور وغل میں بدلا اس نے اپنی آنکھیں اور میچیں۔

"چلیں رسم شروع کریں بھئی...." یہ شرمین کی آواز تھی۔ وہ تھری سیٹر پر براجمان تھی۔ اچانک ہی جگہ تنگ ہونے کا احساس ہونے لگا۔ سب ہی جیسے صوفے پر بیٹھ جانا چاہتے تھے۔

"انگوٹھی کون پہنائے گا؟" یہ ادیبہ باجی کی آواز تھی۔

"ماڈرن زمانہ ہے لڑکا ہی پہنادے۔" تائی کی آواز میں کتنا جوش و خروش تھا۔

لڑکے نے اپنے دونوں ہاتھ دیکھے۔ ناخن تک پٹی بندھی تھی۔

"ابا! آپ پہنادیں۔" وہ منمنایا۔

"لوجی۔ کیا میری منگنی ہے۔" صاف انکار۔

"میں پہنادوں بھائی! جب سے آپ کو چوٹ لگی ہے' سارے کام میں ہی کر کے دے رہا ہوں۔ میں اب بھی آپ کی ہیلپ کر سکتا ہوں۔"

یہ بے حد شوخ آواز زعیم کی تھی۔ زرین نے ناسمجھی کے عالم میں آنکھیں کھولیں۔ اس کے دائیں جانب نفیسہ تائی تھیں اور بائیں جانب پلاسٹر لگی ٹانگ والا وہ کلیم ہی تھا۔

"تو چڑیا آنٹی کہاں ہیں؟" اسے انہونی کا احساس ہوا تو گھونگھٹ الٹ دیا۔

کلیم کا انگوٹھی بڑھاتا ہاتھ رک گیا۔ مگر تب تک نفیسہ تائی اس کا ہاتھ ہوا میں اٹھا کر کلیم تک پہنچا چکی تھیں۔ کلیم نے آہ واہ کرتے ہوئے انگوٹھی اس کی انگلی میں ڈال دی۔ مبارک سلامت کا شور... زعیم نے فوراً" کھڑے ہو کر رقص شروع کر دیا تھا بہنیں تالیاں پیٹ رہی تھیں۔

زرین کا دوپٹا شانے پر گرا تھا۔ وہ حیرت سے ہوش و حواس کھو رہی تھی۔ تو باقی سب خوشی اور جوش سے۔ اس نے کلیم کا چہرہ دیکھنے کی سعی کی۔ مگر ڈاکٹر نے سر کی پٹی گویا آنکھوں تک لپیٹ دی تھی۔ چہرے پر سوجن بھی تھی۔ اس نے نگاہیں اٹھا کر ماں باپ اور دیگر کو دیکھا۔ نسرین کے چہرے پر مسکراہٹ اور مان تھا محبت بھی۔ وہ انگوٹھی کی ڈبیا کھول رہی تھیں۔

"پہناؤ اسے انگوٹھی...!" انہوں نے بڑھا دیا۔

زرین جیسے کسی ٹرانس میں تھی۔ اس نے انگوٹھی لے لی۔ کلیم نے ابا اور چچا کے ٹھوکوں پر دونوں ہاتھ بڑھا دیے۔ کوئی انگلی خالی نہیں تھی۔ عید کی چھٹی کے باعث پٹی کسی اناڑی ڈاکٹر نے کی تھی۔

"یہ تو مسئلہ ہو گیا؟" سب ہم آواز بولے۔

"لو خوامخواہ مسئلہ... مجھے پہنادیں۔ آخر میں بھائی ہوں۔" زعیم ایک بار پھر دھپ سے اس کے آگے دو زانو ہوا۔ سب نے اسے گھورا تو مصنوعی سٹپٹاہٹ سے بولا۔

"میرا مطلب ہے مشکل میں بھائی ہی بھائی کے کام آتا ہے۔"

"اپنے پاس رکھو اپنی ہمدردی... میں کل پرسوں آ کر پہن لوں گا۔" کلیم نے تیزی سے کہہ دیا۔

"چلو یہ بھی ٹھیک ہے۔" نسرین نے انگوٹھی دوبارہ بند کر دی۔ اب سب گلے مل رہے تھے۔ نسرین اور تائی بھی۔ زرین نے حیرت سے سب کو دیکھا اور اپنے ہاتھ کی انگوٹھی کو... یہ بہت پرانے ڈیزائن کی انگوٹھی تھی۔

"میں تمہیں نئی والی بھی بنوا دوں گا۔" کلیم اس کا چہرہ پڑھنا جانتا تھا۔

"یہ سب کیا ہے کلیم؟" وہ چلّا اٹھی۔ سب ہی متوجہ ہوئے۔

"یہ ضرب کلیم ہے زرین...!" کلیم نے سب کے متوجہ ہونے پر آواز ہلکی رکھی۔ مگر نعیم صاحب نے سن لیا۔ وہ کلیم کے ساتھ ہی تو دھنسے بیٹھے تھے۔

"غلط فہمی ہے میاں صاحبزادے... یہ ضرب کلیم نہیں' چشم زرین کا کمال ہے۔ ان سنہری آنکھوں سے نکلنے والے وہ آنسو... جہاں گرے مانو آگ لگا گئے۔"

"ممی کیسے مانیں... اور تائی جی؟" وہ ہنوز صدماتی کیفیت میں تھی۔

"بات یہ ہے کہ..." نعیم صاحب نے سرگوشی کے انداز میں راز کی بات بتائی گویا۔

"لیکن پھر بھی..." وہ وہیں اٹکی تھی۔

"بات یہ ہے کہ..." نعیم صاحب کچھ بتانے کے لیے آگے جھکے۔ کلیم نے سرگوشی کی۔ "دوپٹا تو سر پر ڈال لو۔"

"ایسے کیسے ڈال لوں... اتنی عجیب سی کیمیکل نما بو آ رہی ہے۔ میرا سر دکھنے لگا۔"

زرین نے اتنی دیر میں بو کا مرکز تلاش ہی لیا تھا۔ باپ بیٹا کی آنکھیں چار ہوئیں اور ایک قہقہہ فضا میں گونجا۔

"تو بو تو آنی ہے ناں... تم نے وہ جوڑا پہنا ہے جو امی نے اپنی چوتھی کی رسم پر پہنا تھا۔"

"کیا؟" وہ بے ساختہ چلائی اور خود کو غور سے دیکھا پہلے تو غم میں گھر کر ارد گرد کا ہوش ہی نہیں تھا۔

"یہ فنائل کی بو کے ساتھ لونگوں کی بو مکس ہو گئی ہے۔" کلیم نے نسخہ بھی بتا دیا۔

"تت... تو وہ گلابی میرون کہاں گیا۔"

"کیا تم اپنی تائی جی کو جانتی نہیں... وہ پورے آٹھ ہزار کا سوٹ سنبھال لیا ہے۔ بری میں رکھیں گی۔ ہم نے تو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ کہنے لگیں۔ گھر ہی کے تو چار لوگ ہیں۔"

"اور... اور ممی مان گئیں؟" اس نے ایک بار پھر سرخ جوڑے کو دیکھا۔ شام کو ممی ہی اسے ڈبا پکڑا کر گئی تھیں۔

"جب بڑی بڑی باتیں مان لیں تو یہ تو بہت چھوٹی سی بات ہے ناں۔" نسرین نجانے کب آئی تھیں "اور میں نے تو تم سے پہلے کہا تھا یہ سب ہو گا ہی۔ تمہیں ہی پروا نہ تھی اب بھگتو۔" ان کا انداز چھیڑنے والا تھا۔

"میں کپڑے بدل لوں... بہت بو ہے ممی...!" وہ بے چارگی سے بولی۔

"اور تمہیں ذرا احساس نہ ہوا کہ میں کیا پہنے بیٹھی ہوں۔" اسے کلیم پر جی بھر کے غصہ آیا۔

"اور تمہیں احساس ہے کہ میں نے کیا پہن رکھا ہے۔" اس کا اشارہ پٹیوں کی جانب تھا۔ زرین کو بھی اس کی حالت کا ادراک ہوا۔

"تمہیں بہت زور کی چوٹ لگی کلیم! کیا تم خود کشی کرنے لگے تھے؟" اس کے لہجے میں دکھ تھا۔

کلیم نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ خود کشی جیسا بزدلانہ اقدام کبھی نہ کرتا لیکن اگر ہونے والی بیوی پر زندگی بھر کے لیے امپریشن بن جائے تو کیا مضائقہ...

اس نے جھٹ اپنا پٹیوں والا سر ہلا دیا۔

"تائی جی کیسے مانیں...؟"

"مان گئیں یار! مائیں مان جاتی ہیں۔" اس نے کہا۔

"مجھے یقین نہیں آرہا۔" زرین نے اپنی انگوٹھی کو دیکھا۔ یہ بھی تائی جی کی ہی تھی۔ "مجھے لگتا تھا میں مر جاؤں گی۔ ساری ہمت ختم ہو گئی۔" اسے یکدم رونا آنے لگا۔ اتنی مشکلات کے بعد...

اس کے ہونٹ لرزے تو حسب عادت کلیم کا دل پگھلا۔ اس نے چھیڑنے کو لب کھولے۔

"اب یہ سب... اس وقت تو چچی کالا یا جوڑا مزے سے چڑھا کر بیٹھ گئی تھیں۔"

زرین نے بے ساختہ سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ پھر ڈائننگ ٹیبل کے گرد اکٹھے سب لوگوں پر نظر ڈالی۔ اس نے پل بھر توقف کیا۔

"کلیم! بیٹیوں کو ماؤں کے دیے گئے جوڑوں کو اسی خاموشی سے سر جھکا کر پہن لینا چاہیے۔ اسی میں بھلائی ہے اور عزت... ان کی بھی اور ان سے وابستہ لوگوں کی۔"

اتنی گہری بات سارے فصیحتے کا نچوڑ' اصل حکایت... وہ سر اٹھا کر اور گردن تان کر اسے دیکھ رہی تھی۔ کلیم نے بے ساختہ اپنا پٹیوں میں جکڑا ہاتھ اس کے ملائم ہاتھ پر رکھ کر تھپتھپایا۔ جس دن کا نام خوشی (عید) ہو اس دن کوئی آزردہ کیسے رہ سکتا ہے۔

آمنہ ریاض

تمہارے نام

باقر لودھی اپنے منجھلے بیٹے تقی کی غیر ذمہ دارانہ طبیعت سے سخت نالاں ہیں اور اسے ہروقت ہڈحرامی کے طعنے دیتے رہتے ہیں۔ تقی کو شوبز میں کام کرنے کا شوق ہے جبکہ لودھی صاحب اس کام کے سخت مخالف ہیں۔ دونوں باپ بیٹے میں اکثر جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔ رضی اور جری سے البتہ باقر صاحب کو کوئی شکایت نہیں۔

شفا کو عمیر نے والدین کے بعد باپ بن کر پالا ہے۔ وہ عمیر کی بے حد لاڈلی ہے مگر عمیر کی بیوی سماہر کو اس سے شدید جلن ہے وہ عمیر سے جھوٹ بول کر اسے شفا سے بدظن کرنے کی کوششیں کرتی رہتی ہے۔ عمیر کو اپنی بیوی پر پورا یقین ہے۔

سماہر اور عمیر کی شادی کے ابتدائی دنوں میں شفا سماہر سے بہت بدتمیزی کیا کرتی تھی۔ وہ اسے ہروقت عمیر کی نظروں سے گرانے کی کوشش کرتی اور جھوٹی سچی کہانیاں سنا کر اسے عمیر سے ڈانٹ پڑوا دیتی۔ رات کے کھانے پر پاستانہ بنانے پر اس نے سماہر سے بدلہ لینے کا ارادہ کیا اور سیڑھیوں سے حادثاتی طور پر گر جانے کا الزام سماہر پر لگا دیا کہ سماہر نے اسے دھکا دیا ہے۔ اس بات پر عمیر، سماہر کو دو تھپڑ مار دیتا ہے۔ سماہر کو بہت دکھ ہوا ہے۔ شفا خود بھی گنگ ہو جاتی ہے۔

تقی کے گہرے دوست سمیر کے ابا اپنی پسند سے اس کی منگنی کر دیتے ہیں۔

ناولٹ



شفا عمیر کو ساری بات بتا کر ان سے اور سماہر سے اپنی پچھلی تمام باتوں پر معافی مانگ لیتی ہے۔ عمیر اسے معاف کر دیتے ہیں مگر سماہر شفا سے بیر باندھ لیتی ہے اور غلط بیانی کر کے دونوں بہن بھائی میں غلط فہمیاں پیدا کرتی رہتی ہے۔ اسی طرح وہ عمیر کے منع کرنے کے باوجود ___ جھوٹ بول کر شفا کو کالج ٹرپ پر بھجوا دیتی ہے۔

کاسٹنگ ڈائریکٹر جاثم ___ تقی کو اپنے ڈرامے میں لیڈنگ رول کی آفر کرتا ہے۔ تقی اپنے ابا کی وجہ سے تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے۔

تقی اور سمیر بھی اپنے دوستوں کے ہمراہ مری جاتے ہیں اور اسی ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرتے ہیں، جہاں شفا کا گروپ ٹھہرا ہوتا ہے۔ وہاں سمیر کو ثمر پر اپنی منگیتر کا گمان ہوتا ہے۔ ٹرپ کے دوران دونوں گروپوں کے درمیان ہلکے پھلکے ٹاکرے ہوتے رہتے ہیں۔

۵
پانچویں قسط

"اب تو میڈیکل سائنس نے بھی ثابت کر دیا ہے کہ پندرہ منٹ کا غصہ انسان کا اتنا خون جلا دیتا ہے جتنا خون تین دن کی خوراک سے بھی نہیں بن پاتا۔ میں چونکہ ایک عقل مند انسان ہوں اور مجھے اپنا خون عزیز بھی بہت ہے، اسی لیے میں غصے سے دور رہتا ہوں۔ ابا جو ہیں غصے سے دوستی کرنے کے لیے۔ آپ نے دیکھا نہیں امی! غصہ کر کے ابا نے اپنا چہرہ خوف ناک کر لیا ہے۔ رنگ توے کی طرح کالا اور بال۔ بالکل فارغ البال۔ یعنی نہ ہونے کے برابر۔"

"خیر! اب تم اتنی بھی بے تکی نہ ہانکو۔ ہاں میں مانتی ہوں، ان کے بال تھوڑے جھڑ گئے ہیں لیکن بالکل ختم تو نہیں ہوئے اور کچھ تو بیماریوں کا بھی اثر ہے۔ اتنی سرخ و سفید رنگت ہے کہ کیا ہی کسی کشمیری کی رنگت ایسی ہو گی۔" امی نے فوراً لودھی صاحب کی حمایت لی۔

"خدارا کسی کشمیری کے سامنے بھول کر بھی نہ کہہ دیجیے گا۔ میں تو یہ مبالغہ آرائی سہ گیا۔ کیا پتا کشمیری کو بُرا ہی لگ جائے۔" تقی نے فوراً انہیں بڑی سنجیدگی سے خبردار کیا۔ کہنا مشکل تھا کہ وہ سنجیدہ ہے بھی یا نہیں۔

"اور ابا کی جوانی کی بھی آپ نے خوب کہی۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں موہنجوداڑو کے نوادرات بھی ابا کی جوانی سے نئے ہوں گے۔" وہ سادگی سے بول رہا تھا۔ اس کے انداز اور جملوں کے سبھاؤ سے بالکل پتا نہ چلتا تھا کہ شرارت پر آمادہ ہے۔ بس آنکھیں تھیں جو اس کا پول کھول دیتی تھیں۔ امی نے مسکراہٹ دباتے ہوئے ایک چپت رسید کی۔

"اب اس میں بُرا ماننے کی کیا بات ہے۔" وہ کندھا سہلانے لگا۔ "اور میں کون سا جھوٹ بول رہا ہوں، خدا جانے وہ کون سا سنہری دور ہو گا جب ابا جوان ہوتے ہوں گے۔ اللہ جھوٹ نہ بلوائے بھئی میں تو جب سے پیدا ہوا ہوں، انہیں ایسا ہی دیکھ رہا ہوں۔ آپ تو مجھے قبل از مسیح کی نہیں لگتیں امی! البتہ ابا کے بارے میں شک ہے۔"

"بس آتے ہی شروع ہو جایا کرو۔" امی نے سر پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا تقی اطمینان سے ان کی گود میں سر رکھے حسب عادت بے تکی ہانک رہا تھا۔

جس طرح صابن کا جھاگ پڑے پڑے خود بخود بیٹھ جاتا ہے، اسی طرح مری میں چند دن گزار کر اس کا غصہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ اسے غصہ آتا بھی کم تھا اور اتر بھی جلدی جاتا تھا، پھر وہ ہوم سک بھی بہت تھا۔ گھر اگر اس نے باقاعدہ ایک ایک کمرے میں جھانک کر دیکھا تھا۔ یہ اس کی بڑی عجیب سی عادت تھی۔ وہ صرف گھر والوں سے ہی نہیں گھر کی چار دیواری کے لیے بھی اداس ہو جاتا تھا۔

اب جب سے آیا تھا، امی کی گود میں سر رکھے لیٹا اپنے لاڈ اٹھوا رہا تھا۔ وہ جب بھی اٹھ کر جانے کی کوشش کرتیں، ہاتھ پکڑ کر پھر بٹھا لیتا۔ ساتھ ساتھ اپنی تعریفیں اور ابا کی بد تعریفی بھی جاری تھی۔

"اچھا اب خاموش رہو اور کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔" معاً امی نے آواز دبا کر کہا۔ وہ ان کے انداز سے سمجھ گیا کہ ابا کہیں نزدیک ہی موجود ہیں۔

رگ شرارت جو عموماً ابا کی موجودگی میں یوں بھی مچلتی ہی رہتی تھی، اب تو پھر اتنے دن کے بعد سامنا ہوا تھا، پھر جب سے آیا تھا، دیکھ رہا تھا ابا اسے قصداً نظر انداز کر رہے ہیں، سو اس وقت وہ سوئی ہوئی رگ اور بھی بُری طرح پھڑک اٹھی۔

"امی! اللہ خیر کرے۔ دشمنوں کی طبیعت ناساز لگ رہی ہے۔" بڑا فکر مندی والا انداز تھا۔ امی کسی اور جھونک میں تھیں، سمجھ نہ سکیں۔

"کس کی شامت آئی کہ تم سے دشمنی کر بیٹھا؟"

"ابا کی بات کر رہا ہوں۔ اور کسی میں اتنی ہمت کہاں کہ آپ کے شیر جوان سے دشمنی مول لیتا پھرے۔" بڑا اکڑ کر بتایا لیکن امی کی گھوری نے سیدھا کر دیا۔

"جب سے آیا ہوں دیکھ رہا ہوں، چپ چپ ہیں۔ نہ کوئی طعنہ۔ نہ کوئی برائی۔ کہیں ابا سدھر تو نہیں گئے؟" اتنی فکر مندی تھی اس کے لہجے میں کہ ایک پل کو امی بھی مخمصے میں پڑ گئیں، پھر بگڑ کر بولیں۔

"وہ بگڑے ہوئے کب تھے جو سدھریں گے۔ بگڑے ہوئے تو تم ہو پتا نہیں کب سدھرو گے۔"

"کبھی نہیں ان شاء اللہ۔" اس نے بھی دانت نکالتے ہوئے ڈھٹائی کی حد کر دی۔

"دیکھا تمہاری ان ہی باتوں پر انہیں اعتراض ہوتا ہے۔ کیا علاج کریں تمہارا؟"

"میرے پاس ایک حل ہے۔" اس نے سنجیدگی سے سینے پر بازو باندھتے ہوئے کہا تھا۔ "آپ ابا سے کہیں وہ مجھے عاق کر دیں۔"

امی ششدر رہ گئیں۔ اس نئے مطالبے کے پیچھے خدا جانے اس کی کیا منطق تھی۔

"آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں مذاق کر رہا ہوں۔ میں سو فیصد سنجیدہ ہوں آپ ابا سے کہیں وہ مجھے عاق کر دیں۔" وہ جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور امی کی طرف رخ کر کے چوکڑی لگا کر اصرار کرنے لگا۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا تقی!" امی نے جھنجلا کر کہا۔

"دماغ خراب نہیں ہوا۔ میں بڑی لوجیکل بات کر رہا ہوں۔" اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "دراصل میں نے کچھ روز پہلے دور جاہلیت کے بہت بڑے شاعر کا قصہ پڑھا ہے، جو شاہی خاندان کا فرد بھی تھا اور اس کا نام امراؤالقیس تھا۔ امی! میں شاعر ہوں نہ ہی شاہی خاندان کا فرد۔ پھر بھی مجھے اپنی زندگی امراؤالقیس سے ملتی ہوئی لگتی ہے کیونکہ امراؤالقیس کے ابا میاں حجر صاحب۔ میرے ابا کی طرح اپنے بیٹے کو بہت نالائق سمجھتے تھے اور اسی نالائقی کی پاداش میں انہوں نے اسے عاق کر دیا تھا، پھر ہوا کچھ یوں کہ جب حجر صاحب قتل ہوئے تو ان کے لائق فائق، ہونہار بیٹے تو رو دھو کر ایک طرف ہو بیٹھے اس وقت صرف امراؤالقیس تھا جس نے اپنے ابا کے قاتلوں کو ان کے انجام تک پہنچانے کا ذمہ لیا اور باقی کی ساری زندگی اسی کوشش میں بسر کر دی۔" ابھی یہی

تک پہنچا تھا کہ جملہ بروقت کٹا۔

"تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ جب میں قتل ہوں گا تو رضی اور جری رو دھو کر بیٹھ جائیں گے لیکن اس وقت تم وہ کھونٹے سکے ہو گے جو میرے قاتلوں کو ان کے انجام تک پہنچاؤ گے؟"

آواز کیا تھا، سمجھو نقارہ ہی تھا لیکن تقی کو بہت زور زور کی گدگدی ہونے لگی ڈھٹائی تو اس میں اتنی تھی کہ بار بار ابا کو ستا کر لطف لیتا۔ ابھی بھی گو کہ ان کے تیور پہچان رہا تھا لیکن پھر بھی دانت نکالتے ہوئے زور زور سے اثبات میں سر ہلانے لگا۔

"جی جی ابا! میں ایسا ہی کروں گا۔ اور دیکھیے گا اس وقت آپ کو مجھ پر کتنا فخر محسوس ہو گا۔"

"قبر میں لیٹ کر تم پر فخر محسوس کروں گا؟" انہوں نے سابقہ سنجیدگی سے پوچھا۔

"جی ہاں بالکل۔ بشرطیکہ حساب کتاب کے فرشتوں نے اجازت دی ہو۔" یہ آخری بات نقص امن کے خدشے سے خاصی دھیمی آواز میں کہی گئی تھی۔

"یعنی تم میرے مرنے کی دعائیں کر رہے ہو؟" لودھی صاحب جیسے بمشکل اپنا غصہ دبا رہے تھے۔ تقی سٹپٹا گیا' یہ تو سوچا ہی نہیں تھا۔

"وہ۔ وہ۔ ابا!"

"میں مر جاؤں تو تمہیں خوشی ہو گی۔" ابا کے تاثرات غضب ناک ہو رہے تھے اور چھڑی پر ان کی گرفت بھی سخت ہو رہی تھی۔ تقی محتاط انداز میں دروازے کی طرف کھسکنے لگا۔

"آپ۔۔۔ آپ میرا مطلب نہیں سمجھے ابا!" اس نے گھگھیا کر کہا۔

"مطلب تو تمہیں اب میں سمجھاتا ہوں۔ نالائق۔ نابنجار!" وہ بری طرح بھڑک کر چھڑی لہراتے اس کی طرف لپکے لیکن ان سے بھی پہلے تقی نے ایک دل دوز چیخ ماری اور ایک ہی جست میں لاؤنج کا دروزہ عبور کر گیا۔

"دوبارہ گھر میں قدم رکھنا۔ ٹانگیں توڑ دوں گا تمہاری۔"

لودھی صاحب بری طرح ہانپ رہے تھے۔ اتنی سی مشقت نے بھی انہیں بری طرح تھکا دیا تھا۔ امی ابھی بیٹھی تھیں' سمجھ نہیں پا رہی تھیں' مسکرائیں یا غصہ کریں۔

☼ ☼ ☼

شفا نے جھجکتے ہوئے کمرے میں جھانکا۔ ساہر عمیر کے شوز پالش کرنے کے بعد اب ان کے کپڑے نکالنے لگی تھی۔ دستک کی آواز پر اس نے مڑ کر دیکھا اور شفا کو دیکھ کر مسکرائی۔

"وہاں کیوں کھڑی ہو شفا! اندر آجاؤ نا۔"

"بھابھی! آج میری پہلی کلاس آف ہے' اس لیے میں کالج تھوڑا لیٹ جاؤں گی۔"

"لیٹ جانا تھا تو اتنی جلدی تیار کیوں ہو گئیں؟" ساہر نے اسے کالج یونیفارم میں تیار دیکھ کر کہا۔ وہ سفید شلوار قمیص پر زرد رنگ کا دوپٹا اوڑھے ہوئے تھی۔

"آدھا گھنٹہ ہی لیٹ جانا ہے۔ ویسے بھی میں تیار ہو چکی تو حریم کی کال آئی تھی۔" اس نے بے توجہی سے جواب دیا۔ اس کی متلاشی نظریں کمرے میں گھوم رہی تھیں۔ ساہر کو سمجھنے میں ایک پل ہی لگا۔ ساتھ ہی اس نے آنکھوں سے باہر کی طرف اشارہ کر دیا اور آواز دبا کر بولی۔

"آفس سے کال تھی۔ سننے کے لیے باہر گئے ہیں۔"

"بھابھی! آج بھائی کا ناشتا میں بنا دوں؟" اس نے بھی آواز دبا کر پوچھا تھا۔

"ہاں ضرور۔" ساہر نے روانی میں کہا پھر چونک کر اسے دیکھا تو وہ تذبذب میں پڑ گئی تھی۔ اس کی جھجک کو شفا بخوبی سمجھ رہی تھی۔

"بنا لینے دیں نا۔ بھابھی! بھائی کا فیورٹ آملیٹ پراٹھا بناؤں گی۔ شاید ان کی ناراضی ختم ہو جائے۔" اس نے معصومیت سے کہا۔

"مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے شفا! لیکن عمیر کہیں ناراض نہ ہوں۔" ساہر نے لاچاری سے کہا۔

"نہیں کہاں پتا چلے گا بھابھی! آپ کہہ دیجیے گا' آپ نے بنایا ہے۔"

"جانے بھی دو شفا! جیسے میں کہوں گی اور عمیر فوراً" میری بات مان لیں گے۔۔۔ بھئی وہ تمہارے ہاتھ کے ذائقے سے خوب اچھی طرح واقف ہیں۔۔۔ سالن میں بناؤں اور تم اس میں محض نمک بھی ڈال دو تو انہیں پتا چل جاتا ہے۔"

تب ہی عمیر اندر داخل ہوئے۔ وہ ابھی بھی اپنے سیل پر کچھ دیکھ رہے تھے۔

"ساہر! میرا ناشتا بناؤ۔۔۔ مجھے ذرا جلدی نکلنا ہے۔۔۔" انہوں نے شفا پر نظر بھی نہ ڈالی تھی۔

"آپ بھائی کے کپڑے نکال دیں بھابھی! بھائی کے لیے ناشتا میں بنا دیتی ہوں۔" شفا نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" عمیر نے کہا۔

"بھائی! میں بنا دیتی ہوں۔۔۔"

"میں نے کہا نا ضرورت نہیں ہے۔۔۔ ساہر بنا دے گی۔" اب کی بار عمیر کے لہجے میں سختی اور قطعیت تھی۔

شفا کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ وہ خاموشی سے باہر نکل گئی۔

ساہر نے اسے جاتے دیکھا پھر عمیر سے خفگی سے بولی۔

"اب بس بھی کریں عمیر! پورا ہفتہ گزر چکا ہے اسے واپس آئے اور آپ کی ناراضی ہے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی۔"

"تمہارا کیا خیال ہے' شفا کو اس طرح اداس دیکھنا مجھے اچھا لگ رہا ہے؟" عمیر نے کہا۔ "مجھے بھی اتنی ہی تکلیف ہو رہی ہے جتنی کہ خود اس کو۔ لیکن شفا کی ہٹ دھرمی کا یہی علاج ہے۔ اسے احساس ہونا چاہیے کہ بڑوں کی بات نہ مان کر اس نے غلط کیا ہے۔"

ساہر نے عمیر کو جتا دیا کہ اسے عمیر کا شفا سے خفا ہونا اچھا نہیں لگ رہا لیکن دل سے وہ مطمئن تھی۔

بھائی بہن کے درمیان فاصلے پیدا ہو رہے تھے اور وہ یہی چاہتی تھی۔

جس روز شفا کی واپسی ہوئی۔ اس نے شرمندہ سے انداز میں شفا کو بتا دیا تھا کہ اس نے غلط بیانی کی تھی۔

"مجھے پتا تھا تمہارا بہت دل ہے کہ تم ٹرپ کے ساتھ جاؤ۔ اس لیے میں نے تم سے کہہ دیا کہ عمیر رضامند ہو گئے ہیں۔ میرا خیال تھا تمہاری غیر موجودگی میں میں عمیر کو منا لوں گی لیکن۔۔۔ ایم سوری شفا! عمیر بہت غصے میں آ گئے ہیں۔" وہ باقاعدہ آنکھوں میں آنسو بھر لائی تھی۔

"اور اب اگر انہیں یہ پتا چلا کہ میں نے تم سے جھوٹ کہا تھا تو وہ مجھ سے بھی بہت خفا ہو جائیں گے۔ مجھے تو گھر سے ہی نکال دیں گے۔۔۔ میں واقعی بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے غلط بیانی نہیں کرنا چاہیے تھی۔۔۔ لیکن یقین مانو میں نے تو وہ سب اس لیے کیا کہ تم خوش ہو سکو۔۔۔ میرا طریقہ غلط ہو سکتا ہے' ارادہ ہرگز غلط نہیں تھا۔"

"آپ فکر مند نہ ہوں بھابھی! اتنی آسانی سے تو بھائی آپ کو نہیں نکال سکتے۔" شفا بھی فکر مند ہو گئی تھی لیکن ساہر جانتی تھی اتنی جذباتی اداکاری سے شفا جیسی لڑکی کو ایموشنل بلیک میل کرنا ہرگز بھی مشکل نہیں تھا۔

شفا نے عمیر کے سامنے شرمساری کا اظہار کیا تھا لیکن اپنی صفائی میں ایک لفظ نہیں بولی تھی۔ عمیر تو اس سے یوں بھی بات نہیں کر رہے تھے ایسے میں اس کی خاموشی نے جیسے خود بخود یہ ثابت کر دیا تھا کہ اس نے ہٹ دھرمی کی ہے۔ دونوں بہن بھائی کے دل ایک دوسرے کے لیے خواہ کتنے بھی اداس کیوں نہ ہوں لیکن ان دونوں نے ہی خاموشی تان لی تھی۔

ساہر خوش تھی اور مطمئن بھی۔

اسی کیفیت میں چند منٹ بعد وہ کچن کی طرف آئی لیکن جوں ہی اس نے کچن میں قدم رکھا۔ دھک سے رہ گئی۔ شفا روتے ہوئے کٹنگ بورڈ پر پیاز کاٹ رہی تھی اور اس کے دوپٹے کا پلو چولہے کے پاس تھا شعلے

نے آن کی آن میں خوش رنگ آنچل کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

"شفا۔" سماہر خوف زدہ ہو کر اتنی زور سے چیخی تھی کہ اس کی آواز سے پورا گھر گونج اٹھا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کی آواز اپنے کمرے میں اطمینان سے شوز پہنتے عمیر کے کانوں تک نہ پہنچتی۔

☼ ☼ ☼

سمیر کے منہ پر بارہ بجے ہوئے تھے۔ تقی نے دس بار وجہ پوچھی وہ ہر بار "بس کچھ نہ پوچھو" کہہ کر منہ بسور لیتا۔

تقی نے گیارہویں بار پوچھنے کے بجائے آنکھوں ہی آنکھوں میں "دفع دور" کہا اور بائیں ٹانگ دائیں پر رکھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ سمیر کی سڑی ہوئی شکل دیکھنے سے بہتر تو یہی تھا کہ جاثم رضا کے ویٹنگ روم کا جائزہ لے لیا جاتا۔

سمیر نے کچھ دیر انتظار کیا پھر تڑپ کر بولا۔

"اب پوچھ بھی لو کہ آخر ہوا کیا ہے۔"

"تو اتنی دیر سے کیا میں دیواروں سے پوچھ رہا تھا۔" تقی دھیمی آواز میں سلگ کر بولا — "مگر جناب کی ادائیں ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہیں۔ بس کچھ نہ پوچھو بس کچھ نہ پوچھو۔۔۔ اس سے تو اچھا تھا میں اکیلا جاثم سے ملنے آجاتا۔ کم سے کم تیری یہ زمانے سے آوازار شکل تو نہ دیکھنے کو ملتی۔" اس نے بے مروتی سے جھاڑنے میں ایک منٹ بھی نہیں لگایا تھا۔

سمیر اپنا سا منہ لے کر رہ گیا لیکن چونکہ —— دل ہلکا کیے بغیر سکون بھی نہیں آنا تھا سو بولنے لگا البتہ انداز نروٹھا سا تھا۔

"میں نے ابو سے صاف کہہ دیا ہے کہ مر جاؤں گا لیکن ثمر سے شادی نہیں کروں گا۔"

"پھر کیا کہا انکل نے؟"

"ابو نے دراز سے نیند کی گولیاں نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ دیں اور بولے۔۔۔ یہ کھاتے ہوئے ہاتھ کانپیں تو ریلوے اسٹیشن کا رستہ تمہیں معلوم ہے۔

تیز گام کی ٹائمنگ میں بتا دوں گا۔" وہ رو دینے کو تھا اور تقی کا بے ساختہ قہقہہ اتنا بلند تھا کہ ویٹنگ روم میں بیٹھے دیگر افراد فوراً ان دونوں کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

سمیر نے اسے گھور کر دیکھا۔

"تم انتہائی ال مینرڈ انسان ہو تقی۔۔۔ میں اپنا دکھ سنا رہا ہوں اور تم ہنس رہے ہو۔"

"ہنسی تو مجھے یہ سوچ کر آرہی ہے کہ میں صرف اپنے ابا کو جلاد صفت سمجھتا تھا اب پتا چلا سارے زمانے کا یہی حال ہے۔" اسے سوچ سوچ کر ہی گدگدی ہوئے جا رہی تھی۔ سمیر کو ہرگز بھی "اباؤں" کی فلاسفی سے دلچسپی نہیں تھی اسے اپنی ہی مصیبت پڑی ہوئی تھی۔

"تقی! میں ثمر سے شادی نہیں کروں گا۔" اس کا انداز بچوں جیسا تھا۔ ایسے جیسے کوئی بچہ اپنی ضد منوانے کے لیے زمین پر پاؤں پٹخ رہا ہو۔

"یار! اتنا گھبرانے کی کیا ضرورت ہے۔ پہلے کنفرم تو ہو جانے دو کہ دونوں لڑکیاں ایک ہی ہیں یا نہیں۔" تقی نے تحمل سے سمجھایا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ یہ وہی ثمر ہے جسے ابو نے میرے لیے پسند کیا ہے۔۔۔" سمیر نے بددلی سے کہا تھا۔

"تمہیں تو خیر فرسٹ ایر والی نوشابہ کے بارے میں بھی یہی لگا تھا کہ تقدیر نے اسے تمہارے لیے ہی بنایا ہے۔۔۔ اور وہ جو کیمسٹری ڈپارٹمنٹ کی فارہ تھی اس کے بارے میں تو تمہیں سو فیصد یقین تھا۔" تقی نے ماضی کے کچھ رنگین قصوں کا حوالہ دیا۔ سمیر خفیف سا ہو کر کان کھجانے لگا۔

"خیر مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ انکل سے کہو ثمر بھابھی کی تصویر تو دکھائیں۔"

"وہ تو ابو اب ہرگز نہیں دکھائیں گے۔" سمیر نے منہ لٹکا کر کہا۔

"تو نے انکل کو انکار کی وجہ بتائی؟" تقی نے ذرا سنجیدہ ہوتے ہوئے پوچھا

"دماغ خراب ہے کیا۔" سمیر نے بدک کر کہا۔

"اصل بات بتاتا تو ابو نے میرا اگلا ہی دیا دینا تھا۔"

"اچھا سمیر! جو بھی ہوا اس میں غلطی تو میری ہے نا۔ میں نے ہی مشورہ دیا تھا کہ تو جا کر اس لڑکی سے بات کر۔۔۔ جو ہونا تھا سو ہو گیا۔" تقی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "ویسے بھی دونوں لڑکیاں ایک نہیں ہو سکتیں۔ یاد نہیں۔ ثمر کی سہیلی نے کیا کہا تھا کہ وہ تو شادی شدہ ہے۔ تو بس بات ختم۔"

"ارے ہاں۔۔۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔" یکدم جیسے سمیر کے سر سے کوئی بوجھ اتر گیا تھا پھر منہ بنا کر بولا۔

"بس یار! یہ نام ہی دل سے اتر گیا ہے۔"

تقی ہنس دیا۔ "تم شادی کے بعد بھابھی کا نام بدل دینا۔"

"یہ جاثم تو بہت انتظار کروا رہا ہے یار! میں تو نکلتا ہوں پھر۔" سمیر نے اپنے سیل فون پر ٹائم دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے بتایا تھا ناں روحیل اور وشمہ آپا کو ریسیو کرنے ایئرپورٹ جانا ہے۔۔۔ پانچ منٹ بھی میں لیٹ ہوا تو وہ دونوں بہن بھائی بہت شور مچائیں گے اماں الگ خفا ہوں گی۔" سمیر کسی قدر بے زاری سے کہہ رہا تھا۔

"یہ دونوں ہیں کون جن کی تمہیں اتنی فکر پڑی ہوئی ہے؟" تقی نے پوچھا اسے یہ سوچ کر کوفت ہو رہی تھی کہ اب اسے تنہا انتظار کرنا پڑے گا جاثم سے اپائنٹمنٹ نہیں لی تھی۔ سمیر کو اسی لیے ساتھ لایا تھا کہ جانتا تھا انتظار کرنا ہی پڑے گا۔

"اماں کی فرسٹ کزن اور بہترین دوست کے بچے ہیں یار! بیست سال پہلے ان لوگوں کا گھر ہمارے گھر کے ساتھ ہی تھا پھر وشمہ آپا کی شادی امریکا میں ہوئی تو کچھ عرصہ بعد یہ ساری فیملی وہاں شفٹ ہو گئی۔ آتے جاتے رہے ہیں یہ لوگ لیکن اس بار تقریباً" چار سال بعد دونوں بہن بھائی پاکستان آرہے ہیں تو اماں بہت ایکسائیٹڈ ہیں۔ انہیں اپنی مرحومہ دوست کے بچوں سے پیار بھی بہت ہے۔ فون پر تو مسلسل رابطہ رہا ہے

۔ اب اماں چاہتی ہیں کہ ہم بہن بھائی ان دونوں کو جب تک وہ پاکستان میں رہیں، فل ٹائم دیں۔ یہ روحیل تو میرا ایج فیلو بھی ہے۔ اچھی دوستی ہوا کرتی تھی میری اس کے ساتھ لیکن اتنی بھی نہیں کہ وہ پاکستان آرہا ہے تو میں اپنے سارے کام ہی چھوڑ چھاڑ کر بیٹھ جاؤں ۔ لیکن یہ بات ہماری اماں کو کون سمجھائے۔"

سمیر کچھ بے زاری سے بول رہا تھا۔ اسی وقت ریسیپشنسٹ نے تقی کا نام پکار کر اسے اندر جانے کے لیے کہا تو وہ دونوں ہی ایک ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے تھے

☼ ☼ ☼

شفا تکیے سے ٹیک لگا کر نیم دراز تھی۔ عمیر اس کے پاس بیٹھے تھے۔ انہوں نے اپنا بازو شفا کے کندھوں کے گرد پھیلا رکھا تھا اور سماہر دروازے سے کچھ فاصلے پر کھڑی یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔

"اب دوبارہ تم دوپٹا اوڑھ کر کچن میں نہیں جاؤ گی۔۔۔ بلکہ۔۔۔ تمہیں کچن میں جانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔" عمیر حد درجہ فکر مندی سے کہہ رہے تھے۔

"بھائی! آپ فکر نہ کریں میں بالکل ٹھیک ہوں۔" شفا نے بشاشت سے ہنس کر کہا تھا گو کہ سماہر نے فی الفور اس کا دوپٹا جلتے دیکھ کر کھینچ کر اتار دیا تھا لیکن اس افراتفری میں اس کی گردن سے دوپٹا بری طرح رگڑ گیا تھا اور تھوڑی سی تپش اس کے بازو کو بھی جھلسا گئی تھی۔

حالانکہ کوئی اتنی مصیبت نہیں آگئی تھی۔ چھوٹے موٹے حادثے ہو جایا کرتے ہیں لیکن یہ "چھوٹا سا حادثہ" عمیر کو تڑپا دینے کے لیے کافی تھا۔ ان کی ساری ناراضی اڑن چھو ہو گئی تھی اور اب وہ بہن کی پٹی سے لگے بیٹھے تھے۔

سماہر کے پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا سوائے اس کے کہ وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتی رہے۔ سو وہ یہی کر رہی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ مسکرا رہی تھی۔

"آپ بے فکر رہیں عمیو! اسے تو اب میں کچن کی شکل بھی نہیں دیکھنے دوں گی۔ میں ذرا عادل اور ہدیہ کو دیکھ لوں۔"

جس وقت وہ کمرے کا دروازہ عبور کر رہی تھی اس نے عمیو کو کچھ کہتے سنا جواب میں شفا ہنسنے لگی تھی۔ ساہر کے دل پر بوجھ آن گرا۔

ظہر کی نماز کا وقت ہو رہا تھا لیکن اتنے بھاری دل کے ساتھ وہ نماز بھی نہیں پڑھ سکتی تھی جس ناراضی کے لیے اس نے اتنی منصوبہ بندی کے ساتھ راہ ہموار کی تھی۔ وہ قدرت کی مہربانی سے بنا کسی معافی تلافی کے ختم ہو گئی تھی۔ ساہر کا دل پتھر کا بنا ہوا نہیں تھا لیکن ایک پل کے لیے اس نے یہ ضرور سوچا تھا کہ کاش اس نے شفا کا جلتا ہوا دوپٹا اس کے گلے سے نہ نکالا ہوتا۔



"ڈونٹ ٹیل می کہ تم انکار کرنے آئے ہو۔"

جاثم نے تقی کی بات سن کر بہت تیزی سے کہا تھا۔ تقی کی توقعات کے برعکس اس نے بڑی خوش دلی سے اس کا استقبال کیا تھا اور وہ اس بات پر بھی شرمندہ تھا کہ تقی کو اتنا انتظار کرنا پڑا۔

"تم اگر آنے سے پہلے مجھے کال کر لیتے تو اتنا انتظار ہرگز نہ کرنا پڑتا۔"

"میں نے سوچا آپ نے شاید یونہی کارڈ دے دیا ہو فون کروں تو پہچانیں یا نہیں۔" تقی نے سادگی سے کہا۔ جاثم سے اس کی چند ہی ملاقاتیں ہوئی تھیں اور چونکہ وہ "بڑا آدمی" تھا سو تقی تھوڑا محتاط ہو کر بات کر رہا تھا۔

"اوہ کم آن۔۔۔ پہلے تو یہ آپ جناب کا تکلف چھوڑ دو۔ مانتا ہوں میں تم سے ایک دو سال بڑا ہی ہوں گا لیکن اب اتنا بھی بزرگ نہیں ہوں کہ تم مجھے آپ آپ کیے جاؤ۔" جاثم نے منہ بنا کر کہا تھا۔ تقی کو اس کے انداز پر ہنسی آ گئی اور یہ ایک جملہ ان کے درمیان بے تکلفی پیدا کرنے کے لیے کافی تھا۔

"اور دوسری بات یہ کہ میں اتنا بے کار انسان نہیں ہوں کہ ہر ایرے غیرے کو اپنا کارڈ دیتا رہوں۔ جن میں ٹیلنٹ نظر آتا ہے ان کو ہی دیتا ہوں اور تو ڈاؤٹ تم میں مجھے بہت پوٹینشل نظر آ رہا ہے۔"

"پلیز پلیز۔ اب یہ بات دوبارہ مت کہنا۔" تقی نے بے چارگی سے کہا تھا۔ "کیونکہ اگر تم نے ایک دفعہ اور مجھے یہ احساس دلایا کہ میں ٹیلنٹڈ ہوں تو میں اپنے ابا کی نافرمانی کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔"

"کیا تم مجھے انکار کرنے آئے ہو؟"

"ایسا ہی ہے جاثم! میرے ابا کو یہ ایکٹنگ ویکٹنگ بالکل پسند نہیں۔۔۔ سلور اوو تھ بھی میں نے ان کی اجازت کے بغیر جوائن کیا ہوا تھا۔۔۔ حالانکہ میں کام کرنا چاہتا ہوں لیکن انہیں پتا چلا تو بہت خفا ہوں گے۔۔۔ اور میں انہیں خفا نہیں کر سکتا۔"

"کسی بھی بڑے ایکٹر کی ہسٹری اٹھا کر دیکھ لو۔۔۔ کسی کے بھی ابا راضی مل جائیں تو میرا نام بدل دینا۔"

تقی اس کی بات پر ہنسا تھا' تب ہی پیچھے دروازہ کھول کر کوئی اندر داخل ہوا تھا۔

"اُف۔۔۔ ایک تم ہو جس کے ابا راضی نہیں اور ایک یہ ہماری مہک بی بی ہیں' جن کے ابا راضی ہیں تو یہ خود راضی نہیں۔۔۔" جاثم نے دروازے کی طرف دیکھ کر کہا تھا تقی نے خفیف سی گردن موڑی۔ بلاشبہ وہ جو بھی تھی خوبصورت تھی۔ اس نے ایک نظر میں اعتراف کیا۔

"وہ اس لیے کہ اگر میں آن اسکرین آ گئی تو تمہاری بڑی بڑی ایکٹریسز کی چھٹی ہو جائے گی اور میرا ضمیر اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ میں کسی کی روزی پر لات ماروں' بس اسی لیے تمہاری بات مان کر ڈراما سائن نہیں کر رہی۔" اس کی شرارتی سی ہنسی اور آواز میں بلا کی کھنک تھی۔

"اگر تم دونوں میری بات مان لو تو ہم ایک سپرہٹ پروجیکٹ دے سکتے ہیں۔ بائی دا وے۔۔۔ تقی! یہ مہک ہے میری فرسٹ کزن۔ اور مہک! یہ تقی ہے۔" آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے' کے مترادف جاثم اتنا بتا کر خاموش ہو گیا تھا۔ ان دونوں کے درمیان مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا۔

"اچھا جاثم! میں تو پھر چلتا ہوں۔" تقی نے اجازت چاہی۔

جاثم نے بددلی سے گردن ہلائی۔

"میرا مشورہ ہے تقی! ایک بار پھر سوچ لو' اتنی اچھی اپرچونٹی (موقع) بار بار نہیں ملتی۔"

"اس کی باتوں میں مت آنا۔۔۔ یہ ہر ایک کو ایسا ہی کہتا ہے۔" مہک نے تیزی سے جاثم کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ جہاں جاثم خفیف سا ہو کر چپ ہوا' وہیں تقی کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی' جبکہ مہک خود ہی ہنس دی تھی۔

"تم سے تو میں بعد میں نپٹتا ہوں۔" جاثم نے ہنستی ہوئی مہک کو دیکھ کر کہا' ساتھ ہی تقی سے بولا۔ "تقی! جب بھی تمہیں یہ احساس ہو جائے کہ تم اپنے فادر کی خوشی کے لیے اپنے ٹیلنٹ کو ضائع کر رہے ہو یا کبھی انہیں منا سکو تو سیدھے میرے پاس آنا۔۔۔ مستقبل کے بہترین اداکار کو میں ہی انٹروڈیوس کرانا چاہتا ہوں۔"

تقی کیا کہتا' بمشکل مسکرایا اور بوجھل دل کے ساتھ اس کے آفس سے باہر نکل آیا۔

کیا کبھی ابا جان سمجھ سکیں گے کہ ان کا نالائق' نابنجار بیٹا محض ان کے احترام میں اپنی زندگی کے سب سے بڑے خواب کی تعبیر حاصل کرنے سے دستبردار ہو گیا ہے۔ کاش وہ جان سکتے۔



"میری منگنی ہو رہی ہے۔" ثمر نے بری طرح شرماتے ہوئے بتایا۔ شفا اس کی بات سن کر اپنی جگہ سے دو فٹ اوپر اچھلی تھی۔

"کیا کہہ رہی ہو۔" ثمر شام سے پہلے ہی اس کا حال پوچھنے آ گئی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اسے یہ خبر سنانے کی جلدی تھی۔

"سچ کہہ رہی ہوں سو فیصد سچ۔۔۔ میں اتنی خوش ہوں شفا! کہ بتا بھی نہیں سکتی۔ اللہ نے دیر سے ہی سہی' لیکن بالآخر میری سن ہی لی۔"

"اب اتنی بھی نہ ہانکو۔" شفا ہنس دی۔

"بھئی میں سو فیصد سنجیدہ ہوں' اس دن کا خواب تو میں بچپن سے دیکھ رہی تھی۔ تمہیں کیا پتا' میں اب تک کتنے وظیفے کر چکی ہوں۔" وہ ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔ شفا جانتی تھی' وہ رتی بھر بھی سنجیدہ نہیں ہے' لیکن خوش ضرور ہے۔

"کتنی تیز ہو تم ثمر! رشتہ طے ہو گیا' دعائے خیر بھی ہونے والی اور تم نے مجھے خبر تک نہیں ہونے دی۔"

لو اور سنو مجھے خود اب تک بھنک نہ لگ سکی تو تمہیں کیا بتاتی۔" وہ چوکڑی مار کر اس کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"امی کا تو تمہیں پتا ہے نا' وہ کس مزاج کی ہیں' انہوں نے بابا کو بھی منع کیا تھا۔ وہ مجھے نہ بتائیں' لیکن آج صبح بابا نے چپکے سے مجھے بتا دیا۔ کہنے لگے اب کسی روز اسی طرح چپکے سے تصویر بھی دکھا دوں گا۔" اس کے دانت تھے کہ اندر جانے کا نام ہی نہ لے رہے تھے۔

"لیکن خالہ اتنی رازداری کیوں برت رہی ہیں؟" شفا نے الجھ کر پوچھا۔ جواب میں ثمر نے ایک قہقہہ لگایا۔

"ان کا خیال ہے میں پھڈا ڈال دوں گی کہ مجھے ابھی پڑھائی مکمل کرنی ہے' سو منگنی وگنی نہ کی جائے۔۔۔ کتنی بھولی ہیں میری اماں۔ یہ نہیں جانتیں کہ میں تو یہ خبر سن کر شکرانے کے نوافل ادا کرنے لگ جاؤں گی۔" اس نے ایک اور قہقہہ لگایا تھا۔

"تمہیں نہیں پتا شفا! منگنی کرنے کا میرا خواب برسوں پرانا ہے۔"

"ہم تو میرا خیال ہے خوشی سے پاگل ہی ہو گئی ہے۔" شفا ہنسی۔ "اچھا بتاؤ کون ہے' کرتا کیا ہے؟"

"بھئی یہ سب تو میں نے بابا سے پوچھا ہی نہیں۔ میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ بابا نے اسے میرے لیے پسند کیا ہے اور بابا میرے لیے غلط انسان چن ہی نہیں

سکتے۔" اس کے لہجے میں یقین بولتا تھا۔

"خیر چھوڑو اس بات کو۔ یہ بتاؤ تم نے اپنے دوپٹے کو آگ کیسے لگائی؟"

"میں پاگل ہوں جو خود آگ لگاؤں گی۔ بے دھیانی میں آگ لگ گئی۔"

"چلو خیریت تو رہی۔ اپنا صدقہ ضرور دے دینا۔ دادی کہتی ہیں جان کا صدقہ دیتے رہنا چاہیے۔"

"وہ تو عمیر بھائی نے صبح ہی دے دیا تھا۔ ویسے ایک بات ہے' اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت لازمی ہوتی ہے۔" اس نے مزے سے کہا۔

"یہ بیان بھی یقیناً" سماہر بھابھی کا ہو گا۔" ثمر نے لقمہ دیا۔

"ارے نہیں یار! یہ تو میں خود سوچ رہی تھی' اب یہی دیکھ لو' اس حادثے سے اور تو کیا ہوتا تھا' عمیر بھائی کی ناراضی دور ہو گئی۔"

"عمیر بھائی تم سے ناراض تھے؟ ناممکن۔۔۔ میں مان ہی نہیں سکتی کہ عمیر بھائی تم سے ناراض ہوں۔"

ثمر نے پُریقین لہجے میں کہا تھا۔ جواب میں شفا نے سارا قصہ کہہ سنایا۔ ثمر نے خاموشی سے سنا' پھر اپنا ہی سر پیٹ لیا' گو کہ پیٹنا شفا کا چاہیے تھا۔

"کس قدر احمق ہو تم شفا! سماہر بھابھی نے جو کہا تم نے اس پر یقین کر لیا۔۔۔ او احمقوں کی سردارنی! تمہیں عمیر بھائی کو حقیقت بتانی چاہیے تھی۔"

"اچھا نا! اب مجھے سارے نیگیٹو پوائنٹس نہ گنوانے بیٹھ جانا۔ بھابھی نے تو میری خوشی کے لیے ہی جھوٹ بولا تھا۔ میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ بھائی اب مجھ سے خفا نہیں ہیں۔ جب سب کچھ میرے حق میں صحیح جا رہا ہے تو مجھے کیا ضرورت ہے کہ بلاوجہ کی بدگمانیاں پالتی پھروں۔" اس نے اپنے مخصوص میٹھے بے ریا لہجے میں کہا تھا۔

"اچھا تم بیٹھو۔۔۔ تمہیں سماہر بھابھی کے ہاتھ کے چکن رول کھلاتی ہوں۔ اتنے لاجواب رول تم نے پہلے کبھی نہیں کھائے ہوں گے۔"

ثمر نے اسے جاتے دیکھا اور گہری سانس بھر کر رہ گئی۔ جو ہو رہا تھا وہ بالکل سامنے کی بات تھی۔ لیکن شفا دیکھنا ہی نہ چاہتی تھی یا ابھی قسمت اسے دکھانا ہی نہیں چاہ رہی تھی۔ جو بھی تھا کسی بڑے نقصان کا اندیشہ اسے اکثر شفا کی فکر میں مبتلا کر دیتا تھا۔

اس کا دل چاہا شفا کے پاس کچن میں چلی جائے لیکن پھر پاس پڑا میگزین دیکھنے لگی۔ تب ہی سماہر آ گئی۔ ہنستی مسکراتی' بااخلاق' تہذیب یافتہ۔ گفتگو میں اتنی مٹھاس ہوتی کہ سن کر لگتا نہ تھا' اس کے دل میں چور ہے لیکن ثمر گہرائی میں جھانکنے کی عادی تھی۔ یہ بھی نہیں کہ وہ بہت زیرک تھی۔ بس سماہر کے دل کا کینہ اس نے بھانپ لیا تھا۔

سماہر نے اپنے اخلاق و محبت سے شفا اور عمیر کی آنکھوں پر پٹی باندھی ہوئی تھی' ثمر کے نہیں۔

"شفا بتا رہی تھی کہ تمہاری منگنی ہو رہی ہے۔۔۔ بہت مبارک ہو' میں تمہاری ماما کے پاس بھی آؤں گی' مبارک دینے۔۔۔ لیکن ثمر! تم پلیز اپنی منگنی کا ذکر شفا کے سامنے بار بار مت کرنا۔۔۔ حالانکہ وہ تمہارے لیے بہت خوش ہے۔ لیکن تھوڑی نا سمجھ ہے اور تمہاری ایج فیلو بھی ہے تو کہیں ایسا نہ ہو' اس کے دل میں خیال آئے کہ تمہاری منگنی ہو رہی ہے تو اس کی کیوں نہیں' ذہن بٹ جاتے ہیں نا تو بڑی مشکل ہو جاتی ہے۔"

بظاہر ہمدردانہ لہجے میں کہی گئی بات' ثمر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ہاں البتہ دل ہی دل میں دانت کچکچائے ضرور تھے۔ کیونکہ وہ جانتی تھی۔ شفا سوچے نہ سوچے' سماہر اب بات اس کے دل میں ضرور ڈال دے گی۔ وہ ایسی ہی باصلاحیت تھی۔

☼ ☼ ☼

دن کا دوسرا پہر تھا۔ صحن میں چلچلاتی دھوپ پھیلی تھی لیکن موسم خوشگوار تھا۔

تقی ابھی سو کر اٹھا تھا۔ ٹانگیں تخت پر پھیلائے کرسی پر نیم دراز تازہ اخبار کا مطالعہ فرمایا جا رہا تھا لیکن پنکھے کی ہوا اتنی خوشگوار تھی کہ پھر سے نیند کے

جھونکے آنے لگے۔ وہ تھوڑا اور سیدھا ہوا' اخبار چہرے پر پھیلایا اور پھر سے ٹن۔ امی پاس ہی بیٹھی کریلے چھیل رہی تھیں۔

ہوا سے اخبار پھسل کر گود میں آ گرا تھا۔ اس نے ذرا سی آنکھیں کھول کر دیکھا۔ امی کا سارا زور کریلے چھیلنے سے زیادہ آنکھیں رگڑنے پر تھا۔ تقی نے دو' تین بار آنکھوں کی جھری سے جھانکا' ہر بار یہی منظر دیکھنے کو ملا۔

"یہ کریلوں میں پیاز کی تاثیر کب سے آ گئی۔" اس کی آواز نیند سے بوجھل تھی۔ امی اور شد و مد سے رونے لگیں۔

"کیا ہو گیا ہے امی!" وہ تڑپ کر سیدھا ہو بیٹھا۔

"ابا نے کچھ کہا ہے؟ ڈانٹا ہے آپ کو؟" پہلا خیال یہ ہی آیا۔

"مجھے سماہر یاد آ رہی ہے۔" اس بار انہوں نے آنکھیں رگڑی نہیں تھیں۔ آنسوؤں کو بہہ جانے دیا تھا۔ "کل رات خواب میں دیکھا تھا۔ اب تک ملنے کو دل تڑپ رہا ہے۔ پتا نہیں کس حال میں ہو گی میری بچی۔"

تقی ایک پل کو چپ سا رہا۔ یہ وہ موضوع تھا۔ جس پر امی کے جذبات اور آنسو قابو میں آنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ یہ ہی وہ واحد موضوع بھی تھا جس پر انہیں اپنے سرتاج سے سخت اختلاف بھی تھا اور اسی کی بنا پر وہ ان کی سخت مزاجی کے خلاف نان اسٹاپ بولتی بھی تھیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بولنے سے پہلے ان کی غیر موجودگی کی تصدیق کر لی جاتی تھی۔

"کیا مطلب' کس حال میں ہو گی۔ جس بھی حال میں ہو گی۔ ان شاء اللہ بہت خوش ہو گی۔ ابا کی بات مان لیتی تو آج ہم مظلوموں کی طرح ابا کی پابندیاں برداشت کر رہی ہوتی۔ میں تو کہتا ہوں بہت اچھا فیصلہ کیا تھا اس نے۔"

"کیا خاک اچھا فیصلہ کیا تھا۔ ذرا تحمل سے کام لیتی تو ہم ہی گھر سے رخصت کرتے اسے۔ جب رضی اپنے منہ سے انکار کرتا تھا کہ وہ سماہر کو بہن سمجھتا ہے تو انہوں نے خود ہی خاموش ہو جانا تھا۔ لیکن سچ بات ہے سماہر نے تو ضد میں تمہارے ابا کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔"

"اللہ کو مانیں امی! آج تک ابا کسی بات پر چپ ہوئے بھی ہیں؟" وہ تڑپ ہی گیا تھا۔ "رضی کو بھی انہوں نے دھونس دھمکی سے منا ہی لینا تھا۔ پھر نہ سماہر خوش رہتی اور نہ ہی رضی۔۔۔ اسی لیے میرا اور رضی کا تو یہی خیال ہے' جو ہوا سو اچھا ہوا۔۔۔ ہاں یہ جو ابا نے ملنے ملانے پر پابندی لگا رکھی ہے۔ یہ غلط ہے۔ قطع تعلقی کر کے نہ سماہر کی زندگی رکی ہے' نہ ہم سب کی۔ پھر آخر منہ موڑ کر رکھنے کا کیا فائدہ ہے۔"

"تمہیں کیا پتا تقی! میرا کتنا دل چاہتا ہے سماہر سے ملنے کو۔ اسے گلے لگانے کو۔ گودوں میں کھلایا ہے اسے۔ پہلا نوالہ اس کے منہ میں ڈالتی تھی۔ پھر خود کھاتی تھی اور اب چھ سال ہونے کو آئے کہ اس کی شکل بھی دیکھنے کو نہیں ملی۔" وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

"دل چاہتا ہے اس سے ملوں' اس کے بچوں کو دیکھوں' ان کے کپڑے بناؤں۔۔۔ لیکن۔۔۔ تمہارے ابا بھی نا۔۔۔ ساری زندگی اس آدمی نے یہی کیا ہے' وجہ بے وجہ ضدیں لگا کر میری زندگی بھی بے سکون کرتا رہا اور اپنی بھی۔"

تقی کا بس نہ چلتا تھا' ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا اور دل سے دکھ کا نام و نشان مٹا دے۔ لیکن اس آخری بات پر ہنسی آ گئی۔ امی بھی اپنی محبت سے مجبور تھیں۔ لیکن ووٹ بدلنے میں ایک منٹ نہیں لگاتی تھیں۔

"اچھا یہ شمیم آرا کی طرح آنسو بہانا بند کریں اور اٹھیں' آپ کو سماہر سے ملوا کر لاتا ہوں۔"

"تمہیں پتا ہے سماہر کے گھر کا؟" امی نے ہکا بکا ہو کر پوچھا۔

"اسی زمین پر رہتی ہے نا وہ۔ کون سا چاند پر لے گیا اس کا میاں کہ گھر ہی ڈھونڈا نہ جا سکے۔" تقی نے کہا۔

"آپ تیار ہوں۔ چچا کی طرف چلتے ہیں' وہاں سے سماہر کے گھر کا ایڈریس معلوم کر لیں گے۔"

"نہیں تقی!" امی بے قرار ہو کر اٹھیں' پھر جھاگ

کی طرح بیٹھ گئیں۔ "تمہارے ابا کو پتا چلا تو ایک قیامت اٹھا دیں گے۔ اب اس عمر میں مجھ سے ان کی باتیں سنی نہیں جاتیں۔"

"کچھ بھی نہیں ہوگا امی! آپ چلیں تو سہی۔"

"تم سے تو پہلے ہی خفا رہتے ہیں۔ یہ بات بھی بس بہانہ ہی بنے گی اور کیا ہی اچھا ہو اگر تم اسٹور پر ہی جانا شروع کردو۔۔۔ دراصل تقی! تم ہو ہی لاپروا۔" وہ ازحد دکھی ہو رہی تھیں۔

"چلو جی۔۔۔ بات کہیں سے بھی شروع ہو' یہ طے ہے کہ ختم میری لاپروائی پر ہی ہوگی۔" اس نے ماتھا پوری ہتھیلی سے پیٹا۔ "اور جب میں ہوں ہی لاپروا تو ابا کی خفگی کی پروا بھی کیوں کروں۔ ابا تو ویسے بھی پیدائشی خفا لگتے ہیں۔ یعنی جب خود پیدا ہوئے ہوں گے۔ تب بھی خفا ہی ہوں گے۔ آپ مانیں یا نہ مانیں دادا' دادی مرحوم بھی اسی غم میں دنیا سے جلدی چلے گئے۔"

"تم تو جب بھی بولنا الٹا ہی بولنا' پتا نہیں میں بھی کیوں تمہارے ہی سامنے دل ہلکا کرنے بیٹھ جاتی ہوں۔" امی جھنجلاتے ہوئے سبزی کی ٹوکری لے کر اٹھ گئیں۔

"وہ اس لیے کیونکہ۔۔۔ آپ جانتی ہیں' آپ کی خواہش صرف میں پوری کرسکتا ہوں۔ آپ کے باقی دونوں نونہال ابا کے جتنے بھی لائق فائق سپوت کیوں نہ ہوں۔ ابا کے خلاف جاکر کوئی کام کرنے کی ہمت کبھی نہیں کریں گے۔" اس کا لہجہ متبسم تھا۔ امی سر جھٹک کر کچن کی طرف بڑھ گئیں۔

"ناشتا بنا دیں امی! دو پراٹھے' تین انڈوں کا آملیٹ' ہرا دھنیا زیادہ ڈالیے گا۔"

وہ خوش خوراک تھا اور سوچتے ہوئے اس کی یہ خوش خوراکی اور بھی عروج پر پہنچ جاتی تھی۔

پھر اس نے ڈٹ کر ناشتا کیا اور اس کے بعد چچا کی طرف آگیا۔ اسے رازداری سے ساہر کا ایڈریس جو معلوم کرنا تھا۔

☆ ☆ ☆

ساہر کا ذہن جب سوچ سوچ کر بری طرح تھک گیا تو محض اپنے ڈپریشن سے چھٹکارا پانے کے لیے امی کی طرف آگئی۔ لیکن وہاں بھی عجیب سی مایوسی اسے گھیرے رہی۔

"آخر تمہیں ہوا کیا ہے؟ جب سے آئی ہو' دیکھ رہی ہوں۔ منہ لٹکا کر بیٹھی ہوئی ہو۔" اس کی امی نے ٹوک ہی دیا۔ "عمیر سے جھگڑا ہوا ہے کیا؟"

"او ہو امی! آپ بھی بس ایک بات کے پیچھے ہی پڑ جایا کریں۔" وہ بری طرح چڑ گئی۔ پھر اپنی اونچی آواز کا احساس ہوا تو تحمل سے بولی۔ "بھئی' بتا تو چکی ہوں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ عمیر سے کیوں جھگڑا ہوگا' ہاں البتہ شفا۔۔۔"

"تمہارے اور شفا کے پھر سے جھگڑے ہونے لگے ہیں؟" امی نے کچھ اکتا کر پوچھا تھا۔

"جھگڑا نہیں ہوتا امی! لیکن شفا اب مجھ سے برداشت بھی نہیں ہوتی۔" ساہر نے جیسے تھک کر کہا تھا۔

"میرا دل چاہتا ہے کوئی جادو کی چھڑی ہو میرے پاس۔ جس سے میں شفا کو غائب کردوں۔"

"وہ اب تو کتنی اچھی ہے تمہارے ساتھ۔ جو گزر گیا اسے بھول کیوں نہیں جاتیں تم۔ ہاں میں مانتی ہوں' اس نے اپنے بچپنے میں تمہیں تنگ رکھا ہے۔ لیکن اب تو وہ تمہاری قدر کرتی ہے نا اور آخر کس چیز کی ہے تمہاری زندگی میں جو تم پرانی باتوں کو ذہن پر سوار رکھتی ہو۔"

اس کی امی نے نرمی سے کہا۔ گوکہ اب وہ پہلے کی طرح ان کے سامنے شفا کی وجہ سے روتی نہیں تھی۔ لیکن وہ ماں تھیں اور ماؤں سے زیادہ دلوں کی کیفیت کون سمجھ سکتا ہے۔ اسی لیے اسے وقتاً" فوقتاً" سمجھاتی رہتی تھیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اب ان کی نصیحتوں نے ساہر پر اثر کرنا بالکل چھوڑ دیا تھا۔

"اچھا اب اتنے دن کے بعد آہی گئی ہو تو اس طرح سے منہ بنا کر مت بیٹھو۔ بتاؤ' رات کے لیے کیا خاص چیز بناؤں تمہارے لیے۔ بلکہ عمیر کی پسند کی بھی کوئی چیز بتا دو' تاکہ میں ایک ہی بار نسیمہ کو مارکیٹ بھیج کر سامان منگوالوں۔"

"رہنے دیں امی! کہاں آپ اتنی محنت کریں گی۔ ویسے بھی عمیر کی عادت کا تو آپ کو پتا ہے۔ وہ مجھے پک کرنے ضرور آئیں گے۔ لیکن کھانے تک نہیں رکیں گے۔ ان کا ایک ہی بہانہ۔ شفا گھر میں اکیلی ہے۔" اس نے منہ بگاڑ کر عمیر کی نقل اتاری۔

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ میں ابھی عمیر سے خود بات کرتی ہوں۔ اس سے کہوں گی۔ آتے ہوئے شفا کو بھی لیتا آئے۔ تم سب لوگ یہاں سے ہی کھانا کھا کر جانا۔" امی نے کہا تو اس نے بددلی سے سر ہلا دیا۔

"کیا ہی اچھا ہوتا ساہر! جو تم کل آگئی ہوتیں۔ پتا ہے کل تقی آیا تھا۔"

"واقعی؟" ساہر نے خوشگوار حیرت سے پوچھا۔

"کاش میں واقعی کل آجاتی۔ باقی سب سے نہ سہی' تقی سے تو ملاقات ہو جاتی۔۔۔ کیسا تھا تقی؟ اور باقی سب لوگ کیسے ہیں؟" وہ جوش میں پوچھتی چلی گئی۔ پھر کچھ خیال آیا تو رکی۔ "لیکن امی! تایا ابا نے تقی کو آنے کی اجازت کیسے دے دی؟"

"اجازت کہاں دی۔ تمہیں تو پتا ہی ہے اپنے تایا ابا کا۔ جو ضد لگالیں اس سے مشکل سے ہی پیچھے ہٹتے ہیں۔ تم سے تو ناراض ہوئے سو ہوئے' ہم سے بھی قطع تعلقی کرلی۔ کتنی کوشش کی تمہارے ابو نے کہ کسی طرح بڑا بھائی مان جائے۔ لیکن نہ جی۔۔۔ تقی بھی بغیر بتائے آیا تھا۔ بتا دیتا تو بھائی صاحب آنے دیتے؟"

"آپ نے پوچھا نہیں تقی سے کہ اسے اتنے عرصے کے بعد آنے کا خیال کیسے آگیا؟"

"تمہارا ہی ایڈریس لینے آیا تھا۔ کہہ رہا تھا تمہاری تائی جان بہت اداس ہیں۔ انہیں کسی روز تمہاری طرف لے کر آئے گا۔"

ساہر کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا۔

"کب لے کر آئے گا' یہ نہیں بتایا۔ میں تو آج سے ہی انتظار شروع کردوں گی۔"

"میں تو کہتی ہوں ساہر! تم بھی اپنی ضد چھوڑو۔ بھائی صاحب بڑے ہیں۔ انہوں نے تو غصے میں جو کہا سو کہا۔ تم بھی ضد کرکے بیٹھ گئیں کہ اب کبھی ان کے یہاں نہ جاؤ گی۔ اب تو چھ سال ہونے کو آئے۔ شادی کے فوراً" بعد ہی ان کے گھر چلی گئی ہوتیں تو ان کی ناراضی تمہاری شکل دیکھتے ہی دور ہو جاتی تھی۔"

"رہنے بھی دیں امی! آپ تو جیسے تایا ابا کو جانتی نہیں کہ وہ کتنے ہٹ کے پکے ہیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ تب تو جو ہوا سو ہوا۔ اب بھی تم ہی کسی روز ان کی طرف چلو۔"

"ہرگز نہیں۔" اس نے فوراً" کہا۔ "بچے ہمیشہ سے اپنے بڑوں سے ضدیں منواتے آئے ہیں۔ لیکن تایا ابا اپنے سے چھوٹوں سے ضد لگا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ جب انہیں میری پروا نہیں تو میں کیوں بھاگ کر جاؤں۔۔۔ یہ سچ ہے کہ میرا ان سب سے ملنے کو بہت دل چاہتا ہے لیکن میں خود سے نہیں جاؤں گی۔"

"ضد میں تو تم نے بھی بھائی صاحب کی برابری ہی کی ہوئی ہے۔" امی نے اکتا کر لیکن بحث سمیٹنے والے انداز میں کہا۔

"خیر! مجھے عمیر کا نمبر دو' میں اس سے کہوں شفا کو بھی لیتا آئے اور تم تب تک وشمہ سے بات کرلو۔" انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"وشمہ؟ وشمہ کہاں بیٹھے بٹھائے یاد آگئی آپ کو؟" اس نے سستی سے ٹانگیں پھیلاتے ہوئے کہا۔

"ارے دیکھو ذرا۔ میں تو تمہیں بتانا ہی بھول گئی۔ وشمہ کا فون آیا تھا۔ اس نے بھی تمہارا فون نمبر اور ایڈریس پوچھنے کے لیے فون کیا تھا۔ میرے ذہن میں اتنے کام ہوتے ہیں کہ ہر بات ادھر ادھر ہو جاتی ہے۔ اپنی طرف سے سوچے بیٹھی ہوں کہ تمہیں پہلے ہی بتا چکی ہوں۔"

"اتنے کام کی بات آپ نے کتنی دیر سے بتائی ہے۔" ساہر کی خوشی دیدنی تھی۔ "آپ نے اس کا نمبر نوٹ کیا تھا؟ کب آئی ہے وہ پاکستان؟"

"ہاں وہاں ٹیلی فون سیٹ کے نیچے جو ڈائری پڑی ہے اس میں نوٹ کیا تھا۔ کہہ رہی تھی۔ ابھی کچھ ہی

روز ہوئے ہیں۔ اپنے بھائی کے لیے کوئی لڑکی وغیرہ پسند کرنے آئی ہے۔ میں کہہ رہی تھی سماہر!" انہوں نے جاتے جاتے اسے پکارا۔ "وشمہ کے بھائی کو ذرا دھیان سے دیکھ لینا۔ شفا کی بات وہاں ٹھہر جائے تو کیا برا ہے۔ اچھا ہے امریکا بیاہ دو۔ وہ کون سا روز روز پاکستان آیا کرے گی۔ تمہاری بھی جان چھوٹ جائے گی۔"

"امی! ابھی وشمہ سے ملاقات تو ہو جانے دیں۔ آپ بھی پتا نہیں کتنی دور کی پلاننگ کیے جا رہی ہیں۔" وہ لاپروائی سے کہتی باہر نکل گئی تھی۔ بچپن کی دوست سے بات کرنے کی جلدی جو تھی۔



کچھ روز بعد جاشم نے اسے کال کی تھی۔

"پھر تم نے کیا سوچا؟"

"سوچا تو میں نے بہت کچھ ہے۔ لیکن جواب میرا ابھی بھی نہ ہی ہے۔"

"یعنی یہ کال بھی ضائع ہو گئی۔" جاشم نے مایوسی سے کہا۔ اور دونوں ہنسنے لگے۔

"تم دیکھنا تقی! میں تب تک تمہارے پیچھے لگا رہوں گا، جب تک تم میرے ساتھ کام کرنے کے لیے تیار نہیں ہو جاتے۔"

کوئی اس کے ٹیلنٹ کا قدر دان تھا۔ یہ سوچ کر ہی تقی کا سیروں خون بڑھ جاتا تھا۔

"پورٹ فولیو بنوانے میں انٹرسٹڈ ہو؟ میری کزن این سی میں پڑھ رہی ہے۔ وہ اپنے کسی اسائنمنٹ کے سلسلے میں تمہارا پورٹ فولیو بنانا چاہتی ہے۔ اگر تم انٹرسٹڈ ہو تو میں اسے تمہارا کانٹیکٹ نمبر دے دوں؟ میرا مشورہ ہے اگر اب تک تم نے اپنا پروفیشنل پورٹ فولیو نہیں بنوایا تو مہک سے بنوا لو۔ شی از نو ڈاؤٹ اے ویری گڈ فوٹو گرافر۔ تمہیں آگے بھی بہت مدد مل جائے گی۔"

تقی نے ایک پل کو سوچا پھر انکار کر دیا توجیہہ یہ دی کہ جب کام ہی نہیں کرنا تو پورٹ فولیو بنوانے کا کیا فائدہ؟

اگلے روز مہک صاحبہ بنفس نفیس ملاقات کرنے یونیورسٹی پہنچ گئیں۔ ایک تو رعب حسن اور پھر کام میں تقی کی دلچسپی۔ اسے ماننے ہی بنی۔ بعد میں سمیر کو بتایا تو اس نے بھی یہی کہا۔

"حسن سے متاثر ہو گیا تو۔"

"تو میں نے اس کے حسن کا اچار ڈالنا ہے۔" اس نے چڑ کر کہا۔ "لیکن ایک بات ہے سمیر! میں جتنا اس فیلڈ سے جان چھڑاتا ہوں یہ اتنا ہی مجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔"

"او بس کرو بھائی! بس کرو۔ پہلے سارا دن روحیل کی بک بک سنو، پھر تمہارے فلسفے جان نہیں چھوڑتے۔" وہ کسی بات پر چڑا بیٹھا تھا۔ تقی نے جھنجلا کر فون ہی بند کر دیا۔



"تقریباً" چار سال بعد ہی سہی، لیکن ہماری ملاقات ہو ہی گئی۔" سماہر نے وشمہ سے کہا۔ سماہر نے بصد اصرار اسے اپنے گھر بلایا تھا۔ روحیل بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ کچھ دیر بیٹھ کر چلا گیا اور اب تھوڑی دیر بعد وشمہ کو لینے کے لیے آ گیا تھا۔

"تم اتنی جلدی کیوں آ گئے ہو روحیل! ہمیں کچھ دیر تو آرام سے باتیں کر لینے دیتے۔" سماہر نے کہا۔

"کچھ دیر اور... خدا کا خوف کریں آپ دونوں۔ میں تین گھنٹے بعد آیا ہوں اور آپ لوگوں کی باتیں ہی اب تک ختم نہیں ہو سکیں۔" وہ متبسم لہجے میں سماہر سے مخاطب تھا لیکن نظریں اس کی شفا پر ہی تھیں۔ وہ اپنے آپ میں مگن چائے کپوں میں ڈال رہی تھی اور روحیل بار بار اسے دیکھ رہا تھا۔ محض پانچ منٹ ہی شفا وہاں رکی ہو گی اور اتنی سی دیر میں ہی سماہر نے اس کی دلچسپی بھانپ لی تھی۔

"تمہیں یاد ہے روحیل! تم جب چھوٹے تھے تو کہا کرتے تھے تم بڑے ہو کر سماہر سے شادی کرو گے۔" اچانک وشمہ کو یاد آیا تو اس نے کہا۔ سماہر کے ذہن میں

اس وقت اس کی امی کی کہی ہوئی باتیں گھوم رہی تھیں۔ وہ ذرا غائب دماغی سے ان دونوں کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ دونوں ہنس رہے تھے۔

"تمہیں یاد ہے ساہر! یہ روحیل تمہارا کتنا بڑا عاشق ہوتا تھا اور کہا کرتا تھا تم سے شادی کرے گا۔" وشمہ نے اس کی غائب دماغی محسوس کرکے دوبارہ کہا۔ روحیل ان دونوں سے عمر میں اتنا چھوٹا تھا کہ جب یہ کالج میں تھیں تو وہ اسکول جاتا تھا اور ان دونوں کی آپس میں دوستی بہت تھی اور گھروں میں آنا جانا بھی تھا۔ تو یہ ایک بچے کے عام مذاق کی بات تھی۔

ساہر بھی یاد آنے پر ہنسنے لگی۔

"کیسے بھول سکتی ہوں۔ یہ کتنا زچ کیا کرتا تھا مجھے اپنی باتوں سے اور سچ بتاؤں، یہ مجھے برا بھی بہت لگتا تھا۔ لیکن اب تو اچھا خاصا ہینڈسم ہوگیا ہے۔"

"چلیں دیر سے ہی سہی، میں آپ کو اچھا تو لگا۔ ویسے ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔ آپ اچھی طرح غور کرلیں، کیونکہ میں تو ابھی بھی راضی ہوں۔" اس کا انداز شرارتی تھا۔ مطلب سمجھ کر وہ دونوں ہنس پڑیں۔

"بھول کر بھی ایسی بات مت سوچنا، کیونکہ مجھے عمیر سے بہت محبت ہے۔"

"اور روحیل! اب تم بس کرو۔ وہاں لاس ویگاس میں تو تم نے کسی گوری کو نہیں چھوڑا۔ کم سے کم میری سہیلی کو تو بخش دو۔" وشمہ نے کہا۔

"روحیل فلرٹی ہے؟" ساہر نے کہا۔

"ایسا ویسا؟ میں نے بتایا نا۔ اس نے کسی گوری کو نہیں چھوڑا۔ دو، تین تو اس کا پوچھتے ہمارے گھر بھی پہنچ گئی تھیں۔" وشمہ گوکہ بھائی کی ایک برائی بیان کررہی تھی لیکن اس کی آنکھوں اور باتوں میں بھائی کے لیے پیار ہی پیار تھا۔ جیسے اس کا بڑا کارنامہ بیان کررہی ہو۔

"اب آپ میری اتنی بھی تعریفیں نہ کریں۔ آپ کی سہیلی کو چھوڑ دیتا ہوں، لیکن ان کی نند کے بارے میں تو سوچا جاسکتا ہے نا۔" اس کا انداز ابھی بھی شرارتی تھا، لیکن ساہر نے چونک کر اسے دیکھا اور وشمہ نے ساہر کا چونکنا بھی نوٹ کرلیا تھا۔ ان لوگوں میں آپس میں خاصی بے تکلفی تھی لیکن اپنی نند کے بارے میں ساہر کو ایسی بات بری لگ سکتی تھی۔

اس نے فوراً" روحیل کو ٹوک دیا اور موضوع بھی بدل دیا لیکن ساہر کا دماغ انواع و اقسام کی باتوں سے بھر چکا تھا۔



وشمہ نے اگلے ہی روز اسے فون کیا اور روحیل کی بات کی معافی مانگی۔

"میں بہت شرمندہ ہوں ساہر! لڑکوں کا تو تمہیں پتا ہی ہے۔ زبانیں ان کی پہلے ہی کسی کے قابو میں نہیں ہوتیں۔ امریکا میں کچھ سال گزار کر یہ روحیل کچھ زیادہ ہی اوور ہوگیا ہے۔ دراصل وہاں کا ماحول کھلا ہے۔ کسی لڑکی کی اس انداز سے تعریف کرو تو وہ برا نہیں مانتیں بلکہ خوش ہوتی ہیں۔"

"تم مجھے وضاحتیں مت دو وشمہ!"

"نہیں یار! روحیل کو تمہاری نند کے بارے میں اس طرح سے تو بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔"

"چھوڑو اب اس بات کو۔ یہ بتاؤ تمہیں شفا کیسی لگی؟" وہ تمہید باندھنے لگی۔

"خوبصورت تو خیر بہت ہے لیکن ذرا سیدھی سی لگی ہے مجھے...... تھوڑی بونگی ٹائپ۔"

"وشمہ! تم پاکستان روحیل کے لیے لڑکی پسند کرنے آئی ہو ناں..... تو شفا کے بارے میں کیا خیال ہے؟" اس نے کہہ ہی دیا۔

وشمہ کچھ دیر کے لیے بالکل خاموش ہوگئی۔ شاید وہ مناسب الفاظ ڈھونڈ رہی تھی۔

"ساہر! بلاشبہ تمہاری نند بہت پیاری ہے۔ روحیل کوئی عام انسان ہوتا تو میں ضرور شفا کے لیے سوچتی لیکن آئی ایم سوری روحیل عام انسان نہیں ہے کہ اسے کوئی سیدھی سادی معصوم لڑکی پسند آجائے۔ روحیل کو میں بڑی اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ وہ جس طرح کے مزاج کا ہے۔ کوئی سیدھی سی لڑکی اس کے

ساتھ سروائیو کر ہی نہیں سکتی۔ اسے بولڈنیس پسند ہے۔ گھبرانے شرمانے والی لڑکیوں سے وہ خار کھاتا ہے۔ شفا میں دلچسپی ضرور لے رہا ہے وہ لیکن شادی کے لیے اسے پسند نہیں کرے گا۔ واپس آتے ہوئے اس کے بارے میں بہت سوال پوچھ رہا تھا۔ اگر میں کوشش کروں تو شاید وہ شفا سے شادی بھی کرلے لیکن بعد میں اس کی زندگی اجیرن کیے رکھے گا۔ ایسے مس میچڈ کپلز زیادہ عرصہ نباہ نہیں کرپاتے۔" اس نے بغیر کسی لاگ لپیٹ کے کہہ سنایا تھا۔

"خیر اب اتنی بھی سیدھی نہیں ہے شفا۔ جتنا تم نے ایک ہی ملاقات میں اسے سمجھ لیا ہے۔" ساہر نے قدرے بے زاری سے کہا تھا۔ "میری زندگی تو اچھی خاصی اجیرن کیے رکھی ہے اس نے۔"

"کیا مطلب؟" وشمہ نے الجھ کر پوچھا کیونکہ کل تک تو ساہر شفا کی تعریفیں ہی کررہی تھی۔

جواب میں ساہر نے اپنی ساری داستان کہہ سنائی۔ کہانیاں تو ہمیشہ سے عام سی ہی ہوتی ہیں بیان کرنے کا طریقہ انہیں خاص بنادیتا ہے۔ پھر سب کچھ چونکہ ساہر کے دل پر گزرا تھا اس لیے اس کی باتوں میں اثر بھی زیادہ معلوم ہوتا تھا۔

وشمہ اس کی باتیں سن کر حیران رہ گئی۔

"شکل سے کتنی سیدھی لگتی ہے تمہاری نند لیکن کس قدر چالاک ہے۔"

"بس ایسی ہی ہے وہ۔"

"شکر ہے میں نے پہلے ہی ہامی نہیں بھری ورنہ تم تو کبھی مجھے اس کی بدتمیزیوں سے آگاہ نہ کرتیں۔ کتنی بری ہو تم ساہر! اپنے سر کی مصیبت میرے سر ڈالنے والی تھیں۔ پرانی دوستی کا بھی لحاظ نہیں کیا تم نے تو۔" وشمہ فوراً" ہی جذباتی ہوگئی تھی۔

"تم ہامی بھرتیں میں تب بھی تمہیں یہ ساری باتیں ضرور بتاتی۔ تم نے کون سا اسے اپنے گھر میں رکھنا تھا۔ شادی کے بعد تو روحیل اور شفا وہاں لاس ویگاس میں الگ ہی رہتے ناں۔" ساہر نے نرمی سے کہا۔

"ہاں یہ بھی تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن شفا جیسی لڑکیاں الگ رہیں یا جوائنٹ فیملی میں۔ ٹف ٹائم ضرور دیتی ہیں۔ پہلے میں اس کی معصومیت کی وجہ سے اسے بھابھی بنانا نہیں چاہ رہی تھی۔ اب اس کی چالاکیوں کی وجہ سے ایسا نہیں سوچوں گی۔ روحیل بھلے ہی اسے پسند کرے لیکن شادی تو میں اس کی شفا سے نہیں ہونے دوں گی۔ کیونکہ جو لڑکیاں اچھی نندیں ثابت نہ ہوں، وہ اچھی بھابھیاں بھی نہیں بن پاتیں اور میں نہیں چاہتی۔ وہ آتے ہی میرا عمل دخل بھی روحیل کی زندگی سے ختم کردے۔"

"ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔" ساہر نے بددلی سے فون بند کردیا۔ جذباتیت میں وہ خود ہی اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار بیٹھی تھی۔ کیا تھا جو وہ وشمہ کو خود پر بیتی باتیں نہ بتاتی اور تھوڑا سا اصرار کرکے اسے منا ہی لیتی۔ سچ ہے زبان آپ کے بنتے کام بھی بگاڑ دیتی ہے۔

باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ



نگہت سیما

زمین کے آنسو

"وہ قدیم عراق کا ایک بڑا شہر تھا اور حضرت نوح علیہ السلام کی قوم وہاں بستی تھی۔ وہ لوگ ود، سواع، یغوث یعوق اور نسرا بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ وہ حضرت نوح علیہ السلام کی بات نہیں سنتے تھے اور زمین آنے والے عذاب کے ڈر سے تھر تھر کانپتی تھی۔ جب حضرت نوح علیہ السلام کشتی بناتے تھے تو ان کی قوم حیرت سے انہیں کشتی بناتے دیکھتی تھی اور مذاق اڑاتی تھی کہ بھلا خشکی پر کشتی کا کیا کام۔ حضرت نوح علیہ السلام اللہ کے حکم کا انتظار کرتے تھے۔ پھر اللہ کا حکم آ پہنچا۔ بستی کو سیاہ بادلوں نے گھیر لیا اور ایک خوفناک کڑک کے ساتھ طوفانی بارش نے آلیا۔"

حور عین دونوں بازو گھٹنوں کے گرد حمائل کیے گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے ہوئے کہہ رہی تھی۔ وہ جب تاریخ کے ایوانوں میں جھانک رہی ہوتی تھی تو ایسا لگتا تھا۔ جیسے وہ خود وہاں موجود ہو۔ وقت کی قید سے آزاد ہزاروں کروڑوں سال پیچھے سب دیکھ رہی ہو۔

"پہاڑوں سے بہہ آنے والے پانی اور بارش کے پانی میں زمین کے آنسو بھی شامل ہو رہے تھے۔



مکمل ناول

۱۲ بارہویں قسط

"زمین روتی تھی کہ ساڑھے نو سو برس حضرت نوح نے اس قوم کو سمجھایا اور وہ نہیں سمجھی۔ وہ اس قوم کے انجام پر روتی تھی اور...

حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کنعان کو اس پہاڑ پر چڑھتے دیکھتی تھی، جو اسے بچانے والا نہیں تھا۔ لیکن کنعان نہیں سمجھتا تھا اور رب کے بجائے پہاڑ سے پناہ مانگتا تھا۔ اور پہاڑ کو حکم ربی ہوا۔ "اے پہاڑ ریت بن جا" اور دنیا کا وہ بلند ترین پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا۔

جانتے ہو شاعر یہ جو نجف ہے نا، یہیں دنیا کا وہ بلند پہاڑ تھا۔ جس پر کنعان اور دوسرے لوگوں نے پناہ لی اور جس کی ریت کے ذرے آج بھی نجف کے میدان میں بکھرے پڑے ہیں۔"

میں یہ سب نہیں جانتا تھا۔ مجھے تاریخ سے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی اور حور عین کہتی تھی، جو اپنی تاریخ سے لاعلم ہے اس کا نہ حال ہے، نہ مستقبل پتا نہیں، وہ صحیح کہتی تھی یا غلط۔ لیکن اس وقت میں نے بڑے تفاخر سے اسے دیکھا۔

"اور حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی جس پہاڑ پر جا کر رکی تھی اسے "کوہ جودی" کہتے ہیں۔" یہ میں جانتا تھا لیکن حور عین میری اس معلومات سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوئی۔

"ہاں! حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹے یعنی سام، حام اور یافث جو ان کے ساتھ کشتی پر سوار ہوئے تھے۔ ان سے ہی نوع انسان کی بڑی نسلیں وجود میں آئیں۔ قوم "عاد" کا تو تم نے پڑھا ہو گا تو۔ قوم عاد حضرت نوح کے بیٹے سام کی اولاد میں سے ہے۔ سام کا بیٹا ارم یہ ان کی نسل میں سے تھے۔ بہت طاقت ور ہے لیکن ظالم۔ یہ اپنے زمانے کی انتہائی متمدن قوم تھی۔ وہ لوگ اونچی اونچی عالیشان عمارتیں بناتے تھے۔ ستونوں کی مدد سے اونچی عمارتیں بنانے کا فن انہوں نے ہی ایجاد کیا۔ وہ لیکن شرک کرتے تھے اور توحید کے منکر تھے۔ پھر ان کے سب سے باعزت قبیلے خلود میں حضرت ہود علیہ السلام مبعوث ہوئے۔ وہ انہیں توحید کی طرف بلاتے تھے اور وہ ان کے قتل کا منصوبہ بناتے تھے۔ حضرت ہود اللہ کے حکم سے سورج ڈوبتے ہی بستی سے ہجرت کر گئے اور وہ رات کے اندھیرے میں خالی گھر کے باہر ہاتھ ملتے تھے۔

اور پھر اگلی صبح اللہ کا عذاب آ پہنچا۔ جس کی وعید حضرت ہود انہیں دیتے تھے تو وہ کان نہ دھرتے تھے۔ یہ آندھی کا عذاب تھا، جو آٹھ دن اور سات راتوں تک تسلسل چلتی رہی تھی۔ اس آندھی نے ان کی پناہ گاہوں کو مٹی سے ڈھانپ لیا اور انہیں اٹھا اٹھا کر پٹخا۔ زمین پر مٹی کے بڑے بڑے ٹیلے بن گئے۔ جس میں سب کچھ دفن ہو گیا۔ یہ ٹیلے قیامت تک گواہی دیں گے۔

بے شک انسان خسارے میں ہے۔"

حور عین نے جھری جھری لی۔ جیسے وہ قوم عاد کے تنومند مردوں کو زمین پر گرتے اور مٹی تلے چھپتے دیکھ رہی ہو۔

"حور عین!" میں نے جلدی سے پکارا تو اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ اسے شاید میرا مداخلت گراں گزری تھی۔ لیکن مجھے ماضی کی داستانوں سے کیا لینا تھا۔ میں تو حال میں زندہ رہنے والا شخص تھا۔

میرے سامنے حور عین بیٹھی تھی۔ جس کی غزالی آنکھوں کے سحر میں میں جکڑا گیا تھا۔ ان ظالم آنکھوں کا حزن مجھے اپنے طلسم میں گرفتار کیے ہوئے تھا۔ میں تو حور عین سے حور عین کی باتیں ہی سننا چاہتا تھا۔ میں اس بات کو جاننا چاہتا تھا، جو پچھلی ملاقات میں ادھوری رہ گئی تھی۔ اس آدھی بات نے مجھے کئی دنوں سے بے چین کر رکھا تھا اور آج اتنے دنوں بعد حور عین آئی تھی تو وہ پتا نہیں کیوں تاریخ کے وہ صفحے پھر کھولنے لگی تھی، جو پرانے ہو چکے تھے۔

جو تہذیبیں اور قومیں نیست و نابود ہو چکی تھیں۔ ان کا ذکر لے بیٹھی تھی۔ ان کی نافرمانی ان کا ظلم اور پھر ان پر عذاب الٰہی۔

اوہ! میں نے ایک گہری سانس لی۔

"اس رات کیا ہوا تھا حور عین۔"

"کس رات؟" اس نے اپنی گھنیری پلکیں اٹھائیں۔

"اس رات جب گیارہ سالہ حور عین، مریم کے سامنے ڈھال بن کر کھڑی ہو گئی تھی۔" میرا صبر جواب دے گیا تھا۔

"اس رات۔" اس کی آنکھیں نم ہوئیں اور پلکیں بھیگنے لگیں۔ وہ ہزاروں سالوں کا فاصلہ ناپ کر چوہدری فرید کے صحن میں آ کھڑی ہوئی تھی۔

ہاں! اس رات وہ، جو پانچویں تھی اور سب سے چھوٹی تھی۔ اپنی ماں کے سامنے ڈھال بن کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے دونوں بازو اوپر اٹھائے ہوئے تھے اور مریم کے سامنے کھڑی اپنے ننھے وجود سے اسے چھپاتے چوہدری فرید کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ اور چوہدری فرید جو مریم کو مارنے کے لیے دوڑا تھا۔ اس کا اٹھا ہوا ہاتھ گر گیا اور پھر وہ غصے سے پاؤں زمین پر مارتا اندر کمرے میں چلا گیا۔

حور عین نے ہاتھ نیچے کر کے مڑ کر مریم کو دیکھا۔ مریم اسے اپنے بازوؤں میں دبوچے اس کے سر پہ منہ رکھے زار زار رو رہی تھی۔ پر اس کی آواز نہیں آئی تھی۔ بس آنسو حور عین کے بال بھگوتے تھے اور حور عین

بس نہیں چلتا تھا کہ وہ مریم کو کسی ایسی جگہ چھپا دے جہاں چوہدری فرید اسے نہ دیکھ سکے اور جہاں مریم کو اس طرح رونا نہ پڑے۔

"پر چوہدری فرید اسے کیوں مارنے دوڑا تھا؟"

"اس لیے کہ مریم فریدہ کے لیے اس سے لڑتی تھی وہ فریدہ کا رشتہ شیر افگن کو دینے کے لیے تیار نہ تھی۔ اس نے چوہدری فرید کی منتیں کی تھیں۔ ہاتھ جوڑے تھے۔ پاؤں پکڑے تھے کہ وہ بھلے ایک چھوڑ چار شادیاں کر لے پر فریدہ کو شیر افگن سے بیاہنے کا خیال چھوڑ دے۔ مگر چوہدری فرید اس کی نہیں سنتا تھا۔"

"پھر... کیا چوہدری فرید نے فریدہ کو شیر افگن سے بیاہ دیا؟"

وہ ذرا دیر کو خاموش ہوئی تو بے اختیار میرے لبوں سے نکلا۔ اس نے زخمی نظروں سے مجھے دیکھا۔

"تمہیں زخم کریدنے میں مزا آتا ہے شاعر۔"

"سوری!" میں شرمندہ ہوا تو اس نے ایک گہری سانس لی۔

"اسے جیتنا ہی تھا۔ وہ مرد تھا۔ اس کے پاس طاقت تھی اور مریم عورت... اتنی زمین کی مالک ہوتے ہوئے بھی بے بس مریم کے پاس صرف صبر تھا اور آنسو۔ سو اس نے اسی صبر کو پلو میں باندھ کر اور آنسوؤں کو دل میں اتار کر فریدہ کو شیر افگن کے ساتھ رخصت کر دیا۔ اس روز فریدہ کی عمر تیرہ سال پانچ مہینے اور چھ دن تھی۔ شیر افگن کی بیٹی ثریا نے لال جوڑا پہن کر حویلی میں قدم رکھا تھا۔

مریم نے صبر کی چادر اوڑھے بڑی پیٹی سے اپنے جہیز کی ساٹن کی کڑھائی والی چادریں اور تکیے نکال کر اپنے جہیز کے نواڑی پلنگ پر... جس کی اونچی پشت پر براؤن لکڑی میں رنگ برنگے شیشے دمکتے تھے، بچھائی اور خود اس کمرے سے بڑے کمرے میں اٹھ آئی اور چپ چاپ فریدہ کی چارپائی پر آ کر لیٹ گئی۔ رقیہ اسے کن اکھیوں سے دیکھتی اور دوپٹے کے پلو سے آنکھوں کے کونے پونچھتی تھی اور وہ دیوار کی طرف منہ کیے بے آواز آنسو بہاتی تھی، جو سخت تکیے کی روئی میں جذب ہوتے تھے۔ حور عین اس کی پیٹھ سے چمٹی اپنا ایک بازو اس پر رکھے سونے کی کوشش کرتی تھی۔

مریم پوری رات جاگی تھی۔ لیکن پھر بھی صبح سویرے اٹھ گئی۔ ثریا اور شیر افگن کو ناشتا بھجوا کر وہ جلے پیر کی بلی کی طرح پورے صحن میں چکراتی تھی اور کبھی کبھی گھڑونچی کی جالیوں میں جھانکتی پتا نہیں وہ دارو سائیں کو کھوجتی تھی، جو دو دن سے نظر نہیں آ رہا تھا یا یوں ہی دیکھتی تھی۔"

حور عین نے سر سے ڈھلک جانے والی چادر کو درست کیا اور اٹھنے لگی تو میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"حور عین! فریدہ خوش تو تھی نا؟ شیر افگن نے اسے خوش تو رکھا تھا نا؟" میں پوچھ رہا تھا اور میرا دل سننا چاہتا تھا۔ "ہاں! وہ خوش تھی۔ شیر افگن نے اسے پھولوں کی طرح رکھا چاہا۔" لیکن حور عین کی آنکھیں پہلے خون رنگ ہوئیں اور پھر چھلک پڑیں۔ وہ اٹھتے اٹھتے بیٹھ گئی اس نے آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کو پونچھا نہیں۔ وہ ہاتھ زمین پر ٹیکے آنسو بہا رہی تھی۔

"حور عین!" میں نے بے تاب ہو کر ہاتھ آگے بڑھایا اور پھر پیچھے کر لیا۔

یہ رخصتی سے دوسرے دن کی بات تھی۔ فریدہ شام کو مریم کے ساتھ گھر آئی تھی اور ثریا اپنے میکے گئی تھی۔ وہاں گاؤں میں یہ رسم تھی۔ اگلی صبح شیر افگن آ کر فریدہ کو لے جاتا اور چوہدری فرید ثریا کو۔ پر رات کا جانے کون سا پہر تھا جب حور عین کی آنکھ کھلی اور اس نے کھلے دروازے سے چاند کی روشنی میں دیکھا۔ وہ شاید چودھویں کا یا تیرھویں کا چاند تھا۔ اس کی روشنی پورے صحن میں اجالا کرتی تھی اور برآمدے میں بھی آئی تھی۔ مریم فریدہ کو بازوؤں میں چھپائے بیٹھی تھی اور فریدہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔

"ماں! تجھے اللہ کا واسطہ۔ مجھے صبح وہاں مت بھیجنا

اماں! میں مر جاؤں گی۔"

اور مریم کبھی اس کا سر چومتی۔ کبھی اس کے رخساروں پر بوسہ دیتی اور اس کے ساتھ مل کر روتی۔

"میری بچی! کیا ہوا بول تو۔ کچھ کہہ تو۔"

اور فریدہ بول نہ پاتی۔ بس روتی، تڑپتی تھی۔

"اماں! مجھے نہ بھیجو۔"

حورعین نے چوہدری فرید کو کمرے سے نکلتے اور پھر برآمدے میں مریم اور فریدہ کے پاس کھڑے ہوتے دیکھا۔ وہ گہری نیند سے جاگا تھا شاید۔

"کیا ہنگامہ ہے؟" فریدہ، مریم کو چھوڑ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔

"ابا! مجھے وہاں نہ بھیجو۔ بے شک اپنے ہاتھوں سے میرا گلا گھونٹ دو۔ لیکن وہاں نہیں بھیجو۔"

صبح ہونے کا خوف اسے مارے ڈالتا تھا۔ جب شیر افگن کو اسے لینے آنا تھا اور صبح ہونے میں دیر ہی کتنی تھی۔ وہ چوہدری فرید کی ٹانگیں نہ چھوڑتی تھی۔ تب چوہدری فرید نے زور سے پاؤں جھٹکا اور وہ دبلی پتلی فریدہ اچھل کر گری۔ برآمدے میں پڑے حمام کی ٹونٹی اس کے سر میں لگی اور سر سے بھل بھل خون بہنے لگا۔ لیکن وہ خون کی پروا کیے بغیر سیڑھیوں کی طرف بھاگی۔

"ٹھیک ہے! میں پھر چھت سے چھلانگ لگا دوں گی۔ لیکن صبح....."

کچھ دیر ششدر کھڑا رہنے کے بعد چوہدری فرید اس کے پیچھے لپکا۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی جارہی تھی۔ چوہدری فرید نے آخری سیڑھی پر اس کا بازو پکڑ لیا اور وہ سیڑھی پر ہی ایک بار پھر اس کے پاؤں پکڑ کر بیٹھ گئی۔

"ابا! آپ کو اللہ کا واسطہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا واسطہ!"

چوہدری فرید نے غصے سے پاؤں جھٹکا اور اسے مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا اور پھر اس کا ہاتھ اٹھا ہی رہ گیا وہ سیڑھیوں سے لڑھکتی نیچے فرش پر آگری اور اس کا سر کھل گیا۔

پوری سولہ پکی سیڑھیاں۔

حورعین کتنی ہی بار گن گن کر سیڑھیاں چڑھتی اور اترتی تھی۔

میں سانس روکے اسے دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ فریدہ کو کچھ نہ ہوا ہو اور اس کے گرنے سے چوہدری فرید کو عقل آگئی ہو۔

وہ سر جھکائے زمین پر انگلی سے لکیریں کھینچتی تھی اور اس کے آنسو نیچے زمین پر گرتے تھے۔ بڑی دیر بعد اس نے سر اٹھایا۔

حورعین دروازے میں سہمی سہمی کھڑی مریم کو دیکھ رہی تھی، جو فریدہ کو گود میں سمیٹے فرش پر بیٹھی خالی خالی آنکھوں سے اسے دیکھتی، اس کے بند ہونٹوں کو چومتی تھی۔ اس کے سر سے نکلنے والے خون سے اس کے ہاتھ بھرے جاتے تھے۔ چوہدری فرید بھی فرش پر بیٹھا اس کی نبض ٹٹول رہا تھا اور کن انکھیوں سے مریم کو تکتا پگڑی کے پلو سے آنکھیں پونچھتا تھا۔ پتا نہیں وہ فریدہ کے لیے روتا تھا یا اس لیے کہ اب شیر افگن بھی اپنی بچی کو واپس بلالے گا اور ابھی ایک رات میں ثریا سے جی کہاں بھرا تھا اس کا۔

"کیا... کیا فریدہ؟" میں ہکلا گیا۔

"ہاں!" حورعین نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے بری طرح کچل ڈالا۔

"پتا نہیں کیوں۔ حالانکہ صرف سولہ سیڑھیاں ہی تو تھیں۔ بچپن میں ہم پانچوں ہی ایک دو بار ضرور ان سیڑھیوں سے گری تھیں۔ سر بھی پھٹے تھے۔ ٹانکے بھی لگے تھے۔ لیکن فریدہ کو پتا نہیں کتنی گہری چوٹ لگی تھی۔ دروازے میں کھڑی حورعین کے پاؤں من من بھر کے ہوگئے تب رقیہ نے اسے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ اب وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹی ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھیں۔ برابر والے پلنگ پر رابعہ گہری نیند سوتی تھی۔

تب چوہدری فرید اسے بازوؤں میں اٹھائے اندر لایا اور رقیہ مریم سے لپٹ کر چیخ چیخ کر رونے لگی۔ اس

کے رونے سے رابعہ اٹھ بیٹھی۔ چوہدری فرید نے اسے بتایا کہ فریدہ اندھیرے میں سیڑھیوں سے پھسل کر گر گئی تھی اور پورے گاؤں نے اسے ہی سچ جانا۔ کسی نے نہ پوچھا کہ رات کے وقت اندھیرے میں وہ چھت پر کیا کرنے گئی تھی اور حورعین جو سچ جانتی تھی شکوہ بھری نظروں سے مریم کو دیکھتی تھی کہ وہ لوگوں کو کیوں نہیں بتاتی۔

چوہدری فرید کی بہنیں پورے صحن میں چکراتی بین کرتی تھیں۔ صحن کے بیچوں بیچ پڑی چارپائی پر آنکھیں موندے لیٹی فریدہ کے چہرے کی زردی میں اب بھی سہم اور خوف جھلکتا تھا۔ جیسے ڈر خوف وہیں منجمد ہو گیا ہو۔ مدت کے بعد بھی مریم چوہدری فرید کی بہنوں کو پتھرائی آنکھوں سے دیکھتی اور کہتی تھی۔

"تم نے اس وقت بین کیوں نہیں ڈالے؟ اس وقت کیوں نہیں روئیں، جب تمہارا بھرا بھائی اس کلیوں جیسی نازک تیرہ سالہ لڑکی کو ستر سال کے بوڑھے سے بیاہ رہا تھا۔"

لیکن اس کی آواز نہیں نکلتی تھی۔ وہ صرف ٹکر ٹکر انہیں دیکھتی تھی۔ شیر افگن کی حویلی کے بجائے چوہدری فرید کے گھر سے دو دن کی بیاہی دلہن کا جنازہ اٹھا۔

کئی دنوں بعد جب حورعین نے مریم سے پوچھا۔

"اماں! ابا کو پولیس کب پکڑ کر لے جائے گی؟"

"چپ خصمی!" مریم نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔ اور حورعین سوچتی تھی۔

جب ہاری غلام سرور نے اپنے دشمن کو چھت سے دھکا دے کر مار دیا تھا تو پولیس اسے پکڑ کر لے گئی تھی تو پھر ابا کو کیوں نہیں پکڑتی۔"

"کیونکہ مریم نے شوہر کو بیٹی کا قتل معاف کر دیا تھا۔" مجھے اپنے لہجے کی تلخی خود ہی محسوس ہوئی اور میں مزید کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"اور شاید بیویاں ایسا ہی کرتی ہیں۔" اس کی آواز بہت آہستہ تھی۔ میں نے بمشکل سنا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"کاش! مریم نے فریدہ کے خون بہا۔ میں باقی تینوں کی زندگیاں مانگ لی ہوتیں۔ لیکن مریم کو اتنی عقل ہی کہاں تھی۔"

اس کا سر گھٹنوں پر جھکا ہوا تھا۔ اتنا کہ مجھے اس کا چہرہ نظر نہیں آرہا تھا۔ جسے دیکھنے کی چاہ میں، میں اس کے سامنے بیٹھا اس کی وہ باتیں بھی سنتا رہتا تھا جن میں مجھے دلچسپی نہیں تھی۔

اس کی آنکھیں برس رہی تھیں اور مجھے کشور ناہید کی "قتل عمد" یاد آرہی تھی اور میں دل ہی دل میں دہرا رہا تھا۔

"یہ زندگی کی سل پہ پس چکیں تو رنگ آئے گا۔
عدم نصیب عورتیں، عدم کا راستہ بتائیں گی۔
سفر نصیب عورتیں۔
اجل نشان عورتیں۔
عدم نژاد عورتیں۔
سنو! کہ ایسا کیا ضرور ہے کہ
ان کے قتل کی سزا بھی قتل عمد ہو۔
ہاں ایسا کیا ضرور ہے۔
کہ ان کے قتل کی سزا بھی قتل عمد ہو۔"

"آبی...!" فلک شاہ نے جو بہت دیر سے ایبک کو مسلسل لکھتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ آہستہ سے پکارا تو اس نے چونک کر انہیں دیکھا۔ وہ بیڈ پر اسی کی طرف کروٹ کیے لیٹے اسے ہی دیکھ رہے تھے۔

"جی بابا!" وہ ایک دم قلم ٹیبل پر رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "آپ ابھی تک سوئے نہیں۔"

"نیند نہیں آرہی تھی۔ تمہیں لکھتے دیکھ رہا تھا۔ تھکے نہیں ہو گیا؟"

"بس بابا! آج بہت دنوں بعد قلم اٹھایا تھا... تو بس لکھتا ہی چلا گیا۔ لفظ جیسے خود بخود نوک قلم سے پھسل رہے تھے۔" وہ ان کے بیڈ کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گیا اور ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے نرمی سے بولا۔

"آپ ٹھیک تو ہیں نا بابا؟"

"ہوں..." انہوں نے ہاتھ بستر پر ٹکا کر اٹھنے کی کوشش کی۔

"لیٹے رہیں بابا! اب رات کے ڈیڑھ بجے اٹھ کر بیٹھنے کا ٹائم تو نہیں ہے نا۔" اس نے سامنے کلاک پر نظر ڈالی۔

"لیٹے لیٹے تھک گیا ہوں یار! نیند نہیں آرہی۔"

ایبک نے انہیں اٹھنے میں مدد دی اور بیڈ کراؤن کے ساتھ تکیہ رکھا۔ فلک شاہ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

"بابا! آپ نے آج وہ نیند کی گولی نہیں کھائی نا، جو انکل شیر دل نے آپ کو دی تھی؟"

"نہیں یار! وہ کھاتے ہی نیند آجاتی ہے۔"

"لیکن آپ کا ذہن پرسکون ہو جاتا۔ میں پانی دوں آپ کو؟"

"ابھی نہیں... یہ بتاؤ! تمہارا ناول کب تک مکمل ہو گا؟"

"میرا خیال ہے اگر میں باقاعدگی سے ہر روز ایک، دو گھنٹہ لکھوں تو دس، بارہ دنوں میں... لیکن مسئلہ یہ ہے کہ بعض اوقات کئی کئی مہینے گزر جاتے ہیں، لکھ نہیں پاتا۔"

ایبک اس وقت فلک شاہ کے ساتھ کرنل شیر دل کے گیسٹ روم میں تھا۔ فلک شاہ یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ رات کو وہ ان کے پاس چلا آتا تھا۔ آج لکھنے کا موڈ ہو رہا تھا۔ اس لیے وہ اپنا لکھنے پڑھنے کا سامان بھی اٹھا لایا تھا۔

کرنل شیر دل ہر طرح سے فلک شاہ کا خیال رکھ رہے تھے۔ بلکہ وہ انہیں گاڑی میں بٹھا کر ان بہت ساری جگہوں پر جو فلک شاہ کو بہت پسند تھیں، لے گئے تھے۔

"اور کالم لکھنے کے لیے کیسے وقت نکال پاتے ہو؟"

وہ اسے ہی دیکھ رہے تھے۔

"وہ تو مجبوری ہے بابا! وقت نکالنا ہی پڑتا ہے۔"

"شیر دل کہہ رہا تھا۔ تم آج کل بہت سخت الفاظ استعمال کر رہے ہو۔ ہاتھ ہولا رکھو بیٹا۔" ان کا انداز سمجھانے کا سا تھا۔

"تم جانتے ہو نا، یہاں حق کی آواز بلند کرنے والوں کی زبانیں کاٹ دی جاتی ہیں۔ ہاتھ کچل دیے جاتے ہیں۔"

"لیکن مجھے اختلاف ہے بابا! ان کی پالیسیوں سے۔ ان کے کاموں سے۔ انہیں ملک سے محبت نہیں ہے بابا۔ انہیں صرف اقتدار کی ہوس ہے۔ پیسے کا لالچ ہے۔ یہ سب ملک بیچ کھانے والے لوگ ہیں۔ انہیں اس سرزمین سے محبت نہیں ہے۔ یہ صرف اس کا سودا کرنے اور اپنے خزانے بھرنے کے لیے کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔"

"جانتا ہوں بیٹا! لیکن تم یا میں کیا کر سکتے ہیں؟"

"یہی تو مجبوری ہے بابا! ہم کچھ کر نہیں سکتے۔ ہمارے ہاتھ بندھے ہیں۔ ہم آنکھوں کے سامنے انہیں ملک کو لوٹتا دیکھتے ہیں۔ لیکن ہم زبانیں سیے بیٹھے ہیں۔ بابا پلیز۔"

اس نے ملتجی نظروں سے فلک شاہ کو دیکھا۔

"میں اس ملک کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ عملی طور پر کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ کچھ ایسا بابا! جو میرے ملک کو ان گہرے اندھیروں سے نکال سکے۔"

"تم نے وعدہ کیا تھا ایبک! مجھ سے، اپنی ماں سے اور شیر سے کہ تم..."

"اسی وعدے نے تو مجھے زنجیر کر رکھا ہے بابا۔" اس کی آواز ایک دم مدھم ہو گئی تھی اور سر جھک گیا۔

"تم کیا کرنا چاہتے ہو آبی؟" ان کا دل اس کے لیے دکھا۔ وہ فلک مراد شاہ کا بیٹا تھا اور اس کے سینے میں بھی فلک مراد شاہ کا دل دھڑکتا تھا۔ وہ دل جو ملک میں ہونے والی ناانصافیوں پر تڑپتا تھا۔ جسے پاکستان سے عشق تھا۔ جو اپنے محسنوں قائداعظم اور اقبال کے خلاف ایک لفظ نہیں سن سکتا تھا۔ جو مخلص لوگوں کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ ڈور دیکھنا چاہتا تھا اور اس چاہت نے انہیں کیا دیا۔ حق نواز مر گیا اور وہ...

"میں...!" ایبک نے اپنی طرف اشارہ کیا۔ "پتا نہیں بابا۔ میرے سامنے کوئی راستہ واضح نہیں ہے۔ وہ لوگ جو بظاہر پاکستان اور مسلمانوں سے محبت کا دعوا کرتے ہیں۔ جب ان کے چہروں سے نقاب اٹھتا ہے تو حیرت ہوتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا، بندہ کس کو فالو کرے۔"

"تم اپنے لیے خود راستہ بناؤ بیٹا۔ کسی کے پیچھے چلنے کی تمہیں کیا ضرورت ہے۔ تم ایسے جوانوں سے رابطہ کرو جن کے دل میں واقعی ملک وملت کا درد ہے۔ یہ ملک اس لیے تو نہیں بنا تھا کہ چند لٹیرے اور ڈاکو اسے یرغمال بنالیں۔"

فلک شاہ بھول گئے کہ انہوں نے ایبک سے سیاست اور ایسی کسی بھی سرگرمی میں حصہ نہ لینے کا عہد لے رکھا ہے۔

انہیں یاد نہیں رہا کہ حق نواز مارا گیا تھا... وہ معذور ہو گئے تھے۔

اس وقت انہیں لگ رہا تھا، وہ حق نواز ہیں اور ان کے سامنے فلک مراد شاہ بیٹھا ہوا ہے اور وہ اسے قائل کر رہے ہیں۔

"ہمیں اس وطن کے لیے کچھ کرنا ہے۔ ایبک شاہ! ہم اسے یوں ہاتھوں سے جانے نہیں دیں گے۔ ابھی تو میرے سینے میں سقوط ڈھاکہ... کا زخم تازہ ہے۔ ابھی تو اس سے خون رستا ہے آبی۔ میں تمہارے ساتھ ہوں آبی بتاؤ، کیا کرنا چاہتے ہو۔ میں تمہیں ہر اس عہد سے آزاد کرتا ہوں۔ جو میں نے تم سے لیا تھا۔"

"بابا!" ایبک نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

"جان بابا!" فلک شاہ نے اپنے بازو پر رکھے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ "تم جو کرنا چاہتے ہو، کرو۔ ہو سکتا ہے تم اس وطن کے لیے وہ کر سکو، جو میں نہیں کر سکا۔ میں نے اور حق نواز نے مل کر اس ملک کے لیے بہت سارے خواب دیکھے تھے۔ کوئی ایک خواب بھی تعبیر نہیں پاسکا۔ سردار اعجاز کہتے تھے، خواب ضرور دیکھو فلک مراد شاہ!"

وہ ذرا سا مسکرائے اور پھر نم ہو جانے والی آنکھیں پونچھیں... پتا نہیں کیا، کیا کچھ یاد آگیا تھا۔

"کل میں سردار اعجاز سے ملنے جاؤں گا۔ شیر دل بتا رہا تھا بہت بیمار ہیں۔ اسی سال عمر ہو چکی ہے ان کی۔ لیکن وہ آج بھی خواب دیکھتے ہیں۔ وطن کے لیے۔ قوم کے لیے۔ تمہیں فنکشن میں نہ جانا ہوتا تو میرے

ساتھ چلتے۔"

"تو تم نے طے کرلیا ہے کہ آپ فنکشن میں نہیں جائیں گے؟"

"ہاں۔۔۔ مصطفیٰ بھائی اور عثمان بھائی سے بات ہوگئی تھی۔ کسی بھی قسم کی بدمزگی سے بچنے کے لیے یہ ضروری ہے۔۔۔ اور میں ڈرتا بھی ہوں کہ کہیں کوئی بات برسوں بعد ملنے والی اس خوشی کو نگل نہ لے۔ تمہاری ماما کا دل بہت کمزور ہوگیا ہے۔ وہ دوبارہ سے یہ جدائیاں برداشت نہیں کرسکے گی۔"

"اب بابا جان کو ساری بات کا پتا تو ہے اور پھر مردہ پھپھو نے بھی تصدیق کردی ہے آپ کی بات کی۔ اب کیا ہونا ہے بھلا؟"

"ٹھیک ہے! لیکن تم بھی محتاط رہنا۔ رابیل سے اور مائرہ سے دور ہی رہنا۔"

"جی بابا! اب آپ سوجائیں اور یہ ٹیبلیٹ لے لیں۔" اس نے اٹھ کر بیڈ کی سائیڈ دراز سے گولی نکالی اور روم فریج سے پانی کی بوتل نکال کر گلاس میں پانی ڈالا۔

"تم بھی سوجاؤ۔ اب دو بج رہے ہیں۔ لکھنے نہ بیٹھ جانا۔"

"جی! بس چند لفظ ذہن میں چکرا رہے ہیں۔ لکھ کر سوجاتا ہوں۔"

اس نے گولی ان کی ہتھیلی پر رکھی۔

"ایبک! تم احمد حسن سے کیوں نہیں ملتے؟"

"احمد حسن؟" اس نے گلاس انہیں پکڑاتے ہوئے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"ہاں! میں نے اس کے چند پروگرام دیکھے ہیں۔ "محب وطن" آدمی ہے۔ میں نے کسی اخبار میں پڑھا تھا کہ اس نے اپنی ایک تنظیم بنائی ہے۔ جس میں زیادہ تر نوجوان لوگ ہیں اور ان کا منشور وطن اور اہل وطن کے لیے کچھ کرنا ہے۔"

"تنظیم کا تو مجھے علم نہیں ہے بابا۔ لیکن کچھ صحافتی حلقوں میں اس کے متعلق جو باتیں کی جارہی ہیں اس سے اس کی شخصیت متنازعہ ہوگئی ہے۔ بہرحال میں ملوں گا۔۔۔ کہیں سے تو شروع کرنا ہے۔ اگر وہ واقعی ملک و قوم سے مخلص ہے تو اس کے ساتھ مل کر کام کرلوں گا۔"

فلک شاہ نے سرہلایا اور پانی کے دو گھونٹوں سے گولی نگل لی۔

ایبک نے انہیں لیٹنے میں مدد دی اور پھر جھک کر ان کی پیشانی چومی۔

"شب بخیر بابا۔"

"میری جان۔۔۔ جیتے رہو، خوش رہو۔"

انہوں نے لیٹے لیٹے ہی اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی چوم لی۔

ایبک سیدھا ہوا تو اس کی آنکھیں نم ہورہی تھیں۔

"کتنے انمول ہوتے ہیں یہ رشتے اور دکھ کی بات یہ ہے کہ جب یہ ہمارے قریب ہوتے ہیں تو ہم ان کی وہ قدر نہیں کرتے، جو ان کا حق ہوتا ہے۔"

فلک شاہ نے آنکھیں موندلیں تو وہ انہیں ایک بار پھر سونے کی تلقین کرتا ہوا ٹیبل تک آیا اور قلم ہاتھ میں لیے کچھ دیر یوں ہی فلک شاہ کی طرف دیکھتا رہا۔ انہوں نے کروٹ بدل کر رخ دیوار کی طرف کرلیا تو اس نے میز پر بکھرے کاغذات پر نظر ڈالی اور لکھنے لگا۔

"قوم ثمود پر بھی تو ہیبت ناک بادلوں کا عذاب آیا تھا۔" مجھے اچانک یاد آیا تھا۔

"ہاں۔۔۔!" حورعین جو کسی خیال میں ڈوبی ہوئی تھی۔ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔

"دراصل بستی کو ہیبت ناک بادلوں نے گھیرا تو تھا۔ لیکن ان سے نہ بارش برسی تھی، نہ آندھی۔ بلکہ تیسرے دن کی صبح ایک انتہائی زوردار کڑک پیدا ہوئی تھی۔ یہ کڑک اتنی زبردست تھی جیسے زلزلہ۔"

اس کے لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ نمودار ہوکر معدوم ہوگئی۔ میں دل ہی دل میں شرمندہ ہوا۔ مجھے اسے کچھ بتانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ تو۔۔۔

"اور تم جانتے ہو گے شاعر! کہ قوم ثمود نے پہاڑوں کو تراش تراش کر خوب صورت گھر بنا رکھے تھے۔ ان پر اللہ کا بہت فضل تھا۔ ان کے کھیت سونا اگلتے تھے اور درخت پھلوں سے لدے رہتے تھے۔ لیکن نہ صرف یہ کہ وہ شرک کے مرتکب ہوئے۔ بلکہ انہوں نے اللہ کے نبی حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو قتل کردیا، جو معجزانہ طور پر اللہ کے حکم سے پیدا ہوئی تھی اور پھر ان کے قتل کا منصوبہ بنایا تو جب قیدار اونٹنی کو مارنے کے بعد رات کے وقت حضرت صالح علیہ السلام کے قتل کا منصوبہ بنا رہا تھا تو زمین تھر تھر کانپتی تھی اور جانتی تھی کہ حضرت صالح علیہ السلام نے جس عذاب کی وعید کی ہے، وہ آکر رہے گا اور وہ آیا۔"

مجھے اب حورعین کی باتوں پر حیرت نہیں ہونا چاہیے تھی۔ اتنے دنوں سے میں اس کی باتیں سن رہا تھا اور میں نے اپنے دل میں اعتراف کرلیا تھا کہ حورعین نے "تاریخ" کو بہت زیادہ جانا اور سمجھا ہے۔ لیکن پھر بھی مجھے حیرت ہوتی تھی کہ وہ ایک عام سی چھوٹی سی لڑکی اتنا کچھ کیسے جانتی ہے۔ یکایک وہ کھڑی ہوگئی۔

"مجھے دیر ہوگئی ہے۔ اب چلتی ہوں۔"

"ہاں۔۔۔ اچھا۔" میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

"تم نے یہ نہیں بتایا کہ کیا شیر افگن نے چوہدری فرید کے ساتھ اپنی بیٹی واپس بھیج دی تھی یا فریدہ کے مرنے کے بعد اسے روک لیا تھا؟"

"نہیں۔۔۔ شیر افگن نے اپنی بیٹی کو نہیں روکا تھا۔"

"کہیں کوئی ڈیل تو نہیں ہوئی تھی؟" میرے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

"ڈیل؟" مریم نے زخمی نظروں سے مجھے دیکھا۔

"ہاں! ڈیل۔۔۔" "لیکن رابعہ تو صرف بارہ سال کی تھی۔"

اس کی نظریں مجھ سے ملیں۔ ان نظروں میں کیا تھا۔

بے بسی، دکھ، اذیت۔

مجھے لگا، جیسے میرا دل پھٹ جائے گا۔ وہ ایک دم مڑی اور تیز تیز چلنے لگی۔

وہ جارہی تھی۔ میں اسے جاتے دیکھ رہا تھا۔ چپ ساکت اور میرے اندر کوئی کرلا رہا تھا۔

رابعہ جو چوتھی بہن تھی۔ جو صرف بارہ سال کی تھی۔

"نہیں۔۔۔!" میں نے آنکھیں بند کرلیں اور جب درد کی انتہا سے گزر کر میں نے آنکھیں کھولیں تو وہ جاچکی تھی۔

ایبک نے قلم رکھ دیا۔

"بس آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔"

ایک گہرا سانس لے کر وہ اٹھا۔ آنکھیں نیند سے بوجھل ہورہی تھیں۔ کلپ بورڈ سے کاغذ اتار کر اس نے فائل میں رکھے اور فلک شاہ کی طرف دیکھا۔ وہ سو گئے تھے۔ اس نے نائٹ بلب جلایا اور بیڈ پر لیٹ کر آنکھیں بند کرلیں۔ بند آنکھوں میں اریب فاطمہ کا سراپا لہرایا۔

کتنے سارے دن ہوگئے تھے اریب فاطمہ کو دیکھے۔ اس نے ایک گہری سانس لی۔

"ایسا لگتا ہے جیسے تمہیں دیکھے ہوئے صدیاں بیت گئی ہوں۔ تم میں ایسا کیا ہے اریب فاطمہ! کہ تم میرے اندر سرایت کرتی جارہی ہو؟"

ایک لمحہ کو اس کا جی چاہا کہ وہ انجی کو فون کرکے پوچھے کہ اریب فاطمہ آگئی ہے یا نہیں۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی نظریں وال کلاک پر پڑیں۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ سچ کہا ہے کسی نے، محبت آدمی کے حواس چھین لیتی ہے۔

وہ مسکرایا اور آنکھیں بند کرکے سونے کی کوشش کرنے لگا۔

☆ ☆ ☆

"یہ احمد حسن۔۔۔ کیا تم اسے جانتی ہو فاطمہ؟" سمیرا نے عبایا تہ کرتے ہوئے پوچھا تو اریب فاطمہ نے جو اپنی چادر تہ کرکے بیڈ پر رکھ رہی تھی۔ ایک دم مڑ کر حیرت سے اسے دیکھا۔

"مجھے ایسا لگا تھا جیسے احمد حسن نے تمہیں آواز دی

ہو۔ تمہارا نام لے کر بلایا ہو۔"

"ہاں...!" اریب فاطمہ نے ایک گہرا سانس لے کر اس کی طرف دیکھا۔ "مجھے بھی لگا تھا جیسے اس نے مجھے نام لے کر بلایا ہو۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ احمد حسن کو میرا نام کیسے پتا چلا۔ یقین کرو سمیرا! میں تو آج سے پہلے کبھی اس سے نہیں ملی۔ بلکہ میں نے تو کبھی اس کا پروگرام بھی آج تک نہیں دیکھا۔ حالانکہ میری سیٹ فیلو اس کی بہت بڑی مداح ہے اور اس نے کئی بار مجھے احمد حسن کا پروگرام دیکھنے کے لیے کہا۔ لیکن مجھے یاد ہی نہیں رہتا تھا کہ مجھے آج اس کا پروگرام دیکھنا ہے۔"

اس نے سمیرا کی طرف دیکھا' جو اب جھک کر جوتے اتار رہی تھی۔

"ہو سکتا ہے ہمیں وہم ہوا ہو۔ لیکن میرے کانوں نے اس آواز کو سنا تھا۔ جیسے کوئی بہت دور سے کہہ رہا ہو۔ اریب فاطمہ... اریب فاطمہ!"

وہ جوتے اتار کر اب دائیں ہاتھ سے آہستہ آہستہ پاؤں کو دبا رہی تھی۔ "شاید جوتا تنگ تھا اور سمیرا کے پاؤں میں درد ہو رہا ہے۔" اریب فاطمہ نے سوچا اور پھر سمیرا کو دیکھتے ہوئے وہ جیسے ایک دم کوئی بات اچانک یاد آنے پر چونکی۔

"ایک منٹ... سمیرا ایک منٹ... میرا خیال ہے میں نے اسے دیکھا تھا۔ وہاں اپنے گاؤں میں... میں نے رکشے میں سے دیکھا تھا۔ یہ وہی شخص تھا گاؤں والا اور یقیناً" یہی نام تھا اس کا... میں زینب آپا سے ملنے گئی تھی۔ ان کی ورکشاپ میں۔ وہاں ایک ورکشاپ بنی ہے... خواتین کی فلاح و بہبود کے لیے... زینب آپا بھی وہاں کام کرتی ہیں۔ میں زینب آپا سے مل کر واپس آرہی تھی کہ میں نے اسے وہاں ورکشاپ کے ایک کمرے سے اسفند یار کے ساتھ باہر آتے دیکھا تھا۔ ہو سکتا ہے اسفند نے اسے میرا نام بتایا ہو کہ یہ میری بہن ہے۔ بلکہ ضرور بتایا ہو گا۔ اسفند کو بہت زیادہ اور غیر ضروری باتیں کرنے کی عادت ہے۔ کوئی اس کے ساتھ تھوڑی دیر بیٹھ جائے تو وہ اسے پورے خاندان' بلکہ آس پاس کے پڑوسیوں کی تاریخ بھی بتا دے گا۔"

وہ ذرا سا مسکرائی۔

"اسفند نے گھر میں اماں سے بھی ذکر کیا تھا سمیرا! مجھے یاد آرہا ہے۔ سمیری بتا رہا تھا مجھے کہ بھائی کی ملاقات احمد حسن سے ہوئی ہے' جو ٹی وی میں کام کرتے ہیں۔ اس روز جب میں ورکشاپ سے واپس آرہی تھی تو اس نے بہت غور سے مجھے دیکھا تھا۔ یقیناً" اسے میری شکل یاد رہ گئی ہو گی اور سچ بتاؤں' مجھے اس کا اس طرح دیکھنا بہت برا لگا تھا۔ اس روز اور میں اسفند کا انتظار کیے بغیر ہی ورکشاپ کے گیٹ سے نکل آئی تھی۔ حالانکہ اسفند نے مجھے آواز بھی دی تھی۔ لیکن مجھے اس طرح کے نظر باز لوگ بہت برے لگتے ہیں۔"

"نہیں! وہ اس طرح کا نہیں ہے۔" سمیرا کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

اریب فاطمہ نے حیرت سے دیکھا۔

"میرا مطلب ہے' وہ ایسا نہیں ہو سکتا ہے۔ تم نے اس کے پروگرام نہیں دیکھے۔ تم اس کے خیالات نہیں جانتیں۔ وہ بہت اچھی سوچ رکھتا ہے۔"

"ہے بی۔ لیکن میں اسے نہیں جانتی تھی۔ اس لیے برا لگا۔" اریب فاطمہ مرینہ کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"الریان" میں خاموشی تھی۔ یقیناً" سب ملک ہاؤس میں ہوں گے۔ آج رات حفصہ کی مہندی تھی۔ سب لڑکیاں اور خواتین ناشتا کر کے اپنی اپنی تیاریوں میں لگ گئی تھیں۔ حفصہ اور منیبہ صبح سے ہی ملک ہاؤس میں تھیں۔ وہ ناشتے کے بعد مرینہ کے کمرے میں آئی۔ سمیرا پڑھ رہی تھی۔ اسے آتا دیکھ کر اس نے کتاب بند کر دی۔

"آجاؤ فاطمہ!"

"نہیں... تم پڑھ رہی ہو۔ ڈسٹرب ہو گی۔"

"بیٹھ جاؤ نا فاطمہ!" سمیرا نے اصرار کیا تو وہ بیٹھ گئی۔

رات ہی ابا اسے "الریان" چھوڑ کر گئے تھے۔ اماں نے ابا کو کیسے رضامند کیا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی۔ نہ ہی اس نے پوچھا تھا۔ بس اماں نے اسے صرف اتنا بتایا تھا

کہ صبح ابا جلدی نکلیں گے۔ سو وہ رات میں ہی اپنی پیکنگ وغیرہ کرلے۔ رات وہ اتنے لمبے سفر سے بے حد تھک گئی تھی۔ اس لیے ابا کے جانے کے بعد جلدی سو گئی تھی۔ ابا عبدالرحمٰن شاہ کے اصرار کے باوجود نہیں رکے تھے اور رات میں ہی اپنے کسی عزیز کے ہاں چلے گئے تھے۔ صبح انہیں واپس چلے جانا تھا۔

"اور پتا نہیں وہ واپس چلے بھی گئے ہوں گے اب تک۔" سمیرا کے کمرے میں بیٹھے بیٹھے اس نے سوچا تھا۔

اسے حفصہ کے لیے کچھ گفٹ بھی لینا تھا۔ اس نے سوچا۔ وہ سمیرا سے کہے کہ وہ اس کے ساتھ چلے تو کہیں قریبی مارکیٹ سے وہ کچھ لے لے۔ بلکہ سمیرا سے مشورہ بھی کرلے کہ وہ کیا گفٹ لے۔ لیکن اس سے پہلے ہی سمیرا نے اسے اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔

"مرینہ وغیرہ سب بزی ہیں۔۔۔ رات کے فنکشن کی تیاری میں۔۔۔ مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ تم چلوگی میرے ساتھ؟"

"ہاں! چلو' واپسی پر میں گفٹ بھی لے لوں گی۔ لیکن مجھے یہاں کی مارکیٹوں اور راستوں کا کچھ پتا نہیں ہے۔"

"مجھے پتا ہے۔" سمیرا فوراً کھڑی ہوگئی۔ اریب فاطمہ کو دیکھ کر اچانک اس نے احمد حسن سے ملنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ جب سے مرینہ کے ساتھ احمد حسن سے مل کر آئی تھی۔ بے حد' بے چین تھی۔ ابھی تو مرینہ مصروف تھی اور اس اتوار کو تو وہ بالکل نہیں جاسکے گی تو کیوں نہ وہ آج ہی اریب فاطمہ کے ساتھ جاکر اس سے بات کرلے اور اس سے پوچھ لے کہ اگر وہ احمد رضا ہی ہے تو اپنی شناخت کیوں چھپا رہا تھا۔

اور پھر وہ مرینہ کو بتا کر گھر سے نکل آئی تھیں۔ اریب فاطمہ نے سمیرا سے کچھ نہیں پوچھا تھا کہ وہ کہاں جارہی ہے۔ سمیرا نے خود ہی راستے میں اسے بتایا تھا کہ اسے احمد حسن سے ایک ضروری کام کے سلسلے میں ملنا ہے اور وہ ایک بار پہلے بھی مرینہ کے ساتھ آچکی ہے۔ ہر سنڈے کو اس کے گھر کچھ طلبا اور نوجوان اکٹھے ہوتے ہیں۔ جن کے ساتھ وہ ملکی مسائل پر بات کرتا ہے۔ اریب فاطمہ نے کام کی تفصیل نہیں پوچھی تھی۔ کالج میں بھی اکثر لڑکیاں احمد حسن اور اس کے پروگرام کے متعلق باتیں کرتی تھیں۔

"کیا تمہارے بھائی نے اس کے متعلق' میرا مطلب ہے۔ احمد حسن کے متعلق کوئی اور بات بھی کی تھی؟"

سمیرا نے پوچھا تو اریب فاطمہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ اریب فاطمہ کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ بلکہ اپنے عبایا کو پھر سے تہ کررہی تھی۔

"کوئی اور بات؟" اریب فاطمہ نے یاد کرنے کی کوشش کی۔

"سوری سمیرا! مجھے بالکل یاد نہیں آرہا۔ لیکن ہمارے گھر میں احمد حسن کا ذکر دو' تین بار ہوا ضرور۔"

"کبھی اماں سے بات ہو تو پوچھ لینا۔" سمیرا نے بظاہر لاپروائی سے کہا تھا۔ لیکن ایک دم وہ بے حد مضطرب سی نظر آنے لگی تھی اور ایک بار پھر اس نے اپنا عبایا اٹھالیا اور اب اسے تہ کررہی تھی۔ اریب فاطمہ نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ اس سے پوچھنا ہی چاہتی تھی کہ کیا وہ کچھ پریشان ہے کہ دروازہ زور سے کھلا اور مرینہ اندر داخل ہوئی۔

"اللہ کس قدر خوب صورت مہندی لگائی ہے انجی نے۔ میں تمہیں لینے آئی ہوں۔ چلونا! تم دونوں بھی مہندی لگوالو۔" اس نے حسب معمول تیز تیز بولتے ہوئے دونوں کی طرف دیکھا۔

"ہاں! کب واپس آئی ہو تم؟ سمیرا! تمہارا کام ہوگیا؟"

"نہیں۔۔۔" سمیرا نے نفی میں سرہلایا۔

"اور تمہاری شاپنگ؟" سمیرا کے قریب بیٹھتے ہوئے اس نے اریب فاطمہ کی طرف دیکھا۔

"نہیں۔۔۔ ابھی ساری مارکیٹیں نہیں کھلی تھیں۔ کل تو کوئی فنکشن نہیں ہے نا تو کل کرلوں گی شاپنگ۔"

"ٹھیک ہے! تو پھر میں بھی چلوں گی ساتھ۔" مرینہ نے اپنے ہاتھ پر جس پر مہندی لگی ہوئی تھی پھونک ماری۔

"پتا ہے' بابا جان بہت ناراض ہورہے تھے کہ تم دونوں رکشے میں کیوں گئی ہو۔ ابھی یاسین آجاتا۔ میں نے کہہ دیا۔ یہاں قریب ہی جانا تھا۔ تمہارے جانے کے بعد ہی یاسین بھی آگیا تھا اور ایبک اور ہمدان بھائی بھی۔ انکل فلک ابھی ادھر ہی ہیں انکل شیردل کے گھر۔ تم تھوڑا انتظار کرلیتیں تو۔۔۔" بات ادھوری چھوڑ کر وہ بازو پھیلا کر ہاتھ کا جائزہ لینے لگی۔

"اچھی ہے نا؟" اس نے سمیرا کی طرف دیکھا۔

"دوسرے ہاتھ پر راحت آنٹی سے لگواؤں گی۔ وہ بھی بہت خوب صورت مہندی لگاتی ہیں۔ مما بتا رہی تھیں۔ عمارہ پھپھو کی شادی پر انہوں نے ہی پھپھو کو مہندی لگائی تھی۔ ارے ہاں۔۔۔"

اس نے ایک دم اریب فاطمہ کی طرف دیکھا۔

"پھپھو صبح سے دو' تین بار تمہارے متعلق پوچھ چکی ہیں۔"

اریب فاطمہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر فوراً" ہی نظریں جھکالیں۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ایبک آیا ہوا تھا۔ دل ایک دم ہی ایک نظر اسے دیکھنے کو مچلنے لگا تھا۔

"بے وفا لڑکی! وہ سب تو تمہیں اتنا یاد کررہے تھے اور تم رات سے آئی بیٹھی ہو اور ابھی تک پھپھو اور انجی سے ملنے نہیں گئیں۔"

"وہ۔۔۔ بس میں جانے ہی لگی تھی۔ لیکن پھر سمیرا کے ساتھ چلی گئی۔"

"خیر! چلو اٹھو اب۔" مرینہ کھڑی ہوگئی۔

"اور سمیرا! تم بھی چلو نا پلیز۔ مہندی لگوا کر آجانا۔ تمہارے ان نازک نازک ہاتھوں پر مہندی بہت جچے گی۔"

"نہیں! پلیز میرے سر میں درد ہورہا ہے۔ تم لوگ جاؤ۔"

اریب فاطمہ' مرینہ کے ساتھ کمرے سے نکل آئی۔ وہ مسلسل سمیرا کے متعلق سوچ رہی تھی۔

"سمیرا کے ساتھ کچھ مسئلہ ضرور ہے۔ وہ بہت اپ سیٹ لگتی ہے۔ کچھ ہے' جو اسے پریشان کررہا ہے۔ آج رات کے فنکشن کے بعد میں ضرور اس سے پوچھوں گی۔"

اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا اور مرینہ کے ساتھ ملک ہاؤس کی طرف بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

"تو کیا فلک شاہ نہیں جائے گا ہال میں؟ کیا کہہ رہے ہو آپی؟"

عبدالرحمٰن شاہ نے دکھ اور افسوس سے اپنے پاس بیٹھے ایبک کی طرف دیکھا تو ایبک نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا اور ہولے سے تھپتھپایا' جیسے انہیں تسلی دے رہا ہو۔

"یہاں ہوتے ہوئے بھی وہ شادی میں شریک نہیں ہوگا آپی! ایسا کیوں کررہا ہے وہ؟ مصطفیٰ اور عثمان کو دکھ ہوگا۔"

"یہی بہتر ہے بابا جان!" ایبک کا ہاتھ بدستور ان کے بازو پر تھا۔ "مصطفیٰ انکل اور عثمان انکل جانتے ہیں۔ بابا نے ان سے بات کرلی ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ ان کی وجہ سے احسان انکل شادی میں شریک نہ ہوں۔ انہیں صرف بابا کے وہاں موجود ہونے پر اعتراض ہے۔ ہم سے کوئی مسئلہ نہیں ہے انہیں۔ میں' انجی' ماما اور جواد بھائی تو شریک ہوں گے۔"

"کیا شانی نے کہا ہے یہ؟" عبدالرحمٰن شاہ جیسے بات کی تہہ تک پہنچ گئے تھے۔

"جی بابا جان!" ایبک نے آہستگی سے کہا۔ "مصطفیٰ انکل سے ان کی بات ہوئی تھی اور انہوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا ان سے۔ مصطفیٰ انکل بہت پریشان ہیں۔ انہوں نے بابا سے ذکر کیا تھا تو تب ہی بابا نے انہیں بتا دیا تھا کہ وہ ہال میں جانے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ وہ ایزی محسوس نہیں کریں گے وہاں۔"

لمحہ بھر کے لیے وہ خاموش ہو گئے اور سر جھکا لیا۔

"اور عمو؟" کچھ دیر بعد انہوں نے سر اٹھا کر ایبک کی طرف دیکھا۔

"کیا وہ موی کو چھوڑ کر جائے گی؟"

"جی بابا جان! آپ پریشان نہ ہوں۔"

"اور موی؟ کیا وہ اب شادی ختم ہونے تک وہیں رہے گا' شیر دل کے گھر؟ چلو' وہ فنکشن میں شرکت نہ کرے۔ لیکن یہاں گھر میں تو رہے۔ پھر پتا نہیں کب۔۔۔ اس سے کہو آجائے یہاں۔" ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"جی بابا جان! میں کل لے آؤں گا انہیں۔"

ایبک نے انہیں تسلی دی اور تب ہی مرینہ اور اریب فاطمہ نے لاؤنج میں قدم رکھا۔

"السلام علیکم بابا جان۔"

مرینہ نے بلند آواز میں سلام کیا تو ایبک نے رخ موڑ کر اس کی طرف دیکھا اور مرینہ کے ساتھ اریب فاطمہ کو دیکھ کر ایک دم اس کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ وہ بے اختیار کھڑا ہو گیا اور اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

"آپ کب آئیں؟" اریب فاطمہ کی نظریں ایبک کی طرف اٹھیں اور پھر جھک گئیں۔

"کل۔۔۔ رات کو آئی تھی۔"

مرینہ اور عبدالرحمٰن شاہ نے بیک وقت ایبک کے اس طرح غیر ارادی طور پر کھڑے ہو جانے پہ حیرت سے دیکھا' خود ایبک نے بھی اپنی اس بے اختیاری کو محسوس کر کے فوراً" ہی رخ بدل لیا اور عبدالرحمٰن شاہ کو دیکھنے لگا تھا۔

"بابا جان! میں ذرا انجی سے جواد کی فلائٹ کا ٹائم کنفرم کر لوں' پھر آتا ہوں۔" عبدالرحمٰن شاہ نے سر ہلایا۔

وہ تیزی سے لاؤنج سے باہر نکل گیا۔ شعوری کوشش سے اس نے اریب فاطمہ کی طرف دیکھنے سے گریز کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے جذبے عیاں ہو کر اریب فاطمہ کو بے وقار کر دیں۔ مرینہ شاہ نے حیرت سے اسے باہر جاتے دیکھا تھا۔ اسے یاد آیا تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو جب وہ انجی سے مہندی لگوا رہی تھی اور ایبک آیا تھا تو انجی نے بتایا تھا کہ جواد دو بجے پہنچے گا اور یہ کہ ایبک اسے ایئرپورٹ پر یاد سے لینے چلا جائے۔

پھر کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ آگے پھیلایا اور الٹ پلٹ کر دیکھا۔ عبدالرحمٰن شاہ ان کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔

"تم لوگ کھڑی کیوں ہو گئی ہو' آجاؤ نا۔"

"بابا جان! میری مہندی دیکھیں' خوب ہیں نا۔" مرینہ نے بازو ان کے سامنے پھیلایا۔

"ہوں!" عبدالرحمٰن شاہ نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"میں اریب فاطمہ کو بھی لے آئی ہوں' مہندی لگوانے کے لیے۔"

"ہاں بیٹا! یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہوتی ہیں' انہیں انجوائے کرنا چاہیے' ضرور لگواؤ اور اریب بیٹا! وہاں گاؤں میں سب ٹھیک ہے نا۔"

"جی بابا جان!" اریب نے جھکی ہوئی نظریں اٹھائیں۔

"تمہارے ابا تو رکے ہی نہیں' بہت کہا کہ اب آئے ہیں تو شادی میں شرکت کر کے جائیں۔"

عبدالرحمٰن شاہ مسکرائے۔

"ویسے تمہارے ابا بالکل بھی نہیں بدلے' کافی سال پہلے میں نے انہیں مروہ کے سسرال میں دیکھا تھا۔ تب بھی وہ ایسے ہی تھے۔ یوں ہی چاق و چوبند اور صحت مند' شاید یہ گاؤں کی خالص فضا کا اثر ہے۔"

"شاید۔۔۔ لیکن اماں پر گاؤں کی اس خالص فضا کا رتی بھر اثر نہیں ہوا تھا۔"

اس نے سوچا اور ایک لمحہ کے لیے ان کا سراپا اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

دبلی پتلی کمزور سی' چہرے کی رنگت میں زردیاں گھلی رہتیں۔ وہ ابا سے بارہ برس چھوٹی تھیں لیکن انہوں نے بہت جلد بڑھاپا اوڑھ لیا تھا۔ جبکہ ابا کے سرخ و سپید چہرے سے صحت کی سرخی ٹپکتی تھی۔ ان کا

مطمئن اور بے فکر انداز بتاتا تھا کہ وہ زندگی کو پورے اطمینان اور خوشی کے ساتھ گزار رہے ہیں۔

اس نے ایک گہری سانس لے کر مرینہ کی طرف دیکھا جو اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"چلیں۔۔۔ سب ادھر ہال میں ہیں۔"

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ بیٹا! جاؤ۔" عبدالرحمٰن شاہ نے اخبار اٹھا لیا۔

ڈائننگ ہال میں کرسیاں اور ٹیبل ایک طرف دیوار کے ساتھ لگا دی گئی تھیں اور نیچے کارپٹ پر سب بیٹھی تھیں۔ انجی' اسما' عثمان کی بیگم کو مہندی لگا رہی تھی۔ راحت' منیبہ کا ہاتھ تھامے بیٹھی تھیں۔ جبکہ عاشی دونوں ہاتھوں پر مہندی لگائے ادھر سے ادھر ٹہل رہی تھی۔

"اور اب میری باری ہے راحت چچی! دوسرے ہاتھ پر مجھے آپ سے مہندی لگوانی ہے۔" مرینہ نے ہال میں قدم رکھتے ہی بازو بلند کیا۔

"ٹھیک ہے۔" راحت نے مڑ کر اسے دیکھا اور اس کے ساتھ آتی اریب فاطمہ پر ان کی نظر پڑی تو ان کے لبوں سے نکلا۔

"ارے اریب فاطمہ بھی آگئی ہے۔" سب نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

انجی بھی اسما چچی کو مہندی لگانا چھوڑ کر اشتیاق سے اسے دیکھنے لگی تھی۔ "تمہیں میں مہندی لگاؤں گی فاطمہ!"

"نہیں۔۔۔ میں بھلا کیا کروں گی مہندی لگا کر۔"

"ارے یہ سب کیا کریں گی۔ یار ہماری روایت ہے اور مجھے تو بہت پسند ہے ہاتھوں پر مہندی لگانا۔" منیبہ نے اسے گھورا۔

"لیکن میں نے کبھی نہیں لگائی۔ شاید بچپن میں اماں نے ایک' دو بار عید پر زبردستی لگا دی تھی۔"

"اور اب میں لگاؤں گی زبردستی۔" انجی مسکرائی۔ "یہاں ادھر آجاؤ۔ میرے پاس آکر بیٹھو۔"

اریب فاطمہ نے مرینہ کی طرف دیکھا جو حفصہ کے پاس بیٹھ چکی تھی اور اب اس کے کندھے پر ٹھوڑی رکھے آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہی تھی۔ حفصہ کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی۔ مایوں کے زرد کپڑوں میں وہ بے حد پیاری لگ رہی تھی۔

اریب فاطمہ انجی کے پاس آکر بیٹھ گئی تو مرینہ نے حفصہ کے کندھے سے سر اٹھا کر چاروں طرف دیکھا۔

"ایبک بھائی ادھر نہیں آئے کیا؟"

"آئے تھے لیکن وہ عادل کی طرف چلے گئے ہیں۔ وہ سب عادل کے پاس ہی ہیں۔"

"اچھا!" مرینہ کے چہرے پر مایوسی سی نظر آئی۔

"کیا تمہیں ایبک سے کوئی کام تھا۔" منیبہ کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

"وہ تمہاری سہیلی کا مسئلہ۔۔۔ وہ تمہیں ڈسکس کرنا تھا نا' ایبک بھائی سے اور۔۔۔"

مرینہ نے ایک ناراض سی نظر اس پر ڈالی اور حفصہ کی طرف دیکھنے لگی تو حفصہ نے مرینہ کے گرد اپنا بازو حمائل کرتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"تم موی کی بات کا ہرگز برا نہ ماننا رینا۔ آج کل یہ اپنے ڈاکٹر صاحب کے خیالوں میں رہتی ہے۔"

"ہائے کیا وہ ڈاکٹر ہیں؟" اس نے راحت چچی کو مخاطب کیا۔ راحت نے سر ہلایا۔

"کیسے ہیں وہ' کیا رینا آپی کی طرح عینک لگاتے ہیں؟"

راحت نے نفی میں سر ہلایا۔

"تو راحت ماہی! کیا وہ ڈاکٹر شفیق کی طرح گنجے ہیں؟" عاشی کی بات پر سب نے قہقہہ لگایا تھا۔

ڈاکٹر شفیق ان کے فیملی ڈاکٹر تھے اور عاشی ان سے بہت چڑھتی تھی۔ کیونکہ جب کبھی وہ بیمار ہوتی اس کی منت سماجت اور رونے دھونے کے باوجود وہ اسے انجکشن لگا دیتے تھے۔

"اگر نہیں بھی ہیں تو ہو جائیں گے گنجے عاشی گڑیا۔" حفصہ ہنسی۔

"تو پھر میں ان سے بات نہیں کروں گی۔"

اریب فاطمہ بہت دلچسپی سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ جب انجی نے پاس پڑی پلیٹ میں کون رکھی اور ٹشو سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں ذرا ماما کو دیکھ آؤں۔"

"کیا ان کی طبیعت خراب ہے؟" اریب فاطمہ نے پوچھا۔

"نہیں۔ بس کچھ تھکن محسوس کر رہی تھیں۔ اس لیے لیٹ گئیں۔"

"میں بھی چلتی ہوں' ان سے مل لوں۔"

"ہاں چلو... وہ تمہارا صبح بھی پوچھ رہی تھیں۔" وہ دونوں ہال سے باہر نکل کر عمارہ کے کمرے کی طرف بڑھیں۔

"ہم تمہیں بہت مس کر رہے تھے فاطمہ!" اس کے ساتھ ساتھ چلتے انجی نے اس کی طرف دیکھا۔

"پھر پتا نہیں کب آنا ہو یہاں۔ لیکن ہم جلد تمہارے گھر آئیں گے۔ میں اور ماما۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے نا۔ میرا بھائی بہت اچھا ہے۔"

اریب فاطمہ کی نظریں جھک گئی تھیں اور رخساروں پر سرخی دوڑ گئی۔ انجی نے بہت دلچسپی اور محبت سے اسے دیکھا۔

"میرا جی چاہتا ہے ایبک کی شادی جلدی ہو' تاکہ ہم... ماما' بابا اور میں' کسی خوشی کو پوری طرح محسوس کر سکیں۔ پتا ہے اریب... ہم نے جب سے ہوش سنبھالا ہے۔ کبھی کسی خوشی کو بھرپور طرح سے محسوس نہیں کیا۔ ہر خوشی کے موقع پر ماما اور بابا کو بابا جان اور "الریان" یاد آجاتے۔ یوں وہ خوشی آنسوؤں میں ڈوب جاتی۔ چاہے وہ عید کا دن ہو یا ایبک کی اور میری کوئی کامیابی۔ میری شادی پر بھی ماما' بابا کے آنسو نہیں تھمتے تھے۔ ان شاء اللہ اب ایبک کی شادی کو ہم بھرپور طرح سے انجوائے کریں گے۔"

اریب فاطمہ خاموش رہی لیکن اس کی پلکوں کی لرزش اور اس کے لبوں پر بکھری مسکان بتا رہی تھی کہ ایبک کے نام نے کیسے اندر اودھم مچا دیا تھا۔

انجی نے آہستہ سے عمارہ کے کمرے کا دروازہ دھکیلا... اور وہ دونوں اندر آئیں۔ عمارہ سو رہی تھیں۔

"ماما سو گئیں شاید۔" انجی نے اریب فاطمہ کی طرف دیکھا۔

"جگانا نہیں پلیز' پھر مل لوں گی۔"

انجی نے سر ہلاتے ہوئے اشارے سے اسے آگے آنے کو کہا۔

"عمارہ پھپھو جاگ جائیں گی۔ ہم باہر چلتے ہیں۔"

"نہیں..." انجی مسکرائی۔ ماما نہیں جاگیں گی۔ میرا خیال ہے انہوں نے اپنی میڈیسن لے لی ہیں۔ ان میں نیند ہوتی ہے۔ آؤ... آجاؤ نا' کچھ دیر بات کرتے ہیں' پھر مجھے تمہیں کچھ دینا بھی تو ہے۔"

"کیا... کیا دینا ہے؟" اریب فاطمہ نے حیرت سے پوچھا۔

"آؤ تو بتا دیتی ہوں۔" انجی دوسرے بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔ یہ گیسٹ روم تھا اور یہاں دو سنگل بیڈ تھے۔

اریب فاطمہ دبے پاؤں چلتی ہوئی اس کے قریب آکر بیٹھ گئی۔

"اریب فاطمہ!" انجی نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے محبت سے اسے دیکھا۔ "جب ایبک نے تمہارے متعلق بتایا تو مجھے یقین تھا کہ وہ جسے ایبک نے چنا ہے وہ کوئی بہت خاص لڑکی ہوگی اور جب تمہیں دیکھا۔ تم سے ملے تو ماما' بابا سب نے تمہیں بہت پسند کیا۔ بابا نے کہا' ایبک کے لیے ایسی ہی لڑکی ہونا چاہیے تھی۔ میں تم سے بہت ساری باتیں کرنا چاہتی تھی۔ تمہارے بارے میں تم سے جاننا چاہتی تھی۔ لیکن تم بہت جلدی چلی گئیں۔"

"ارے!" وہ ہولے سے ہنسی۔

"میں ایک بہت معمولی سی لڑکی ہوں انجی آپا! مجھ میں کچھ خاص نہیں ہے۔ میں نہیں جانتی ایبک نے مجھے کیوں..." اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی اور نظریں جھکالی تھیں۔

"تم ایبک کی نظروں میں بہت خاص ہو اریب فاطمہ!" انجی نے ہولے سے اس کا ہاتھ دبایا۔

اریب فاطمہ کی آنکھوں میں نمی پھیل گئی۔

"میں بے حد عام سی شکل و صورت کی بے حد عام سی لڑکی ہوں انجی آپا! میرے ابا زمین دار ہیں۔ تھوڑی سی زمین ہے۔ لیکن ہمارا شمار خوش حال لوگوں میں ہوتا ہے۔ میرے دو بڑے بھائی' ابا کے ساتھ ہی کام کرتے ہیں۔ دونوں نے زیادہ نہیں پڑھا۔ چھوٹا شہریار پڑھ رہا ہے۔ وہ ڈاکٹر بننا چاہتا ہے اور وہ ان شاء اللہ بن جائے گا۔ بہت لائق ہے اماں کی طرح۔"

اس نے نظریں اٹھائیں۔ اس کی پلکیں بھیگ رہی تھیں۔

"میرے پاس نہ بہت زیادہ ایجوکیشن ہے' نہ میں بہت خوب صورت ہوں۔ ہو سکتا ہے ابا گریجویشن کے بعد میری تعلیم ختم کر دیں... میں شاید آپ کے بھائی کو ڈیزرو نہیں کرتی۔ ان کے لیے تو کوئی بہت اعلا تعلیم یافتہ..."

"نہیں اریب فاطمہ!" انجی نے اس کی بات کاٹی۔

"تم آبی کو ڈیزرو کرتی ہو یا نہیں' یہ فیصلہ تم کو نہیں آبی کو کرنا تھا اور اس نے کر لیا۔ ہم بہت جلد تمہارے گھر آئیں گے۔ جب تم اجازت دو۔"

اس نے ایک بار پھر اس کا ہاتھ ہولے سے دبا کر چھوڑ دیا اور کھڑی ہو گئی۔ اریب فاطمہ نے دائیں ہاتھ کی پشت سے اپنی بھیگی پلکیں پونچھیں۔ انجی اس کی طرف پشت کیے وارڈ روب سے کچھ نکال رہی تھی۔ پھر وہ ایک شاپنگ بیگ نکال کر مڑی اور اریب کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

"تم بہت پیاری ہو' لیکن تمہیں اپنی خوب صورتی کا ادراک نہیں ہے۔ تمہاری آنکھیں اتنی سحر انگیز ہیں کہ بندہ ان کے سحر میں ڈوب جاتا ہے۔ تم نہیں جانتیں' تم بہت انمول ہو ہم سب کے لیے۔"

"انجی آپا آپ بھی..." اریب فاطمہ شرمائی۔

"اپنے بھائی کی طرح باتیں کرتی ہیں۔"

"اچھا...!" انجی اس کے قریب بیٹھ گئی اور ہاتھ میں پکڑا بیگ گود میں رکھ لیا۔

"سچ بتاؤ' کیا آبی نے بھی تم سے ایسا ہی کہا۔"

اریب فاطمہ کی نظریں جھک گئیں۔ پلکیں لرزنے لگیں اور لبوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ آکر ٹھہر گئی۔

"خیر' اگر نہیں بھی کہا تو اسے آبی کی طرف سے ہی سمجھ لو۔" انجی ہولے سے ہنسی۔

"اور یہ بتاؤ آج رات کیا پہن رہی ہو۔"

"کچھ بھی پہن لوں گی۔ میرے پاس دو' تین بہت پیارے ڈریسز پڑے ہیں۔ مروہ آنٹی نے جانے سے پہلے دلوائے تھے۔ بارات اور ولیمہ کے لیے تو ثنا آنٹی نے منیبہ اور مریبہ جیسے ہی بنوائے ہیں تقریباً" بابا جان نے کہا تھا انہیں... اور مہندی کا میں نے خود ہی منع کر دیا۔ شیور نہیں تھا نا کہ میں مہندی میں آ بھی پاؤں گی یا نہیں۔"

اس نے تفصیل سے بتایا تو انجی نے شاپنگ بیگ میں سے پنک اور فیروزی امتزاج کا سوٹ باہر نکالا۔

"دیکھو یہ کیسا ہے۔"

"بہت پیارا' بہت خوب صورت' آپ یہ پہن رہی ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں... یہ تم پہنو گی اریب فاطمہ!" انجی سوٹ تہہ کر کے بیگ میں رکھ رہی تھی۔

"میں...!" اریب فاطمہ نے حیرت سے اپنی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں تم... میں ایبک کے ساتھ شاپنگ کے لیے گئی تھی۔ ایبک نے یہ تمہارے لیے خریدا ہے۔"

"لیکن..." اس نے متذبذب نظروں سے انجی کی طرف دیکھا۔

"انکار مت کرنا بیٹا! دونوں بہن' بھائیوں نے بہت شوق سے تمہارے لیے خریدا ہے۔"

انجی اور اریب فاطمہ نے چونک کر سامنے دیکھا۔ عمارہ آنکھیں کھولے مسکرا رہی تھیں۔

"ارے ماما! آپ جاگ گئیں۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔" انجی اٹھ کر ان کے قریب آئی۔

"ہاں... میں بالکل ٹھیک ہوں۔" عمارہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

"سوری پھپھو! ہم نے آپ کو ڈسٹرب کر دیا۔"
بالکل بھی نہیں، مجھے اب جاگنا ہی تھا۔ بہت دیر سے سو رہی تھی۔ ادھر آؤ اریب فاطمہ! میرے پاس آ کر بیٹھو۔ وہاں تمہارے گھر میں سب ٹھیک تھے نا؟"

"جی!" اریب فاطمہ اٹھ کر ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ عمارہ نے اسے اپنے ساتھ لگا کر اس کی پیشانی چومی۔

"میں روز مونی سے پوچھتی تھی کہ تم کب آؤ گی۔"

"آپ باتیں کریں۔ میں ذرا ہال کا چکر لگا کر آتی ہوں۔" ابھی کھڑی ہو گئی۔

عمارہ نے سر ہلایا اور اریب فاطمہ کی طرف متوجہ ہو گئیں۔



رابیل نے تنقیدی نظروں سے خود کو آخری بار آئینے میں دیکھا۔ بلاشبہ وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ شاید "الریان" کی ساری لڑکیوں سے زیادہ خوب صورت۔ ابھی کچھ دیر پہلے مائرہ نے یہ بات کہی تھی۔

"آج تو ہر نظر میری بیٹی کی طرف اٹھے گی۔ اللہ تمہیں نظر بد سے بچائے۔"

"آج کا دن میرا ہے۔" اس نے دل میں سوچا۔ "ماما صحیح کہتی ہیں۔" آج سے پہلے وہ خود کو بھی اتنی خوب صورت نہیں لگی تھی۔

اس نے ڈریسنگ ٹیبل سے پرفیوم نکال کر خود پر چھڑکا اور پھر بیڈ پر پڑا دوپٹا اٹھا کر اسٹائل سے کندھے پر ڈالتے ہوئے اس نے پھر ڈریسنگ ٹیبل آئینے میں خود کو دیکھا اور دروازہ بند کر کے لاؤنج میں آ گئی۔

پھر دوسری یا تیسری سیڑھی پر قدم رکھتے ہی اس کی نظر نیچے ٹی وی لاؤنج میں موجود ایبک پر پڑی تھی۔ کرتا شلوار میں ملبوس وہ بہت جچ رہا تھا۔ شاید وہ ابھی ابھی اندر آیا تھا۔ رابیل وہیں سیڑھی پر رک کر اسے دیکھنے لگی۔ اگر اس کے دل نے ایبک کو پسند کر لیا تھا تو یہ کچھ غلط بھی تو نہیں تھا۔ وہ ایسا تھا کہ اسے پسند کیا جائے اور وہ لڑکی کتنی خوش نصیب ہو گی جسے ایبک فلک شاہ کی رفاقت ملے گی اور وہ خوش نصیب لڑکی بھلا میرے علاوہ اور کون ہو سکتی ہے۔

"میں رابیل احسان شاہ۔ میں نے آج تک تمہیں اگنور کیا ایبک فلک شاہ، لیکن اب اگنور نہیں کروں گی۔"

اس نے ریلنگ پر ہاتھ رکھا۔ ایبک نے یکدم رخ بدلا تھا۔ اب وہ اس طرح کھڑا تھا کہ رابیل اس کی بائیں سائیڈ دیکھ رہی تھی۔ وہ غالباً کسی کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ کون تھا۔ اس نے اگلی سیڑھی پر قدم رکھا اور پھر ٹھٹک کر وہیں رک گئی۔

وہ اریب فاطمہ تھی، جو ہولے ہولے قدم اٹھاتی ایبک کی طرف آ رہی تھی۔ ایبک بے اختیار ایک قدم آگے بڑھا تھا۔

"اریب فاطمہ!" رابیل کے کانوں میں ایبک کی مدھم سی آواز آئی تھی۔

رابیل نے ریلنگ کو مضبوطی سے تھاما۔ اب وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ اریب فاطمہ کی نظریں جھکی تھیں اور ایبک گردوپیش سے بے خبر اسے دیکھ رہا تھا۔

"تو کیا ایبک اور اریب فاطمہ؟" اس نے ڈوبتے دل سے سوچا۔

"نہیں بھلا اریب فاطمہ میں ایسا کیا ہے کہ ایبک فلک شاہ اس کے سامنے دل ہار جائے۔ دیہاتی ماحول کی پروردہ لڑکی جسے مروہ پھپھو نے ازراہ ہمدردی اپنے گھر میں رکھا ہوا تھا اور اب تعلیم مکمل کرنے کے لیے یہاں "الریان" میں چھوڑ گئی ہیں۔"

اس نے خود ہی اپنے خیال کی نفی کی اور اس کا ڈوبا ڈوبا دل تیرنے لگا۔ اس نے ذرا سا جھک کر دیکھا وہ دونوں ابھی تک ایسے ہی کھڑے تھے۔ شاید ایبک اس سے کچھ کہہ رہا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ حفصہ وغیرہ یا عمارہ پھپھو کے متعلق پوچھ رہا ہو۔ اس نے اندازہ لگایا اور قدم نچلی سیڑھی پر رکھا۔ یہاں سے اریب فاطمہ کا چہرہ بہت واضح نظر آ رہا تھا۔ اس کی اٹھتی گرتی پلکوں کا نظارہ واقعی مبہوت کر دینے والا تھا۔ وہ بے حد خوب صورت لگ رہی تھی۔ چھت پر لگے فانوس کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی اور اس کے لبوں پر شرمیلی سی مسکان منجمد تھی۔ "شاید شاید ایبک نے اس سے کوئی بے حد خوب صورت بات کہی ہے۔"

عین اسی لمحے اریب فاطمہ جھکی تھی۔ شاید اس کے ہاتھ سے کچھ نیچے گرا تھا، جسے وہ اٹھانا چاہتی تھی۔ اس کے ریشمی بال ایک دم ہی اس کے کندھوں پر پھسل آئے تھے اور انہوں نے اس کے چہرے کو بھی چھپا لیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے بال پیچھے کرنے لگی تھی اور ایبک نے زمین پر گرنے والی چیز اٹھا کر اسے دے دی۔ شاید ٹشو رومال یا کچھ اور۔ اس کے بالوں نے ابھی تک اس کے دائیں کندھے اور دائیں رخسار کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کے بال بے حد لمبے اور گھنے تھے۔ کمر سے نیچے تک آتے تھے اور آج شاید اس نے اپنے بالوں کو کھلا چھوڑ رکھا تھا۔

کسی نامعلوم احساس نے اس کی آنکھوں میں نمی پھیلا دی۔ آنسوؤں سے آنکھوں کے آگے دھند سی چھا گئی تھی۔ دھندلی آنکھوں سے اس نے دیکھا، ایبک نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تھا اور بہت نرمی اور آہستگی سے اس کے رخسار پر بکھرے بالوں کو چھوا تھا۔ وہ ریلنگ کو مضبوطی سے تھامے کھڑی تھی۔ اسے لگا جیسے اس کی ٹانگوں میں جان ہی نہیں ہے۔ ایبک اس کے بال پیچھے ہٹا رہا تھا۔ وہ ساکت کھڑی تھی کسی پتھر کے مجسمے کی طرح۔ اسی وقت اوپر لاؤنج سے عاشی کی آواز آئی تھی۔

"ہمدان بھائی! میں نیچے جا رہی ہوں۔ رابی آپی اپنے کمرے میں نہیں ہیں۔" کوشش کے باوجود وہ گردن موڑ کر پیچھے نہ دیکھ سکی۔

ایبک اب صوفے پر بیٹھ چکا تھا اور اریب فاطمہ مرینہ کے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ اس نے ریلنگ کو اتنی مضبوطی سے تھام رکھا تھا جیسے ذرا سی بھی اس کی گرفت کمزور ہوئی تو وہ گر جائے گی۔

عاشی رابیل کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

"رابی آپی! آپ اس طرح کیوں کھڑی ہیں۔" اس نے رابیل کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

"دیکھیں! میں کیسی لگ رہی ہوں۔ ویسے آپ بھی اچھی لگ رہی ہیں۔"

اس نے جھک کر نیچے دیکھا اور اس کی نظر مرینہ کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جاتی اریب فاطمہ پر پڑی تو کسی خیال سے اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"رابی آپی!" اس کا انداز سرگوشی کا سا تھا۔

"یہ فاطمہ آپی کا ڈریس دیکھا آپ نے۔ یہ وہی ڈریس ہے، جو ایبک بھائی اپنی دوست کو گفٹ دینے کے لیے لائے تھے۔"

اس نے آنکھیں پٹپٹائیں۔ "پھر اریب فاطمہ ہی ایبک بھائی کی دوست ہوئیں نا۔ مجھے لگتا ہے ایبک بھائی فاطمہ آپی سے ہی شادی کریں گے۔ ہیں نا۔"

وہ اپنی عمر سے زیادہ ذہین تھی۔ رابیل نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا جیسے وہ عاشی کی بات سمجھ ہی نہ پائی ہو۔ عاشی نے سمجھا شاید اسے اس کی بات پر یقین نہیں آیا۔

"یہ بات پورے "الریان" میں صرف مجھے پتا ہے کہ ایبک بھائی کس سے شادی کرنے والے ہیں۔ میں ایبک بھائی سے پوچھتی ہوں۔"

وہ زور سے ہنسی اور تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگی۔ رابیل نے اسے سیڑھیوں سے اترتے اور ایبک کے پاس جاتے دیکھا۔ ایبک مسکرا رہا تھا اور وہ ہنستے ہوئے نفی میں سر ہلا رہی تھی۔ اس نے ریلنگ سے ہاتھ اٹھایا اور تیزی سے واپس مڑی اور جیسے ہی اس نے لاؤنج میں قدم رکھا، عمر اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر لاؤنج میں آیا۔

"واؤ۔" اس نے رابیل کو دیکھ کر حیرت انگیز آواز نکالی۔ "یہ آپ ہی ہیں نا رابیل آپی!"

وہ اس کے قریب آ کر اسے نہ پہچاننے کی ایکٹنگ کرنے لگا۔ "میں نے سمجھا شاید آسمان سے کوئی اپسرا اتر آئی ہے یا پرستان سے کوئی پری آ گئی ہے۔"

وہ عمر کی بات کا جواب دیے بغیر تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی اور اپنے پیچھے دروازہ زور سے بند کیا۔ عمر نے کندھے اچکائے اور زبیر کو جلدی نیچے آنے کا کہتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

رابیل اندر بیڈ پر اوندھی لیٹی رو رہی تھی۔ ابھی تو اس کے دل میں محبت کی کونپل پھوٹی تھی۔ نئی نویلی کونپل کھلنے سے پہلے ہی۔۔۔

وہ تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔

وہ ایبک فلک شاہ کو پسند نہیں کرتی تھی۔ کیونکہ ماما اسے پسند نہیں کرتی تھیں۔

وہ ایبک فلک شاہ کے ”الریان“ آنے پر چڑتی تھی کیونکہ ماما کو اس کا ’الریان‘ آنا برا لگتا تھا۔ عمر اس کی تعریف کرتا تو اسے غصہ آتا تھا۔ شاید وہ ایبک فلک شاہ سے نفرت کرتی تھی کیونکہ ماما کو اس سے نفرت تھی۔

لیکن پھر یہ نفرت کی زمین سے محبت کہاں پھوٹ پڑی تھی وہ نہیں جانتی تھی۔ وہ بالکل بھی نہیں جانتی تھی کہ نفرتوں کے تھوہر پر محبتوں کے گلاب کیسے اگ آئے تھے، لیکن اس کے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا تھا اور وہ ایبک فلک شاہ سے محبت کرنے لگی تھی۔ اس کے ساتھ کی تمنا کرنے لگی تھی حالانکہ اس کی ایبک سے کبھی بہت زیادہ بات نہیں ہوئی تھی۔ پھر بھی پھر بھی۔

وہ بلک بلک کر رو رہی تھی اور تکیے پر مٹھیاں مار رہی تھی۔

”کیوں ہوا ایسا؟

کیوں ایبک نے اریب فاطمہ کو اپنے لیے پسند کیا؟

کیا وہ رابیل احسان شاہ سے زیادہ خوب صورت ہے؟

نہیں وہ تو اس کے سامنے بالکل معمولی سی ہے۔

پھر ایبک فلک شاہ کو میں کیوں نظر نہیں آئی؟

رابیل احسان شاہ جو ”الریان“ کی ساری لڑکیوں سے زیادہ خوب صورت زیادہ طرح دار ہے۔“

اس نے بیڈ کی پٹی پر مکا مارا۔ اب وہ ایک بار پھر رو رہی تھی۔ پہلی پہلی محبت کی ناقدری اسے تڑپا رہی تھی۔

نیچے شور تھا۔ شاید سب تیار ہو کر لاؤنج میں اکٹھے ہو گئے تھے لیکن وہ رو رہی تھی۔ پتا نہیں کتنی دیر ایسے ہی گزر گئی تھی جب کمرے کا دروازہ کھلا اور مائرہ نے اندر قدم رکھا اور اسے روتے دیکھ کر تیزی سے آگے بڑھیں۔

”رابی۔ رابی بیٹا کیا ہوا۔“

اس نے سر اٹھا کر مائرہ کو دیکھا۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سوج چکی تھیں۔ رخساروں پر اب بھی آنسو ٹھہرے ہوئے تھے۔ مائرہ نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

”ماما!“ رابیل نے مائرہ کی طرف دیکھا۔ اس کا جی چاہا وہ شکوہ کرے کہ یہ سب ان کی وجہ سے ہوا ہے۔ انہوں نے اسے ایبک سے دور رکھا۔ ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ ایبک کے سامنے ہوتی اور ایبک اسے نہ دیکھتا۔

”میری جان بولو نا۔۔۔ میرا دل گھبرانے لگا ہے۔“ مائرہ نے اس کے گیلے رخساروں کو اپنے ہاتھوں سے پونچھا۔ ”سب نیچے بار بار تمہارا ہی پوچھ رہے تھے۔ میں نے کہا۔ وہ تو تیار ہے۔ آ ہی رہی ہو گی۔ ابھی تمہارے بابا جان کا پیغام ملا کہ سب بچیاں آئیں ملک ہاؤس۔ تم نہیں پہنچیں تو میں خود دیکھنے آ گئی۔ سب لوگ نکل رہے ہیں اور تم نے کیا حلیہ بنا لیا ہے اپنا؟ آخر کیا ہوا ہے عمر کہہ رہا تھا تمہارا مزاج خراب ہے کیا کسی نے کچھ کہا ہے۔“ مائرہ نے لمبی بات کی۔

”کسی نے کچھ نہیں کہا۔ بس میرے سر میں اچانک درد اٹھا۔ میں نیچے ہی جا رہی تھی تو بہت شدید درد اٹھا برداشت سے باہر۔ میں واپس کمرے میں آ گئی۔“ وہ نظریں جھکائے سوچ سوچ کر کہہ رہی تھی۔

”تو۔“ مائرہ پریشان ہو گئی۔ ”میں تمہارے پاپا سے کہتی ہوں۔ پہلے ڈاکٹر کی طرف چلتے ہیں۔“

”نہیں ماما! آپ لوگ جائیں اب درد نہیں ہے۔ میں آرام کروں گی۔“

”لیکن پہلے تو کبھی اس طرح درد نہیں ہوا تمہیں؟“ مائرہ نے پریشانی سے اسے دیکھا۔ ”یہ اچانک

درد۔“

”اگر پہلے کبھی درد نہیں ہوا تو ضروری تو نہیں کہ کبھی زندگی بھر نہیں ہو گا۔ شاید رات کو بہت دیر تک جاگتی رہی تھی اس لیے۔“

مائرہ بغور اسے دیکھ رہی تھیں۔ ”لگتا ہے میری بیٹی کو نظر لگ گئی ہے۔“ مائرہ نے اس کے ستے ہوئے چہرے کو دیکھا۔

”تم لیٹ جاؤ رابی! میں بابا جان سے کہتی ہوں وہ تمہیں نظر کا دم کر دیں۔“

”ماما! کوئی نظر نہیں لگی مجھے۔ کسی نے مجھے دیکھا ہی نہیں سوائے آپ کے۔“

”اپنوں کی نظر بھی لگ جاتی ہے۔ میں دیکھتی ہوں بابا جان چلے تو نہیں گئے۔“

”ماما پلیز! اس وقت کسی کو ڈسٹرب نہ کریں اور آپ جائیں۔ میں نہیں جاؤں گی۔“

”لیکن بعد میں تمہاری طبیعت خراب ہو گئی تو۔ میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ تمہارے پاپا کو بتا کر آئی ہوں۔“ رابیل تنہا رہنا چاہتی تھی۔ ابھی دل پر بہت بوجھ تھا۔ وہ رونا چاہتی تھی چیخ چیخ کر۔ اپنی اس نومولود محبت پر۔ جس نے صرف اس کے دل میں جنم لیا تھا۔ ”فار گاڈ سیک ماما۔۔۔ میں سونا چاہتی ہوں۔ ہم دونوں فنکشن میں شریک نہ ہوئے تو سب ناراض ہوں گے۔“

”مجھے کسی کی ناراضی کی پروا نہیں ہے۔ میری بیٹی۔“

”آپ کی بیٹی کوئی مر نہیں رہی ہے آپ جائیں۔“ رابیل نے تلخی سے مائرہ کی بات کاٹی تب ہی دروازہ زور سے کھلا اور منیبہ کا چہرہ نظر آیا۔ اس کی سانس پھول رہی تھی۔ شاید وہ دوڑتی ہوئی آئی تھی۔

”مائرہ چچی سب گاڑیاں نکل گئی ہیں۔ احسان انکل نیچے انتظار کر رہے ہیں اور ناراض ہو رہے ہیں۔ جلدی کریں۔“ اس نے رابیل کی طرف دیکھا۔

”کیا ہوا تمہیں رابی! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔“ وہ پریشان ہو گئی تھی۔

”ہاں سر درد تھا اب ٹھیک ہوں۔“

”مونی۔۔۔ منیبہ!“ نیچے سے کسی نے منیبہ کو آواز دی تھی۔

”تم جاؤ مونی! ہم آ رہے ہیں۔“

”ٹھیک ہے جلدی آنا۔“ منیبہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

”ماما آپ بھی جائیں پلیز۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔ سو کر اٹھوں گی تو فریش رہوں گی۔“

”ٹھیک ہے۔“ مائرہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”لیکن تمہارے پاپا پریشان ہو جائیں گے تمہارے اس طرح گھر رہنے پر۔ اگر تم کچھ بہتر محسوس کر رہی ہو تو ہم کچھ دیر رک جاتے ہیں۔ تم منہ ہاتھ دھو کر میک اپ کر لو۔“

”ماما! میرا موڈ نہیں ہے اب جانے کا۔ میں صرف سونا چاہتی ہوں۔ پاپا ہارن دے رہے ہیں پلیز۔“

”اچھا ٹھیک ہے لیکن مجھے تمہاری فکر رہے گی میں پھر رسم کے بعد جلدی آ جاؤں گی۔“ رابیل نے کچھ نہیں کہا وہ لیٹ گئی تھی۔ مائرہ نے ایک نظر اسے دیکھا۔

”اگر کوئی مسئلہ ہو تو تمہارے پاپا کے پاس فون ہے انہیں فون کر دینا۔ نیچے سب ملازم بھی ہیں۔“

پھر ایک دم کسی خیال سے ان کی آنکھیں چمکیں۔

”پھر بھی دل گھبرائے تو ”ملک ہاؤس“ میں موی ہو گا نا وہ تو ہال میں نہیں جا رہا۔ ادھر چلی جانا۔“

رابیل جانتی تھی کہ فلک شاہ کرنل شیر دل کے گھر گئے ہوئے ہیں اور اب شادی تک انہیں ادھر ہی رہنا ہے، لیکن اس نے مائرہ سے کچھ نہیں کہا۔ اس کا بات کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا، پھر سے بہت سارے آنسو اس کے اندر اکٹھے ہو رہے تھے۔ وہ رونا چاہتی تھی۔

زندگی میں اس نے جو چاہا تھا اسے ملا تھا۔ بچپن سے لے کر اب تک اس کی ہر خواہش پوری ہوئی تھی۔ لیکن اب دل نے ایبک فلک شاہ کی خواہش کی تھی اور ایبک شاہ اس سے پہلے ہی کسی اور کا ہو چکا تھا۔

اس کے آنسو بہت آہستگی سے اس کے رخسار پر سے پھسلتے ہوئے تکیے میں جذب ہو رہے تھے۔

"ایبک فلک شاہ نے اریب فاطمہ کو چنا اس لیے کہ میں اس کے سامنے نہ تھی۔ وہ جب جب آیا میں نے اسے اگنور کیا۔ اگر میں اسے یوں اگنور نہ کرتی تو وہ کبھی بھی اریب فاطمہ کی طرف متوجہ نہ ہوتا۔"

دلِ خوش فہم نے زخموں پر مرہم رکھا تو وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"اب بھی اگر میں اسے توجہ دوں۔ تو کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ مجھ سے... اور یہ ناممکن تو نہیں ہے۔ اگر وہ اریب فاطمہ کا اور میرا مقابلہ کرے تو ہر لحاظ سے میرا ہی پلڑا بھاری رہے گا۔"

اس کے آنسو خشک ہو گئے تھے۔ پتا نہیں کہاں سے پڑھا ہوا نپولین کا جملہ اسے یاد آ گیا تھا۔

If you have a leaver
use the right
point and time you can
lift the world

"اور یہ تو اب مجھ پر ہے کہ میں کیسے اپنی محبت حاصل کرتی ہوں۔"

وہ اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہو کر اپنا جائزہ لینے لگی۔ روئی روئی آنکھیں دہکتے رخسار... وہ اس وقت بھی قیامت لگ رہی تھی۔ اریب فاطمہ اس کے سامنے تھی ہی کیا۔ گندمی رنگت کی عام سی شکل و صورت کی لڑکی۔ اپنی آنکھوں کی وجہ سے اٹریکٹو لگتی تھی بس۔ اس نے ہاتھ پھیلا کر اپنے مومی ہاتھوں کو دیکھا۔ سرخ سفید رنگت، تیکھے نقوش، دلکش سراپا۔

اصل چیز تو Right Point Right time تھا۔

اور وہ یہ کر سکتی تھی۔

بارات پر وہ مشہور پارلر سے تیار ہو کر جائے گی تو پھر اس کے سامنے کون ٹک سکے گا۔ اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ ڈریسنگ ٹیبل کے پاس سے ہٹ گئی۔

بہت زیادہ رونے سے سچ مچ اس کے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ اس نے بیڈ سائیڈ ٹیبل کی دراز کھولی اور گولی نکال کر پانی سے نگلی اور بیڈ پر لیٹ گئی تھوڑی دیر سونے سے فریش ہو جاؤں گی جب تک یہ لوگ واپس آئیں گے میں جاگ چکی ہوں گی اور آج میں ادھر ہی رہوں گی۔ حفصہ، انجی اور منیبہ کے ساتھ انجی سے اور عمارہ پھپھو سے خوب گپ شپ لگاؤں گی اور ایبک... کیا پتا وہ وہاں ہو یا کرنل شیر دل کی طرف اپنے بابا کے پاس۔

اور پھر نہ جانے کب ایبک کو سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی دوبارہ جب اس کی آنکھ کھلی تو بارہ بج رہے تھے نیچے خاموشی تھی۔ شاید ابھی تک وہ لوگ واپس نہیں آئے تھے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سر ابھی تک بھاری ہو رہا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے اس نے سوچا۔ پھر سو جائے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ اٹھ کر واش روم کی طرف جا رہی تھی۔ ٹھنڈے پانی سے اچھی طرح منہ دھو کر اس نے نیند بھگانے کی کوشش کی اور پھر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر بالوں میں برش کرنے لگی۔ تب ہی دروازہ زور سے کھلا اور مائزہ بوکھلائی ہوئی سی اندر داخل ہوئیں۔

"تم ٹھیک ہو... ٹھیک ہو نا رابی، تمہیں کچھ ہوا تو نہیں، کچھ کہا تو نہیں کسی نے۔"

"میں ٹھیک ہوں ماما!" رابیل برش ڈریسنگ پر رکھ کر مڑی۔ "اور مجھے کیا ہونا تھا۔ کسی نے کیا کہنا تھا مجھے۔"

"او تھینک گاڈ... شکر ہے میں پہنچ گئی۔ اگر ذرا سی بھی لیٹ ہو جاتی تو پتا نہیں کیا ہو جاتا۔"

"کیا ہو جاتا ماما؟" رابیل نے حیرت سے اسے دیکھا۔ تب ہی سیڑھیوں پر قدموں کی آہٹ سنائی دی اور دروازہ کھول کر احسان شاہ اندر داخل ہوئے۔ ان کی پہلی نظر مائزہ پر پڑی تھی۔

"تم!" انہوں نے مائزہ کو مخاطب کیا، جو مڑ کر احسان شاہ کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ "تم کس کے ساتھ آئی ہو۔ میں نے تمہیں کہا بھی تھا کہ میں مصطفیٰ بھائی کو بتا کر آتا ہوں تو تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

"میں مسز صدیق کے ساتھ آئی ہوں۔ وہ کھانا کھا چکی تھیں اور گھر آ رہی تھیں۔ میرا دل یکدم بہت گھبرانے لگا تھا۔ میں نے سوچا کہیں رابیل کی طبیعت خراب نہ ہو گئی ہو زیادہ... اور آپ نے تو ابھی کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ مسز صدیق اسی بلاک میں تو رہتی ہیں۔"

"کم از کم تم مجھے بتا کر تو آتیں۔ میں..."

"شکر ہے میں آ گئی احسان شاہ! ورنہ پتا نہیں کیا ہو جاتا۔" مائزہ نے احسان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

"کیا ہو جاتا؟" احسان شاہ گھبرائے۔

"میں آئی تو اندرونی دروازہ کھلا تھا۔ اندر سے بند نہیں تھا۔ گیٹ پر خان تھا۔ شاید ملازم لڑکی دروازہ کھول کر باہر گئی ہو اپنے کوارٹر میں کسی کام سے۔" انہوں نے ذرا توقف سے کہا۔

"حالانکہ ثنا بھابھی نے اسے تاکید کی تھی کہ وہ ان کے آنے تک ادھر ہی رہے۔ ٹی وی دیکھتی رہے یا لاؤنج میں ہی سو جائے نیند آئے تو..."

"تو آخر ہوا کیا؟"

"میں نے اسے دیکھا۔ وہ اوپر چڑھ رہا تھا سیڑھیوں پر۔ دروازہ کھلنے پر اس نے مڑ کر مجھے دیکھا اور پھر ایک دم پلٹا اور تیزی سے سیڑھیاں اتر کر دوڑتا ہوا میرے پاس سے گزر کر دروازہ کھول کر لان کی طرف بھاگ گیا۔"

"کون تھا وہ... تم نے خان کو آواز کیوں نہ دی؟"

"وہ مومی تھا، احسان شاہ! مومی... لان میں سے ملک ہاؤس میں چلا گیا۔" مائزہ نے احسان شاہ کا بازو جھنجھوڑا۔

"ماما! کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ وہ بھلا یہاں کیسے آ سکتے ہیں۔"

"کیوں نہیں آ سکتا وہ یہاں۔ مجھ سے انتقام لینا چاہتا تھا وہ اور جب دل میں انتقام کی آگ لگی ہو تو کچھ نہیں دیتا۔ عقل رخصت ہو جاتی ہے۔ بھول گیا ہو گا کہ "الریان" میں قدم رکھے گا تو عمارہ کو طلاق ہو جائے گی۔ ملازموں سے پتا چلا گیا ہو گا اسے کہ رابی اکیلی ہے گھر میں۔ وہ میری بیٹی کو برباد کرنا چاہتا تھا۔ احسان! میری بیٹی کو..."

احسان شاہ دل پر ہاتھ رکھے خالی خالی آنکھوں سے مائزہ کو دیکھ رہے تھے۔ مائزہ جو کچھ کہہ رہی تھیں وہ ناقابلِ یقین تھا۔

فلک شاہ ایسا ہو سکتا ہے اس عمر میں وہ ایسی بات... جبکہ اس کی اپنی بیٹی بھی ہے اور جبکہ عمارہ...

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو گی مائزہ!"

"غلط فہمی!" مائزہ چیخیں۔ "آپ کیا سمجھتے ہیں۔ میں پاگل ہوں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ میں جھوٹ بولوں گی بھلا؟ ابھی بابا جان کو فون کریں۔ انہیں بتائیں سب... وہ جو ملک ہاؤس کو عمارہ کے لیے "الریان" بنا رہے تھے تو "الریان" کے دروازے کھل گئے۔ عمارہ کے لیے... نکالیں مومی کو دھکے دے کر اور..."

"ماما!" رابیل ایک قدم آگے بڑھ کر ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ احسان شاہ نے دل پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔

"آپ نے کہا انکل فلک شاہ یہاں آئے تھے۔ آپ نے انہیں بھاگ کر جاتے دیکھا؟"

"ہاں دیکھا... دیکھا میں نے۔" وہ اسی طرح بلند آواز میں چیخی تھیں۔

"مجھے نہیں پتا۔ آپ کیوں جھوٹ بول رہی ہیں۔ لیکن انکل فلک شاہ کرنل شیر دل کے گھر میں ہیں کئی دن سے اور اگر وہ یہاں ہوتے تب بھی تو وہ نہیں آ سکتے تھے یہاں۔ اس لیے نہیں کہ ان کے آنے سے عمارہ پھپھو کو طلاق ہو جاتی، بلکہ اس لیے کہ وہ... وہ تو اپنے قدموں پر کھڑے بھی نہیں ہو سکتے۔ وہ تو بہت سالوں سے وہیل چیئر پر ہیں۔ ایک قدم بھی وہ نہیں چل سکتے وہ..."

"کیا کہہ رہی ہو تم مومی... وہیل چیئر پر؟" احسان کے لبوں سے نکلا تھا۔

"جی بابا! کئی سال پہلے ان کی ٹانگیں کسی حادثے میں کچلی گئی تھیں شاید۔ تفصیل مجھے معلوم نہیں۔"

مائرہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی رابیل کو اور کبھی احسان شاہ کو دیکھ رہی تھیں۔ کچھ غلط ہو گیا تھا' نہیں بلکہ بہت کچھ غلط ہو گیا تھا۔ بازی الٹ گئی تھی۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ انہیں پہلے پتا کیوں نہیں چلا کہ موی.... لیکن کیسے پتا چلتا گھر کا کوئی فرد بھی ان کے اور احسان شاہ کے سامنے فلک شاہ کا ذکر نہیں کرتا تھا۔ وہ کہاں پسند کرتے تھے کہ کوئی ان کے سامنے ان کا ذکر کرے۔

ہال میں بابا جان کے ساتھ عمارہ' ایبک اور انجی کو دیکھ کر اس کا خون کھول رہا تھا۔ اگر موی بھی وہاں ہوتا تو وہ برداشت ہی نہ کر پاتیں اور بابا جان مصطفیٰ' مرتضیٰ' احسان اور عثمان کو ساتھ کھڑے دیکھ کر کہہ رہے تھے۔

"اللہ پر یقین رکھو! بیٹا ایک دن موی بھی ان کے ساتھ ہو گا۔ شانی کا دل ضرور صاف ہو گا۔"

"کبھی نہیں میری زندگی میں نہیں بابا جان.... ایسا کبھی نہیں ہو گا۔" انہوں نے سوچا تھا۔ لیکن جب وہ الریان میں داخل ہوئی تھیں تو پہلے سے ان کے ذہن میں کچھ نہیں تھا۔ وہ صرف رابیل کے خیال سے ہی مسز صدیق کے ساتھ آ گئی تھیں۔

انہوں نے "الریان" میں داخل ہونے کے بعد ملازم لڑکی شمی کو اندرونی گیٹ سے باہر آتے اور اپنے کوارٹر کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ عموماً" سب ملازم آنے جانے کے لیے کچن کا پچھلا دروازہ ہی استعمال کرتے تھے لیکن اس وقت وہ شاید "الریان" کی سجاوٹ دیکھنے کے خیال سے اندرونی گیٹ سے نکلی تھی۔ الریان میں آج خوب صورت لائٹنگ کی گئی تھی۔ ابھی انہوں نے لونگ روم میں قدم رکھا ہی تھا کہ باہر گیٹ پر احسان شاہ کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا تھا۔ یقیناً" انہیں وہاں نہ پا کر احسان شاہ پریشان ہو کر نکل آئے تھے اور مائرہ کے شاطر ذہن نے وہاں کھڑے کھڑے سب پلاننگ کر لی تھی۔ لیکن ان کی پلاننگ غلط ہو گئی تھی۔ اس پلاٹ میں بہت سے جھول تھے۔ بہت سی خامیاں تھیں۔ لیکن انہوں نے یہ ضرور صحیح کہا تھا کہ جب دل انتقام کی آگ میں جل رہا ہو تو کچھ نہیں سوجھتا۔ عقل رخصت ہو جاتی ہے۔ اگر فلک شاہ معذور نہ بھی ہوتا تو بھی اس کا جھوٹ پکڑا جانا تھا۔ سب کچھ غلط ہو گیا تھا۔ انہوں نے فلک شاہ سے کہا تھا کہ وہ کبھی کسی سے نظر نہیں ملا سکیں گے۔ لیکن اس وقت تو خود ان کی نظریں اٹھ نہیں رہی تھیں۔ انہوں نے بمشکل نظریں اٹھائیں اور تھوک نگلتے ہوئے مردہ آواز میں کہا۔

"ہاں ہو سکتا ہے مجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔ نیچے لاؤنج میں صرف ایک بلب جل رہا تھا۔ وہ کوئی اور ہو گا۔ مجھے لگا کہ وہ موی تھا۔ سائیڈ سے وہ بالکل موی جیسا لگا تھا مجھے۔"

انہوں نے احسان شاہ کی طرف دیکھا جو بہت سرد نگاہوں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

"آپ اس طرح کیوں مجھے دیکھ رہے ہیں؟" وہ یکدم بھڑک گئی تھیں

"کیا مجھے غلط فہمی نہیں ہو سکتی۔ وہ کوئی اور بھی تو ہو سکتا ہے۔ ملک ہاؤس کی طرف سے دیوار پھلانگ کر آیا ہو.... کوئی چور ڈاکو...."

احسان شاہ اس کی پوری بات سنے بغیر دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔ مائرہ ان کے پیچھے لپکیں۔

"احسان.... احسان پلیز میری بات سنیں۔"

رابیل کچھ دیر یوں ہی کھڑی کھلے دروازے کو دیکھتی رہی۔ پھر دروازہ بند کر کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"ماما نے جھوٹ کیوں بولا۔"

اگر وہ جھوٹ نہیں تھا تو کیا سچ مچ کوئی چور"۔ ایک لمحہ کے لیے اس کے ذہن میں خیال آیا تھا۔ لیکن پھر دوسرے ہی لمحے وہ ایبک کے متعلق سوچنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

"اور کیا پتا وہ لڑکیاں پھر دوبارہ آئیں گی یا نہیں۔"

احمد رضا نے سوچا اور بے چینی سے کروٹ بدلی۔ وہ بہت دیر سے سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن نیند نہیں آ رہی تھی۔

بلاشبہ وہ لڑکی اریب فاطمہ تھی۔

اریب فاطمہ' اسفند یار کی بہن۔

اسفند یار جو ضلع رحیم یار خان کے چک نمبر 151 میں رہتا تھا اور جو ابو کی کسی سیکنڈ کزن کا بیٹا تھا۔

اور اس میں تو کوئی شک نہیں تھا کہ وہ اریب فاطمہ ہی تھی۔ اس نے اریب فاطمہ کو دوبار دیکھا تھا۔ ایک بار جب وہ آفس میں رچی کے ساتھ بیٹھا تھا اور وہ اسفند یار کے ساتھ احاطے میں داخل ہوئی تھی چند دن بعد دوبارہ جب وہ احاطے میں کھڑا رچی کا انتظار کر رہا تھا۔ تو وہ اسفند کے ساتھ واپس جا رہی تھی۔ شاید وہ اپنی اسی سہیلی سے پھر ملنے آئی تھی۔ وہ اسے اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اس نے دونوں بار ہی سیاہ چادر اوڑھ رکھی تھی۔ جس پر ننھے ننھے شیشے نفیس کڑھائی کے درمیان چمکتے تھے اور.... اور اس کی آنکھیں بالکل سمیرا کی آنکھوں جیسی تھیں۔

ہاں اس کی اس سیکنڈ کزن کی بیٹی کی آنکھیں بالکل سمیرا کی آنکھوں جیسی تھیں۔ وہ حیران ہوا اور ایک دم اٹھ بیٹھا۔

لیکن وہ یہاں مجھ سے ملنے کیوں آئی تھی۔

وہاں بھی تو....

لیکن اسفند یار کہتا تھا وہ کسی احمد حسن کے پروگرام نہیں دیکھتا۔

تو پھر کہیں رچی.... رچی جو شیخ عبدالعزیز تھا۔ کہیں اس نے تو نہیں بھیجا ہے۔

لیکن وہ عبایا والی لڑکی.... کیا یہ وہی لڑکی تھی کے ای والی' وہ جو اس عینک والی لڑکی کے ساتھ آئی تھی یا کوئی اور تھی۔ اس نے لاشعوری طور پر پوری شام اس کے فون کا انتظار کیا تھا اور دوبار ثمینہ حیدر سے پوچھا تھا کہ ان لڑکیوں کا فون تو نہیں آیا اور اسے تاکید کی تھی کہ انہیں کہہ دے کہ وہ کل صبح ان سے مل سکتا ہے۔ وہ سارا دن گھر پر ہی ہو گا لیکن انہوں نے پھر فون نہیں کیا

"اور اگر انہوں نے فون نہ کیا اور اگر وہ پھر ملنے نہ آئیں تو...."

وہ بے چین ہوا۔

وہ آواز جو مدھم تھی' جو سنی ہوئی سی لگتی تھی اور کیا آنکھوں کی طرح آواز بھی ملتی ہے۔

یا پھر وہ دوسری لڑکی کی آواز تھی۔

دوسری لڑکی جس نے نقاب سے اپنا چہرہ چھپایا ہوا تھا اور آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ تھا۔

اس کے پاس اسفند یار کا نمبر تھا۔ اس نے سوچا وہ اسفند یار سے فون کر کے پوچھ لے کہ اس کی بہن یہاں کیوں آئی تھی لیکن پھر اسے اپنا یہ خیال انتہائی احمقانہ اور فضول سا لگا۔

ہاں کچھ دنوں تک فون کر کے وہ احمد رضا کے متعلق پوچھ سکتا ہے کہ انہیں اس کے متعلق کچھ علم ہوا کہ نہیں.... اسفند یار نے بتایا تھا کہ اماں نے کہا ہے کہ رحیم یار خان سے جب کوئی عزیز ملنے آیا تو وہ ضرور احمد رضا کے متعلق پوچھیں گی کہ وہ لوگ کہاں ہیں آج کل۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے اور اسفند یار اتنا بولتا ہے کہ وہ خود ہی بتا دے گا کہ اریب فاطمہ...."

اور رچی کی آنکھوں میں اریب فاطمہ کے لیے جو غلاظت تھی' ہوس تھی۔ میں کہہ دوں گا اسفند یار کو کہ وہ اریب فاطمہ کو رچی سے دور رکھے۔

لیکن میں.... بھلا وہ میری بات سنے گا.... وہ تو شیخ عبدالعزیز کے ہاتھ عقیدت سے چومتا ہے۔ اسے گاؤں والوں کے لیے نجات دہندہ کہتا ہے۔ شیخ صاحب ہمارے محسن ہیں ہم سب گاؤں والوں کے۔

اس نے ہولے سے اپنا ہاتھ بیڈ کی پٹی پر مارا۔

"مجھے کیا.... میں آخر اس لڑکی کے متعلق اتنا کیوں سوچ رہا ہوں۔ شاید اس لیے کہ وہ ابو کی کسی سیکنڈ کزن کی بیٹی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ وہ رچی جیسے شخص کے لیے کام کرے۔"

رچی کا خیال آتے ہی اسے ان پیپرز کا خیال آیا جو رچی نے آج بھجوائے تھے اور ابھی اسے انہیں دیکھنے کا خیال نہیں آیا تھا۔ بیڈ پر بیٹھے بیٹھے اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی' کہیں کسی ٹیبل پر کوئی فائل نہیں پڑی تھی۔ ثمینہ بہت ذمہ دار لڑکی تھی۔ یقیناً" اس نے

انہیں سنبھال کر ہی رکھا ہوگا۔ اس نے سائیڈ ٹیبلز کی دراز چیک کیں اور پھر اٹھ کر دیوار گیر الماری کو کھولا۔ جس کی چابیاں لاک کے ساتھ ہی لگی ہوئی تھیں۔ سامنے ہی ایک فائل پڑی تھی۔ اس نے فائل کھولی۔ اس میں یقیناً" وہی پیپرز تھے جو آج رچی نے بھجوائے تھے۔ وہ فائل لے کر بیڈ پر آیا اور کاغذات کا مطالعہ کرنے لگا۔

اسلامی نظام تعلیم۔
اسلامی معاشرے کی گھٹن۔
مدرسہ کا نظام۔
اسلامی ممالک میں شراب نوشی عام کرنا۔
خواتین کو اعلا جابز مہیا کرنا۔

اس نے چند ٹاپک پڑھے اور گھبرا کر فائل بند کردی۔

"یہ کیا ہے۔۔۔ یہ میں کیا کررہا ہوں۔ کیا کرنے لگا ہوں۔ مجھے ان موضوعات پر بات کرنا اور لکھنا ہے۔ جو۔۔۔ نہیں اسلام ایسا دین نہیں ہے۔

اسلام تو دین حیات ہے۔" بچپن میں مولوی صاحب کی پڑھائی ہوئی باتیں ذہن میں گونج رہی تھیں۔

"یہ رچی کیا چاہتا ہے۔ یہ لوگ ایسا کیوں کررہے ہیں۔ انہیں مسلمانوں سے کیا دشمنی ہے۔ وہ پاکستان کے اتنے خلاف کیوں ہیں؟"

رچی نام کا مسلمان ہے۔ یہ وہ جانتا تھا۔

"الونیا کون ہے۔ اس کی کوئی ایجنٹ جس کا کام اس جیسے لوگوں کو پھانسنا ہے اور وہ اسماعیل جس نے نبوت کا دعوا کیا تھا۔ وہ۔۔۔

"مسلمانوں میں انتشار پھیلادو۔"

اس نے امریکا میں ایک باورچی کے گھر کسی کو کہتے سنا تھا۔

"فرقہ وارانہ فساد۔ شکوک و شبہات پیدا کرو۔"

شاید اسماعیل بھی اسی سلسلے کی کوئی کڑی تھا۔ نہ جانے کتنے لوگ اس کے لیے کام کررہے ہیں اور میں بھی ان میں سے ایک ہوں۔" رات کے اس پہر وہ مضطرب سا ہو کر بیڈ روم کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ چین تو کہیں نہیں تھا۔

وہ بہت سارے لوگوں کا پسندیدہ بن چکا تھا۔ نوجوان اس کی بات کو سنتے تھے اور سمجھنے کی کوشش کرتے تھے اور وہ۔۔۔ وہ کیا تھا۔ وہ بھی ان لوگوں میں سے ایک تھا جو اس ملک کی جڑیں کھودنے والے تھے اور مسلمانوں کے دشمن تھے۔

یہ بات اسے اب سمجھ میں آئی تھی۔

اور وہ ان کے ہاتھوں میں کھیل رہا تھا اور کہیں کوئی راہ نجات نہیں تھی۔ وہ قصوروار تھا۔ اس سے غلطی ہوئی تھی۔

وہ اسماعیل کذاب کی باتوں کے سحر میں آگیا تھا یا لالچ نے اس کے دل و دماغ کے دروازے بند کردیے تھے۔

کچھ تو تھا، جو وہ اس جھوٹے نبی کے جال میں پھنس کر یہاں تک آپہنچا تھا کہ اسے اب اپنے ہی ملک کے خلاف کام کرنا تھا اور یہ بات رچی نے صاف صاف کہہ دی۔ اتنے سالوں سے جو چھپا تھا، وہ واضح ہوگیا تھا۔ اسے آگے چل کر کیا کرنا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا۔ بظاہر ابھی اس نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا تو۔۔۔

وہ اندرونی گیٹ کھول کر لان میں آگیا۔

چوکیدار گیٹ کے پاس اپنی چارپائی پر سویا ہوا تھا۔ اس کی گن اس کے پاس پڑی ہوئی تھی۔ جو چاندکی روشنی میں صاف نظر آرہی تھی۔ رات میں چاندنی بکھری ہوئی تھی۔ اس نے لان میں رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اوپر آسمان کی طرف دیکھا اور کتنی ہی دیر مبہوت سا اسے دیکھتا رہا۔

چوکیدار نے کروٹ بدلی۔ چارپائی کڑکڑائی تو وہ چونکا۔ اب چوکیدار اس کی طرف کروٹ کیے سو رہا تھا۔ شاید تھوڑی دیر کے لیے کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹا ہو۔ ابھی کچھ دیر میں اٹھ کر بیٹھ جائے گا۔"اگر میں رات کے اس پہر چپکے سے اپنا کچھ ضروری سامان اٹھا کر چلا جاؤں کہیں اور، کسی دور دراز گاؤں میں رہنے لگوں تو رچی کو کیا خبر ہوگی کہ میں کہاں ہوں۔

لیکن رات کے اس پہر ہی کیوں، میں دن کے کسی وقت بھی جاسکتا ہوں، مجھ پر کہیں آنے جانے کی پابندی تو نہیں ہے نا۔

"لیکن میں کہاں جاؤں گا، کیا کروں گا۔" اسے اچانک وہ دن یاد آگئے جو اس نے ان کالے لوگوں کے علاقے میں اس بدبودار فلیٹ میں گزارے تھے۔ ایک جھرجھری سی لے کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور ٹہلنے لگا۔ اس کے پاؤں کے نیچے کوئی چیز آئی تھی۔ شاید کوئی پلاسٹک کا ٹکڑا۔ اس نے جھک کر دیکھا۔ وہ پلاسٹک کا گلاس تھا۔ شاید چوکیدار کا ہو۔ وہ سیدھا ہوا تو اس نے چوکیدار کو اٹھ کر بیٹھتے دیکھا۔

"صاحب آپ!" وہ گن ہاتھ میں لے کر کھڑا ہوگیا۔

"ہاں۔۔۔!" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "اندر پتا نہیں کیوں دل گھبرا رہا تھا۔"

وہ واپسی کے لیے مڑا۔ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر اندرونی دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے مڑ کر دیکھا۔

چوکیدار اسی کی طرف دیکھ رہا تھا اور کیا خبر یہ بھی رچی کا آدمی ہو۔ اس گھر میں جتنے بھی ملازمین تھے ان میں سے کسی ایک کو بھی اس نے ملازم نہیں رکھا تھا۔ یہ سب پہلے سے موجود تھے۔ اس کے اس گھر میں آنے سے پہلے۔

"صاحب! اگر آپ کی طبیعت خراب ہو تو آپ کو اسپتال لے چلوں۔"

اس کے مڑ کر دیکھنے پر چوکیدار نے پوچھا تو وہ نفی میں سر ہلا کر دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

اپنے بیڈ روم میں آکر اس نے کلاک پر نظر ڈالی۔ ابھی صرف تین بجے تھے اور صبح ہونے میں ابھی دیر تھی۔

اس نے ٹیبل سے فائل اٹھائی اور ایک بار پھر ان کاغذات کا جائزہ لینے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ کاغذات کے مطابق پوائنٹ نوٹ کررہا تھا۔

"شاید واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے۔" اس نے خود سے کہا اور اس کی آنکھوں میں نمی سی پھیل گئی۔ لیکن وہ مسلسل کام کرتا رہا۔ اس نے اگلے تین، چار پروگراموں کا خاکہ تیار کرلیا تھا اور وہ سوالات بھی تیار کرلیے تھے جو اسے طیب خان سے کرنے تھے۔ طیب خان کے بعد اگلے پروگرام میں اس کے مہمان ڈاکٹر جہاں زیب تھے۔ وہ اس شخص کو بالکل نہیں جانتا تھا۔ رچی نے اس کے متعلق صرف اتنا لکھا تھا کہ یہ ایک ماڈرن اسکالر ہیں۔ سوالنامہ رچی نے بھیج دیا تھا۔ باقی کا پروگرام اس نے اپنی ذہانت سے ہینڈل کرنا ہوتا تھا اور وہ بہت سے کامیاب پروگرام کرچکا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ کہاں کیا کہنا ہے۔

ان پیپرز کو ایک طرف رکھ کر اس نے وہ آرٹیکل دیکھے، جو اسے لکھے ہوئے ملتے تھے اور اسے اپنے نام سے چھپوانے ہوتے تھے۔ وہ جانتا تھا ان موضوعات پر وہ اس سے کہیں بہتر اور اچھا لکھ سکتا ہے۔ لیکن اسے اس کی اجازت نہیں تھی۔

اس نے تمام کاغذات فائل میں لگائے اور کرسی کی پشت پر سر رکھتے ہوئے ٹانگیں پھیلا کر آنکھیں بند کرلیں۔ صبح کی اذان کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ مسجد نزدیک ہی تھی اور بیڈ روم کی کھلی کھڑکی سے اذان کی آواز اس کے کانوں میں آرہی تھی۔ وہ آنکھیں موندے اذان سنتا رہا۔

سمن آباد والے گھر میں بھی اذان کی آواز اس کے کمرے میں سنائی دیتی تھی۔ کئی بار اذان سن کر وہ پھر سو جاتا تھا تو سمیرا آکر اسے جگاتی تھی۔

"رضی! اٹھ بھی جاؤ اب، میں جانتی ہوں تم جاگ رہے ہو۔ ابو نیچے انتظار کررہے ہیں۔"

کبھی وہ اٹھ جاتا اور کبھی سمیرا کے جانے کے بعد پھر سو جاتا تھا۔ وہ نماز کا اس طرح پابند نہیں ہوسکا تھا جس طرح سمیرا، ابو اور امی تھے۔ لیکن پھر بھی جب وقت گزر جاتا تو اسے پچھتاوا ہوتا تھا اور وہ دل ہی دل میں عہد کرتا تھا کہ وہ کل ضرور نماز پڑھے گا۔

لیکن۔۔۔

اس نے آنکھیں کھولیں اور سوچا۔ وہ آج سالوں

بعد فجر کی نماز پڑھے۔ لیکن پھر اس نے آنکھیں موند لیں۔ وہ تقریباً" پوری رات جاگتا رہا تھا اب اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ پھر وہ یوں ہی کرسی کی پشت پر سر رکھے رکھے سو گیا۔ دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو سات بج رہے تھے۔ وہ اٹھ کر لاؤنج میں آیا اور ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کیا۔

"چائے لاؤں صاحب؟" گلزار (ملازم لڑکے) نے اندر آکر پوچھا۔

"ہاں لے آؤ۔ مس ثمینہ آگئیں؟"

"نہیں۔۔۔" ناشتا ثمینہ حیدر اپنی نگرانی میں تیار کرواتی تھیں۔

"یہ بھی کیا زندگی ہے۔" اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور کیا کبھی احمد رضا نے اس زندگی کا تصور کیا تھا؟

سمیرا ناشتا بناتی جاتی تھی اور کچن سے سر باہر نکال کر اسے آوازیں دیتی رہتی تھی۔ "رضی آجاؤ۔۔۔ جلدی کرو رضی!" وہ ناشتا ٹیبل پر لگا رہی ہوتی تھی تو وہ گنگناتے ہوئے سیڑھیاں اترتا اور پھر بہت اطمینان سے سیڑھیوں کے نیچے موجود بیسن کے آئینے میں اپنا جائزہ لیتا اور وہ اس کے دیر کرنے پر چڑتی اور اگر حسن رضا ٹیبل پر موجود ہوتے تو وہ صرف مسکرا دیتے تھے۔ انہوں نے کبھی بہن بھائی کی گفتگو میں دخل نہیں دیا تھا۔

ٹی وی پر تلاوت ہو رہی تھی۔ لحہ بھر وہ سنتا رہا۔ قاری کی آواز بے حد پرسوز تھی۔ اسے قرآن پڑھے کتنا عرصہ ہو گیا تھا اسے یاد نہیں تھا۔

"رضی! اس رمضان میں تم بھی قرآن ختم کرلو۔ بھول جاؤ گے۔"

"میرا دماغ تمہاری طرح نہیں ہے۔" وہ جواب دیتا تھا۔

"اگر میں نے قرآن پڑھا ہوتا سمجھ کر تو کیا میں تب بھی گمراہ ہو جاتا؟ کیا تب بھی میں اسماعیل کذاب کے طلسم میں جکڑا جاتا؟"

اس نے خود سے پوچھا تھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ دیر بعد وہ برش کرکے اور منہ ہاتھ دھو کر آیا تو تب بھی لاؤنج میں قرات کی آواز گونج رہی تھی۔ اب وہ سورۃ الجاثیہ کی تلاوت کر رہے تھے۔ وہ بیٹھ کر سننے لگا۔ اب قاری صاحب ترجمہ کر رہے تھے۔ وہ دھیان سے سن رہا تھا۔

"پھر کیا تم نے کبھی اس شخص کے حال پر غور کیا ہے۔ جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا مقصود بنا لیا اور اللہ نے اس کے علم کے باوجود اسے گمراہی کے گڑھے میں پھینک دیا اور اس کے دل اور کانوں پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا اور اللہ تعالیٰ کے سوا اب کون ہے جو اسے ہدایت دے۔ کیا تم لوگ ایسے شخص کے ماضی و حال سے کوئی سبق نہیں لیتے؟"

قاری صاحب ترجمہ کر رہے تھے اور وہ سن رہا تھا۔ لیکن سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ اس کا دماغ سویا سویا تھا۔ اس نے پوری طرح ان الفاظ کو سمجھا نہیں تھا۔ لیکن وہ اندر دماغ کے کسی کونے میں محفوظ ہو رہے تھے۔

وہ گمراہ ہو گیا تھا اپنے علم کے باوجود۔ یہ صحیح تھا۔ اللہ نے سچ کہا تھا۔

وہ بھی ان لوگوں میں سے تھا۔ ٹھیک ہے اس نے زبان سے اسماعیل کذاب کو نبی نہیں کہا تھا لیکن دل میں۔۔۔ ہاں دل میں تو کچھ تھا کچھ غلط۔ دل میں اس نے اسماعیل کذاب کو تسلیم کیا تھا' تب ہی تو وہ وہاں تھا اس کی محفل میں اس کے مقرب خاص بننے پر اس نے اندر سے بڑی خوشی محسوس کی تھی۔ شاید کسی روز وہ زبان سے بھی کہہ دیتا اور یہ گمراہی کس لیے تھی کہ اس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا مقصود بنا لیا تھا۔

اور یہ بھی سچ ہے۔ بلاشبہ اللہ کی کہی ہر بات سچ ہے۔

شہرت کی خواہش

دولت کی خواہش اور۔۔۔ اور

اور اب کون ہے جو اسے ہدایت دے۔

اس کی آنکھیں نم ہوئیں۔

تو اب کون ہے جو۔

اس سے آگے بھی قاری صاحب نے کچھ کہا تھا لیکن کیا۔ اڑے اڑے ذہن میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

تلاوت ختم ہو گئی تھی۔ اس نے ٹی وی آف کر دیا۔

"اور اب کون ہے جو مجھے ہدایت دے سوائے اللہ کے۔"

"اللہ!" اس کی آنکھیں نم ہوئیں۔ "کیا اللہ مجھے ہدایت دے گا اور مجھے معاف کر دے؟"

"شاید نہیں۔" اس نے جیسے خود ہی فیصلہ کرلیا۔ "اب کچھ نہیں بچا۔ سوائے رسوائی کے۔" اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ اور سر صوفے کی پشت پر رکھ دیا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ جب بندہ سچے دل سے توبہ کرتا ہے تو اللہ اپنے بندے کی توبہ قبول کرتا ہے۔ آنکھوں میں پھیلتے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے اس نے آنکھیں زور سے بھینچ لیں۔ اور سوچا' وہ آج جنید علی کو منع کر دے گا کہ وہ ابو کو تلاش کرے۔ اس سے کیا فائدہ۔۔۔ اس رسوائی میں وہ انہیں مزید شریک نہیں کرے گا وہ شاید اب کبھی انہیں دیکھ نہیں سکے گا۔ مل نہیں پائے گا۔ لیکن وہ ہمیشہ ان سے محبت کرتا رہے گا۔ اپنے آخری سانسوں تک۔

"ابو! امی! سمیرا۔۔۔ میں آپ سب سے بہت محبت کرتا ہوں بہت۔۔۔ میں نے آپ سب کو دکھ دیا۔ میں نے آپ کے خواب کرچی کرچی کیے۔ اس کے لیے آپ مجھے معاف کر دیجیے گا۔ اگرچہ میں معافی کے لائق نہیں۔ بالکل بھی نہیں۔"

اس نے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے کچل ڈالا۔ اسے لگا جیسے ابھی اس کی چیخیں نکل جائیں گی۔ اسے خود کو سنبھالنے میں بہت دقت ہوئی لیکن اس نے خود کو سنبھال لیا اور ٹانگیں پھیلا کر آنکھیں کھول کر ایک نظر اپنے سامنے ٹیبل پر پڑے چائے کے کپ کو دیکھا جو گلزار رکھ گیا تھا' پھر آنکھیں بند کرلیں۔ کچھ دیر بعد جب ثمینہ حیدر ناشتا بنوا کر لائیں تو سامنے ٹیبل پر پڑی چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی اور احمد حسن گہری نیند سو رہا تھا۔ ثمینہ نے گلزار کو ٹرالی واپس لے جانے کو کہا اور خود بھی اس کے پیچھے باہر نکل گئی۔

پھر اگلے کئی دن اس نے اریب فاطمہ اور اس عبایا والی لڑکی کا انتظار کیا تھا۔ لیکن پورا ایک ماہ گزر گیا تھا۔ وہ لڑکیاں پھر نہیں آئی تھیں اور نہ ہی وہ کے ای والی لڑکیاں پھر آئی تھیں۔ تب ایک روز جب اس کا ڈرائنگ روم بھرا ہوا تھا اس نے مونا کی کسی بات کا جواب دیتے ہوئے پوچھا تھا۔

"مس مونا! وہ آپ کی ڈاکٹر مریبہ اور وہ دوسری میڈم پھر نہیں آئیں۔ کیا میرے پروگرام انہیں پسند نہیں آئے؟"

"نہیں سر! آپ کے پروگرام تو پہلے سے زیادہ پسند کیے جا رہے ہیں۔ مگر انہوں نے پھر آنے میں دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ مریبہ کی دوست تو شاید اپنے گاؤں گئی ہوئی ہے۔ مریبہ نے بتایا تھا اس کی والدہ شدید بیمار ہیں۔ زیادہ فین تو وہی تھی آپ کی' مریبہ تو اس کے اصرار پر چلی آئی تھی۔"

"اچھا تو خیر! آپ کیا کہہ رہی تھیں کہ آپ کے خیال میں امریکا تیسری دنیا کے ذخائر پر قبضہ کرنا چاہتا ہے کیونکہ اس کی بقا اسی میں ہے؟"

"جی سر! اور اس مقصد کے لیے ہی اس کی نظر پاکستان پر ہے۔"

"آپ کا خیال صحیح بھی ہو سکتا ہے۔" وہ مسکرایا تھا۔

کئی اور طلبا نے بھی تائید کی تو سب کا موقف سننے لگا۔ کل رات جو پروگرام اس نے کیا تھا وہ اس سلسلے کا آخری پروگرام تھا۔ وہاں موجود نوجوانوں میں سے اکثر کا اصرار تھا کہ یہ پروگرام جاری رہنا چاہیے تھا۔

"بھئی یہ تو چینل والوں کی مرضی ہے۔" وہ مسکرایا تھا۔

"سر! کیا آپ کوئی اور پروگرام کریں گے؟" کسی نے پوچھا تھا۔

"ابھی سے تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"سر! آپ کو پتا ہے لوگوں نے ڈاکٹر جہاں زیب اور ظفر منصور والے پروگرام پر بہت اعتراض کیے ہیں۔"

"ہاں جانتا ہوں۔"

"شاید اس وجہ سے پروگرام بند کیا جا رہا ہے۔"

"نہیں خیر ایسا تو نہیں ہے اور پھر ڈاکٹر زیب اور ظفر منصور کی ذاتی رائے تھی، جو انہوں نے بیان کی۔ میں اس سے متفق نہیں تھا۔"

"لیکن ان غداروں کو آپ کو اپنے پروگرام میں انوائٹ نہیں کرنا تھا۔" وہ دبلا پتلا لڑکا غصے میں لگ رہا تھا۔

"آپ انہیں غدار کن معنوں میں کہہ رہے ہیں؟"

"جو شخص قائداعظم، اقبال اور پاکستان کے خلاف معمولی سی بات بھی کرتا ہے میرے نزدیک وہ غدار ہے۔" اس کا رنگ سرخ ہو رہا تھا۔

"گڈ، میں بھی ایسا ہی سمجھتا ہوں لیکن ینگ بوائے! یہ مہمان وغیرہ سب چینل والوں کی مرضی سے آتے ہیں۔ میرا ان میں کوئی کردار نہیں ہوتا۔"

اسے لوگوں کے دلوں میں اترنے اور انہیں مطمئن کرنے کا فن آتا تھا آج بھی جب نوجوان طلبا اور کچھ دوسرے لوگ رخصت ہوئے تو اس کی ذات سے بے حد متاثر ہو کر گئے تھے۔ دل ہی دل میں سب نے اس کی وطن سے محبت اور بے باکی کو سراہا تھا۔

"ایسے ہی جوان ملک و قوم کی تاریخ لکھتے ہیں اور قوم و ملک کو سنوارتے ہیں۔" ایک قدرے ادھیڑ عمر شخص نے جاتے جاتے تبصرہ کیا تھا اور ان کے جانے کے بعد وہ جنید علی کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر قہقہہ لگا کر بولا تھا۔

"ہاں ایسے ہی لوگ!" جنید علی نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا۔

"تم ٹھیک ہو نا؟"

"ہوں۔۔۔ نہ ٹھیک ہونے والی کیا بات ہے۔ تمہارے مشورے پر غور کر رہا ہوں کہ کچھ دنوں کے لیے گھوم پھر آؤں۔ چل رہے ہو ساتھ؟"

جنید علی نے سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے سوچ کر پروگرام بنا لیتے ہیں۔ یوں بھی چینل پر پروگرام کا فی الحال کوئی پرابلم نہیں ہے تو چلتے ہیں کاغان وغیرہ کی طرف۔ اگلا مہینہ صحیح رہتا ہے ناردرن ایریا میں جانے کے لیے۔"

احمد رضا نے سر ہلایا۔

"ہاں یار! تمہاری فیملی کے متعلق کچھ کلیو تو ملا ہے۔ تمہارے ابو کے دفتر کے ایک بندے سے پتا چلا تھا کہ پانچ سال پہلے وہ لوگ راولپنڈی منتقل ہو گئے تھے۔ لیکن ان کے ایڈریس اور فون نمبر وغیرہ سے وہ لاعلم ہے۔ بہرحال پتا چل جائے گا ایک دن۔"

جنید علی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کھڑا ہو گیا۔ احمد رضا کا چہرہ سپاٹ تھا۔ اس خبر سے اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا تھا۔

"اوکے پھر میں چلتا ہوں۔" جنید علی حسب معمول طلبا وغیرہ کے اس اجتماع میں موجود تھا اور اب واپس جا رہا تھا۔

"اوکے اللہ حافظ"

اس نے جنید علی سے ہاتھ ملایا اور اس کے جانے کے بعد پھر قہقہہ لگایا۔ اونچا بلند قہقہہ۔

وہ کیوں ہنس رہا تھا وہ خود نہیں جانتا تھا۔ پچھلے ایک ماہ سے اس کی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی اور وہ خود اس کیفیت کو نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ کبھی اسے لگتا وہ دنیا کا بدنصیب ترین انسان ہے۔ جس کی جھولی خالی ہے۔ وہ اکیلا ہے اس بھری دنیا میں۔ رسوائی کی کالک سے اس کا چہرہ سیاہ ہو رہا ہے اور کوئی نہیں جو اس کالک کو اس کے چہرے سے ہٹا سکے۔ وہ ایسا شخص ہے جس کے لیے ہر در بند ہو چکا ہے۔

کبھی اسے لگتا وہ دنیا کا خوش قسمت ترین شخص ہے۔ جس کے پاس وہ سب کچھ ہے جس کی کسی بھی آدمی کو خواہش ہو سکتی ہے۔ دولت اور شہرت اس کے قدموں کی لونڈی ہے اور رچی نے کہا تھا۔

"ابھی تو کچھ بھی نہیں ہے احمد رضا! ایک دن آئے گا جب تم دنیا کے دولت مند ترین آدمیوں میں سے ایک ہو گے۔"

"لیکن کیسے؟" اس نے رچی سے پوچھا تھا۔

"بس دیکھتے رہو رچی تمہارے لیے کیا کرتا ہے۔"

رچی اس کے لیے کیا کرنے والا تھا وہ نہیں جانتا تھا

لیکن یہ جانتا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے، صحیح کہہ رہا ہے۔ ایک روز ایسا ہی ہو گا۔ وہ اس احساس سے خود کو خوش کرنا چاہتا تھا کہ ایک روز وہ دنیا کے امیر ترین لوگوں میں سے ایک ہو گا۔ یہ احساس اسے خوش نہیں کرتا تھا بلکہ اندر جیسے کہر سی گرنے لگی تھی اور یہ کہر خوشی کے ہر احساس کو ڈھانپ لیتی تھی۔ تب وہ اونچے اونچے قہقہے لگاتا۔

وہ اس ایک ماہ میں ایک بار بھی حاجی صاحب کی طرف نہیں گیا تھا۔ وہ شاید کہیں گئے ہوئے تھے۔ اندر جو بدلاؤ کا عمل شروع ہوا تھا اس میں ٹھہراؤ آ گیا تھا۔

وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ وہ خوش نصیب ہے یا بدنصیب۔

"تو احمد رضا تم کیا ہو۔ بہروپیے؟" اس نے قہقہہ لگایا اور پھر بہت دیر تک ہنستا رہا۔

ثمینہ حیدر نے حیرت سے اسے دیکھا اور پھر ہاتھ میں پکڑے میگزین اور اخبار ٹیبل پر رکھے۔

احمد رضا نے ایک نظر اسے دیکھا اور اخبار اٹھا کر دیکھنے لگا۔ ایک دو اخبارات میں اس کے اس آخری پروگرام کے متعلق بھی کالم تھے۔ اس نے سرسری نظروں سے دیکھا۔ تعریف ہی کی گئی تھی۔ سراہا گیا تھا۔ ایک کالم نگار نے تو اسے مردِ مجاہد کا خطاب دیا تھا۔ وہ مسکرایا اور آخری اخبار اٹھا لیا اور پھر چونکا اندرونی صفحات میں ایک چھوٹا سا آرٹیکل تھا۔ عنوان تھا۔

"احمد حسن کون ہے؟"

احمد حسن کو ایک بے باک اور سچا صحافی کہا گیا ہے۔ کیا وہ واقعی صحافی ہے؟ اس نے کہاں سے تعلیم حاصل کی۔ وہ امریکا سے آیا ہے؟

کیا وہ سی آئی اے کا ایجنٹ ہے؟ یا اس کا تعلق موساد سے ہے۔ مثلاً "غیر ملکی نظر آنے والا احمد حسن واقعی احمد حسن ہے یا کوئی جان، رچرڈ، ایڈورڈ ہے۔ ہاں وہ احمد حسن کیسے ہو سکتا ہے وہ کوئی جان، رچرڈ یا ہیری ہی ہو سکتا ہے۔"

اس نے باقی کا مضمون نہیں پڑھا اور اس کے حلق سے پھر قہقہہ چھوٹ پڑا۔

"احمد حسن کون ہے۔" اور پھر ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ اندر آتی ثمینہ حیدر نے ایک بار پھر حیرت سے اسے دیکھا۔

"کیا وہ نشے میں ہے۔" لیکن اس نے اسے کبھی پیتے نہیں دیکھا تھا۔

اس نے ہاتھوں کی پشت سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے ثمینہ کی طرف دیکھا۔

"احمد حسن کون ہے۔ یہ۔۔۔ یہ اس اخبار میں لکھا ہے۔ کیا تم جانتی ہو احمد حسن کون ہے۔ کوئی ایڈورڈ، جان، رچرڈ۔۔۔"

وہ پھر ہنسا تھا۔

"سر! وہ کوئی ایبک فلک شاہ آئے ہیں آپ سے ملنے۔"

"ایبک فلک شاہ۔" اس نے پرسوچ نظروں سے ثمینہ حیدر کو دیکھا۔

"کیا تم جانتی ہو یہ کون ہے۔"

"سر! میں صرف ایک ایبک فلک شاہ کو جانتی ہوں جو ایک رائٹر ہے۔ میں نے تو اس کی کہانیاں نہیں پڑھیں لیکن میری فرینڈز بہت فین تھیں اس کی۔ شاید وہ ٹی وی کے لیے بھی لکھتا ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے انہیں بٹھاؤ ادھر ڈرائنگ روم میں۔ میں فریش ہو کر آتا ہوں۔" وہ فوراً ہی ڈرائنگ روم سے نکل کر اپنے بیڈ روم میں چلا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ خود کو کمپوز کر کے اور فریش ہو کر واپس آیا تو ایبک ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا اور اس کے ہاتھ میں وہی اخبار تھا، جسے وہ اپنی ٹیبل پر چھوڑ گیا تھا۔ اسے آتے دیکھ کر ایبک اخبار رکھ کر کھڑا ہو گیا تھا اور اس نے بہت گرم جوشی سے اس سے مصافحہ کیا۔

"السلام علیکم! میں ایبک ہوں۔"

پہلی نظر میں ایبک کی شخصیت نے اسے متاثر کیا اور پھر تھوڑی دیر کی گفتگو کے بعد وہ مزید متاثر ہوا۔ دھیمے دھیمے لہجے میں مدلل انداز سے بات کرتا یہ شخص یقیناً اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتا تھا۔ اس کی گفتگو سے اس ملک کے لیے محبت ٹپکتی تھی۔ اس نے اخبار

میں چھپے اس مضمون کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی تھی' جو اس کے سامنے کھلا رکھا تھا اور نہ ہی اس کے پروگراموں کے متعلق کچھ کہا تھا۔ وہ اپنے خواب اور اپنے پلانز اس سے شیئر کر رہا تھا۔

"سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے کسی بھی سیاسی پارٹی پر اعتبار نہیں ہے۔ میں کسی بھی پارٹی کو جوائن نہیں کرنا چاہتا' لیکن میں اپنے ملک کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں مجھے لگتا ہے جیسے میرا ملک کچھ غلط لوگوں کے پنجے میں ہے۔"

ایک لمحہ کے لیے احمد رضا کے دل میں خیال آیا تھا کہ متاثر کن شخصیت والا شخص جو اس کے سامنے بیٹھا ہے لیکن اس کی طرح بہروپیا تو نہیں ہے اور یہ خیال آتے ہی بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

"کیا آپ کو۔۔۔ رچی۔۔۔ میرا مطلب ہے شیخ عبدالعزیز نے بھیجا ہے۔"

ایبک فلک شاہ کی آنکھوں میں حیرت نمودار ہوئی۔

"میں اس نام کے کسی شخص کو نہیں جانتا۔ ایکچوئیلی میرے والد صاحب نے مجھے آپ سے ملنے کے لیے کہا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ آپ مخلص اور محب وطن شخص ہیں۔ اگر مجھے کسی پارٹی کو جوائن نہیں کرنا ہے تو میں آپ کے ساتھ مل کر کوئی لائحہ عمل طے کرلوں۔ دراصل انہوں نے آپ کے کچھ پروگرام دیکھے تھے بیمل ٹی وی پر۔۔۔"

اور احمد رضا کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔ لوگ اسے کیا سمجھتے ہیں اور وہ کیا ہے۔ شرمندگی کے احساس سے اس کی نظریں جھک گئیں۔ ایبک بے حد گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"جی۔ جی یقیناً۔" اپنے چہرے پر اس کی نظریں محسوس کرکے اس نے چونک کر ایبک کی طرف دیکھا۔

"مجھے آپ جیسے شخص کے ساتھ مل کر کام کرنا اچھا لگے گا جو اپنے دل میں ملک و قوم کے لیے اتنا درد رکھتا ہو۔"

اس روز ایبک کے ساتھ اس کی ملاقات مختصر رہی تھی کیونکہ بار بار رچی کے میسجز آرہے تھے کہ وہ اس سے بات کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ وہ دوبار اس کی کال منقطع کرچکا تھا۔

کسی ضروری کام سے جانے کا بہانہ کرکے اس نے ایبک سے معذرت کی تھی کہ وہ زیادہ تفصیل سے بات نہیں کرسکتا اس وقت۔

"ٹھیک ہے ان شاء اللہ جلد ہی پھر ملیں گے۔" ایبک نے خوش دلی سے کہا تھا۔ "اس دوران آپ بھی سوچیے گا اور میں بھی کہ ہم اپنے کام کا آغاز کس طرح کرسکتے ہیں۔ ہمارا طریقہ کار کیا ہوگا۔"

"ضرور!" وہ ایبک کو گیٹ تک رخصت کرنے آیا تھا اور جب واپس آیا تو اس کے بیڈ روم والے فون کی بیل ہورہی تھی۔ اس گھر میں دو فون کنکشن تھے۔ ایک فون اس کے بیڈ روم میں تھا اور اس کا کوئی ایکسٹینشن وغیرہ نہیں تھا۔ اس فون پر صرف رچی ہی اس سے بات کرتا تھا یا پھر اس کے سیل فون پر اگر مختصر بات کرنا ہوتی تو۔

تیزی سے بیڈ روم میں داخل ہوتے ہی اس نے فون ریسیو کیا۔

"فون کیوں نہیں اٹینڈ کررہے تھے؟" رچی کے لہجے سے ناراضی جھلکتی تھی۔

"میں تنہا نہیں تھا۔" اس نے رسان سے جواب دیا۔

"کون تھا کیا پہلے بھی ملتے رہے ہو اس سے؟" رچی کے لہجے میں تجسس تھا۔

"نہیں! پہلی بار آیا ہے ایبک فلک شاہ نام بتایا ہے اس نے اپنا۔"

"ایبک فلک شاہ۔" رچی نے دہرایا۔

احمد رضا جو ابھی تک کھڑا تھا فون اسٹینڈ کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کیا کہہ رہا تھا؟"

رچی نے پوچھا تو اس نے مختصراً ایبک کے ساتھ ہونے والی گفتگو دہرادی۔

"گڈ۔۔۔ انٹرسٹنگ۔" رچی کے لبوں سے نکلا۔

"کیا تم نے پہلے کبھی ایبک فلک شاہ کے متعلق نہیں سنا۔"

"نہیں۔" احمد رضا نے سنجیدگی سے کہا۔ "احمق تم۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ میڈیا سے متعلق ہر اہم شخصیت کے متعلق تمہیں معلومات ہونا چاہئیں خواہ وہ پرنٹ میڈیا ہو خواہ الیکٹرانک میڈیا۔"

"کیا اس کا تعلق میڈیا سے ہے؟" احمد رضا نے پوچھا تو رچی نے کہا۔

"خیر اس پر پھر بات کریں گے۔ اس وقت میں نے تمہیں اس لیے فون کیا ہے۔ فی الحال بیمل پر تمہارے پروگرام ختم ہوگئے ہیں اور تم کل صبح ہی رحیم یار خان آجاؤ۔ یہاں تمہیں کچھ زیادہ دن رکنا ہے۔ ہوسکتا ہے ایک دو ماہ۔ اسی حساب سے تیاری کرکے آنا۔"

"لیکن میں تو جنید علی کے ساتھ ناردرن ایریا کی طرف جانے کا پروگرام بنا رہا تھا۔"

"جانتا ہوں۔ اسے فی الحال کینسل کردو اور کل صبح پہلی فلائٹ سے یہاں کے لیے روانہ ہوجاؤ اور ہاں وہاں مس ثمینہ یا کسی اور سے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں کہ تم کہاں جارہے ہو۔ جنید علی صبح تمہیں پک کرلے گا اور ایرپورٹ چھوڑ دے گا۔"

احمد رضا خاموش رہا۔

"اور ہاں میرے پاس تمہارے لیے کچھ اچھی اور کچھ بری خبریں ہیں۔ ویسے تم نے اخبار تو دیکھے ہوں گے۔"

"ہاں دیکھے ہیں۔"

"وہ آرٹیکل پڑھا تھا جس میں لکھنے والے نے تمہیں سی آئی اے کا ایجنٹ لکھا ہے؟" دوسری طرف شاید رچی مزا لے رہا تھا۔

"یہ مضمون کیا تم نے چھپوایا ہے؟" احمد رضا کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

"نو۔۔۔ ناٹ ایٹ آل۔" رچی نے تردید کی۔ "تمہیں یہ خیال کیوں آیا؟"

"بس یوں ہی۔"

"او کے پھر کل ملاقات ہوتی ہے۔"

رچی نے فون آف کردیا تھا۔ احمد رضا کچھ دیر یونہی بیٹھا رہا۔

رچی اسے وہاں کیوں بلا رہا ہے اور وہ بھی زیادہ عرصہ کے لیے۔ وہاں ایسا کیا کام ہے۔

وہ سمجھ نہیں پارہا تھا۔

وہاں چک نمبر 151 میں لڑکیوں کے لیے ایک سینٹر بنایا گیا تھا۔ اور وہاں صادق آباد میں بھی رچی نے ایک گھر لے رکھا تھا۔ وہ لوگ وہاں کیا کررہے تھے' وہ نہیں جانتا تھا۔ لیکن بہرحال جانا تو تھا۔ وہ اٹھا اور اپنی ضروری چیزیں پیک کرنے لگا۔ گو یہ کام ثمینہ حیدر بہتر طریقے سے کرسکتی تھی لیکن رچی نے منع کیا تھا ثمینہ کو بتانے سے اور اگر وہ اسے پیکنگ کے لیے کہتا تو یقیناً" وہ پوچھتی کہ اسے کہاں جانا ہے۔

ایک بڑا اٹیچی اور بیگ تیار کرکے وہ کمرے سے باہر نکلا تھا۔ اس کا ارادہ کچھ دیر ٹی وی دیکھنے کا تھا۔ اس نے ثمینہ حیدر کو چائے بنوانے کا کہا۔ سر بھاری ہورہا تھا اور پھر کسی خیال کے آتے ہی وہ لاؤنج سے نکل کر اندرونی دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ گیٹ پر موجود چوکیدار سے حال احوال پوچھ کر وہ گیٹ سے باہر نکل گیا اور کچھ دیر بعد وہ حاجی صاحب کے گیٹ پر بیل دے رہا تھا ملازم نے گیٹ کھولا۔

"حاجی صاحب تو کراچی گئے ہیں۔"

"اچھا!" وہ سر جھکائے دل گرفتی سے واپس مڑا۔ وہ رحیم یار خان جانے سے پہلے حاجی صاحب سے ملنا چاہتا تھا۔ وہ عالم آدمی ہیں۔ دین دار ہیں۔ وہ ان سے پوچھنا چاہتا تھا۔

"کیا وہ قابل معافی ہے۔

کیا اللہ اسے معاف کردے گا۔"

اتنے سارے دن وہ خود کو باور کراتا رہا تھا کہ اب ہمیشہ ایسا ہی رہے گا۔

وہ جو کرچکا ہے اس کی تلافی نہیں ہوسکتی اسے اب تاعمر رچی کی غلامی کرنا ہے۔ اس کے گناہوں میں ہر گزرتے دن کے ساتھ اضافہ ہونا ہے۔

اس کے نام کے ساتھ مرتد کے ساتھ اور جانے کیا کیا کچھ لکھا جاتا ہے۔

وہ ایجنٹ ہے۔

وہ ملک کا غدار ہے۔

دھوکے باز ہے۔

خود کو یہ سب باور کرانے کے باوجود اندر کہیں خواہش ہمکتی تھی۔

معافی مل جانے کی خواہش۔۔۔

احمد حسن سے دوبارہ احمد رضا بن جانے کی خواہش ۔۔۔ کہیں کوئی درد اندر ہی اندر چٹکیاں لیتا تھا۔ اذیت دیتا تھا۔ کوئی راستہ تو ہوگا پلٹنے کا۔ شاید کوئی روزن کوئی کرن مل جائے روشنی کی۔۔۔

وہ یہ خیال آتے ہی گھر سے نکلا تھا' لیکن شاید اس کے لیے کوئی راستہ نہیں ہے۔ مایوسی نے ایک بار پھر اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور وہ سر جھکائے اپنے گیٹ میں داخل ہو گیا۔ جہاں ثمینہ حیدر چائے پر اس کا انتظار کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تو تم میری بات سمجھ رہے ہو نا احمد رضا!" رچی اس کے سامنے بیٹھا بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

احمد رضا نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا۔

"ہاں۔"

"تمہیں اب جلد ہی یہاں سے جانا ہوگا۔"

"کہاں؟"

"شام' لیبیا' مصر کہیں بھی۔ ابھی اس کا فیصلہ نہیں کیا گیا کہ تمہیں کہاں بھیجا جائے گا۔"

"ابھی تمہاری ٹریننگ بھی مکمل نہیں ہوئی۔"

وہ پچھلے دو ماہ سے یہاں تھا۔ فروری میں وہ پہلی بار یہاں آیا تھا اور چار ماہ بعد پھر رچی نے اسے بلوا لیا تھا۔

"تمہارے متعلق یہاں کچھ شکوک پائے جاتے ہیں اس لیے فیصلہ کیا گیا ہے کہ تمہیں کسی اور ملک میں بھیج دیا جائے۔"

"تمہارا اشارہ اگر اس مضمون کے متعلق ہے تو مجھے یقین ہے کہ وہ مضمون تم نے خود ہی چھپوایا تھا۔"

رچی نے اس کی بات پر تبصرہ نہیں کیا تھا۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا تھا پھر حتمی انداز میں بولا تھا۔

"تمہیں جانا ہوگا احمد رضا! یہ طے ہو چکا ہے۔"

"اور اگر میں نہ جانا چاہوں تو۔"

"تمہارے پاس انتخاب کا حق نہیں ہے۔"

"لیکن میں اسی ملک میں رہنا چاہتا ہوں رچی!" اس نے ملتجی نظروں سے رچی کو دیکھا تھا۔

"تو تمہیں ہمیشہ کے لیے نہیں بھیجا جا رہا۔ بس کچھ عرصہ بعد جب ہمارا مشن کمپلیٹ ہو جائے گا تو تم لوٹ آنا۔ خیر اس موضوع پر پھر بات کریں گے فی الحال تو تمہیں خوشخبری سنا دوں۔"

احمد رضا نے بنا کچھ کہے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"الوینا نے تم سے شادی کی خواہش ظاہر کی ہے اور اگلے ہفتے اس کے والدین یہاں آ رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اگلے ہفتے تم دونوں کی شادی ہو جائے۔ ہو سکتا ہے اس مشن میں وہ تمہارے ساتھ ہو۔"

"لیکن مجھے کسی ایسی لڑکی سے شادی نہیں کرنا جو پہلے سے شادی شدہ اور دو بچوں کی ماں ہو۔ یقیناً" اس شادی کی طرح اس کے والدین بھی جعلی ہوں گے۔"

احمد رضا کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ رچی کو سنبھلنے میں چند منٹ لگے تھے۔

"لیکن اس نے اپنے شوہر کو طلاق دے دی ہے۔ صرف تمہاری خاطر۔ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔"

رچی نے اس سے وضاحت طلب کرنے کے بجائے کہا تھا۔ بلاشبہ وہ بہت چالاک تھا۔

"لیکن میں اس سے محبت نہیں کرتا رچی! اب تم مجھے وہ خبر سناؤ جو بری ہے۔"

"وہ ہاں۔ احمد رضا! تمہارے والدین کے متعلق اطلاع ملی تھی کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں اور تمہاری بہن شادی کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ کینیڈا چلی گئی ہے۔"

"کیا یہ خبر بھی میری موت کی خبر کی طرح جھوٹی

ہے؟" اس نے سوالیہ نظروں سے رچی کی طرف دیکھا جو اپنی بات کا اثر جاننے کے لیے اس کی طرف بغور دیکھ رہا تھا۔

"نہیں۔ ہرگز نہیں۔ تم جنید علی سے پوچھ سکتے ہو۔ اس نے اطلاع دی تھی مجھے۔ ابھی چند دن پہلے۔"

"نہیں۔" اس کا دل جیسے نیچے پاتال میں گرتا جا رہا تھا۔ "جنید علی نے بتایا تھا تو۔۔۔"

"نہیں۔۔۔" اس کے لبوں سے پھر نکلا تھا۔ "ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اسے تو ابھی ابو سے معافی مانگنی تھی۔ ابھی تو۔۔۔ شاید ابو معاف کر دیتے تو اللہ بھی معاف کر دیتا۔ لیکن ابو۔۔۔ امی۔۔۔

اس کا دل چاہا وہ دھاڑیں مار مار کر روئے۔

اب کیا بچا تھا' کوئی امید۔۔۔ کوئی آس باقی نہیں رہی تھی۔

رچی اس کا کندھا تھپتھپا کر کمرے سے نکل گیا تھا۔ اس نے کچھ دیر کے لیے اسے تنہا چھوڑ دیا تھا۔ بلکہ اگلے دو' تین دن بھی اس نے احمد رضا سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ رچی کے گھر میں مقیم تھا اور ناشتے اور کھانے کی ٹیبل پر بھی ہلکی پھلکی باتوں کے سوا کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ شاید وہ اسے سنبھلنے کے لیے وقت دے رہا تھا۔

بظاہر وہ سنبھل گیا تھا۔ لیکن اندر سے اس کا دل بالکل خالی ہو گیا تھا۔

جس میں نہ کوئی خواہش تھی نہ آرزو۔ وہ جیسے انسان سے ایک روبوٹ میں ڈھل گیا تھا۔ اس کی ٹریننگ شروع ہو گئی تھی۔

ٹریننگ میں عربی زبان سیکھنا بھی شامل تھی۔

رچی خود بہت اچھی عربی بولتا تھا۔

احمد رضا کی عربی سیکھنے کی رفتار بہت آہستہ تھی۔

اس کے اندر سے جیسے جینے کی امنگ ختم ہو گئی تھی۔

اس کا مستقل قیام رچی کی قیام گاہ میں تھا۔ جس کی بیسمنٹ میں ٹریننگ دی جا رہی تھی۔ دو اور لڑکے بھی

تھے۔ جن میں سے ایک اس سے عمر میں بڑا تھا۔ دوسرا تقریباً" اس کا ہم عمر تھا۔ لیکن احمد رضا نے کبھی ان سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ کبھی کبھار چک نمبر 151 بھی جاتے تھے۔ ان دو ماہ میں وہ چھ، سات دفعہ رچی کے ساتھ آیا تھا۔ اس کے سینٹر کی عمارت کا فرسٹ فلور بھی مکمل ہو گیا تھا۔ اسفند اور عظمت سے بھی دو، تین بار اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ عظمت کچھ اکھڑا سا تھا۔ کم بات کرتا تھا۔ لیکن اسفند پہلے کی طرح بہت خوش دلی سے ملا تھا اور گھر چلنے کی دعوت بھی دی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ اس کے ساتھ گھر نہیں گیا تھا۔

"احمد رضا! میں چاہ رہا تھا کہ تمہاری ٹریننگ مکمل ہو جائے تو تم الوینا سے شادی کر لو۔"

"نہیں..." احمد رضا نے چونک کر اسے دیکھا۔

"میں الوینا سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔"

"تو کیا کوئی اور... کیا تم کسی اور لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہو... ثمینہ حیدر بھی اچھی لڑکی ہے۔"

"مجھے کسی سے شادی نہیں کرنا۔" اس نے سختی سے کہا اور رچی کی طرف دیکھا۔ "میری ٹریننگ کب ختم ہو گی؟"

"شاید ایک ماہ یا دو ماہ مزید۔"

احمد رضا نے سر ہلایا تھا۔

اس وقت وہ چک نمبر 151 میں تھے اور سینٹر کے ساتھ والے گھر میں رچی کے کمرے میں بیٹھے تھے۔

"میں اب جاؤں؟"

احمد رضا نے کھڑے ہوتے ہوئے اجازت چاہی۔

"ہاں! ٹھیک ہے۔ میں نے تمہیں کچھ دکھانا بھی تھا۔ لیکن خیر پھر سہی۔" وہ مسکرایا۔

"تم تو شادی کے لیے تیار نہیں ہو رہے، لیکن میں شادی کر رہا ہوں۔"

"مبارک ہو۔"

"یہ نہیں پوچھو گے کس سے؟"

"تم خود ہی بتا دو۔" احمد رضا نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"تمہاری فیانسی وہاں امریکا میں کیا نام تھا اس کا ایک بار تم نے تعارف کروایا تھا۔"

"نہیں... وہ تو شاید شادی بھی کر بیٹھی ہے۔ میں اسفندیار کی بہن اریب فاطمہ سے شادی کر رہا ہوں۔" خوشی رچی کے چہرے سے چھلک رہی تھی۔

احمد رضا ساکت نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"یہ... یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔" رچی مسلمان نہیں ہے۔ اس بات کا اب اسے یقین ہو چکا تھا۔

"یار! پاکستانی عورت دنیا کی بہترین عورت ہے۔ میں پوری دنیا میں گھوما ہوں۔ لیکن میں نے پاکستانی عورت جیسی وفا حیا کہیں نہیں دیکھی۔"

رچی کہہ رہا تھا۔ لیکن احمد رضا نہیں سن رہا تھا۔ وہ اریب فاطمہ سے شادی کر رہا ہے۔ اس کے بعد اس نے کیا کہا تھا۔ احمد رضا نے نہیں سنا تھا۔

"کیا... انہوں نے تمہارا رشتہ قبول کر لیا ہے؟" بڑی دیر بعد اس نے خود کو کہتے سنا۔

"ہاں میں نے پہلے عظمت یار سے بات کی اور پھر اس کے والد سے۔ اس کی والدہ مجھے کچھ رضامند نہیں لگیں۔ لیکن باقی سب کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"اچھا... کب کر رہے ہو شادی؟"

"شاید اگلے ہفتے... اسفندیار اسے کل لاہور سے لے آیا ہے۔"

رچی اتنا خوش تھا کہ اس نے اپنی خوشی میں احمد رضا کے چہرے کے بدلتے تاثرات نوٹ نہیں کیے تھے۔

احمد رضا بھاری دل کے ساتھ اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔

"نہیں، یہ غلط ہے، ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ ایک مسلمان لڑکی کی شادی کسی غیر مسلم سے ہرگز جائز نہیں ہے۔ بھلے وہ اہل کتاب ہی کیوں نہ ہو۔

پھر... حیرت ہے وہ لوگ کیسے مان گئے۔ شیخ عبدالعزیز کا محل نما گھر۔ عرب شہزادوں سے اس کے تعلقات، مال و دولت کی فراوانی۔

انہوں نے سوچا ہو کہ ان کی بیٹی عیش کرے گی۔ لیکن شرعاً" یہ شادی ہی جائز نہیں ہے۔" وہ بے چین ہو کر کمرے سے باہر نکل آیا اور پھر گھر سے بھی باہر۔ اسے اسفندیار اور عظمت یار کا گھر ڈھونڈنے میں دقت نہیں ہوئی تھی۔ پہلے ملنے والا بارہ سالہ لڑکا گھر پوچھنے پر سیدھا اسے ان کے گھر چھوڑ آیا تھا۔ اس گھر میں وہ ایک بار پہلے بھی آ چکا تھا۔ ابا کے ساتھ اور اب دوسری بار۔ وہ اس گھر کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ بالکل غیر ارادی طور پر آیا تھا۔ اس کے ذہن میں کچھ نہیں تھا کہ وہ ان لوگوں سے کیا کہے گا۔

گھر میں سوائے ان کی والدہ کے کوئی نہیں تھا۔

"بیٹا! دونوں بھائی گھر پر نہیں ہیں، کسی کام سے آئے ہو کیا؟" وہاں گاؤں میں سینٹر سے متعلقہ لوگوں کی سب بہت عزت کرتے تھے۔

اس نے دیکھا۔ ان خاتون کا چہرہ ستا ہوا تھا اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔

"اسفند کی والدہ کو کچھ اعتراض تھا۔" اس کے کانوں میں رچی کی آواز گونجی اور اس نے وہیں کھڑے کھڑے فیصلہ کیا۔

"مجھے دراصل آپ سے ہی ملنا تھا۔"

خاتون کی آنکھوں میں حیرت نظر آئی۔ لیکن پھر انہوں نے کہا۔ "آ جاؤ بیٹا۔"

کچھ دیر بعد وہ ان کے سامنے بیٹھا رچی کی حقیقت بتا رہا تھا اور وہ حیرت سے سن رہی تھیں۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔

"ہم سید تو غیر سیدوں میں بھی شادیاں نہیں کرتے۔ حیرت ہے آپ لوگ کیسے مان گئے۔"

"اسفند کے ابا کہتے ہیں شیخ صاحب کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیق سے ملتا ہے اور... کیا تم یہ ساری بات اسفند، عظمت اور ان کے ابا کو بتا سکتے ہو؟"

"نہیں... وہ یقین نہیں کریں گے اور پھر میں سامنے نہیں آنا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں میرا نام اور اصل حقیقت ظاہر کیے بغیر آپ اس رشتے سے انکار کر دیں۔ کچھ بھی بہانہ بنا کر۔"

خاتون کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ پھر انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"تم نے ابھی کہا تھا ہم سید... کیا تم سید ہو؟"

"ہاں!"

"تم... تم شادی کرو گے اریب فاطمہ سے؟"

"میں..." احمد رضا نے اپنی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں تم... تم نے اپنا نام احمد حسن بتایا ہے نا... اسفند نے بتایا تھا تم احمد رضا کے دوست ہو... احمد رضا میرا بھتیجا لگتا ہے رشتے میں۔"

احمد رضا کا جی کیا وہ بتا دے کہ وہ ہی احمد رضا ہے اور بہت سال پہلے وہ حسن رضا کے ساتھ یہاں آیا تھا اور اسی جگہ بیٹھا تھا مونڈھے پر اور وہ تخت پوش پر بیٹھی ہوئی تھیں آج کی طرح۔ انہوں نے پھر دہرایا۔

"تم شادی کرو گے اریب فاطمہ سے؟" غیر ارادی طور پر اس کا سر اثبات میں ہل گیا۔

"ٹھیک ہے، تو پھر آج ہی شام تم نکاح کر لو اریب فاطمہ سے۔"

"جی!" اس نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔

"ہاں یہ نکاح آج شام ہی ہو گا۔" وہ دبلی پتلی خاتون جو کچھ دیر پہلے شکستگی اور دکھ کا پیکر نظر آ رہی تھیں، ایک دم ہی بہت مضبوط اور بہادر نظر آنے لگی تھیں۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

حیا بخاری

آگہی کے سلسلے

ناولٹ

فضا میں نشاط انگیز خنکی رچی تھی۔ چودھویں کا خوب صورت چمکتا چاند اس قدر روشن تھا کہ آس پاس کے تارے نظر سے پوشیدہ ہو رہے تھے۔ ڈھلتی رات میں مسلسل چاندنی گھل رہی تھی۔ عجیب سحر انگیزی سی طاری ہو رہی تھی ساری فضا پہ۔

وہ مسلسل کئی گھنٹوں سے اسٹڈی روم کی واحد کھڑکی کے پاس اپنی پسندیدہ ریوالونگ چیئر پہ بیٹھا اس فسوں خیز منظر سے دل کو لبھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کمرا تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ کھلی کھڑکی سے اندر آتی چاندنی نے اگرچہ اس اندھیرے کو کچھ کم کر دیا تھا مگر پھر بھی اندھیرے کو چاندنی پہ کچھ سبقت رہی تھی۔

تب ہی سامنے والے چھوٹے سے بنگلے کی ٹیرس جیسے روشنی میں نہا سی گئی تھی اور جس وجود پر اس کی نظر پڑی تھی۔ اسے دیکھ کر اس کے سینے میں درد سا اٹھا تھا۔

حسب عادت اس نے لمبے گھنے بالوں کی چوٹی باندھی ہوئی تھی۔ سفید سوٹ میں وہ رات کے اس پہر کوئی اپسرا لگ رہی تھی۔ وہ بالکل ویسی ہی تھی۔ لمبا قد، خوب صورت اور متناسب سراپا، بڑی بڑی آنکھوں پہ بار بار گر پڑنے والی گھنی پلکیں۔ جنہیں اکثر وہ مذاق میں بے لگام کہا کرتا تھا۔ اس کے خوب صورت بیضوی چہرے پہ وہی معصومیت وہی نکھار تھا جو کبھی اسے صرف اور صرف بناوٹ اور مصنوعی لگا کرتا تھا۔

اتنی سردی میں وہ شاید ہمیشہ کی طرح چاندنی سے لطف اندوز ہونے رات کے اس پہر ٹیرس پہ آئی تھی۔ ہاتھ میں چائے کا کپ تھا، وہ بہت توجہ سے اسے دیکھتا رہا۔ تب ہی شاید اسے کسی کی نظروں کا ارتکاز محسوس ہوا تو اس نے ادھر ادھر دیکھا، کچھ نظر نہ آیا تو چند لمحوں بعد ہی اس نے لائٹ آف کر دی اور چلی گئی۔

شاویز ذاکر نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس بھری۔ اسی وقت اس کا سیل بجا تھا۔ اس نے بے دلی سے ایس ایم ایس چیک کیا۔ اس کے جگری دوست علی وزیر کا پیغام تھا۔

”یار! تمہاری بھابھی امی کے ہاں ہیں اور تم تو جانتے ہو اس کے بنا ایک پل بھی بتانا مجھے دوبھر ہو جاتا ہے۔ سو اگر جاگ رہے ہو تو شرافت سے جواب دو یا ابھی کال کرو۔“

کتنی ہی محبت اور بے تابیاں سمیٹے ہوئے تھا وہ پیغام اس دشمن جاں کے لیے جو کبھی اس کی متاع حیات





تھی۔ محبت تھی۔ رنگ زندگی تھی۔ اس نے لب کچلتے ہوئے فوراً" ہی وہ پیغام ضائع کردیا تھا۔

اس لمحے کتنے ہی دکھ کتنے ہی کرب اس کی روح میں سرایت کر گئے تھے۔ ندامت کا دکھ کہ اس نے اس پھولوں جیسی لڑکی کے دل سے کھیل کر اسے ناکردہ گناہ کی سزا دی تھی۔

پچھتاوے۔ کا دکھ کہ کہانیوں کے کرداروں سے ہمدردی اور ان کے جذبات سے کھیلنے والوں سے شدید نفرت کرنے کے باوجود وہ حقیقت میں ایک ترسی ہوئی لڑکی کے جذبات سے کھیل گیا۔ بلکہ اسے گناہ گار قرار دے کر اپنے ہی طور پر اسے سزا بھی سنادی۔

اور اک لاحاصل کی تمنا کا کرب۔۔۔ اپنے پیار کو اپنے ہی ہاتھوں پامال کرنے کا کرب۔۔۔

شاویز ذاکر کو سینے میں شدید درد محسوس ہوا تھا۔ کرب سے اس کی آنکھیں بند ہونے لگی تھیں۔ اس نے اپنا وجود ڈھیلا چھوڑ دیا۔

☼ ☼ ☼

"عریشہ! تم کچھ نہیں جانتیں۔۔۔ صرف اس لیے کہ میں نے کبھی تمہیں وہ سب نہیں بتایا جو مجھ پر بیتا۔ تمہارے ابو کی ڈیتھ سے پہلے اور بعد میں جو کٹھن وقت میں نے گزارا۔۔۔ یہ میں ہی جانتی ہوں لیکن میں نے تمہیں ان گھریلو سیاستوں سے دور رکھا۔ صرف اس لیے کہ تم سگے رشتوں سے نفرت محسوس نہ کرنے لگو۔ میں نے ان سب کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ لیکن اب میرے پاس کچھ نہیں بچا۔ میں زیور دے کر اپنے ہاتھ پاؤں نہیں تڑوا سکی۔ مجھے تمہاری شادی بھی کرنا ہے اور میرے پاس کوئی قارون کا خزانہ نہیں۔" عادلہ بولتی چلی گئیں۔

"شاویز۔۔۔ شاویز کدھر ہو بیٹا!" وہ بیڈ پہ لیٹا خواتین ڈائجسٹ میں اپنی پسندیدہ راحت جبیں کا "ساری بھول ہماری تھی" میں مگن تھا کہ بابا کے بار بار پکارنے پہ بھی اس کا ارتکاز نہ ٹوٹ پایا تھا۔ ذاکر علی نے بالآخر اس کے پاس آکے کتاب اس کے ہاتھوں سے جھپٹ لی تھی۔ وہ فوراً" اچھلا تھا۔

"کیا ابو۔۔۔ آپ نے تو ڈرا دیا۔" وہ خفا ہوا۔

"ڈرا تو تم مجھے رہے ہو شاویز! یہ کیا ہر وقت لڑکیوں کی کتابیں پڑھتے رہتے ہو۔" ان کے لہجے میں اکتاہٹ تھی۔

"وہ بے چاری مظلوم لڑکی۔۔۔ اسے رشتہ دار بے وقوف بنارہے ہیں۔" اس نے ناول کا حوالہ دیا۔

"میں کیا کروں یار! تمہیں پتا ہے کھانا پکاتے وقت تم سے بات نہ کروں تو کھانا بدمزا بنتا ہے۔" انہوں نے اس کے کاندھے کے گرد بازو پھیلاتے ہوئے کہا۔

"سوری بابا!" اسے ذاکر علی کے وضاحتی لہجے پہ شرمندگی محسوس ہوئی۔

"چلو' جلدی سے نیچے آجاؤ۔ میں اتنی دیر میں پیاز کاٹتا ہوں۔" وہ آرام سے اس کا کندھا تھپتھپاتے باہر چلے گئے۔ اس نے بھی فوراً" ان کی پیروی کی تھی۔ چند لمحوں بعد ہی وہ بڑے مزے سے باپ کو کھانا پکاتا دیکھ رہا تھا۔ جو مسلسل کسی نہ کسی ٹاپک پر بات بھی کیے جا رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

"امی! میری براؤن سینڈل نہیں مل رہی۔ یہیں تو رکھی تھی میں نے۔" ساری الماری کا حال بگاڑنے کے بعد آخر اس نے اپنی کم گو سی امی جان سے مدد مانگ ہی لی تھی۔

"وہ۔۔۔ وہ تو سمیرا نے مانگی تھی۔ تم رکو میں لے آتی ہوں ابھی۔" سدرہ بیٹی کی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھیں۔ سو فوراً" ہی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ مگر اشنہ نے فوراً" ہی ان کا ہاتھ پکڑ کر رکنے پر مجبور کردیا۔

"کیوں۔۔۔ اسے کیوں دی آپ نے؟" غصے سے اس کی چھوٹی سی ناک لال پڑنے لگی تھی۔

"اسے ضرورت تھی بیٹا! ورنہ وہ تھوڑی ہی مانگتی تم سے؟" سدرہ نے اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا۔

"ساری دنیا کی ایک سے ایک اچھی چیز ہوتی ہے اس کے پاس۔ میں اتنی مشکل سے اپنی پاکٹ منی بچا کے کوئی چیز لیتی ہوں۔ اور وہ بھی آپ فوراً" اسے اٹھا کر دے دیتی ہیں۔ آپ کو مجھ پر بالکل بھی ترس نہیں آتا۔" وہ رونے کے قریب ہوگئی۔

"بیٹا! وہ تمہاری چچا زاد بہن ہے۔ تمہارے چچا کے بعد ان کا رہا ہی کیا ہے۔ اگر تمہاری کوئی چیز اس کی پریشانی حل کرتی ہے۔ تو تمہیں خوش ہونا چاہیے نہ کہ اداس۔" انہوں نے مدھم لہجے میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"پلیز میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔" وہ واقعی ہاتھ جوڑ کے کھڑی ہوگئی تھی۔ "ہر وقت ان کی محرومیوں کا رونا رو رو کر آپ مجھے نفسیاتی مریض بنا دیں گی۔ آپ اور ابو ہر وقت بس ان کی مشکلات حل کرتے رہیں۔ ان لوگوں سے آپ کی اس ہمدردی سے مجھے ایسے لگنے لگا ہے جیسے یتیم سمیرا نہیں' میں ہوگئی ہوں۔" وہ چلائی تھی۔

"اشنہ!" سدرہ نے اسے غصہ سے ٹوکا تو وہ غصے سے پیر پٹختی باہر چلی گئی۔

"اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں اشنہ! بعض اوقات انسان کتنا مجبور ہوجاتا ہے۔ میں جو کچھ جانتی ہوں میری بچی! کاش کہ تم کبھی اس حقیقت سے آگاہ نہ ہو۔ ورنہ تمہارا جینا مشکل ہوجائے گا۔" انہوں نے خود کلامی کرتے ہوئے دوپٹے کے پلو سے اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

☼ ☼ ☼

"شاویز! علی کا فون ہے بیٹا!" وہ بیڈ پہ لیٹا مزے سے کتاب کے مطالعے میں مصروف تھا جب لاؤنج سے اسے بابا کی آواز سنائی دی۔ اس نے نیچے جاتے ہی فون ان سے جھپٹ لیا۔

"موبائل پر کال نہیں کرسکتا؟" شاویز کی تیزی دیکھ کر ذاکر علی مسکرا دیے۔

"بہانے نہ بنا۔ میں جانتا ہوں تجھے تو کتنا تخی ہے۔" اس نے چڑتے ہوئے کہا اور ٹیبل پہ پڑی مونگ پھلیوں پہ ہاتھ صاف کرنے لگا۔

"بس یار! مت پوچھ' آج کل بہت سخت پریشان ہوں۔"

ذاکر علی جو کھانا بنانے کے ساتھ ساتھ شاویز کی گفتگو بھی سن رہے تھے۔ ایک دم چونکے۔

"بس یار! کیا بتاؤں۔ اس عریشہ کی بچی نے تو میرا ناک میں دم کردیا ہے۔"

"عریشہ!" نام سنتے ہی ذاکر علی کے چلتے ہاتھ رک گئے۔

"یار! مجھے تو سمجھ نہیں آتی' یہ لڑکی کیا عقل بغیر پیدا ہوئی ہے۔ ارے نہ سوچا نہ سمجھا۔ اپنا سارا زیور دینے جارہی ہے۔" ذاکر علی آہستگی سے چلتے ہوئے اس کے پاس آکر صوفے پہ بیٹھ گئے۔

"مجھے تو اس کی ماں پر ترس آتا ہے۔ مگر کچھ کر بھی نہیں سکتا۔ سوائے دل جلانے کے۔" وہ مسلسل بول رہا تھا۔ علی شاید صرف ہوں ہاں ہی کررہا تھا۔

"اچھا چل تو کام کر' پھر میں خود تجھے فون کرکے بتاؤں گا تفصیل۔" اس نے خدا حافظ کہتے ہوئے فون بند کردیا تھا اور اگلے ہی لمحے چونک گیا۔ بابا مسلسل اسے گھورے جارہے تھے۔

"کیا؟" وہ ان کی خود پہ جمی نگاہوں کے جواب میں اتنا ہی پوچھ پایا۔

"کتنی مدت سے تمہارے پیچھے پڑا ہوں کہ لڑکی پسند ہے تو بتادو مگر تم نے اتنی بڑی بات چھپائی اپنے بابا سے۔"

"ہاں تو میں نے کب چھپائی۔ پسند آئے گی تب ہی بتاؤں گا ناں۔" وہ حیران ہوا۔

"اچھا بچو! تو پھر یہ عریشہ کون ہے؟" بابا نے جیسے اس کی چوری پکڑلی تھی۔ شاویز کے قہقہے نے البتہ ان کا منہ کھلا رہنے پہ مجبور کردیا تھا۔

"کیا؟" اب کی بار سوال کرنے کی باری ذاکر علی کی تھی۔

"وہ تو میری فیورٹ راحت جبیں کی اسٹوری کی ہیروئن ہے بابا!" شاویز مسلسل ہنسے جا رہا تھا اور ذاکر علی کا دل چاہا کہ وہ اپنا سر ہی پیٹ لیں۔

☼ ☼ ☼

"اس وقت کہاں جا رہی ہو اشنہ؟" انہوں نے ساتھ لیٹی اشنہ کو اٹھتا دیکھا تو فوراً ہی اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"امی! آپ جاگ رہی ہیں۔" وہ حیران ہوئی۔

"ہاں۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔ تم کہاں جا رہی ہو۔" وہ اسے دوبارہ اٹھتے دیکھ کر بولیں۔

"نیند نہیں آ رہی مجھے بھی سوچا جا کر کافی بنا لاؤں۔" اس نے لمبے گھنے سیاہ بالوں کو پونی میں مقید کرتے ہوئے کہا۔

"اس وقت؟ رات کے ایک بج رہے ہیں۔" سدرہ نے اس کا سفید نرم ملائم ہاتھ اپنے ہاتھوں میں نرمی سے دبایا۔

"تو کیا ہوا امی! نیند نہیں آ رہی اور آپ بھی جاگ رہی ہیں۔ تو میں آپ کے لیے بھی بنا دوں گی۔" اس نے حیرانی سے ماں کی سیاہ آنکھوں میں جھانکا۔

"نہیں بیٹا! میرا مطلب تھا تم اس وقت نیچے جاؤ گی تو سب ڈسٹرب ہوں گے ناں۔" سدرہ نے اسے اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہا تو وہ کوفت سے منہ بنا کر رہ گئی۔

یہ گھر اس کے بابا اور چاچا نے مشترکہ طور پر خریدا تھا۔ اوپر کے پورشن میں وہ ہما اور بابا جبکہ نیچے چاچا کی فیملی رہائش پذیر تھی۔ کچن دونوں پورشن کے لیے ایک ہی تھا جو نیچے کے پورشن میں ہی تھا۔ سو واقعی اگر اس وقت وہ نیچے جاتی تو ان سب کی نیند ڈسٹرب ہوتی اور پھر بابا کے ہاتھوں اس کی درگت بنتی۔ چار ماہ پہلے اس کے چاچا کی ہارٹ اٹیک سے ڈیتھ ہو گئی تھی۔ تب سے بابا اور امی ان کی فیملی کے متعلق بہت حساس ہو گئے تھے اور سمیرا اور چاچی کی دلجوئی کے لیے وہ اشنہ کو بھی مجبور کرتے رہتے۔

اشنہ اس تمام صورت حال سے چڑچڑی سی ہونے لگی تھی اور یہی چڑچڑاپن اسے بدمزاج بنا رہا تھا۔ اس وقت بھی اس نے چاچی اور سمیرا کو دل ہی دل میں کوسا تھا اور رخ پھیر کے لیٹ گئی۔

سدرہ اس کے اس انداز پہ دکھی دل سے مسکرا دیں وہ جانتی تھیں کہ صبح تک یہ سب بھول چکی ہو گی۔ انہوں نے مطمئن ہو کے لائٹ بجھا دی۔

☼ ☼ ☼

"اس کا مطلب، اب تم اسلام آباد رہو گے۔ ہاں؟" شاویز نے گرم چائے کا کپ اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ علی اس کا جگری دوست تھا۔ وہ دونوں پندرہ سال سے یہ دوستی نبھاتے آ رہے تھے۔ علی کو بہت اچھی کمپنی میں اعلیٰ عہدے پہ جاب مل گئی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ اسلام آباد شفٹ ہو رہا تھا۔ شاویز کے لیے یہ خبر شاکنگ تھی۔

"جانا تو پڑے گا یار! اب اتنی اچھی آفر کون چھوڑے گا بھلا۔" علی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"علی بیٹا! کچھ اپنے دوست کو بھی سمجھاؤ یار۔ یہ تو بس سارا دن لڑکیوں والے ڈائجسٹ ہی پڑھتا رہتا ہے۔" ذاکر علی بھی وہیں چلے آئے۔

"یہ ڈائجسٹ تو میں خود بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔ مگر صرف شاویز کی زبانی۔" علی نے ہنس کر کہا تو شاویز مسکرا دیا۔

"اور پھر شاویز کو نوکری کی ٹینشن بھی تو نہیں ہے ناں، اپنا بزنس ہے اس کا اور آئی تھنک، بہت کامیابی سے چلا بھی رہا ہے یہ۔" اس نے کھلے دل سے شاویز کی تعریف کی۔

"پھر بھی یار! میں چاہتا ہوں یہ گھریلو طور پہ بھی سیٹ ہو جائے۔ لیکن یہ ہے کہ اسے کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آئی۔" ذاکر علی نے فکرمندی سے کہا۔

"ہاں شاویز! انکل کی یہ بات تو بالکل ٹھیک ہے اب جبکہ تم سیٹل ہو چکے ہو تو تمہیں یہ فیصلہ جلدی کر لینا چاہیے۔" علی نے اس بار ذاکر علی کی سائیڈ لی تھی۔

"میں نے کب انکار کیا ہے۔ مگر میں چاہتا ہوں کسی ایسی لڑکی سے شادی کروں جو مخمل کی طرح حالات کی ستائی ہوئی ہو۔" اس نے پرعزم لہجے میں کہا۔

"مخمل... یہ کون ہے؟" ذاکر علی اور علی وزیر دونوں ہی یک زبان ہو کے بولے تھے۔

"نمرہ احمد کا ناول پڑھ رہا ہوں آج کل اس کی..." وہ بات مکمل نہ کر سکا۔ علی وزیر اس پہ چڑھ دوڑا تھا جبکہ ذاکر علی نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

☼ ☼ ☼

"شاویز... شاویز! بیٹا تم ٹھیک تو ہو۔" ریوالونگ چیئر پہ بے سدھ پڑے شاویز کو دیکھ کر وہ بے حد پریشان ہو گئے تھے۔ تب ہی اس کا چہرہ تھپتھپانے لگے۔ چند ہی سیکنڈز میں اس نے دھیرے سے آنکھیں کھول دیں۔

"بابا آپ؟" اس کی خوب صورت براؤن آنکھوں میں حیرانی تھی۔

"ہاں بیٹا! پانی پینے نکلا تو اسٹڈی روم سے ہلکی سی روشنی آتی دیکھی۔ میں سمجھا شاید کھڑکیاں کھلی رہ گئی ہوں۔ تب ہی یہاں چلا آیا۔ مگر یہاں آیا تو... تم نے تو میری جان نکال دی۔" مسکرا کر کہتے ہوئے وہ اس کے برابر ہی کرسی گھسیٹ کے بیٹھ گئے۔

"سب ٹھیک ہے ناں بیٹا؟" انہوں نے دوبارہ استفسار کیا۔

"آپ نے سچ کہا تھا بابا! کئی بار جو کچھ ہمیں دکھائی دیتا ہے وہ سچ نہیں ہوتا۔ ہم کسی کے رویے، لہجے سے اس کے کردار کے بارے میں کوئی اندازہ یا فیصلہ کر سکتے ہیں مگر ہمارا وہ اندازہ یا فیصلہ کتنے فی صد درست یا غلط ہو سکتا ہے ہمیں یہ معلوم نہیں ہوتا۔ سچ جھوٹ کی پہچان واقعی بہت مشکل کام ہے۔" اس کے لہجے میں کتنی اداسی تھی۔ ذاکر علی اسے دیکھتے رہ گئے۔

"اور میں نے تم سے یہ بھی کہا تھا بیٹا! کہ جو بھی فیصلہ کرنا۔ اسے دل سے نبھانا۔ کبھی پچھتانا مت۔"

انہوں نے شاید کچھ یاد دلانا چاہا۔ شاویز نے ایک زخمی مسکراہٹ اچھالی تھی۔

"نبھا تو رہا ہوں۔ میں نے کب اس سے انکار کیا۔"

"میں سوچ رہا تھا کیوں نہ ہم اپنے پرانے محلے شفٹ کر جائیں۔ ویسے بھی وہ گھر تم نے بیچنے تو نہیں دیا تھا۔" ذاکر علی نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

"ابھی میں نے رشنہ کو دیکھا بابا!" شاویز نے شاید ان کی بات نہیں سنی تھی۔

"ہاں۔ صبح آئی تھی ہم سے ملنے۔" بابا ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئے۔

"کس وقت؟" وہ چونکا۔

"تمہارے آفس جانے کے کچھ دیر بعد۔" انہوں نے سادہ سا جواب دیا۔

"اوہ۔ یقیناً" اس نے مجھے جاتے دیکھ لیا ہو گا۔ ویسے بھی وہ مجھ سے ملنا بھی کیوں چاہے گی۔ میں نے اس کے ساتھ کیا بھی تو بہت برا۔" وہ نادم تھا۔

"اشنہ بہت اچھی بچی ہے۔ تم نے واقعی اس کے ساتھ بہت برا کیا شاویز۔ مگر اللہ نے تو اس کے ساتھ اچھا کیا۔ میرے لیے اور تمہارے لیے یہی کافی ہونا چاہیے یار! تم اپنے کیے پر شرمندہ ہو تو اس سے معافی مانگ لو۔ تمہاری زندگی آسان ہو جائے گی۔" انہوں نے کچھ دیر توقف کیا پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"رات بہت ہو چکی ہے۔ میرے خیال میں تمہیں سو جانا چاہیے۔ سمیرا کی آنکھ کھل گئی تو وہ بھی پریشان ہو جائے گی۔" وہ اس کا کندھا تھپتھپا کے باہر چلے گئے اور وہ سوچنے لگا کہ کیا واقعی سمیرا اس کے لیے پریشان ہو سکتی ہے۔ اس نے ایک طنزیہ مسکراہٹ خود پہ نچھاور کی تھی اور خود ہی نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اسے آج کالج کے لیے بہت دیر ہو گئی تھی۔ وہ تیزی سے قدم اٹھاتی موڑ مڑنے لگی کہ سامنے سے آنے والی سیاہ کرولا کو بالکل نزدیک پا کے اس کے ہوش اڑ گئے۔ اس سے پہلے کہ گاڑی اسے روند ڈالتی۔ گاڑی چلانے والے نے کمال مہارت سے گاڑی گھمائی تھی اور گاڑی روڈ کی دوسری سائیڈ پہ لگے قد آور درخت سے ٹکراتے ٹکراتے بچی تھی۔ گاڑی رکتے ہی وہ فوراً" نیچے اتر کر اس لڑکی کی طرف دوڑا۔ وہ خوف سے آنکھیں بند کیے ابھی تک وہیں بیٹھی تھی۔

"آر یو آل رائٹ؟" شاویز ذاکر نے دھیرے سے اپنا دایاں ہاتھ اس کے دائیں ہاتھ پہ رکھا تھا۔ لڑکی نے آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھولیں اور شاویز کو لگا جیسے دنیا جہان کی خوب صورتی قدرت نے بس جیسے ان دو کالی سیاہ آنکھوں میں ڈال دی ہو۔ لمبی گھنی لرزتی پلکوں نے اس کے دل میں طوفان مچا دیا تھا۔ اشنہ بے حد خوف زدہ تھی۔ شاویز حیرانی سے اسے تکے گیا۔

"تم ٹھیک ہو؟" اس نے ایک بار پھر پوچھا مگر بجائے جواب دینے کے اشنہ دوبارہ آنکھیں موند کے وہیں سڑک پہ ڈھے گئی۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

"غلام علی، دیکھ تو جانتا ہے سمیرا مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے۔" سیاہ رات میں صحن میں لگے درختوں تلے گنڈ سایوں میں سے ایک نے جیسے سرگوشی سی کی۔

"تو مجھے بھی کیا وہ کم عزیز ہے۔ اشنہ سے تو زیادہ ہی چاہتا ہوں اسے۔" بھاری مردانہ لہجہ نشے سے مخمور تھا۔

"ہاں، تب ہی تو وہ اشنہ کی اترن پہنتی ہے۔" باریک نسوانی آواز طنز سے بھرپور تھی۔

"میں تو ان کو کچھ نہیں دیتا سوائے مہینے کے راشن کے۔ سب تمہارے ہاتھ پہ رکھ دیتا ہوں۔" دبی دبی آواز میں کہتا وہ اس کے نزدیک ہوا۔

"ہاں یہ لعنت بھی مجھ پہ ڈال دے کہ تیرا سب کچھ میں ہی لٹا رہی ہوں اگر تو نہیں دیتا تو پھر کون سا ایسا خزانہ دبا رکھا ہے ان دونوں نے جو اتنے مہنگے مہنگے سوٹ لے لیتی ہے تیری بیٹی۔" تلخی سے بھرپور لہجے میں کہا گیا۔

"اچھا بابا۔ کل کرتا ہوں پتا۔ بس اب خوش۔ اب تو آرام سے بیٹھ کر کچھ دو چار میٹھے بول بول دے۔" مرد نے باقاعدہ ہاتھ جوڑے تھے۔ کھنکتے ہوئے قہقہے سے فضا گونج اٹھی تھی۔

☼ ☼ ☼

"اشنہ اتنی دیر کہاں لگا دی بیٹا!" اسے گھر پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی تھی تب ہی اپنے پورشن میں آتے ہی سدرہ اس کی طرف لپکی تھیں۔

"سوری امی! بس ایک حادثہ ہو گیا تھا چھوٹا سا۔" وہ ان کی پریشانی پہ جی بھر کے شرمندہ ہوئی۔

"یا اللہ خیر! کیا ہوا؟" وہ اور گھبرا گئیں۔

"کچھ نہیں امی! بس ایک کار سے ٹکر ہوتے ہوتے بچ گئی۔" اس نے مسکراتے ہوئے ان کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"زیادہ چوٹ تو نہیں آئی اشنہ!" انہوں نے باقاعدہ اس کے ہاتھ پیر چیک کیے۔ ان کی بے تابی و پریشانی پہ وہ دل سے مسکرا دی۔

"اوہ امی! میں ٹھیک ہوں۔ آپ آرام سے بیٹھیں۔" اس نے سدرہ کو کاندھوں سے پکڑ کر اپنے پاس بیڈ پہ بٹھاتے ہوئے کہا۔

"اصل میں ایکسیڈنٹ نہیں ہوا۔ مگر ڈر کے مارے آپ کی یہ بہادر بیٹی بے ہوش ہو گئی۔ جس کی وجہ سے وہ نیک دل انسان مجھے ہسپتال لے گیا۔ بس پھر گھر کی راہ لی۔" اس نے مختصراً" بیان کیا۔

"اسی لڑکے نے تمہیں چھوڑا یہاں؟" سدرہ اب جا کے مطمئن ہوئیں۔

"نہیں۔ اس نے ضد تو بہت کی مگر میں نے مناسب نہ سمجھا۔ اچھا اب پلیز! آپ مجھے ایک کپ اچھی سی چائے پلا دیں۔ بہت تھکاوٹ محسوس ہو رہی ہے مجھے۔"

اس نے لاڈ سے کہا تو سدرہ اثبات میں سر ہلاتے فوراً" اٹھ گئیں۔ وہ وہیں بیڈ پہ ڈھے گئی۔ براؤن آنکھوں سے مسکراہٹ اچھالتا وہ خوبرو نوجوان جیسے پوری شان سے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ وہ دل سے مسکرا دی تھی۔

☼ ☼ ☼

آج بہت دنوں بعد دھند چھٹی تھی۔ دن بہت صاف تو نہیں تھا مگر پھر وہ سورج کی مدھم کرنیں حرارت دینے میں کامیاب رہی تھیں۔ وہ سدرہ کو کچن میں مصروف دیکھ کر سفید چادر لے کر باہر چلی آئی۔ گھر سے کچھ ہی فاصلے پہ پارک تھا۔ وہ صاف ستھری سڑک پہ دھیرے دھیرے قدم جماتی پارک کی طرف بڑھنے لگی۔

پارک میں داخل ہوتے ہی اسے خوشگوار سا احساس ہوا تھا۔ پارک تقریباً" خالی تھا اکا دکا فیملیز ہی نظر آ رہی تھیں۔ اسی وقت اس کی نظر سامنے سے آنے والے اس شخص پر پڑی تھی۔ وہ تیز تیز چلتا اسی کی طرف آ رہا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں میں چبھن سی محسوس ہوئی۔ وہ فوراً" واپس مڑی۔ وہ اس شخص کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ جس نے اسے خوابوں سے پلکیں سجانا سکھایا اور پھر اپنے ہاتھوں سے ہی ان خوابوں کو چکنا چور کر کے اس کی آنکھوں میں کرچیاں بھر گیا۔ اس کا مان، اعتماد اور سب سے بڑھ کر اس کی ذات کو روند ڈالا تھا اس شخص نے۔ وہ تیزی سے قدم اٹھاتی پارک سے باہر آ گئی۔ تب ہی اچانک وہ شخص اس کے ہم قدم ہوا تھا۔

"اشنہ! پلیز ایک بار میری بات سن لو۔ پلیز۔" وہ ملتجی ہوا۔ ان دونوں کے قدم تھمے نہیں تھے۔

"آخری بار اشنہ..... میں پھر کبھی تمہارے راستے میں نہیں آؤں گا۔"

وہ دوبارہ اسی منت بھرے لہجے میں بولا تھا۔ مگر وہ تیزی سے سڑک پار کر گئی تھی۔ وہ گھر کے اندر چلی گئی مگر شاویز دیر تک اس کے گھر کے دروازے کو تکتا رہا۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم! میں اشنہ ہوں۔ یہیں بالکل آپ کے سامنے والے بنگلو میں رہتی ہوں۔ آپ لوگ نئے

آئے ہیں تو میں نے سوچا کیوں نہ میٹھا بنا کر لے آؤں۔ تاکہ آپ کی اس محلے میں آمد خوشگوار ہو جائے۔"

گلابی رنگ کے کاٹن کے سوٹ میں نازک سی لڑکی ذاکر علی کے گیٹ کھولتے ہی اندر چلی آئی اور تواتر سے بولتی گئی۔ وہ بے حد دلچسپی سے اسے دیکھے گئے۔ انہیں اس طرح دیکھتا پاکے وہ جھٹ سے خاموش ہوئی۔

"سوری! اصل میں اتنا بولتی تو نہیں ہوں میں مگر آپ نئے ہیں تو میں نے سوچا تعارف مکمل ہونا چاہیے۔" وہ وضاحتی لہجے میں بولی تو ذاکر علی مسکرا دیے۔ آج انہیں اس نئے گھر میں پہلا دن تھا۔

"ارے نہیں بیٹا! بلکہ میں تو بور ہو رہا تھا۔ اللہ نے تمہاری شکل میں بیٹی بھیج دی۔" وہ واقعی اس سے مل کر بے حد خوش ہوئے۔

"اچھا' آپ یہ رکھ لیں۔" اس نے ہاتھ میں پکڑے برتن میز پہ رکھتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! کبھی دل چاہے تو آجایا کرنا۔" اللہ نے کوئی بیٹی تو دی نہیں مگر تم آؤ گی تو یہ کمی بھی پوری ہو جائے گی۔" انہوں نے دل سے کہا تو اشنہ مسکرا دی۔

"اچھا' پھر تو مزا آئے گا کیونکہ مجھے بھی بابا کی بہت ضرورت ہے۔" وہ رکی۔ "اوہ! میں کیا آپ کو بابا کہہ کر پکار سکتی ہوں؟" اس نے سوال کیا۔

"وائے ناٹ۔ لیکن تمہارے باپ کے بارے میں جان کر افسوس ہوا۔" انہوں نے افسوس سے کہا تو وہ معصومیت سے انہیں تکنے لگی۔

"کیا جان کر؟" اس کے لہجے میں حیرانی تھی۔

"یہی کہ آپ کے ابو حیات نہیں ہیں۔" انہوں نے افسوس بھرے لہجے میں کہا تو اشنہ کی پلکیں بھیگنے لگیں۔

"الحمد اللہ انکل! میرے ابو زندہ ہیں۔ مگر پتا نہیں کیوں انہیں میں بالکل اچھی نہیں لگتی۔" معصومیت سے کہتی وہ پلٹنے لگی تو ذاکر علی کو مزید دکھ ہوا۔

"مگر ہمیں تو تم بہت اچھی لگی ہو۔"

"سچ میں؟" وہ پل بھر میں پرانی جون میں واپس آ چکی تھی۔

"ہاں بھئی بیٹیاں تو سب ہی پیاری ہوتی ہیں۔ ہماری دوستی پکی۔

اپنا سیل نمبر بتاؤ۔" اشنہ نے نمبر بتایا تو انہوں نے محفوظ کر لیا۔



آج بابا جلدی سو گئے تھے۔ سو وہ آرام سے اسٹڈی میں اپنا کوئی پسندیدہ ناول پڑھ سکتا تھا۔ وہ اطمینان سے اپنے لیے کافی بنا کر سٹڈی میں آیا۔ ریوالونگ چیئر پہ بیٹھ کر اپنی کتاب اٹھا کر پڑھنے لگا۔ تب ہی ان کے گھر کے سامنے والے بنگلے کے ٹیرس پہ روشنی چمکی۔ اس نے بلا ارادہ ہی نظریں اٹھا کر ادھر دیکھا اور حیران رہ گیا۔ وہ وہی لڑکی تھی جس کی اس کی کار سے ٹکر ہوتے ہوتے بچی وہ کتنے دنوں سے اسے تلاش رہا تھا۔ کتنی ہی بار اس جگہ کھڑا انتظار کرتا رہا کہ شاید وہ ایک بار پھر اس راہ سے گزرے۔ اور آج جب وہ مایوس ہو کر اس جگہ نہیں گیا تو خدا نے اسے اس کے سامنے لا کھڑا کیا۔ اس کے ہونٹوں پہ بہت ہی خوب صورت مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔

"کیا ہو رہا ہے برادر!" اسی وقت اس کے موبائل پہ علی وزیر کا میسج آیا۔

"بس یار! سمجھو تمہاری بھابھی مل گئی۔" اس نے پر مسرت انداز میں ٹیکسٹ ٹائپ کیا۔

"ریئلی....؟" دوسری طرف حیرانی تھی۔

"ہاں' مگر فی الحال پلیز خاموش رہنا۔ جب تک میں لاسٹ ڈیسیجن نہ لے لوں۔"

"اوکے اوکے۔" علی وزیر نے بہت ہی پیاری اسمائل بھیجی تھی اسے۔

اسی وقت ٹیبل پہ پڑے ذاکر علی کے موبائل پہ میسج ٹون بجی تھی۔ اس نے یونہی سیل اٹھا کر دیکھا۔

"نیو ایس ایم ایس فرام اشنہ" وہ جی بھر کے حیران ہوا۔ اس نے میسج کھولا۔

"کیا ہو رہا ہے فرینڈ؟" بہت ہی دوستانہ انداز تھا بھیجنے والی کا۔ "بابا اور کسی لڑکی سے دوستی۔" اس نے

حیرانی سے سوچا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے ٹائپ کرنے لگا۔

"تمہارے ایس ایم ایس کا انتظار" تب ہی اس کی نظر سامنے والی ٹیرس پہ پڑی۔ وہ لڑکی بھی شاید پیغام ٹائپ کر رہی تھی۔ پھر اس کے بابا کے سیل پہ بِیپ ہوئی۔ "ہاہاہا۔"

اسے شک سا ہوا۔ اس نے بابا کا سیل اٹھایا اور اشنہ کے نام پہ بیل دینے لگا۔ اس کی نظریں سامنے کھڑی لڑکی پہ جمی تھیں اور واقعی اس کا شک صحیح نکلا تھا۔ اس لڑکی کا فون بجنے لگا تھا۔ مگر اس نے فوراً ہی کال کاٹ دی تھی اور چند سیکنڈ بعد ہی پیغام چمکا۔

"امی سو رہی ہیں۔ ہماری باتوں سے ڈسٹرب ہوں گی۔" شاویز دل ہی دل میں مسکرا دیا۔

☆ ☆ ☆

"اشنہ! مجھے تمہاری وہ وائٹ شال کی ضرورت ہے جس پہ فیروزی پھول کڑھے ہوئے ہیں۔" اشنہ پیپرز کی تیاری کر رہی تھی کہ سمیرا نے آ کے اسے ڈسٹرب کر دیا۔

"تم اندھی ہو؟" نہایت بدتمیزی سے کہتی اشنہ سدرہ کو حیران کر گئی۔

"کیا۔ کیا مطلب؟" سمیرا گڑبڑائی۔

"خود تو تم ہو ہی گنوار۔ مجھے بھی اپنے جیسا بنانا چاہتی ہو۔ میں پڑھ رہی ہوں تمہیں دکھائی نہیں دیتا؟" وہ اور چیخی۔

"مگر؟" سمیرا نے بولنے کی کوشش کی مگر اشنہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

"اگر مگر کچھ نہیں، یہاں سے دفعان ہو جاؤ۔" وہ چلائی۔

"اشنہ!" سدرہ نے اسے تنبیہی لہجے میں پکارا تو وہ غصے سے پیر پٹختی کتابیں اٹھا کر ٹیرس پہ چلی گئی۔ سمیرا کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ آنکھیں رگڑتی نیچے دوڑ گئی۔ سدرہ اسے پکارتی رہ گئیں۔

☆ ☆ ☆

"دراز پلکیں ۔۔۔ وشال آنکھیں
مصوری کا کمال آنکھیں

ہزاروں ہی ان سے قتل ہوں گے
خدا کے بندے سنبھال آنکھیں"

نئے نمبر سے موصول ہونے والا پیغام اسے جی بھر کے حیران کر گیا۔ اس نے کسی خیال کے تحت پیغام ٹائپ کیا۔

"کیا آپ کو جانتی ہوں میں؟"

چند لمحوں بعد ہی پیغام حاضر تھا۔

"میں۔ مگر شاید میں آپ کو یاد نہ رہا ہوں۔ لیکن آپ کی آنکھیں مجھے سونے نہیں دیتیں۔" وہ چونکی اور تب ہی اس کے ذہن میں کسی کی تصویر ابھری تھی وہ مسکرائی مگر جواب نہ دیا۔

"معذرت اگر برا لگا ہو تو۔ لیکن میں آپ سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔ سادہ، بے ضرر دوستی۔" اگلا پیغام حاضر تھا۔

"میں لڑکوں سے دوستی نہیں کرتی۔" اس نے سادہ الفاظ میں انکار کر دیا۔

"اچھا تو ذاکر علی کیا خاتون ہیں؟" پیغام کے آگے زبان دکھاتی اسمائلی نے اسے ہنسنے پہ مجبور کر دیا۔

"آپ ہنستی بہت پیارا ہیں۔" وہ چونکی تھی۔ تب ہی اس کی نظر سامنے والے خوب صورت بنگلے کی کھڑکی میں کھڑے اس وجود پہ پڑی۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا اور پھر موبائل پہ کچھ ٹائپ کرنے لگا۔

"اس نظرِ کرم کا شکریہ۔" اشنہ جی بھر کے حیران ہو گئی۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے سوال ٹائپ کیا "آپ ذاکر انکل کے۔۔۔؟"

"بیٹا ہوں جناب عالی کا۔ شاویز ذاکر۔" مسکراتا جواب حاضر تھا۔ اس نے منہ چڑاتی ہوئی شکل بھیجی تھی اور لائٹ بند کر کے اندر چلی گئی۔ اس رات اشنہ کو کسی رویے، کسی وجود سے ملی کوئی ٹینشن یاد نہ آئی۔ وہ رات اس نے پہلی مرتبہ حسین سپنوں میں بسر کی تھی۔

بالکل ایک عام سی لڑکی کی طرح۔۔۔

☆ ☆ ☆

"شاویز! بیٹا تمہاری پسندیدہ رائٹر کا پلے آ رہا ہے۔ جلدی آؤ۔" وہ لیپ ٹاپ پہ مصروف تھا جب ذاکر علی نے اسے نیچے لاؤنج سے آواز دی۔ وہ لیپ ٹاپ بند کر کے چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر اٹھ کر باہر چلا آیا۔ سیڑھیوں سے لاؤنج کے وسط میں پڑے ٹیلی ویژن کی اسکرین اسے واضح نظر آ رہی تھی۔ "زرد موسم" کا ٹائٹل چل رہا تھا۔ وہ چند لمحے خالی نظروں سے اسکرین کو گھورتا رہا۔

"شاویز! جلدی آؤ ناں۔" بابا اسے دوبارہ بلا رہے تھے۔ وہ چونکا۔

"نہیں بابا! میں نہیں آ رہا۔" اس نے اس سے انہیں جواب دیا۔

"کیوں یار، ایمن کی لائف پھر بگڑنے لگی ہے۔ پتا نہیں کب عقل آئے گی اس لڑکی کو۔" شاویز اور علی کی تعریفوں سے قائل ہو کے وہ اب خود باقاعدہ نہ صرف ڈراما دیکھنے لگے تھے۔ بلکہ باقاعدہ طور پہ خواتین ڈائجسٹ کے سالانہ خریدار بھی بن چکے تھے۔

"نہیں بابا! مجھے اب عریشہ، مخمل اور ایمن سے کوئی ہمدردی نہیں رہی۔ ان فیکٹ مجھے تو اپنے آپ سے ہمدردی ہونے لگی ہے۔" اس نے مایوس لہجے میں جواب دیا تھا اور اندر مڑ گیا۔ ذاکر علی نے اداسی سے ٹی وی آف کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"آؤ میں چھوڑ دوں تمہیں۔" گاڑی کا دروازہ اس کے لیے کھولتے ہوئے شاویز نے کہا تو اشنہ جو اپنے ہی خیالوں میں گم چلی جا رہی تھی چونک پڑی۔

"نہیں، میں ٹھیک ہوں۔" اس نے صاف انکار کر دیا۔

"تمہیں مجھ پہ اعتبار نہیں؟" وہ ناراض ہوا۔

"بات اعتبار کی نہیں، اصول کی ہے۔ میں اس طرح کسی کی گاڑی میں نہیں بیٹھ سکتی۔"

"کہاں جا رہی ہیں آپ؟"

"یہاں قریب ہی جانا ہے۔ دو گلیاں آگے ٹیوشن سینٹر ہے۔"

"اوہ ٹیوشن۔ مجھے کہہ دیا ہوتا۔ میں بھی بہت اچھا ٹیچر ہوں۔" شاویز نے مسکراتے ہوئے کہا تو اشنہ چپ چاپ اسے دیکھے گئی۔ وہ کتنا لاپروا سا تھا۔ بالکل بے فکر۔ اشنہ کو اس پہ رشک آیا۔

"نہیں! میں وہاں ٹیوشن پڑھاتی ہوں۔" اس نے مدہم لہجے میں کہا اور آگے بڑھ گئی۔ شاویز کو شاید اس جواب کی توقع نہ تھی۔ اتنے اچھے گھر میں رہتے ہوئے وہ ٹیوشن کیوں پڑھا رہی تھی۔ شاویز کو لگا وہ واقعی وہی لڑکی ہے۔ جس کی اسے تلاش تھی۔

☆ ☆ ☆

"تمہاری جرأت کیسے ہوئی سمیرا سے اس لہجے میں بات کرنے کی۔" غلام علی بے حد غصے میں تھے۔ سدرہ سہمی سی دیوار سے لگی کھڑی تھیں۔ وہی ہوا جس کا انہیں ڈر تھا۔ سمیرا نے زلیخا اور زلیخا نے فوراً جیٹھ سے شکایت لگا دی تھی اور غلام علی پورے جلال سے اشنہ پر برسنے لگے تھے۔ مگر وہ بھی ان کی ہی بیٹی تھی۔ اس کے چہرے پہ خوف کا شائبہ تک نہ تھا۔

"میں اس کے پاس نہیں گئی۔ بلکہ یہ مجھے تنگ کرنے آئی تھی۔" وہ بھی دوبدو بولی۔

"تنگ کرنے۔ تم اس کی بڑی بہن ہو۔ تمہاری چیزوں پہ اس کا بھی اتنا ہی حق ہے۔" انہوں نے سمیرا کو خود سے نزدیک کیا۔ اشنہ کی آنکھیں جلنے لگیں۔

"نہیں ہے یہ میری بہن اور نہ ہی میری کسی چیز پہ اس کا حق ہے۔" وہ چلا اٹھی۔

"یہ تربیت دے رہی ہو تم اسے؟" غلام علی سدرہ کی طرف بڑھے۔ وہ دل و جان سے کانپ گئیں۔

"نہیں دے رہیں مجھے یہ کوئی تربیت۔" اس نے بڑھ کر ماں کو گلے سے لگا لیا۔ "آپ کے رویے نے مجھے یہ سب کرنے پہ مجبور کیا ہے۔ سنا آپ نے؟" وہ دھاڑی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ میں ابھی زلیخا سے کہہ دیتا ہوں۔ تمہاری تعلیم کا خرچا۔ کالج جانا سب بند۔ میں دیکھتا ہوں کیسے اکڑتی ہو تم....." وہ غرائے تھے۔

"وہ مجھے ایک پیسہ بھی نہیں دیتیں۔ میں خود اپنا خرچا اٹھاتی ہوں۔ سنا آپ نے؟ اوکے۔" اس نے جیسے ان کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی۔

"تم بالکل اپنی ماں پہ گئی ہو۔ زلیخا کی کوئی اچھائی مان ہی نہیں سکتیں تم۔" سمیرا کو لیے وہ غصے سے کمرے سے باہر چلے گئے۔ سدرہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھیں۔

اشنہ مضبوطی سے لب بھینچے انہیں دلاسا دیتی رہی۔ اسے اپنے باپ سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔

☼ ☼ ☼

پارک میں بینچ پہ تنہا بیٹھی اشنہ ہر کسی کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ وہ گہری سوچ میں گم بیٹھی تھی۔ آنکھوں میں تیرتی نمی نے اس کی خوب صورت سیاہ آنکھوں کی چمک میں کچھ اور اضافہ کر دیا تھا۔ چہرے پہ بلا کی معصومیت چھائی ہوئی تھی۔ جاگنگ کرتے شاویز کی نظر جونہی اس پہ پڑی وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا آس پاس ہی آکر بیٹھ گیا۔ آہٹ پہ وہ چونکی۔

"پریشان ہو دوست!" شاویز کی گمبھیر آواز اور دوستانہ لہجے نے اس کے آنکھوں میں نمکین پانی بھر دیا۔ پھر بھی اس نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

"تم نے مجھے دوست بنایا اور اب مجھے اپنی پریشانی نہ بتا کر تم میری دوستی کو شرمندہ کر رہی ہو۔" وہ مسکرایا تھا۔

"وہ مجھے بالکل بھی اچھی نہیں لگتی۔ میرا دل چاہتا ہے میں اسے قتل کر دوں۔" اس نے نہایت غصے سے کہا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو؟" وہ بغور اس کا جائزہ لینے لگا۔ اشنہ سٹپٹا گئی۔

"یار! دیکھنے میں تو تم بہت معصوم لگتی ہو۔ مگر ارادے تو تمہارے بہت خطرناک ہیں۔" اس نے ڈرنے کی اداکاری کی تو اشنہ ہنس دی۔ وہ بھی مسکرا دیا۔

"ویسے یہ ہے کون۔ جس نے میری دوست کو اس قدر پریشان کر رکھا ہے؟" اس نے سوال کیا۔

"میں چلتی ہوں امی انتظار کر رہی ہوں گی۔" وہ اٹھ کر تیز تیز قدم اٹھاتی دور چلی گئی۔

شاویز اس دھوپ چھاؤں والے مزاج والی لڑکی کو بس گھور کے رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

"آج تم نے بلیک سوٹ کیوں پہنا؟" وہ ٹیرس پہ چاندنی انجوائے کرنے آئی تھی کہ کھٹ سے شاویز کا پیغام چلا آیا۔ اس نے سامنے دیکھا۔ وہ اسے ہی گھور رہا تھا۔ وہ مسکرا دی۔

"کیوں آپ کو کالا رنگ پسند نہیں؟" اس نے جواب بھیجا۔

"بہت پسند ہے مگر تمہاری بے لگام پلکوں تک۔"

"بے لگام پلکیں؟" وہ حیران ہوئی۔

"ہاں، جب جی چاہتا ہے اٹھ جاتی ہیں جب دل کرتا ہے گر پڑتی ہیں۔" وہ اس کا جواب پڑھ کر پھر سے مسکرا دی۔

"اشنہ! ایک بات کہوں۔" نجانے کیوں اس کا دل زور سے دھڑکا تھا۔ اس نے جواب ٹائپ نہیں کیا۔

"مجھے لگتا ہے۔ میں دوستی سے بہت آگے بڑھ آیا ہوں اشنہ۔" وہ ویسے ہی ساکت کھڑی رہی۔

"کیا میں تمہارا ہم سفر بننے کے قابل ہوں؟" اس نے دھیرے سے کچھ ٹائپ کیا اور میسج بھیج دیا۔ شاویز نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔ اشنہ جلدی سے اندر چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

"سر! غلام علی تو آج چھٹی پہ ہیں۔" پیون کی اطلاع پہ اس کا سر چکرا کر رہ گیا۔

"ان کے پاس تو بہت ضروری کاغذات تھے جو آج ہی مجھے اسلام آباد بھجوانا تھے۔" وہ فکر مند ہوا۔ "تم ایسا کرو ان کی فائل سے ذرا ان کا ایڈریس یا فون نمبر لے کر آؤ۔"

شاویز نے پیون کو کہا اور خود دوسری فائلز چیک کرنے لگا۔ کچھ لمحوں بعد ہی پیون لوٹا تو اس کے پاس غلام علی کا سارا بائیو ڈیٹا موجود تھا۔ ایڈریس دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا تھا۔ یہ وہی بنگلو تھا جہاں اشنہ رہتی تھی۔

"تو کیا اشنہ!" وہ بے حد حیران ہوا۔ اس نے خود وہاں جانے کا فیصلہ کیا اور گاڑی کی چابی اٹھا کر آفس سے باہر نکل آیا۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم۔" دروازہ کسی لڑکی نے کھولا تھا۔ شاویز اسے پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ گندمی رنگت پہ کھلتی گلابیاں اس کی کشش میں اضافہ کر رہی تھیں۔ اس نے بہت ہی قیمتی کپڑے زیب تن کر رکھے تھے۔ شاویز انجانے میں ہی اس کا اشنہ سے موازنہ کرنے لگا۔

"جی!" سمیرا ایک اجنبی جوان کو دیکھ کر مرعوب لہجے میں بولی۔

"غلام علی ہیں؟ میں ان کے آفس سے۔" وہ اتنا ہی بول پایا۔

سمیرا نے اسے اندر آنے کے لیے راستہ دے دیا تھا۔ وہ اسے اپنی ہمراہی میں لاؤنج میں لے آئی۔ دیوار سے لگے تخت پہ غلام علی تکیے سے ٹیک لگا کے لیٹے ہوئے تھے۔ شاویز کو دیکھتے ہی انہوں نے اٹھنے کی کوشش کی۔

"اٹس اوکے! کیسی طبیعت ہے اب۔" شاویز ان کے قریب ہی جا کر بیٹھ گیا۔

"بس معمولی سی کمزوری ہے سر! امید ہے جلد ہی ٹھیک ہو جائے گی۔" نقاہت ان کی آواز سے عیاں تھی۔

"نہیں! آپ مکمل آرام کریں۔ میں اصل میں کاغذات لینے آیا تھا۔"

"سر! آپ نے ناحق تکلیف کی۔ ابھی تو اشنہ گھر پہ نہیں ہے۔ میں اس کے ہاتھ بھجوا دوں گا۔" غلام علی کی بات سن کر شاویز چونک گیا۔ تب ہی زلیخا بھی وہیں آگئیں۔ شاویز جیسے ہینڈسم اور امیر کبیر لڑکے کو دیکھتے ہی ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"آپ ان کو بھیج دیں۔ یہ لے آئیں گی۔" اس نے کہا۔

"نہیں سمیرا اتنی سمجھ دار نہیں ہے۔ کاغذات اوپر الماری میں ہیں۔ اشنہ ہوتی تو ابھی اٹھا کے لے آتی۔" اشنہ کی سمجھ داری جان کر شاویز کو دل ہی دل میں عجیب سی خوشی محسوس ہوئی۔ وہ اِدھر اُدھر کی چند باتوں کے بعد جانے کے لیے اٹھا تو زلیخا خود اسے چھوڑنے گیٹ تک آئیں۔

"خفا مت ہونا بیٹا! اصل میں سمیرا اتنی پڑھی لکھی نہیں، جتنی اشنہ ہے۔ بن باپ کے بچی ہے ناں۔" وہ سمجھ نہ پایا تھا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"سمیرا غلام علی کے مرحوم بھائی اکرم علی کی اور میری بیٹی ہے۔ اللہ جانے آج اس کا باپ زندہ ہوتا تو کیا زندگی ہوتی میری بیٹی کی۔ وہ بھی اشنہ کی طرح سمجھ دار ہوتی۔" ان کی آنکھوں کی نمی نے ان کے لہجے کی عیاری و مکاری پہ بھی پردہ گرا دیا۔ شاویز جب وہاں سے نکلا تو ذہنی طور پہ بے حد ڈسٹرب تھا۔

☼ ☼ ☼

اس نے ٹیوشن اکیڈمی سے چھٹی کی تھی آج مگر اب بے حد بوریت محسوس کر رہی تھی۔ بابا بھی دو دن سے گھر پر تھے۔ مگر ان کا زیادہ ٹائم نیچے ہی گزرتا تھا۔ وہ ان کی موجودگی میں زیادہ باہر جانے سے گریز کرتی۔

اس نے بور ہو کے ذاکر کو اور شاویز ذاکر کو میسج کر دیے۔ ذاکر انکل نے فوراً جواب دیا۔ وہ ان سے پورا ایک گھنٹہ بذریعہ مختصر پیغام بات چیت کرتی رہی۔ شاویز نے اسے جواب نہیں دیا تھا۔ پتا نہیں کیوں اس بات نے اس کا دل بے چین سا کر دیا۔ رات تک وہ وقفے وقفے سے شاویز کو پیغامات بھیجتی رہی۔ مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ اسے دلی طور پہ صدمہ پہنچا۔

☼ ☼ ☼

"کہاں جارہی ہو اشنہ!" بابا کی آواز سن کر اس کے تیزی سے آگے بڑھتے قدم ایک دم ٹھہر گئے تھے۔

"اکیڈمی جارہی ہوں۔" اس کا لہجہ روکھا تھا۔

"اچھا ذرا میرا ایک کام تو کرو بنا۔" غلام علی کی نرم آواز نے اسے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ اسے عجیب سی خوشی محسوس ہوئی۔

"جی..... بولیں۔" وہ چاہ کر بھی تکلف کی درمیانی دیوار جو غلام علی کے سخت رویے کی وجہ سے ان دونوں کے درمیان حائل تھی۔ ایک پل میں نہ گرا سکی تھی۔

"یہ کچھ کاغذات ہیں۔ میرے باس تک پہنچانے ہیں۔ یہ کارڈ رکھ لو ان کا۔ ایڈریس اس پہ درج ہے۔" انہوں نے کاغذات کے ساتھ ایک کارڈ بھی اشنہ کو تھما دیا۔ اشنہ نے ایک سرسری نگاہ ڈالی اور مزید حیران ہوئی

"یہ تو ہمارے سامنے والے بنگلے کا نمبر ہے۔" وہ بڑبڑائی۔

"اوکے میں دے دوں گی۔ اور کچھ؟" نہایت سبھاؤ سے کہتی غلام علی کو پہلی بار اپنی بیٹی پہ فخر محسوس ہوا۔

"نہیں جاؤ تم۔" انہوں نے آرام سے کہا تو اشنہ خدا حافظ کہتی باہر چلی گئی۔ آج اس کا موڈ بے حد خوش گوار تھا۔ ذاکر علی کے گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ سو وہ اندر چلی گئی۔ نوکر اسے لاؤنج میں ہی لے آیا۔ ذاکر علی گھر پہ نہیں تھے۔ لاؤنج میں شاویز کسی خوبرو لڑکے کے ساتھ گپ شپ میں مصروف تھا۔ اس کی آمد پہ وہ دونوں ہی چونکے تھے۔ شاویز نے تو فوراً" ہی نظر ہٹالی مگر علی وزیر اسے دیکھتا رہ گیا۔

اشنہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی شاویز کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ "بابا نے یہ کاغذات بھیجے تھے آپ کے لیے۔" اس نے سادہ سے لہجے میں شاویز کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ شاویز نے ایک اجنبی نظر اس پہ ڈالی۔ اشنہ اس کی آنکھوں میں اجنبیت دیکھ کر کانپ سی گئی۔

"آپ نے کیوں تکلیف کی؟ یہ کاغذات تو سمیرا بھی لا سکتی تھی۔"

شاویز کا کاٹ دار لہجہ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ بڑی مشکل سے اس نے خود کو سنبھالا۔

"مجھے یہاں بابا نے بھیجا ہے سو آپ یہ سوال ان سے ہی پوچھیے گا تو بہتر ہوگا۔" اس نے بھی روکھے انداز میں جواب دیا اور کاغذات وہیں ٹیبل پہ رکھ دیے۔ علی اس نازک سی لڑکی کے بگڑے تیور پہ جیسے مر مٹا۔

"ارے میرا اشنہ بچہ آیا ہوا ہے" تب ہی ذاکر علی اندر آئے۔ مگر اشنہ مزید نہ ٹھہر پائی۔ وہ تیزی سے ان کے پاس سے گزر گئی۔ وہ اسے پکارتے رہ گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

کتنی ہی دیر وہ روتی رہی تھی۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ اس نے اپنے پہلو میں لیٹی ماں کو دیکھا۔ مدت ہوئی بابا نے انہیں مریض قرار دے کر اپنے کمرے سے بے دخل کر دیا۔ تب سے وہ اس کے پاس ہی سوتی تھیں۔ اشنہ نے کبھی ان دونوں کے اندرونی معاملات یا تعلقات جاننے یا سنوارنے کی کوشش نہ کی تھی۔ وہ صرف اپنی ذات تک محدود ہو کے رہ گئی تھی۔

آج جہاں بابا کے اعتماد نے اسے خوشی دی تھی۔ وہیں شاویز کے ایک دم سے اس قدر اجنبی رویے نے اسے اندر تک زخمی کر دیا تھا۔ اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ آہستہ سے اٹھی اور چائے بنانے نیچے چلی آئی۔ ویسے بھی جاگتے رہنے اور رونے سے اسے سر میں شدید درد محسوس ہو رہا تھا۔ وہ کچن میں چائے بنانے لگی۔ تب ہی اسے کچن کے ساتھ والی گیلری سے کسی کی مدھم سرگوشی سنائی دی۔ اسے بے حد خوف محسوس ہوا۔ اس نے چولہا بند کر دیا اور آہستہ سے گیلری کے پہلے ستون کے ساتھ جا چھپی۔ آواز زلیخا چاچی کی تھی اور بہت واضح تھی۔

"آج تم نے بہت دیر کر دی۔ میں تو سونے لگی تھی۔" اشنہ حیران ہوئی۔ رات کے اس پہر وہ بھلا کس سے بات کر رہی تھیں۔

"مجھے لگا اشنہ جاگ رہی ہے۔ اب مطمئن ہوا تو چلا آیا۔" اور اشنہ کو لگا جیسے اس کے کانوں میں کسی نے سیسہ پگھلا کے ڈال دیا ہو۔

"ورنہ تمہیں تو پتا ہے تمہاری قربت پائے بنا مجھے نیند کہاں آتی ہے۔" غلام علی کی آواز جیسے کسی نشے میں ڈوبی تھی۔

"مجھے بھی کہاں چین آتا ہے۔ گھڑیاں گنتی رہتی ہوں کہ کب تمہارا ساتھ نصیب ہو۔" اس کا دل چاہا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ یہ تھا اس کا باپ اور یہ تھی اس کی مظلوم بیوہ چاچی۔

وہ جان گئی تھی کہ بابا نے امی کو خود سے علیحدہ کیوں کر دیا اور اسے یہ بھی سمجھ میں آگیا کہ بابا کی چاچی اور سمیرا پہ عنایات کی وجہ ان کی غربت اور یتیمی نہیں بلکہ بابا اور چاچی کے ناجائز......

وہ ننگے پیر دوڑ کر سیڑھیاں چڑھی اور کمرے میں پہنچ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ سدرہ کی آنکھ کھلی تو وہ حیران سی اسے دیکھے گئیں۔

"امی! وہ بابا..... چچے۔" وہ بول ہی نہ پائی۔ سدرہ نے اسے خود سے لپٹا لیا اور خود بھی بے آواز رونے لگیں۔

☆ ☆ ☆

اشنہ تین دن سے نہ تو ان کی گھر گئی نہ ہی اس نے شاویز کو دوبارہ کوئی پیغام بھیجا۔ آج وہ بلا ارادہ ہی ان کے گھر چلا آیا تھا۔

غلام علی گھر پہ نہیں تھے۔ زلیخا نے ہی اسے اندر لاؤنج میں بٹھایا اور بیٹی کو کافی لینے بھیج دیا۔

"اصل میں گھر کے سارے کام بے چاری سمیرا کرتی ہے تو تھک جاتی ہے۔ اس لیے سالن میں بنا لیتی ہوں۔ میں ذرا سالن دیکھ آؤں۔"

وہ بہانہ کرتی اٹھ گئیں۔ تو شاویز ارد گرد کا جائزہ لینے لگا۔ تب ہی سیڑھیوں سے اترتی گلابی رنگ کے کاٹن کے سوٹ میں ملبوس اشنہ نے اسے بے خود سا کر دیا۔ وہ بے دھیانی میں اسے تکے گیا۔ اشنہ نے صرف ایک نگاہ غلط اس پہ ڈالی اور لاؤنج سے نکلنے لگی کہ سمیرا کافی لے کر آگئی۔ اس نے کافی شاویز کو پکڑاتے ہوئے اشنہ کو بھی آواز دے ڈالی۔ وہ وہیں رک گئی۔

"اشنہ! مجھے تمہارا وہ بلیک سوٹ چاہیے۔ جارجٹ والا پلیز مجھے ساتھ والوں کے لڑکے کی برتھ ڈے پہ جانا ہے۔" سمیرا نے منت بھرے لہجے میں کہا تو اشنہ منہ بنا کر رہ گئی۔

"ہر چیز ہونے کے باوجود مانگنے والی عادت نہ چھوڑنا۔" نخوت سے کہتی وہ آگے بڑھنے لگی کہ زلیخا نے پکار لیا۔

"ایک ہی دن کی تو بات ہے بیٹا۔ واپس کر دے گی۔" انہوں نے لہجے میں حتی الامکان لجاجت بھرتے ہوئے کہا۔ تو اشنہ جو پہلے ہی نفرت سے سلگ رہی تھی۔ پھٹ پڑی۔

"جو کچھ آپ میرے باپ سے لیتی تھیں۔ وہ کیا ناکافی ہے۔ جو اب میری چیزوں پہ بھی حق جتانے لگی ہیں؟"

"اشنہ پلیز بی ہیو یور سیلف۔" شاویز خود کو بولنے سے باز نہ رکھ پایا تھا۔

"ایکسکیوز می۔ آپ میرے ذاتی معاملات میں دخل نہ ہی دیں تو اچھا ہے۔" روکھے لہجے میں کہتی وہ اسے تنبیہہ کر گئی۔ شاویز غصے میں باہر چلا گیا۔

"اور تم آئندہ مجھ سے کوئی چیز مانگنے کی غلطی مت کرنا۔" اس نے نفرت سے سمیرا کا بازو دبوچ کے کہا اور تیزی سے گھر سے باہر چلی گئی۔

زلیخا نے مسکراتے ہوئے سمیرا کو سینے سے لگایا۔ ان کی آنکھوں میں عجیب شاطرانہ مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"بابا! مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" ذاکر علی بیڈ پہ بیٹھے تھے کہ شاویز چلا آیا۔

"ہاں بولو کیا بات ہے۔" شاہ ویز کی والدہ کی وفات

کے بعد انہوں نے ماں باپ بن کر شاویز کی پرورش کی۔ علی وزیر بھی ان کی زیر شفقت رہا۔ علی وزیر ان کے جگری دوست کا بیٹا تھا جس کے ماں باپ بچپن میں ہی حادثے کا شکار ہو گئے تھے۔ ذاکر علی نے بھی ان دونوں میں کوئی فرق نہ رکھا۔ مگر علی وزیر نے ایجوکیشن کے بعد ان پر بوجھ بننا پسند نہ کیا اور ایک اچھی جگہ جاب کرلی۔ آج کل وہ اسلام آباد رہ رہا تھا مگر ہر دوسرے تیسرے ویک اینڈ پہ چلا آتا۔ ابھی بھی وہ یہیں آیا ہوا تھا۔

"بابا میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔ آئی تھنک اب مجھے شادی کرلینی چاہیے۔" شاویز کی بات سنتے ہی ان کے چہرے پہ بہت پیاری مسکان آ سجی۔ ان کی آنکھوں کے آگے بے اختیار ہی اشنہ کی بھولی صورت لہرانے لگی۔

"میں غلام علی صاحب کی بھتیجی سمیرا سے شادی کرنا چاہتا ہوں بابا!"

وہ دم بخود رہ گئے۔ یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔ شاویز اشنہ جیسی پیاری لڑکی کی جگہ کسی اور کو منتخب کرے گا انہوں نے تو ایسا کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

"مگر اشنہ۔" وہ بول بھی نہ سکے۔

"نہیں بابا! میں نے آپ کو بتایا تھا ناں کہ میں کسی ایسی لڑکی سے شادی کروں گا جو حالات کی ماری اور ترسی ہوئی ہو، تاکہ میں اسے ہر قسم کا سکون دے سکوں۔"

"کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟" ان کی آواز مدھم تھی۔

"جی، میں نے بہت دیکھ بھال اور پرکھنے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے؟" وہ مطمئن تھا۔

"کئی بار جو کچھ ہمیں دکھائی دیتا ہے۔ وہ سچ نہیں ہوتا بیٹا۔" وہ شاید سمجھا رہے تھے۔

"نہیں بابا! میرے سامنے کئی بار اس نے بہت روڈلی بیہو کیا ہے اور اس کے اپنوں سے اس کا رویہ بے حد گستاخانہ ہوتا ہے۔ میں کم از کم یہ سب برداشت نہیں کر سکتا۔"

"ہم کسی کے رویے یا لہجے میں اس کے کردار کے بارے میں فیصلہ یا اندازہ تو کر سکتے ہیں۔ مگر ہمارا اندازہ کتنے فیصد درست ہے یا غلط یہ ہمیں ایک فیصد بھی معلوم نہیں ہوتا۔ یہ نہ ہو کہ بعد میں تمہیں پچھتانا پڑے۔" وہ متفکر تھے۔ مگر شاویز کا فیصلہ بھی اٹل تھا۔

"تو برخوردار! شاویز نے تو اپنی پسند بتا دی۔ اب اگر تمہاری بھی کوئی چوائس ہے تو تم بھی بتا دو۔" ذاکر علی نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ وہ سب اس وقت شاویز کے کمرے میں بیٹھے گپ شپ میں مصروف تھے۔

"ہے تو سہی بابا! مگر پتا نہیں وہ ہاں کرتی بھی ہے یا نہیں۔" علی نے کہا تو شاویز اور ذاکر دونوں ہی مسکرا دیے۔

"ڈونٹ وری جلدی سے نام بتاؤ۔" شاویز نے اس کی ہمت بندھائی۔

"وہ اس دن شاویز کے منیجر غلام علی کی بیٹی آئی تھی ناں آپ کے ہاں۔ اشنہ۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" ذاکر علی تو خوشی سے جھوم اٹھے۔ وہ ہنستے ہوئے علی سے لپٹ گئے۔ جبکہ اشنہ کا نام علی کے منہ سے سن کر نجانے کیوں شاویز کا دل ڈوب سا گیا۔

"ساری عمر رونے سے بہتر ہے ایک بار ہی رو لیا جائے۔ دل کا کیا ہے، سنبھال لوں گا۔" اس نے دل ہی دل میں خود کو تسلی دی اور علی سے باتیں کرنے لگا۔



اگلے روز ہی بابا نے اسے نہایت قیمتی انگوٹھی اس کے اپنے کمرے میں آ کے پہنا دی تھی۔ وہ بے حد خوش تھی۔ جمعہ کے دن سادگی سے نکاح اور رخصتی رکھی گئی تھی۔ البتہ ولیمہ بے حد شاندار ہونا طے پایا تھا۔ اسے اپنا آپ ہواؤں میں اڑتا محسوس ہوا۔

"اشنہ ذرا اپنی انگوٹھی تو دکھاؤ کیسی ہے؟" اشنہ نہا کر نکلی تو سمیرا کو اس کا منتظر پایا۔ اس نے خاموشی سے اپنا ہاتھ اس کے آگے کر دیا۔

"کمال ہے ذاکر انکل نے تمہیں بھی بالکل ویسی ہی انگوٹھی پہنائی جیسے مجھے۔" وہ حیران تھی۔

"تمہیں بھی کیا مطلب؟" اشنہ نے پوچھا۔

"مطلب میری بھی منگنی ہوئی ہے۔ اماں نے منع کیا کہ تمہیں نہ بتاؤں ورنہ جل جاؤ گی۔" اس نے مدھم آواز میں کہا تو اشنہ کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ "ہاں شاید اس لڑکے سے جو اس دن وہاں بیٹھا تھا یہ کافی خوب صورت تھا۔ پھر تو لکی ہے سمیرا بھی۔"

وہ خوش ہوئی تھی اور اپنی اس حالت پہ وہ خود بھی حیران تھی۔ آج اسے کچھ بھی برا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ صرف خوش تھی۔ بے حد خوش۔

غلام علی قاضی کے ساتھ اس کے کمرے میں آئے زندگی میں پہلی بار غلام علی نے اشنہ کو اتنی اہمیت دی کہ اس کا نکاح بھی آج ہی سادگی سے رکھ دیا۔ قاضی صاحب نے اس سے اقرار مانگا تو وہ منہ کھولے انہیں دیکھنے لگی۔ وہ شاویز کے بجائے علی وزیر کے لیے اس کا اقرار مانگ رہے تھے۔

"بیٹا! جلدی کرو۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں علی وزیر بھی ذاکر صاحب کے بیٹے جیسا ہی تو ہے۔"

غلام علی کی بات پہ اس کی پلکوں نے لرزنا شروع کر دیا تھا۔ یہاں بھی اس کے حق پر سمیرا نے قبضہ جما ہی لیا۔ بہت ضبط سے اس نے نکاح نامے پہ سائن کر دیے۔

اس کے ساتھ کبھی اچھا نہیں ہوا تھا۔ مگر اس بار تو وہ بالکل ٹوٹ سی گئی تھی۔ کل شام اس کی رخصتی تھی اور آج ساری رات اس نے روتے ہوئے گزار دی۔

ساری رات اس کے آنسو اس کا تکیہ بھگوتے رہے۔ اس نے بھی انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان کے ساتھ پچھلی باتوں کو بھی بہہ جانے دیا۔ اپنے حقوق جس شخص کے نام کیے تھے۔ وہ مکمل طور پہ اس سے وفاداری نبھانا چاہتی تھی۔ اس نے ایک بار پھر اپنے رب پہ توکل کیا اور خود کو حالات کے دھارے پہ چھوڑ کر آنے والے کل کی تیاری کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

آج وہ پورے دل سے تیار ہوئی تھی۔ اندر سے چاہے وہ کتنی ہی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی۔ مگر شاویز کے سامنے اس کو خود کو مضبوط ثابت کرنا تھا۔ اسے بتانا تھا کہ اس کے یوں راہ بدل لینے کے باوجود اس نے زندگی سے منہ نہیں موڑا نہ ہی اپنے خدا سے مایوس ہوئی ہے۔

اسٹیج پہ بیٹھی دونوں دلہنوں نے تمام حاضرین کی توجہ سمیٹی ہوئی تھی۔ ڈارک بلیو کلر کے خوب صورت کامدار لہنگے میں سمیرا بہت پیاری لگ رہی تھی۔ مگر نہ جانے کیوں اس کے چہرے پر وہ معصومیت نہیں تھی جو اشنہ کے چہرے پہ چھائی ہوئی تھی۔ اس نے عجب ہی روپ نکالا تھا۔ انگ انگ سے جیسے عجیب سی روشنی فضا کو نکھارے جا رہی تھی۔

شاویز لاکھ خود کو باز رکھتا مگر نظر آوارہ بار بار بھٹک کر اس پری پیکر کا دیدار کرنے لپکتی۔ سرخ کامدار کرتے اور چوڑی دار پاجامے میں غضب ڈھا رہی تھی۔ پوری تقریب کے دوران اس نے نظر نہیں اٹھائی تھیں۔ جبکہ سمیرا فوٹو گرافرز کے لیے بار بار پوز بدل رہی تھی۔ وہ اس کی حرکتوں پر عجیب سی شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔

اچانک ہی اشنہ نے اپنا چہرہ اوپر کیا اور بالکل غیر ارادی طور اس کی نگاہ شاویز سے جا ٹکرائی۔ اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں گلہ تھا یا پھر دنیا جہان کی آسودگی شاویز بالکل بھی نہ سمجھ پایا تھا۔ اشنہ نے فوراً" نظریں پھیر لیں۔ شاویز کو اندر ہی اندر کچھ غلط ہونے کا احساس ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

"سمیرا... میں نے پوری امانت داری سے اپنا آپ تمہیں سونپا ہے اور میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری تمام حسرتیں مٹانے کی پوری کوشش کروں گا۔"

پھولوں سے سجے کمرے میں سمیرا کا سجا سنورا روپ اسے سرشار کر رہا تھا۔ وہ باہر جتنا بے چین تھا۔ اب

سمیرا کو پا کے بہت اطمینان محسوس کر رہا تھا۔ اس نے جیب سے ایک سونے کی چین نکالی اور اس کے سامنے ہتھیلی پھیلا دی۔ "یہ تمہارا گفٹ۔"

سمیرا نے پوری آنکھیں کھول کے دیکھا' سونے کی چین بہت خوب صورت اور نازک سی تھی۔

"بس یہی لی آپ نے میرے لیے؟" اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔

"کیا مطلب؟" وہ جی بھر کے حیران ہوا۔

"امی نے تو بتایا تھا کہ آپ بہت بڑے بزنس مین ہیں۔ مگر آپ نے تو سلامی میں یہ پتلی سی چین ہی پکڑا دی ہے۔" وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ وہ چپ رہا۔

"اچھا۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔ پلیز یہ لائٹ جلدی بند کر دیجیے گا۔" بے دلی سے کہتی وہ ویسی ہی تکیہ لے کر لیٹ گئی۔ چین اس نے سائیڈ ٹیبل پہ اچھال دی تھی۔ شاویز اپنی جگہ سے ہل بھی نہ پایا تھا۔

☼ ☼ ☼

علی نے خاص طور پہ اپنے کمرے کو چنبیلی کے پھولوں سے سجایا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اسے عجیب سی خوشی کا احساس ہوا تھا۔ وہ خاموشی سے اس خوب صورت پری کے پاس آ بیٹھا اور جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کی نظر اتارنے لگا۔ کافی دیر کی خاموشی سے شاید اشنہ اکتائی تھی اس نے اپنی لانبی گھنی سیاہ پلکیں دھیرے دھیرے اٹھائیں اور اسے اپنی طرف یک ٹک تکتے پا کے جھٹ سے دوبارہ گرا بھی دیں۔

"واؤ یار' تمہاری آنکھیں اسپیشلی پلکیں کتنی ونڈر فل ہیں۔"

دل میں آئی ہر بات فٹ سے بول دینا علی وزیر کی پرانی عادت تھی۔ اشنہ اس کی بے اختیاری پہ مسکرا دی۔

"اور تم ہنستی بھی بہت خوب ہو۔" ایک اور تعریف۔ اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

علی نے ایک دم ہی اس کے ہاتھ پکڑ لیے اور غور سے اسے دیکھنے لگا۔ تو وہ تھوڑی سی نروس اور علی کے چپ چپ سے انداز سے کچھ خوفزدہ ہو گئی۔

اشنہ نے ایک گہری نگاہ اس پہ ڈالی۔ اس نے بہت قریبی رشتوں سے صرف دھوکا ہی کھایا ہے۔ پتا نہیں علی کیسا ثابت ہو گا وہ خاموشی سے اسے دیکھے گئی۔

"تمہیں پتا ہے اشنہ! اس دن جب تم شاویز کو کاغذات دینے آئیں تو میں پہلی نظر میں ہی تمہارا اسیر ہو بیٹھا۔ میں نے اس بات کا ذکر کسی سے نہ کیا سوائے اپنے اللہ کے اور دیکھو آج تم میری دعاؤں کے نتیجے میں میرے پاس ہو۔ مجھے اپنا دوست سمجھ کر تم مجھ سے اپنا ہر دکھ' ہر پریشانی شیئر کر سکتی ہو۔ مگر تمہیں مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہو گا۔" بہت ہی جذب سے کہتا وہ اس کی آنکھوں کو مزید رونے پہ آمادہ کر گیا۔ اشنہ بول نہ پائی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے علی کو دیکھا۔

"یہی کہ تم آئندہ کبھی نہیں روؤ گی۔ وعدہ؟" علی نے اپنا دایاں ہاتھ اس کے سامنے پھیلایا۔ اس نے نرمی سے اپنے آنسو صاف کیے اور سفید نرم ہاتھ اس کے ہاتھ پہ رکھ دیا۔ علی نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں اشنہ! کیا تم بھی کوئی اظہار مجھے دان کرو گی۔" اس نے شریر ہوتے ہوئے اس کے چہرے پر آئی لٹ کو چھوا تھا۔ اشنہ سمٹی۔

"میں پہلے اپنے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہوں گی۔ کیا آپ اجازت دو گے۔" وہ مدھم لہجے میں بولی۔

"ارے واہ وہ تو مجھے بھی کرنا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ اس کے بعد تم اظہار کر دو گی۔ بولو... کرو گی ناں۔"

اس نے بازو سے پکڑ کر اسے اپنے نزدیک کرنا چاہا مگر اشنہ تیزی سے جان چھڑا دور جا کھڑی ہوئی۔

"پتا نہیں۔" شرارت سے کہتی وہ باتھ روم میں جا گھسی تھی۔ علی دل سے مسکرا دیا۔

☼ ☼ ☼

ساری رات وہ نہیں سو پایا تھا۔ صبح سر میں شدید

درد محسوس کرنے پہ وہ چائے بنانے کچن میں چلا آیا۔ وہاں موجود اشنہ کو دیکھ کر وہ ساکت رہ گیا تھا۔ وہ اس وقت سادہ کاٹن کے گلابی سوٹ میں ملبوس شاید چائے بنا رہی تھی۔ گیلے لمبے بال کمر پہ کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ وہ چائے لے کر مڑی تو اپنے پیچھے شاویز کو کھڑا دیکھ کر ٹپٹا گئی۔

"آپ یہاں؟ آئی مین کسی نوکر سے کہہ دیا ہوتا۔" وہ شرمندہ سا ہوا۔

"نہیں۔ میں گھر پہ بھی اپنے کام خود کرتی تھی۔" اس نے کاندھوں پہ پھیلا دوپٹا سلیقے سے سر پہ سجا لیا۔ شاویز کو لگا جیسے چاند پہ یکدم گلابی بادل پھرا دینے آئے ہوں۔

"میں بابا کے لیے چائے بنا رہی تھی۔" وہ شاید نروس تھی۔ شاویز بس اسے دیکھے گیا۔ تب ہی اشنہ نے خود ہی ہمت کر کے راستہ مانگا۔ وہ ایک طرف ہو گیا۔ اشنہ اتنی تیزی سے وہاں سے نکلی جیسے وہ کوئی جن ہو جو ابھی اسے قید کر لے گا۔ شاویز ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

شادی کے صرف تین دن بعد ہی اشنہ اور علی اسلام آباد چلے گئے تھے۔ ان کی شادی کو مہینہ ہونے کو آیا تھا مگر گھر کی روٹین نہ بدلی۔ سمیرا سارا وقت یا تو سجتی سنورتی رہتی یا موویز دیکھتی رہتی۔ شاویز لاکھ اسے گھر پہ توجہ دینے کا کہتا۔ وہ ہر بار جھٹک دیتی۔ وہ ہر بار خاموش ہو جاتا۔

آج کئی دنوں بعد اس کا موڈ خوشگوار تھا۔

"السلام علیکم بابا! سمیرا کدھر ہے۔" لاؤنج میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر کوکنگ کا شوق پورا کرتے بابا پہ ہی پڑی۔

"وعلیکم السلام بیٹا جانی! اندر کمرے میں ہو گی۔ بہت خوش ہے میرا بیٹا آج۔" وہ چہرے سے ہی اس کی مسرت بھانپ گئے۔

"ہاں۔ سمیرا کا ایڈمیشن ہو گیا ہے، بہت اچھے کالج میں۔ بکس بھی لے آیا ہوں اس کے لیے۔" وہ پرجوش لہجے میں بتانے لگا۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" بابا بھی خوش ہوئے۔

"میں ذرا اسے دکھا دوں۔" اس نے جیسے اجازت طلب کی۔

"ہاں ضرور بیٹا۔" بابا دوبارہ سے چولہے کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ وہ تیزی سے اوپر آیا اور ساری بکس کھول کر اس کے سامنے ہی بیڈ پہ پھیلا دیں۔ سمیرا جو مووی دیکھنے میں مصروف تھی۔ چڑ گئی۔

"کیا ہے یہ شاویز!" بے دلی سے اس نے ایک دو کتابیں الٹ پلٹ کے دیکھنا شروع کیں۔

"تمہارا ایف اے میں ایڈمیشن ہوا ہے سمیرا۔ یہ بکس ہیں تمہاری۔" وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھے گئی۔

"میں نے تم سے وعدہ کیا تھا ناں کہ تمہاری ہر حسرت پوری کروں گا۔ اب تم پر اشنہ چلا سکتی ہے نہ تم پر کوئی پابندی لگانے والا ہے۔" اس نے نرمی سے سمیرا کا ہاتھ تھام لیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ مگر اگلے ہی پل اسے شدید دھچکا لگا۔ جب سمیرا نے تیزی سے اس سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور غصے سے ایک دو بکس اٹھا کر دور زمین پہ اچھال دیں۔

"آپ کو ہو کیا گیا ہے۔ کس نے کہہ دیا ہے آپ سے کہ مجھ پہ کوئی پابندی یا دھونس جما سکتا ہے۔ پابندی نہیں، اشنہ پہ ہوتی تھی۔ مجھے تو چاچا نے ہر آزادی دے رکھی تھی۔ بلکہ میں نے تو خود اسکول کے بعد پڑھنا ہی نہیں چاہا۔ اشنہ تو بے چاری ٹیوشن پڑھا پڑھا کے پڑھتی تھی۔ چاچا تو سارے پیسے ہمیں دے دیا کرتے تھے۔" وہ غرور سے سر اٹھا کر بولی۔

وہ کیا کہہ رہی تھی۔ شاویز صدمے سے وہیں ساکت ہو گیا تھا۔

"اس کی مجال تھی جو ہمارے سامنے بولتی، یہ تو بعد میں ہمارے اور چاچا کے برے سلوک کی وجہ سے وہ بدزبان ہوتی گئی۔ میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ نہیں ہے مجھے کسی ہمدردی کی ضرورت۔ میں جیسی ہوں مجھے ویسی ہی جینے دیں۔ پتا نہیں آپ مجھے کیا سمجھتے ہیں۔ میں لاوارث نہیں۔ نہ میری کوئی حسرت ہے۔ میں نے زندگی میں جو چاہا پایا۔ جو دل چاہا کیا سنا آپ نے۔" غصے سے چیختی وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ شاویز زمین پہ ہی گھٹنوں کے بل گر پڑا۔ اس کی آنکھوں کے گوشے نم ہونے لگے۔

☼ ☼ ☼

علی کے بار بار اصرار پر سمیرا اور بابا کو لیے اسلام آباد آ تو گیا مگر اب اسے اشنہ سے نظر ملانا دوبھر ہو رہا تھا۔ اشنہ اسے سلام کرنے بعد دوبارہ اسے کہیں دکھائی نہیں دی۔ وہ سمیرا کو لیے اندر ہی کہیں چھپی بیٹھی تھی۔ علی شام کو گھر لوٹا تو شاویز اس پہ چڑھ دوڑا۔

"حد ہوتی ہے بے مروتی کی یار! ہمیں بلا کر خود جناب کا اتا پتا ہی نہیں۔" وہ سخت ناراض ہوا۔

"معاف کر دے یار! پہلے آفس کے کام میں دیر ہو گئی۔ پھر تیری بھابھی کے ایڈمیشن میں لیٹ ہو گیا۔ آج لاسٹ ڈیٹ تھی ناں۔" وہ معذرت خواہانہ لہجے میں بولا تو بابا چونک گئے۔

"کس چیز کا ایڈمیشن۔"

"ماسٹرز کا ارادہ رکھتی ہیں میڈم جی۔ وہ بھی انگلش لٹریچر میں۔" اس نے پر مسرت لہجے میں بتایا تو بابا کی نگاہ خود بخود ہی شاویز کی جانب اٹھ گئی۔ اس نے فوراً ہی نظریں جھکا لیں۔

"بابا! آئیں آپ میری اسٹڈی تو چیک کریں ذرا۔" اسی وقت سمیرا اور اشنہ وہاں آئیں تو اشنہ نے ذاکر علی سے کہا۔

"ارے واہ تم نے اسٹڈی روم بھی سیٹ کر لیا۔" وہ جی بھر کے خوش ہوئے۔

"جی آپ کی بہو تو کتابوں کی دیوانی ہیں۔ گھر کا سب سے بڑا کمرہ سیٹ کیا ہے اسٹڈی کے طور پہ۔" علی نے ہنستے ہوئے کہا۔ اشنہ بابا کو لیے آگے بڑھی تو شاویز بھی ان کے پیچھے ہو لیا۔ علی سمیرا سے گپ شپ کرنے لگا۔ شاویز کو آتا دیکھ کر اشنہ انہیں دروازے میں ہی چھوڑ کے کام کا بہانہ کر کے واپس چلی گئی۔

اور شاویز... کمرے میں رکھے ہر شیلف میں طریقے سے رکھی گئی بکس جیسے اس کی پسند سے ہی لی گئی ہوں۔ اس کے پسندیدہ میگزین ناولز اور شاعری کی تمام بہترین کتب موجود تھیں وہاں بابا بھی بہت دلجمعی سے کتابوں کے معائنے میں مصروف تھے۔ خوامخواہ ہی اس کی پلکیں بھیگنے لگیں۔ تب ہی بابا نے اس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھ کر اسے چونکا دیا تھا۔

"جب ہم اپنے فیصلے میں غلط ثابت ہو جائیں تو حالات کو اللہ کی مرضی پہ چھوڑ دینا چاہیے۔ وہ بے شک ہمارے لیے بہتر فیصلہ کرتا ہے۔" بابا نے مسکرا کر کہا۔

اور شاویز کو لگا جیسے قدرت نے اشنہ کے لیے واقعی بہتر فیصلہ کیا تھا۔ وہ اس جیسی معصوم اور سمجھ دار لڑکی کے قابل ہی نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

"پتا ہے شاویز! پہلی بار جب میں نے اشنہ کو دیکھا تھا تو مجھے لگا تھا کہ بس یہ ہماری آخری ملاقات تھی۔ مگر اب جب اسے اپنے اتنا پاس دیکھتا ہوں تو دل جھوم سا جاتا ہے۔ کبھی کبھی ہماری زندگی میں واقعی ایسا کچھ ہو جاتا ہے جو ہمیں کبھی یقین بھی نہیں ہوتا کہ ہو جائے گا۔" علی وزیر اپنی ہی دھن میں بولے جا رہا تھا اور شاویز... وہ مسلسل اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں، اس کے لہجے بلکہ اس کی ہر اک ادا سے بے پایاں خوشی چھلک رہی تھی۔ وہ کتنا مسرور تھا۔

"میں تو خدا کا شکر ادا کرتے نہیں تھکتا۔"

"تم لوگ پھر کب آ رہے ہو ہمارے گھر۔" شاویز نے بات بدلنا چاہی۔ اس وقت وہ علی کے اصرار پہ سمیرا اور بابا کو لے کر اسلام آباد آیا ہوا تھا۔

"میں تو ہر دوسرے تیسرے ویک اینڈ پہ کوشش کرتا ہوں یار! پر تمہاری بھابھی ہی نہیں مانتیں۔" شاویز کا دل۔ عجیب سا دھڑکا۔

"اسے وہاں بالکل بھی مزا نہیں آتا اور آئے گا بھی کیسے بہت تلخ یادیں جو جڑی ہیں اس شہر سے اس کی۔" بولتے بولتے علی افسردہ ہوا۔ شاویز بری طرح چونکا۔

"کیسی یادیں۔" اسے لگا وہ شاویز کو ابھی کٹہرے میں لا کھڑا کرے گا۔

"یار! میں نے تو ہمیشہ تم سے ماوئی، محمل اور عریشہ جیسی لڑکیوں کے بارے میں سنا تھا۔ لیکن اشنہ ایک ایسا کردار بن کے میری زندگی میں آئی جو باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیمی کی زندگی گزارنے پہ مجبور رہی۔ میں تو حیران ہوں کہ اتنی سمجھ دار اور حساس لڑکی کا باپ اتنی ناشکری کیسے کر سکتا ہے اور سب سے بڑھ کر اشنہ کے والد کا اپنی بھاوج سے تعلق۔ انہوں نے بھاوج کو پورا گھر سونپ رکھا تھا۔ اف میرے خدا! میں تو سوچتا تھا یہ سب اخباری باتیں ہیں یا افسانوی۔ حقیقت میں بھی کوئی اتنا گر سکتا ہے۔ آئی کانٹ بلیو دس۔"

وہ بولتا چلا گیا اور شاویز دم بخود بیٹھا اسے سنتا گیا۔ کتنی جلدی قدرت نے اس کی ساری غلط فہمیاں دور کر دیں۔ آگہی کے کتنے ہی در تھے جو یکے بعد دیگرے اس پہ کھلتے جا رہے تھے۔ وہ اس کا اسلام آباد میں آخری دن تھا۔ اگلی ہی صبح وہ واپس پشاور آ گئے۔

☼ ☼ ☼

اور آج پورے چھ ماہ اشنہ اپنے شہر واپس آئی تھی۔ شاویز نے حالات سے سمجھوتا کر لیا اور سمیرا کو اپنے حال پہ چھوڑ کر اس نے اپنے آپ کو آفس اور اسٹڈی تک محدود کر لیا۔ بابا سے بھی اس کا سامنا دن میں ایک دو بار سے زیادہ نہ ہوتا۔ مگر اشنہ کو دوبارہ اس شہر میں دیکھ کر جیسے سارے پرانے درد تازہ ہو گئے۔ آگہی کے کرب اسے نہ تو چین سے سونے دیتے نہ ہی جینے دیتے۔ اس نے کتنی بڑی بازی اپنی مرضی سے ہار دی۔ وہ بھی بنا کسی ٹھوس وجہ کے۔

وہ اشنہ سے بے حد شرمندہ تھا۔ اس سے ملنا چاہتا تھا۔ اپنے کیے کی معافی مانگنا چاہتا تھا۔ آج بڑی مشکل سے اس نے خود میں حوصلہ پیدا کیا اور اشنہ سے ملنے اس کے گھر چلا آیا۔ غلام علی اور زلیخا گھر پر نہیں تھے دروازہ خود اشنہ نے کھولا وہ اسے دیکھ کر حیران ہوئی۔

"میں آنٹی سے ملنے آیا ہوں۔" اس نے بہانہ تراشا، مبادا یہیں سے واپس نہ کر دے اسے۔

"جی۔" وہ راستے سے ہٹ گئی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اس کی ہمراہی میں آنٹی کے کمرے میں آ گیا۔ سدرہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ وہ وہیں بیٹھ کر ان کا حال احوال لینے لگا۔ اشنہ چائے بنانے کچن میں چلی آئی۔ کچھ دیر بعد ہی وہ چائے رکھ کر واپس پلٹ گئی۔ کافی دیر تک شاویز اس کی راہ تکتا رہا مگر پھر مجبوراً اسے آنٹی سے اجازت لینی پڑی۔

سیڑھیوں سے اترتے وقت وہ اشنہ کی بات پہ چونکا۔ وہ شاید علی سے فون پر بات کر رہی تھی۔

"بابا نے زلیخا آنٹی سے نکاح کر لیا ہے علی۔" اس کی بھرائی ہوئی آواز نے شاویز کو اندر تک ہلا دیا۔

"نہیں علی! اب مجھے مزید ایک دن بھی یہاں نہیں ٹھہرنا۔ پلیز آپ آ کر مجھے لے جائیں پلیز۔"

وہ رو رہی تھی۔ شاویز اس سے زیادہ نہ سن سکتا تھا۔ وہ تیزی سے باہر نکلتا چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

"بابا، اشنہ پریگنٹ ہے اور میں نہیں چاہتا کہ اسے کوئی پریشانی ہو۔ اس لیے میں مما کو بھی ساتھ لے جا رہا ہوں۔" علی اسی شام وہاں پہنچا تو بابا اسے دیکھ کر جہاں خوش ہوئے وہیں حیران بھی۔ مگر علی نے جب ان کو ساری بات بتائی تو وہ بھی اپنی جگہ شاکڈ رہ گئے۔

"کوئی آدمی اتنا بھی کیسے گر سکتا ہے۔ مگر تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو بیٹا۔ ویسے بھی ایسی حالت میں اشنہ کے ساتھ کسی بڑے کا ہونا ضروری ہے۔" وہ علی کے ساتھ تھے ہمیشہ کی طرح۔

اشنہ سمیرا کے کمرے میں بیٹھی اس کی سی ڈیز کلیکشن دیکھ رہی تھی کہ شاویز وہاں چلا آیا۔ اشنہ کو

قطعی امید نہ تھی کہ وہ اس وقت بھی گھر واپس آ سکتا ہے وہ تیزی سے اٹھ کر نکلنے لگی۔ جب شاویز نے اس کا راستہ روک لیا۔

"صرف ایک بات تم سے کہنا چاہتا ہوں اشنہ پلیز مجھے۔"

"میں نے آپ کو ہر تعلق سے دستبردار کر دیا ہے۔ سو اب ہمارے درمیان نہ کوئی تعلق رہا نہ کوئی ناراضی مگر پھر بھی میں نے آپ کو معاف کیا۔" وہ کہہ کر رکی نہیں بلکہ تیزی سے نکلتی چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

"کیوں مما! کیوں کیا آپ نے ایسا۔ آپ کو ذرا بھی شرم نہ آئی کہ آپ کی بیٹی اپنے سسرال میں آنکھ اٹھا کر جی بھی نہ پائے گی۔" سمیرا کو جب سے ماں اور غلام علی کی شادی کا پتا چلا تھا اس نے قیامت اٹھا دی تھی۔

"تو میں اکیلی کیسے جیتی۔ تم نے تو ٹھاٹ سے اپنا گھر بسا لیا اور میں۔ میں کیا کرتی بتاؤ۔" زلیخا کے لہجے میں شرم مفقود تھی۔

"کچھ بھی کرتیں مما! میرے ساتھ رہ لیتیں۔ مگر ایسا نہ کرتیں۔" وہ تڑپی۔

"تم کیسی بیٹی ہو۔ میں نے تمہارے بھلے کے لیے کیا جو کچھ بھی کیا۔ اگر غلام علی سے تعلق نہ بناتی تو کیسے عیش اڑاتیں تم ہاں۔۔۔ بولو۔" انہوں نے غصے سے سمیرا کو ہی جھنجھوڑ ڈالا۔ وہ لال آنکھوں سے انہیں دیکھے گئی۔

"کاش، کاش بابا کی جگہ آپ مر جاتیں۔ کاش آپ مر جاتیں مما۔"

وہ چیخی تھی۔ زلیخا کو طیش آ گیا۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اس پر تھپڑ برسانا شروع کر دیے کہ اچانک ہی شاویز نے ان کا ہاتھ روک دیا۔

"بس آنٹی۔ اگر آپ سمیرا کی ماں نہ ہوتیں تو دیکھتیں کہ میں آپ کے ساتھ کیا کرتا۔" وہ بے حد سخت لہجے میں بولا۔

"اور یاد رکھیے گا، چھوڑوں گا تو میں اب بھی نہیں۔" وہ غصے سے کہتا سمیرا کو ساتھ لیے وہ باہر چلا گیا تو زلیخا نے نفرت سے زمین پہ تھوک دیا۔

☼ ☼ ☼

اور واقعی شاویز نے اپنا کہا سچ کر دکھایا تھا۔ اس نے غلام علی کو اگلے ہی دن نوکری سے فارغ کر دیا تھا۔ غلام علی کے ساتھ ساتھ زلیخا کا بھی سارا طنطنہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ ان دونوں نے شاویز کو راضی کرنے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہے۔

مایوس ہو کر غلام نے سارا غصہ زلیخا پر نکالا تھا۔ اس کے اس خوب صورت وجود کو نیلوں نیل کر دیا تھا جس پہ وہ ہمیشہ غرور کیا کرتی تھی۔ وہ ساری رات غلام علی نے کروٹیں بدلتے اور زلیخا نے آہیں بھرتے گزاری تھی۔ عشق و محبت اور وفا کے پردے میں چھپے لالچ، ریا اور ہوس بالآخر آشکار اور رسوا ہو چلے تھے۔

☼ ☼ ☼

چودھویں رات کا پورا چاند اس کی کمزوری تھی۔ وہ کھڑکی میں کھڑی چاند کو تکتے اپنی زندگی سوچ گئی۔

اسے بابا سے کبھی محبت نہیں ملی مگر مما سے بھی توجہ حاصل کرنے میں وہ ناکام رہی تھی۔ دبی سہمی مما خود کسی ایسے ان دیکھے خول میں سمٹی ہوئی تھیں کہ اس پہ توجہ دینا شاید ان کے بس میں ہی نہ رہا تھا اور پھر چاچا کے مرنے کے بعد جو حالات و واقعات اس نے دیکھے تھے۔ ان سب کی وجہ سے تو خود اس کے دل و دماغ اور احساسات و جذبات بے حد مجروح ہوتے تھے۔

شاویز اور ذاکر علی انکل سے ملنے کے بعد اسے لگا کہ محبتیں اب اس سے زیادہ دور نہیں، شاویز میں وہ ایک مخلص دوست اور ذاکر علی میں ایک شفیق باپ کو تلاشنے لگی۔ مگر ایک بار پھر وہ تہی دست رہ گئی۔ نہ تو اس کی آرزوؤں کی پامالی کی وجہ اسے بتائی گئی نہ اس سے کوئی وضاحت طلب کی گئی۔ شاویز نے کلی اختیار اپنے پاس رکھتے ہوئے اپنے تئیں اسے سزا دے دی۔ مگر اس بار اللہ تعالیٰ نے اسے مایوس نہ ہونے دیا، علی وزیر کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے نہ صرف اسے محبت

کرنے والا شوہر نوازا تھا بلکہ ایک بہت ہی مخلص دوست اور غمگسار ہم سفر عطا کیا۔ اللہ نے ایک بہت ہی پاکیزہ اور پائیدار رشتے کی صورت اسے مالا مال کر دیا تھا۔ وہ ہار کے بھی جیت گئی۔

"کیا سوچ رہی ہے ہماری جان جاناں۔" علی نے نرمی سے اپنا بازو اس کی کمر کے گرد حمائل کیا تھا۔ وہ گہری سوچوں سے چونکی۔

"سوچ رہی تھی کہ میں نے بہت دیر کر دی۔" اس نے مسکراتے ہوئے سر علی کے مضبوط کندھے پہ ٹکا کے کہا۔

"کس بات میں دیر......" علی نے لب اس کے ریشمی بالوں پہ رکھ دیے تھے۔ اشنہ نے سکون سے آنکھیں موندلیں۔

"بتاؤ ناں۔" اس کی خاموشی پہ علی نے اسے اپنے سامنے کیا۔

"اظہار کرنے میں۔" اشنہ نے مسکراتے ہوئے اپنی خوب صورت پلکیں اٹھائیں۔ علی نے سوالیہ انداز میں کندھے اچکائے۔

"میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں علی۔ بہت زیادہ محبت۔" کتنے ہی تارے جگمگائے تھے اس کی خوب صورت بڑی بڑی آنکھوں میں۔ علی وزیر مبہوت سا اسے دیکھے گیا تو وہ شرما کے سر جھکا گئی۔



"مبارک ہو یار! تم چاچو بن گئے ہو وہ بھی بھتیجا، بھتیجی دونوں کے۔ اللہ پاک نے مجھے رحمت و نعمت دونوں سے اکٹھے ہی نوازا ہے۔" علی کی چہکتی آواز نے جہاں اسے مسرور کیا وہیں اک عجیب سی خلش بھی جگا دی۔ ابھی کل ہی تو سمیرا کی فائنل رپورٹ آئی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا کسی خرابی کی وجہ سے وہ کبھی ماں نہیں بن سکتی۔ شاید یہ قدرت کی طرف سے اس کو اور سمیرا کو سزا ملی تھی۔

"اشنہ کیسی ہے۔" اس نے بمشکل پوچھا۔

"بالکل فٹ ہے میں ہوں ناں، اسے بھلا کچھ ہو سکتا ہے۔ ہر پل اللہ سے اسی کے لیے ہی تو دعا مانگتا ہوں۔ تم سوچ نہیں سکتے شاویز! ہاؤ مچ آئی لو مائی اشنہ۔"

کیا کچھ نہیں تھا علی کے لہجے میں، پیار، مان، خوشی ...... اور اس کے پاس کیا تھا۔

اس نے ایک نظر بے فکر سوئی سمیرا پہ ڈالی اور اپنا احتساب کرنے لگا۔ اسے اپنا آپ بہت نادار لگا۔

علی کے پاس سب کچھ تھا۔ اشنہ کے پاس سب کچھ تھا۔ وہ اشنہ جسے اس نے پتا نہیں کس کس جرم کی سزا سنا ڈالی تھی اور وہ شاویز ذاکر، تہی دامن تھا۔ اس کے پاس کچھ نہ تھا سوائے ندامت کے، پچھتاوے اور کرب کے۔

ندامت ...... کہ اس نے ایک بہت ہی معصوم لڑکی کے جذبات سے کھیلا اس کی آنکھوں میں خوابوں کے دیے جلا کر خود ہی راکھ کر ڈالے۔

پچھتاوا ...... کہ صرف کہانیوں کے کرداروں سے ہمدردی میں وہ دن بھر اور رات بھر کڑھتا رہتا۔ مگر جب حقیقت میں حالات کی ماری لڑکی قدرت نے اسے دکھائی تو اس نے اس معصوم لڑکی کو پرکھنے کی زحمت تک گوارا نہ کی۔ جب تک دل چاہا اس سے کھیلتا رہا جب دل کیا اٹھا کے پھینک دیا۔ اس کے احساسات و جذبات کی بالکل پروا نہ کی بلکہ اس کے رویے کو دیکھ کر اسے اپنی طرف سے شدید ترین سزا کا مستحق بھی قرار دے دیا اور کرب۔

لا حاصل کا کرب، اپنا پیار، اپنی محبت اپنے ہی ہاتھوں پامال کرنے کا کرب اور سب سے بڑھ کر آگہی کا کرب۔ جواب مستقل اس کے ساتھ رہنے والا تھا۔

وہ اچھی طرح جان گیا تھا کہ اچھے یا برے رویے سے کسی انسان کو اچھا یا برا ہرگز نہیں گردانا جاسکتا۔ رویہ انسان کے ماحول کی دین ہوتا ہے۔ دل کا حال تو صرف اور صرف خدا جانتا ہے۔



نذرِ وطن - کچھ ماہیے

اک خواب سفر میں ہے
پھولوں میں نہیں اترا
جو رنگ شجر میں ہے

رحمت کا اشارہ ہے
اس گھور اندھیرے میں
امید کا تارا ہے

پھر رات نہیں چلتی
جو پیڑ سے کٹ جائے
وہ شاخ نہیں پھلتی

اب فرض حفاظت ہے
یہ پاک وطن ساتھی
اللہ کی امانت ہے

اک باغ بنے ایسا
ہو خاک کے تختے پر
کوئی اور نہ اس جیسا

ہم تاج یہ ہیرا ہے
دنیا کے سمندر میں
یہ ملک جزیرہ ہے

باغوں میں کھلیں کلیاں
رہیں روز قیامت تک
آباد تری گلیاں

کھیتوں میں ستارے ہیں
ہر شاخ کی آنکھوں میں
ارمان ہمارے ہیں

تقدیر نہیں بنتی
جب خواب ادھورا ہو
تعبیر نہیں بنتی

یہ خواب رہے زندہ
ہے آج بھی یہ روشن
کل اور ہو تابندہ

گلزار بنا دیں گے
اس چاند زمیں کو ہم
تاروں سے سجا دیں گے

پہچان ہماری ہے
یہ پاک زمیں یارو
جند جان ہماری ہے

اک چاند، اک تارا ہے
لہراتا ہوا پرچم
اعلان ہمارا ہے

تعبیر کی صورت ہے
اس دیس کا ہر بچہ
تعبیر کی صورت ہے

امجد اسلام امجد

تارے اُترے جب پھیلایا دامن کو
عید کے چاند میں دیکھا میں نے ساجن کو

مہندی، چوڑی اور تمہارا ساتھ سجن
اس سے بڑھ کر کیا ہے ایک سہاگن کو

تیری چاہت، تیرے قرب کے موسم نے
کتنے پیارے پھول دیے ہیں آنگن کو

پیلے جوڑے اور گلابی آنچل نے
کتنے پیارے رنگ دیے ہیں ساون کو

چاند کو دیکھا پھر تم سامنے آئے تھے
عید کی خوشیاں بھر گئیں میرے دامن کو

چاند رات کی مہندی مجھ سے کہتی ہے
تم بھی اک پیغام لکھو ناں ساجن کو

ذکیہ غزل

دہشت گردی،

ہماری آنکھیں ہمارا خون بہتے ہوئے دیکھتی ہیں
ہمارے دل ہمارے آنسوؤں سے بھرے ہوئے
ہمارے زخم ... ہر روز تازہ
ہماری وحشت ... ہمارے خوف
ہم ...
جو مرتے ہیں ہر روز ...
کہیں بھی ... کسی بھی جگہ ...
مسجدوں میں ... بازاروں میں ...
عیدگاہوں میں ... جنازہ پڑھتے ہوئے ...
ہمارے جنازے بڑھ جاتے ہیں ...
ہم ...
ہم کون ہیں؟
اور یہ کون ہیں؟
تازہ شیو ...
بے شکن لباس ...
میچنگ ٹائی ...
یہ کون ہیں؟
یہ کیوں نہیں ...؟ مارے جاتے ...!

آمنہ زرّیں

رنگا رنگ پھول

شگفتہ جاہ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"قیامت کے دن ہر دولت مند اور نادار کی خواہش یہی ہوگی۔ اسے دنیا میں صرف (زندہ رکھنے کے قابل) تھوڑی سی روزی ملی ہوتی۔"

شکر پارے،

☆ سیاستدان وہ ہے جو اپنی بیوی کو باور کروا دے کہ بدصورت عورتیں ہی میک اپ کرتی ہیں۔
☆ تجربہ نام ہے اس چیز کا جو غلطی کے بطن سے حاصل ہوتی ہے۔
☆ دوست وہی ہے جس کے دشمن اور تمہارے دشمن مشترک ہوں۔
☆ بالاقساط خریداری وہ ہے جو مہینوں کو مختصر ترین اور سالوں کو طویل ترین کر دیتی ہے۔
☆ ایمانداری اور دیانت داری پکڑے جانے کے خوف کا نام ہے۔
☆ جیوری وہ بارہ افراد ہوتے ہیں جو یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ مدعی اور مدعا علیہ میں کس کا وکیل بہترین ہے۔
☆ ٹپ اس تنخواہ کا نام ہے جو ہم دوسروں کے ملازمین کو دیتے ہیں۔
☆ کنوارا وہ شخص ہے جس نے ایک بار بھی وہی غلطی نہ کی ہو۔
☆ عورتوں کے لیے پچیس سال کی عمر بہترین ہے خصوصاً اس وقت جب وہ پینتیس سال کی ہو چکی ہوں۔
☆ مرد وہ چیز حاصل کرنا چاہتا ہے جو وہ حاصل کر سکتا ہے جبکہ عورت وہ چیز حاصل کرنا چاہتی ہے جو وہ حاصل نہیں کر سکتی۔
☆ مجرم وہ ہے جو پکڑا نہ جا سکے۔

ادم کمال۔ فیصل آباد

ابتدائے عشق ہے،

دلہن عروسی جوڑے میں بیٹھی تھی کہ دولہا آیا اور کہنے لگا۔
"مجھے اس دن کا کافی عرصے سے انتظار تھا۔"
دلہن نے جواب دیا۔ "اس وقت دن نہیں رات ہے۔"
"میرا مطلب ہے کہ تمہیں حاصل کرنے کے لیے میں نے کتنے پاپڑ بیلے، کولہو کے بیل کی طرح کام کیا۔" دولہا نے وضاحت پیش کی۔
"اس کا مطلب ہے کہ تم پاپڑ بیلنے کا کام کرتے ہو اور پارٹ ٹائم تیل کا کاروبار بھی کرتے ہوگے۔" دلہن نے کہا۔
"ڈارلنگ! تم سمجھیں نہیں۔" دولہا نے روہانسا ہو کر کہا۔
"اس سے پہلے تو کسی دولہا نے اپنی دلہن سے ایسی بات نہیں کی ہوگی۔" دلہن بولی۔
دولہا اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔
"آپا ٹھیک کہتی ہیں کہ دلہن گھر سے رخصت ہوتے وقت دس منٹ میں خود رو کر سب کو رلا دیتی ہے"

اور دولہا بے چارہ ساری زندگی روتا رہتا ہے۔" دلہن نے پھر جواب دیا۔

"اب ساری زندگی کہاں رہ گئی ہے۔ تقریباً آدھی تو گزر گئی ہے۔"

دولہا دلہن کی باتیں سن کر لاجواب ہو گیا اور اس کی زبان گنگ ہو گئی۔

نمرہ، اقرا۔ کراچی

مرد کہیں جسے،

- وہ کمپیوٹر ہے جس میں اپنی بیوی کی خامیوں اور پڑوسن کی خوبیوں کا مکمل ریکارڈ موجود ہوتا ہے۔
- مرد کی وفاداری کے لیے یہی بہت ہے کہ وہ محبوبہ کو بیوی بنا کر گھر لے آتا ہے اور پھر دوسری کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتا ہے۔
- مرد سے کام لینے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے آپ اس کی ایک سو ایک بار منتیں کریں۔
- یاد رکھیے، ادھر مرد کو غصہ آیا ادھر اس نے ماضی کے طعنے دینا شروع کر دیے۔
- تاریخ گواہ ہے کہ ہر کٹھن گھڑی میں مرد نے عورت کو قربان کرنے سے کبھی دریغ نہیں کیا۔ انارکلی کی مثال ہی لے لیجیے۔
- مرد سے بحث مت کرو کیونکہ تمہارے کچھ بولنے سے پہلے ہی اس کی انا بدک کر کھڑی ہو جائے گی۔

عائشہ۔ گوجرہ

حاصل کلام،

وکیل استغاثہ نے گواہ پر جرح کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں تو سلمان صاحب! چھ اپریل کو جب آپ بیگم حمید کے گھر گئے تو انہوں نے کیا کہا؟"

"آبجیکشن یور آنر!" وکیل صفائی نے فوراً مداخلت کی۔ "فاضل وکیل کو میرے دکیل سے یہ سوال کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔"

"کیوں نہیں پہنچتا؟" وکیل استغاثہ نے جارحانہ لہجے میں کہا۔

اس کے بعد دونوں وکیلوں کے درمیان ایک گھنٹے تک بحث ہوتی رہی۔ وکیل استغاثہ نے بیسیوں قانونی حوالے دیے اور پچاسوں مثالیں پیش کیں جن کی بنا پر وہ سوال پوچھنے کا حق رکھتے تھے۔ ان کے جواب میں وکیل صفائی بھی بہت سے دلائل پیش کرتے رہے۔ جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ وکیل استغاثہ اپنی حیثیت کا ناجائز استعمال کر رہے ہیں۔ آخر کار جج صاحب نے وکیل استغاثہ کو سوال کرنے کی اجازت دے دی۔ وکیل استغاثہ نے گہری سانس لے کر گویا تازہ دم ہوتے ہوئے نئے سرے سے سوال کیا۔

"ہاں تو سلمان صاحب! چھ اپریل کو جب آپ بیگم رشید کے گھر گئے تو انہوں نے کیا کہا؟"

"کچھ بھی نہیں وکیل صاحب! کیونکہ وہ گھر پر موجود نہیں تھیں۔" گواہ نے سادگی سے جواب دیا۔

کومل عدنان۔ ملیر کراچی

سچے دوست،

ایتھنز میں سقراط نے اپنا چھوٹا سا مکان بنوایا ہوا تھا۔ ایک شخص نے کہا۔

"آپ جیسا بڑا آدمی ایسا چھوٹا سا مکان کیوں بنواتا ہے۔ اپنی شان کے لائق مکان تعمیر کرنا چاہیے۔"

سقراط نے کہا۔ "میں اس تنگ مکان کو عالی شان اور باسامان سمجھوں گا۔ اگر وہ سچے اور اصلی دوستوں سے معمور ہو گا۔"

عائشہ خان۔ ٹنڈو محمد خان

ماں،

میں نے لوحِ دل پر تیرا نام لکھا۔ تم کو آواز دی ماں۔ اور میری آنکھوں میں سمندر اتر آئے۔
قلم کی ناؤ بے رحم سمندر کی سفاک موجوں کا کہاں
مقابلہ کرے۔
یوں لگتا ہے دل کے توے پر لفظ جل گئے ہیں۔
جلے ہوئے لفظوں کی راکھ میں انگلیاں پھیرتے ۔۔۔
ان گنت قرن گزر گئے
آج پھر
میں دشت تنہائی میں آبلہ پا، بے سائبان، کاندھے پر یادوں کی زنبیل اٹھائے، سایۂ شجر کا متلاشی
سوچ رہا ہوں
کہ کیا ماں کے بعد بھی کہیں سایہ ہوتا ہے؟
(محمد حامد سراج کی تاثراتی تحریر "میا" سے اقتباس)

صباحت مرزا۔ گجرات

دل میں رکھنے کی باتیں،

- اپنوں کی محبت کو ٹھکرانا نہ صرف بے ادبی ہے بلکہ بدنصیبی بھی ہے۔
- خوش اخلاقی ہمیشہ بدصورتی کا پردہ ہوتی ہے۔
- چھوٹے ذہن ہمیشہ خواہشوں پر چلتے ہیں اور بڑے ذہن مقاصد پر عمل کرتے ہیں۔
- محبت بادام جیسی ہوتی ہے کیا خبر اندر سے دانہ کیسا نکلے۔
- دوستی ایک ایسا عمل ہے جو پیار سے بویا جاتا ہے اور شکر سے کاٹا جاتا ہے۔

پروین ولی محمد۔ حیدر آباد

طریقہ احتجاج،

1928ء میں ہندوستان میں سائمن کمیشن آیا تو راجا محمود نے میرے کان میں کہا۔

"اب ہم بائیکاٹ کے مظاہرے کے لیے کوئی نیا طریقہ سوچیں گے۔"

ہم نے طریقہ سوچ لیا۔ ہم نے "سائمن واپس چلے جاؤ" کے پوسٹر لکھ کر غباروں اور پتنگوں کے ساتھ باندھے۔ لکھنؤ کے تعلق داروں نے کمیشن کے افراد کو قیصر باغ میں چائے کی دعوت دی تھی۔ جب وہ لوگ باغ میں چائے پی رہے تھے تو میں نے اپنے مکان کی چھت سے پتنگ بڑھانے شروع کیے۔ پھر غبارے اڑا دیے۔ اتفاق سے ہوا کا رخ موافق تھا۔ غبارے مہمانوں کے درمیان جا گرے۔ جب پتنگیں مطلوبہ بلندی تک بڑھیں تو میں نے ڈوریں کاٹ دیں اور یہ بھی مہمانوں میں جا گریں۔

تعلق دار تو بہت گھبرائے لیکن کمیشن کے برطانوی ممبروں نے اس دلچسپ طریقۂ احتجاج سے بہت لطف اٹھایا۔ شام کو پولیس میرے دروازے پر کھڑی تھی۔ لیکن ان کے پاس وارنٹ نہیں تھے۔ میں نے مزاحمت کی اور وہ وارنٹ لینے چلے گئے اور لوٹ کے نہ آئے۔

(اقتباس:۔ چوہدری خلیق الزمان، بقلم خود)

ملیحہ صدیقی۔ کراچی

انقلاب،

ایک ملک میں انقلاب آیا تو اس کا باشندہ بیرون ملک سے واپس آیا اور ایئر پورٹ سے نکل کر ٹیکسی ڈرائیور سے بولا۔

"سگریٹ کہاں سے ملے گا؟"

"سگریٹ خریدنے کے لیے آپ کو چرچ جانا پڑے گا۔"

"کیا؟ چرچ تو وہ جگہ ہے جہاں عبادت کی جاتی ہے۔"

"لوگ عبادت کے لیے یونیورسٹی جاتے ہیں۔"

"لیکن یونیورسٹی میں تو لوگ پڑھنے جاتے ہیں؟"

"نہیں پڑھنے والے تو جیل جاتے ہیں۔"

"لیکن جیل میں تو مجرم ہوتے ہیں۔"

"اوہ نہیں! وہ تو برسر اقتدار ہیں۔"

رضوانہ شکیل راؤ۔ لودھراں

خالدہ جیلانی

مبارک ہو عید کا دن سب کو

سونیا اکرم ——— اسلام آباد

تم آئے ہو تو آؤ وفا کی بات کریں
وفا کی بات میں ہر بے وفا سے کرتا ہوں

فوزیہ جنید ——— کہروڑ پکا

دن ڈھل گیا تو آئے وہ ملنے کے واسطے
یارب ہماری عید ہوئی بھی تو شام کو

ثمرین اکرام ——— میر پور خاص

عید کا چاند ہے ہر سمت ہے گہما گہمی
آنا چاہوں میں تیرے پاس تو آؤں کیسے
میری ہر سانس امانت ہے تیری یادوں کی
ٹوٹ کر اس سے - زیادہ تجھے چاہوں کیسے

اقصیٰ اکرم ——— ڈوال

یوں تیری چاہتیں سنبھالی ہیں
جیسے عیدی ہو میرے بچپن کی

اُم رومان ——— عبدالحکیم

روٹھنے والے اگر اجازت ہو
عید کے روز ملنے آجاؤں

ثمرہ، اقرار ——— کراچی

کبھی تو خواب میں آؤ کہ عید کا دن ہے
رُخِ جمال دکھاؤ کہ عید کا دن ہے

ندا قمر ——— لاہور

ہر طرف گل کھلیں مسرت کے
تم جو آؤ تو عید ہو جائے

ثمینہ کوثر عطاری ——— ڈوگہ گجرات

عید کا چاند نظر آئے گا جس دم مجھ کو
میں تیرے وصل کی اے دوست دعا مانگوں گا

حسنیٰ سویٹی، امامہ ——— عبدالحکیم

یں ہوں تیرا خیال ہے اور چاند رات ہے
دل درد سے نڈھال ہے اور چاند رات ہے
پھر تتلیاں [illegible] اڑنے لگیں وحشت خواب میں
پھر خواب [illegible] سال ہے اور چاند رات ہے

سلیمہ شیخ ——— ملتان

رستوں کو دھواں شہر کو سنسان نہ کرتے
کرنا ہی تھا یہ کام تو انسان نہ کرتے
بھتے جیسے بھی حالات الگ بات ہے لیکن
ممکن ہی نہیں تھا کہ تیرا دھیان نہ کرتے

آمنہ امتیاز مغل ——— بھکر

ہے تعلق تو فقط اک سادہ لفظ
پھر جو بھی ہے، وہ پناہ میں ہے

آمنہ اُجالا ——— ڈہرکی

بارش ہوئی تو پھولوں کے تن چاک ہو گئے
موسم کے ہاتھ بھیگ کر سفاک ہو گئے
بارش کو کیا خبر ہے کہ بارش کی چاہ میں
کیسے بلند و بالا شجر خاک ہو گئے

امبر گل ——— ٹھڈو (سندھ)

ہر کسی کے لیے کہاں، ہوتی ہیں عید کی خوشیاں
سنا ہیں لاتا ہے کہاں سب کے لیے عید کا چاند

کنول ناز ——— پسرور

پتھر ہی لگیں گے ہر سمت سے آکر
یہ جھوٹ کی دنیا ہے یہاں سچ نہ کہا کر
اب روتا ہے کیا تجھ سے کئی بار کہا تھا
حالات کے دھارے کے مخالف نہ بہا کر

*

امت الصبور

کلثوم رانے کی ڈائری سے

کچی عمر کی محبتیں اور خواب۔ وقت گزر جائے تو ان کے بارے میں سوچ کر ہنسی آتی ہے۔ رابعہ بصری کی یہ نظم ان ہی کیفیتوں کی عکاس ہے۔

تم مجھے اب بھی یاد آتے ہو
مگر
اب تمہارے نام سے دھڑکنیں مُرتعش نہیں ہوتیں
اب تمہارا ذکر
اور تمہارے لہجے کی گمبھیرتا نظروں میں نہیں جچتی
اور تمہاری سمندر کی ہم رنگ آنکھیں
جنہیں دیکھ دیکھ کر جیتی تھی
اب دل کو چھوتی نہیں ہیں
اور اب میں تمہیں سوچتی ہوں
تو خود پہ ہنس پڑتی ہوں
کہ
کچی عمر میں لڑکیاں کتنی نادان ہوتی ہیں

کومل جوئیہ کی ڈائری سے

محبت کا جذبہ ہو یا نفرت کا، وصل کا خواب ہو یا ہجر کا ملال، شاعر اپنے احساسات کو شاعری کے قالب میں ڈھال کر ہر دل کی آواز بنا دیتا ہے جیسا کہ سلیم کوثر کی یہ خوبصورت غزل دل پہ دستک دیتی محسوس ہوتی ہے۔

مجھے خبر تھی مرے بعد وہ بکھر جاتا
سو اس کو کس کے بھروسے پہ چھوڑ کر جاتا

وہ کوئی نشہ نہیں تھا کہ ٹوٹتا مجھ کو
وہ سانحہ بھی نہیں تھا کہ جو گزر جاتا

رُکا ہوا تھا مرا سانس مرے سینے میں
اُسے گلے نہ لگاتا تو گھٹ کے مر جاتا

شکستہ ہو گیا پندار آئینہ ورنہ
یقین کر میں ترے عشق سے مکر جاتا

نہ جانے کتنے محاذوں پہ جنگ تھی میری
بس ایک وعدہ نبھانے میں اپنے گھر جاتا

نیلم شہزادی کی ڈائری سے

لڑکیاں واقعی معصوم ہوتی ہیں یا کچھ دھوکے اس قدر دلکش ہوتے ہیں کہ نسل در نسل اس گنگا میں بہتی چلی جاتی ہیں۔ پھر ٹوٹ جانے والے خواب آنکھوں میں کانچ کی کرچیوں کی طرح چبھتے رہتے ہیں۔ پروین شاکر کی یہ نظم قارئین کی نذر۔

پھولوں کی پنکھڑیاں چنتے چنتے
آئینہ در آئینہ خود کو کھوجتی یہ لڑکی
شہر کی اس سنسان گلی تک آ پہنچی ہے
کہ مڑ کر دیکھتی ہے تو پیچھے دُور دُور تک
کرچیاں بکھری ہوئی ہیں
ایسا نہیں کہ اس نے
اپنے عکس کو جوڑنے کی سعی نہیں کی
پر اس کھیل میں کبھی تصویر دھندلا گئی
کبھی انگلیاں لہو لہان ہو گئیں



نادرہ خاتون

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

نگہت سیما... چکوال

جولائی کا شمارہ ملا "زمین کے آنسو" کے صفحہ نمبر 135 پر دو تین جملے چھپنے سے رہ گئے ہیں۔ ویسے تو ایک دو جملے کٹ جانے سے فرق نہیں پڑتا لیکن یہاں حقائق متاثر ہو رہے ہیں اس لیے لکھ رہی ہوں آپ پلیز چھاپ دیجیے گا۔

جملہ یہ تھا۔

"ولایت تک مقدمہ لڑا گیا تھا لیکن پھانسی ہو گئی۔ مشین گنیں رات کو ہی مسلمانوں کے محلوں میں لگا دی گئی تھیں۔ صبح فجر کے وقت پھانسی دی گئی تھی۔ چالیس ہزار آدمی جنازے میں تھے۔ امیر احمد کا باپ مستری تھا۔ تم نے غازی علم الدین کے متعلق تو سنا ہو گا نا۔ اس نے راج پال کو مارا تھا جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کتاب لکھی تھی۔ وہ بھی مستری تھا۔ علامہ اقبال نے اس کے متعلق کہا تھا۔ "ترکھانوں کا منڈا سبقت لے گیا۔"

ج۔ نگہت معذرت خواہ ہیں کہ کمپوزنگ میں آپ کی کچھ سطریں حذف ہو گئیں۔ تاریخ کی درستی کے لیے تصحیح کر رہے ہیں۔

شازیہ جمال نیر... وہوا

اس بار ریکارڈ گرمی نے مزاج اور دماغ بری طرح خراب کر رکھا تھا لیکن "پیارے خواتین کی آمد نے دونوں پر حیرت انگیز حد تک خوشگوار اثر ڈالا اور اب اگلے پندرہ دنوں تک انہیں خوشگوار ہی رہنا ہے کیونکہ میں ایک ہی دن میں پورا رسالہ ختم کرنے کے بالکل بھی حق میں نہیں ہوں۔

بات ہو جائے تازہ شمارے کی تو سرورق پر براجمان سرخ دوپٹا لیے دوشیزہ بہت اچھی لگی' عنیزہ سید کا "کوہ گراں تھے ہم" بالکل ویسا ہی ہے جیسا اسے ہونا چاہیے تھا' جسٹ پرفیکٹ! پسندیدہ کردار بلاشبہ "سعد سلطان" ہی ہے۔ اس کی اپنے والد کے ساتھ لطیف طنزیہ گفتگو مزہ دے جاتی ہے۔

"میرے خواب لوٹا دو" میں نگہت جی تمام کرداروں سے بخوبی انصاف کر رہی ہیں۔ ویسے مجھے ذاتی طور پر "رازی" جیسے کردار پسند نہیں' جنہیں کھل کر نہ اچھا کہہ سکتے ہیں نہ برا۔ البتہ "شمشیر علی" خاصا فیورٹ بنا ہوا ہے۔

سائرہ رضا کا "انصاف اور منصف" بہت بہت اچھا لگا۔

یقین جانیے ایک ٹرانس کی سی کیفیت میں پڑھنا شروع اور ختم کیا' کتنی بار آنکھیں بھیگیں' کتنی بار لب کاٹے کچھ خبر نہیں حقیقت یہی ہے اگر گھر کے سربراہ رشتوں اور معاملات میں انصاف اور اعتدال سے کام نہ لیں تو شیرازہ یونہی بکھرتا ہے۔ "خیال یار" کے لیے یہی کہنا چاہوں گی "سمیرا حمید نیا نام۔ بہترین کام!"

"ساجن کی کیا بات" میں عائشہ نصیر احمد کے جملوں کی برجستگی نے خوب رنگ جمایا۔ امایہ خان کی "دستک" اچھی لگی "ایک موقع" میں مسز تنظیم نے دریا کو کوزے میں بند کیا اور کیا خوب بند کیا۔ "نئے مزاج کا شہر" عنبرین اعجاز کا اچھوتا انداز تحریر پسند آیا۔ انیسہ سلیم جی "اپنی سیانی" سے ملے بہت دن نہیں ہو گئے؟ ملاقات کا کوئی بندوبست کروا دیجیے اب۔ ویسے طویل دوپہریں' ساون کی گھٹائیں' کوکتی کوئل' ہوائیں' آم کس کی یاد دلا رہے ہیں؟ جی ہاں راحت جبیں کے ایک اور شاہکار مکمل ناول کی جو پڑھنے

کو مل رہا ہے؟

ج - پیاری شازیہ آپ نے خط لکھا اور تفصیلی تبصرہ بھی کیا بہت خوشی ہوئی۔ انیسہ، سلیم اور راحت جبیں تک آپ کا پیغام ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔ شازیہ آپ بہت اچھا لکھتی ہیں ہم آپ کی تحریروں کا انتظار کرتے ہیں۔ آپ ہمیں کوئی اچھا سا ناول یا ناولٹ لکھ کر بھجوائیں۔ ناول کے بارے میں آپ کو فون پر بتا دیں گے۔

ثمرین اکرام۔۔۔ میرپور خاص

ٹائٹل بہت خوب صورت تھا ماڈل کا دلفریب انداز دل میں اتر گیا۔ کرن کرن روشنی میں رمضان المبارک کے بارے میں پڑھ کر روح سیراب ہو گئی۔ سوہائے علی ابڑو اور انوشے عباسی کا انٹرویو پسند آیا آپ سے ایک بار پھر ریکویسٹ کر رہی ہوں۔ پلیز جیو کے نیوز اینکر منصور علی خان کا انٹرویو شائع کیجئے اور بندھن میں یاسر نواز اور ندا یاسر کا انٹرویو بھی کیجئے پلیز۔ "میرے خواب لوٹا دو" نگہت عبداللہ کی بہترین تحریر اب اختتامی مراحل میں ہے۔ بہت ہی زبردست اور دلچسپ تحریر ہے۔ اس کے بعد میرا موسٹ فیورٹ ناول "جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم" عنیزہ سید کی بہترین تحریر ماہ نور اور سعد کا کردار مجھے بہت پسند ہے پلیز عنیزہ جی! ماہ نور اور سعد کو ملا دیجئے گا۔ یہ دونوں جدا ہوئے تو کہانی کا سارا حسن ختم ہو جائے گا۔ ماہ تمام میں آمنہ ریاض نے نند بھاوج کے روایتی موضوع پر بہت دلچسپ لکھا ہے اور ہاں آپ سے ایک بات معلوم کرنا تھی میں نے تین چار ماہ پہلے (آپ کا باورچی خانہ) میں حصہ لیا تھا اپنا مکمل ایڈریس اور شوہر کا فون نمبر بھی بھجوایا تھا۔ آپ نے میرے ہزبینڈ سے فون پر ایڈریس کنفرم بھی کیا تھا انعام بھجوانے کے لیے مگر ابھی تک تو موصول نہیں ہوا۔

ج - ثمرین خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ قبول کریں۔ آپ کی فرمائشیں شاہین رشید تک پہنچا رہے ہیں۔ آپ کو انعام میں ایک کتاب تقریباً" دو ماہ پہلے بھجوائی جا چکی ہے حیرت ہے کہ اب تک آپ کو موصول کیوں نہیں ہوئی۔ آپ اپنے ڈاکیہ سے پتا کریں۔

نگہت یوسف۔۔۔ سرگودھا (سلطان پور)

خواتین کے ساتھ رشتہ پچھلے 9 سالوں سے جڑا ہوا ہے اور آئندہ اس میں ان شاءاللہ مزید مضبوطی کا امکان ہے۔ جب میں نویں میں تھی تب خواتین شروع کیا تھا اور اب میں Med کی طالبہ ہوں۔

سب سے پہلے "کوہ گراں تھے ہم" پڑھا۔ عنیزہ سید جی آپ کے ناول کی ہر قسط کو پڑھ کر بے اختیار آپ کے ہاتھ چومنے کو دل کرتا ہے اس میں سعد سلطان کا کردار میرا سب سے زیادہ پسندیدہ کردار ہے۔ "زمین کے آنسو" بھی ٹھیک ہی ہے لیکن کرداروں کی بھرمار ہے۔ ماہ تمام نے ہنسا ہنسا کر دوہرا کر دیا بہت ہی فنٹاسٹک قسط تھی اور جب تقی نے بھی شفا کے ساتھ چیخیں بلند کرنا شروع کر دیں۔ مکمل ناول میں ساجن کی کیا بات بس ٹھیک ہی تھا۔ افسانوں میں انصاف اور منصف بہترین تھا۔ آخر میں آپ سے ایک گزارش کرنا ہے اور وہ ہے صبا قمر اور شاہد آفریدی کے انٹرویوز کی۔

ج - پیاری نگہت! خواتین کی محفل میں خوش آمدید اور دعائیں۔ نو سال سے آپ خواتین پڑھ رہی ہیں تو پھر خط لکھنے میں اتنی تاخیر کیوں؟

آپ کی فرمائش نوٹ کر لی ہے' جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

زاہدہ پروین۔۔۔ تحصیل سلانوالی ضلع سرگودھا

سب سے پہلے تو ہم نے مکمل ناول پڑھا۔ کیا خوب لکھا عائشہ نصیر احمد نے۔ ہلکی پھلکی سی تحریر لیکن ایک اہم سبق کہ ظاہری نہیں انسان کو باطنی طور پر دیکھو پھر ہم آئے "ماہ تمام" کی طرف تو جناب بہت مزا آیا۔ کئی جگہ تو ہم بے تحاشا ہنسیں سچی بہت اچھی کہانی ہے میرے خیال میں تقی ساہر کا کزن ہے اور شفا کا ہیرو اور سمیر کی منگیتر ثمرہ ہی ہے۔ انٹرویو بھی اچھے تھے اور جناب نگہت عبداللہ کے ناول میرے خواب لوٹا دو کا ذکر نہ کرنا بہت بڑی زیادتی ہو گی اس دفعہ کی قسط تو انتہائی زبردست اور شاندار تھی مزا آ گیا اریبہ کا نکاح کا سن کر۔ رازی کے حال کا پڑھ کر لیکن پلیز نگہت جی سارہ اور رازی کا ملاپ نہ کیجئے گا ورنہ اریبہ کبھی خوش نہیں رہ سکے گی۔ اور ہاں جی آسیہ رزاقی جی آپ نے بہت رلایا ہے سچ میں میرا دل دکھ سے بھر گیا۔ آخر ساس یہ کیوں نہیں سوچتی کہ ان کی بہو بھی کسی کی بیٹی ہے۔

ج - پیاری زاہدہ! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کے

پچھلے خطوط شامل نہ ہو سکے۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔ نگہت عبداللہ تک آپ کی فرمائش پہنچا رہے ہیں۔

ام رومان۔۔۔ عبدالحکیم

خواتین سات جولائی کو ملا۔ سرورق اچھا لگا۔ کرن کرن روشنی سے مستفید ہونے کے بعد سب سے پہلے نگہت عبداللہ کا "میرے خواب لوٹا دو" پڑھا۔ نگہت جی آپ کا ناول بہت اچھا جا رہا ہے۔ شدت سے لاسٹ قسط کا انتظار رہے گا۔ بس سارہ کی شادی کسی بھی صورت رازی سے نہیں ہونی چاہیے۔ اس کے بعد عنیزہ سید کا ناول "کوہ گراں تھے ہم" پڑھا۔ بہت بہت زبردست ہے۔ سعد کا فلزا ظہور سے ملنا اتنا اچھا نہیں لگا اور ماہ نور کو اتنا پریشان نہیں کرنا چاہیے اسے۔ رابعہ بی بی کی الجھنیں سلجھنے کا بھی شدت سے انتظار ہے۔ نگہت سیما کا "زمین کے آنسو" بھی بہت اچھا ہے۔ پلیز آپی اریب فاطمہ اور ایبک کو ضرور ملنا چاہیے۔ مجھے لگتا ہے یہ رابیل اور رجی ان دونوں کے درمیان پرابلم بن جائیں گے۔ آمنہ ریاض کا "ماہ تمام" بھی بہت زبردست جا رہا ہے۔ ان کے ناول "بساط دل" کے بعد تو میں ان کی بہت فین بن چکی ہوں۔ باقی سلسلے بھی زبردست ہیں۔ خاتون کی ڈائری سے ماریہ سید واجد علی' کہکشاں ارجمند اور آمنہ اجالا کے انتخابات پسند آئے۔ انوشے عباسی اور سوہائے سے ملاقات خوب رہی۔

ج - ام رومان! خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔ آپ نے کافی عرصہ بعد یاد کیا۔ خیریت تو تھی۔ اب اتنا طویل وقفہ نہ دیجیے گا۔

مسز رضوانہ مشہود۔۔۔ نارتھ کراچی

میں ہمیشہ کی طرح خاموش قاری بنی رہتی۔ کبھی تحریروں پر تبصرہ نہ کرتی۔ ماہ جولائی کے خواتین کی دو پر اثر' حقیقت سے قریب تحریروں نے بے ساختہ قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ سب سے پہلے بات کروں گی محترمہ آسیہ رزاقی کے ناولٹ "سمجھوتا" کی۔ جس نے آغاز سے ہی ایسا گرفت میں لیا کہ دنیا مافیہا سے بے خبر ہو کر پڑھتی چلی گئی۔ انسانی نفسیات کے ایک انتہائی حساس پہلو کا باریک بینی سے جائزہ لے کر محترمہ آسیہ رزاقی نے وہ شاہکار تخلیق کیا کہ عقل دنگ رہ گئی۔ بالکل ہمارے اردگرد' ہمارے قریبی رشتوں کی کہانی کہ ہر ہر فقرے پر دل سے آواز آتی رہی کہ ہاں 90 فیصد ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہمارے اپنے بہت قریبی جاننے والوں میں ایسا ہی ہوا۔ ماں کی "فرماں برداری" میں "جنت کے چھن جانے کے خوف میں" اچھا بھلا بسا بسایا گھر اجاڑ ڈالا۔ وہ بھی پانچ بچوں کے ہوتے ہوئے۔ کس جرم کی سزا میں؟ وہی پسند کی شادی جس کی دین اسلام تو اجازت دیتا ہے' مگر بقلم "آسیہ رزاقی صاحبہ" ڈائن ماں نہیں یا تو پسند کی شادی کرنے ہی نہ دیں۔ دھونس دلائل سے روکیں یا اگر کر دیں یا بیٹا خود کر لائے تو اسے خاندان کی عزت سمجھنا چاہیے۔ میرے ناقص علم میں ان چھوٹی چھوٹی باتوں مثلاً "بہو کی کم آمیزی' ساس کی ہدایات پر حرف بہ حرف عمل نہ کرنا۔ بے عقلی' نندوئیوں سے الگ رہنا' نندوں پر توجہ نہ دینا' ہرگز بھی طلاق دلوانے کا شرعی جواز نہیں۔ بیوی کا کردار ٹھیک نہ ہو' لیکن دو چشم دید گواہ اس کے کردار کی کجی کے گواہ ہوں۔ تب بھی اسے ایک دم چھوڑ دینے کا حکم نہیں۔ دین اسلام مختلف قابل برداشت سزائیں تجویز کرتا ہے۔ پھر اگر بیوی سچے دل سے تائب ہو جائے تو اسے موقع دے کر دیکھنا چاہیے۔ اگر راہ راست پر آ گئی تو پھر پہلے جیسے تعلقات استوار کر لینے چاہئیں۔ کبھی پچھلی زندگی کا طعنہ نہیں دینا چاہیے تو ماں کے فرماں بردار عارف اور ہمارے قریبی جاننے والے فرماں بردار بیٹے اللہ کو کیا منہ دکھائیں گے کہ ان کی بیویوں میں تو یہ عیب ہی نہ تھا۔ غرض بلاشبہ بہت خوب صورت ناولٹ ہے۔ عارف کو اس کے کیے کی سزا مل گئی۔ پورے خواتین کی جان اور شان اس بہترین "سمجھوتا" پر محترمہ آسیہ رزاقی کو میری طرف سے ڈھیروں دلی دعائیں کہہ دیں۔ اب بات کرتی ہوں دوسری دل کو چھو لینے والی تحریر کی۔ سمیرا حمید خواتین میں بہت خوب صورت اضافہ ثابت ہو رہی ہیں۔ ماشاءاللہ بہت تیزی سے منجھی ہوئی مصنفات میں شامل ہوتے جا رہی ہیں۔ سمیرا کا ناولٹ "خیال یار" بلاشبہ ایک بہترین موضوع پر اچھوتی تخلیق ہے۔ اللہ کی اور ان کی محبت میں فرق یہ ہے کہ اللہ کی محبت طاقت بن جاتی ہے اور انسان کی محبت کمزوری پھر صد ہم کا کیا قصور جو ایک محروم محبت و توجہ لڑکی ماں اور دادی کے

طے کردہ رشتے ہادی کو اپنا سب کچھ مان چکی تھی۔ پھر اس کا اوصاف کی طرف جھکاؤ تو اس کے لیے کڑی آزمائش ثابت ہوا تاکہ اس کے اعصاب ٹوٹ گئے۔ لیکن شکر کسی ناقابل تلافی نقصان سے پہلے ہی اپنے اصل ہادی کو پہچان گئی۔ پا گئی ویلڈن سمیرا جی' اللہ کرے حسن قلم اور زیادہ' پلیز صدھم کے معنی بتادیں اور یہ بھی کہ اسے ادا کیسے کرنا ہے۔ بہت منفرد اور خوب صورت نام ہے۔ آخر میں میری شاہین آپا سے پرزور فرمائش ہے کہ پلیز اگر ہو سکے تو سابق کرکٹر شعیب اختر کا فیملی انٹرویو لے لیں۔ اگر فیملی انٹرویو نہ دیں تو شعیب اختر ہی کا انٹرویو لے لیں۔

ج ۔ رضوانہ جی! آپ تو کراچی میں رہتی ہیں۔ کراچی میں پرچا تین' چار تاریخ تک آجاتا ہے۔ پھر آپ کو اتنا لیٹ کیوں ملتا ہے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ بہت صحیح لکھا آپ نے والدین کی فرماں برداری اپنی جگہ بہت اہم ہے۔ لیکن شوہر ہونے کی حیثیت سے جو فرائض عائد ہوتے ہیں۔ ان کا نبھانا بھی ضروری ہے اور طلاق تو جائز کاموں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ عمل ہے۔ اس طرح چھوٹی چھوٹی باتوں پر طلاق دینا' کسی طور اسے ہنسی کھیل بنالینا کسی طور جائز نہیں۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں۔ انہیں اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ والدین کو بھی عقل سلیم دے کہ وہ اپنی اولاد کو نیک اور سیدھی راہ دکھائیں نہ کہ اس طرح انہیں بربادی کی راہ پر ڈالیں۔ ماں کی فرماں برداری میں ایک گھر ٹوٹا اور پانچ بچے ماں یا باپ سے علیحدہ ہوئے۔ اس کا ذمہ دار کون ہے؟
صدھم کے معنی تو سمیرا حمید ہی بتا سکتی ہیں۔ یہ نام ہم نے بھی پہلی بار سنا ہے۔

رابعہ اقبال' راحیلہ اقبال۔۔۔ حاجی واہ (مظفر گڑھ)

خواتین اور شعاع سے تعلق تو اس وقت سے ہے۔ جب لفظوں سے تو شناسائی تھی۔ مفہوم سے ناآشنا تھے۔ آپی! ہمارے ہاں ڈائجسٹ پڑھنے کو اچھا کام تسلیم نہیں کیا جاتا۔ لیکن ہم پورے یقین سے کہتے ہیں کہ یہ ہماری زندگی میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ ان سے ہمیں آگہی ملی۔ شعور ملا اور زندگی گزارنے کے طریقے بھی۔ ہر ماہ خواتین حاصل کرنے کے لیے بہت بے چین رہتے ہیں۔ کبھی کبھی تو مہینے کی انتیس تاریخ ہو جاتی ہے اور ڈائجسٹ نہیں ملتا۔ ارے بھئی! کوئی بازار جائے تو لا کے دے نا! جولائی کا شمارہ بہت زبردست تھا۔ نگہت عبداللہ نے خوب لکھا اب آخری قسط کا انتظار ہے۔ "زمین کے آنسو" بھی زبردست جارہا ہے۔ آپی جی بس ایبک اور اریب کو جدا مت کیجیے گا۔ سائرہ رضا حقیقت لکھتی ہیں اور خوب لکھتی ہیں۔ آپ نے بالکل ٹھیک لکھا۔ انصاف ہمیشہ ہو کر رہتا ہے۔ گڈ جی۔۔۔ سمیرا حمید کے تراشے خیال نے جو راہ دکھائی۔ اس نے ہمیں بھی ہادی برحق کی طرف خوب متوجہ کیا۔ اس کے علاوہ آسیہ رزاقی کا ناولٹ' آمنہ ریاض کا "ماہ تمام" اور سب افسانے سبق آموز اور گڈ تھے۔ ڈائجسٹ ہر لحاظ سے بہتر تھا۔

ج ۔ رابعہ اور راحیلہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ کی شرکت سے بہت خوشی ہوئی۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

سلمیٰ سحر۔۔۔ حافظ آباد

ٹاپ آف دی لسٹ عنیزہ سید جارہی ہیں۔ سعد سلطان اتنا زبردست کریکٹر ہے کہ الفاظ کم ہیں اس کے سامنے۔ نگہت سیما کا "زمین کے آنسو" تو ہمیں آنسو رلاتا ہے۔ بشریٰ سعید تو "سفال گر" کے بعد غائب ہی ہو گئیں پلیز بشریٰ جی! جلدی سے حاضر ہو جائیں۔ آمنہ ریاض اور نگہت عبداللہ بھی بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔
ج سلمیٰ! زندگی کے دامن میں ہمارے لیے کیا ہے نہیں جان سکتے۔ آنے والا کوئی ایک پل پوری زندگی بدلنے کی طاقت رکھتا ہے۔ آپ کچھ کٹھن لمحات سے گزریں' لیکن پھر کچھ خوشیوں نے آپ کے گھر پر دستک دی۔ بشریٰ سعید کی کمی تو ہم بھی شدت سے محسوس کررہے ہیں۔ انہوں نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ اگست کے لیے مکمل ناول لکھیں گی۔ اب اگست کا شمارہ بھی آگیا' لیکن ان کا وعدہ وفا نہ ہوا۔
خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

حمنہ حبیب۔۔۔ عبدالحکیم

ٹائٹل اچھا تھا۔ نگہت عبداللہ کا "میرے خواب لوٹا دو" بلاشبہ بہت زبردست جارہا ہے۔ رازی کے ساتھ تو بہت برا ہونا چاہیے اور سارہ اور سمیر کو بھی ملادیں نا جی۔۔۔ اور اریبہ اور سارہ کے بھائی کی شادی تاجور سے کروادیں تو پکا ہی اچھا ہو۔ عنیزہ سید کا "کوہ گراں تھے ہم" بہت بہت بہت زبردست ناول ہے۔ سعدیہ کی ماں سعد کی بھی ماں ہیں اور کھاری کی ماں کون ہیں۔ یہ بھی جلدی سے بتادیں عنیزہ جی۔۔۔ نگہت سیما کا "زمین کے آنسو" ناول بھی بہت زبردست ہے۔ آپی جی پلیز اریب فاطمہ اور ایبک کو جدا نہ کرنا اور احمد رضا کو ان لوگوں سے نجات دلوادیں اور احسان شاہ کی غلط فہمی بھی جلدی دور کردیں۔ عائشہ نصیر احمد کا مکمل ناول بھی اچھا تھا۔ سمیرا حمید کا "خیال یار" ناولٹ بھی بہت اچھا تھا۔ آمنہ ریاض کا "ماہ تمام" بھی بہت اچھا جارہا ہے۔ اور آپی جی شفا کے ساتھ کچھ بھی برا نہ ہوا۔

افشاں خان' عطیہ حق نواز۔۔۔ شاہ پور چاکر

خواتین سے وابستگی تو بہت پرانی ہے۔ 9th کلاس میں تھی۔ پہلی بار تب باقاعدہ طور پر پورا رسالہ پڑھا اور 2007ء میں بھائی کی شادی کے بعد سے باقاعدگی سے گھر میں آرہا ہے۔ جس کا کریڈٹ عطیہ بھابھی کو جاتا ہے۔ تو جناب اب تو خواتین سے رشتہ بڑا مضبوط ہو چکا ہے۔ میں B.B.A کے فائنل سمسٹر میں ہوں اور چونکہ پڑھائی کی وجہ سے ہاسٹل میں رہتی ہوں تو دو' چار دن کے لیے آنا ہوتا ہے۔ صرف قسط وار کہانیاں پڑھ لیتی ہوں۔ اب چونکہ چھٹیاں ہیں تو موقع سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے سارے پرانے رسالے پڑھ ڈالے ہیں۔ تمام کہانیاں' ہمیشہ کی طرح بہت اچھی اور سبق آموز لگیں۔ ناول میں مجھے "میرے خواب لوٹا دو" جبکہ بھابھی کو "جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم" بے حد و حساب پسند ہے۔ مکمل ناول "زمین کے آنسو" میری 'امی اور بھابھی کی مشترکہ پسند ہے اور "ماہ تمام" میں سماہر بھابھی ولن کے رول سے ہٹ کر سپورٹنگ رول میں آگئیں تو ان سے جو شکایتیں تھیں' کچھ حد تک دور ہو گئیں۔

ج پیاری افشاں اور عطیہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ اپنی امی کو ہمارا سلام اور شکریہ پہنچادیں۔ ایک ضروری بات' سماہر بھابھی کے بارے میں آپ نے یہ کیسے سمجھا کہ وہ سپورٹنگ رول میں آگئیں؟ ہمیں تو ایسا کچھ نظر نہیں آرہا ہے۔

نورالہدیٰ بنت افضل۔۔۔ بہاول پور

جولائی کا ٹائٹل بالکل فریش اور نکھرا تھا۔ ماڈل نے دوپٹا اوڑھا ہوا تھا جو اچھا لگا۔ "جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم" میں سعد یقیناً" رابعہ آپا کا اور کھاری فلزا ظہور کا بیٹا لگتا ہے۔ بہت اچھی تحریر ہے۔ نئے مزاج کا شہر پڑھ کر بیک وقت ہنسی بھی آئی۔ رونا بھی آیا۔ "سمجھوتا" بہت اچھا ناولٹ تھا۔ عارف اور اس کی امی جیسے لوگ ہی معاشرے کا بگاڑ ہیں۔ سمیرا حمید کے ناولٹ میں صدھم نے اچھا فیصلہ کیا۔ سائرہ رضا کا ناول اس حدیث کے مفہوم کی عکاسی کررہا تھا کہ "دیور تو موت ہے" "زمین کے آنسو" واہ جی واہ! کیا بات ہے! بہت اچھا چل رہا ہے۔ لیکن احمد رضا کو اس کے گھر والوں سے ملوادیجیے گا۔ "ساجن کی کیا بات" اچھا ناول تھا پر دادی کی اکڑ سمجھ میں نہیں آئی' انعمتہ کا کردار بہت سویٹ تھا۔

ج ۔ نورالہدیٰ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید اور دعائیں۔ آپ کی تعریف و تنقید متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ بیمار کا حال اچھا ہے کا جواب قابل اشاعت نہیں ہے۔ خامشی کو بیاں ملے اور خواتین کے سب ہی سلسلوں کے لیے اپنا انتخاب آپ ایک ہی لفافے میں ڈال سکتی ہیں۔ بھجوانے کا طریقہ وہی ہے۔ جس طرح آپ نے یہ خط بھجوایا ہے۔ آپ اسی خط کے لفافہ میں ڈال دیتیں تو ہمیں اسی ماہ مل جاتا۔

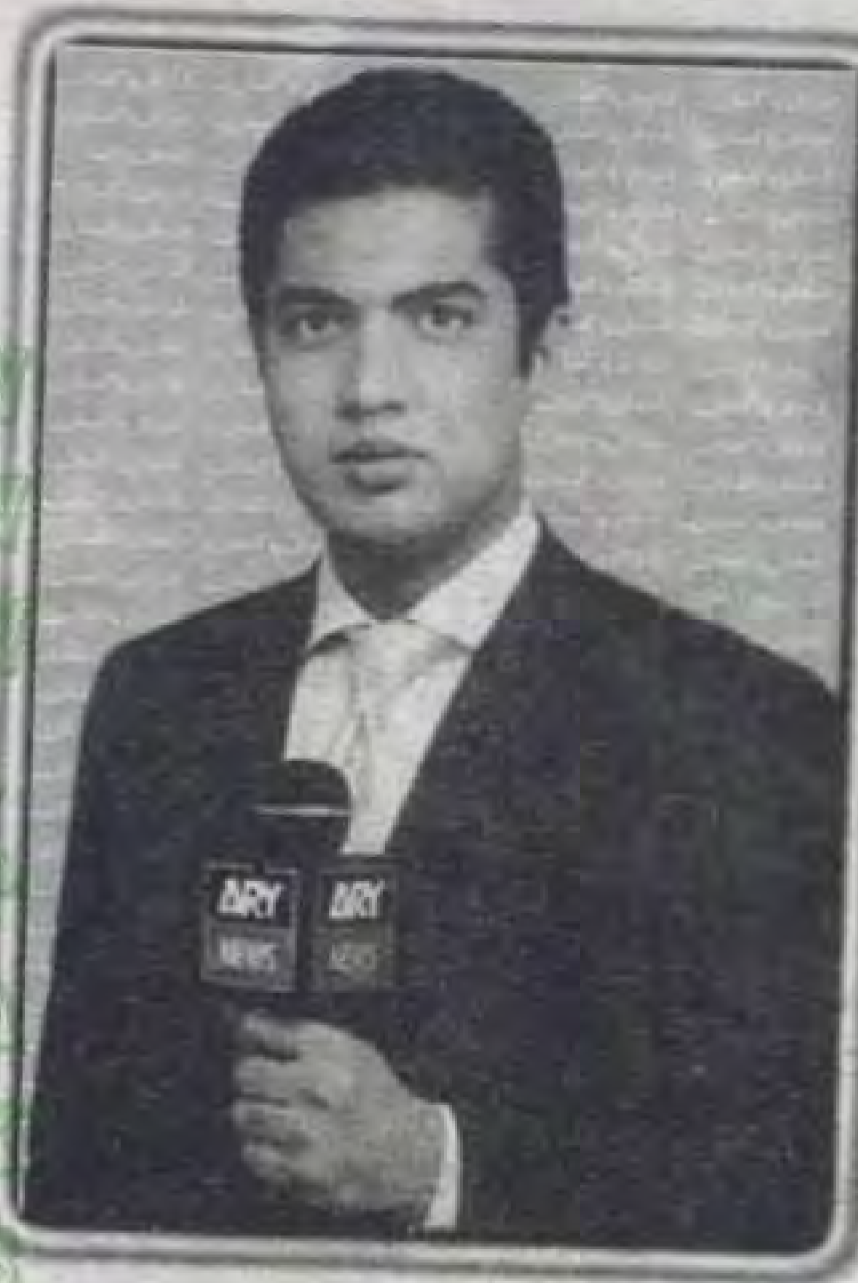


"سرِعام" کے اینکر

اقرارالحسن سے ملاقات

شاہین رشید

برائی اس وقت تک ختم نہیں ہوتی جب تک اس کو جڑ سے نہ پکڑا جائے اور برائی کو جڑ سے پکڑ کر اس کا خاتمہ کرنا ہمارا اور آپ کا کام نہیں بلکہ ان لوگوں کا کام ہے، جو پاور میں ہیں۔ ہم اور آپ تو صرف نشان دہی کر سکتے ہیں اور یہ کام ہمارا میڈیا ایک عرصے سے کر رہا ہے مگر برائیاں ختم ہونے کے بجائے ان میں بتدریج اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ ہمیں یاد ہے کہ شاید 80ء کی دہائی میں پی ٹی وی میں لاہور سے سلیم طاہر ایک پروگرام کیا کرتے تھے جس میں وہ مختلف اداروں کی کارکردگی، ناانصافیوں اور بہت سی برائیوں کو ریکارڈ کر کے ناظرین تک پہنچایا کرتے تھے۔ مگر نتیجہ کیا ہوا؟ وقتی طور پر اثر ہوا اور پھر بڑے لوگوں نے اپنی سفارش سے سب کچھ ٹھیک کروالیا۔ آج کل برائی کی نشان دہی کا کام "اے آروائی" کے اینکر اقرارالحسن انجام دے رہے ہیں اور ان کی جرأت کو داد دینی پڑے کہ ان برے حالات میں بھی وہ "سرعام" جیسا پروگرام پیش کر کے گویا "جہاد" کر رہے ہیں مگر نتیجہ حوصلہ افزا نہیں ہے۔ سب کچھ ویسا ہی چل رہا ہے مگر یہ بھی بڑی بات ہے



کہ لوگوں کی نالج میں ہر بات آجاتی ہے کہ ہمارے معاشرے میں کیا ہو رہا ہے۔

"کیا حال ہیں۔ بہت عرصے سے چاہ رہی تھی آپ کا انٹرویو کرنا۔"

"جی اللہ کا شکر ہے۔ بس مصروفیات اتنی رہیں گزشتہ دنوں کہ کیا بتاؤں۔"

"الیکشن 2013ء کو گزرے اگرچہ تین ماہ ہو گئے ہیں لیکن اس ٹرانسمیشن کی تعریف نہ کرنا یقیناً زیادتی ہوگی لیکن ایک بات تو بتائیں آپ، وسیم بادامی اور کاشف عباسی زیادہ تر کالے کپڑوں میں کیوں آتے تھے۔"

قہقہہ "دوسروں کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ کالے کپڑے پہننے میں زیادہ آسانی ہے کہ چوائس نہیں کرنی پڑتی کہ اب پینٹ کون سی لیں، شرٹ کس رنگ کی لیں۔۔۔ اور ایک ساتھ تینوں کے کالے کپڑوں کا بھی محض اتفاق ہی تھا۔"

"کیا کلر فل کپڑے اچھے نہیں لگتے آپ کو؟"

"میری اماں کو بھی اس بات پر بہت اعتراض ہے۔ مگر میں ذرا سست قسم کا انسان ہوں۔ دو چار ذرا سے فرق کے ساتھ کپڑے بنوالیتا ہوں اور استری کر کے لٹکا دیتا ہوں اور پہن لیتا ہوں۔ کون دماغ لڑائے کہ کون سی شرٹ ہو کون سی پینٹ ہو۔"

"مگر یہ کام آپ کا تو نہیں ہے بیگم کا ہے۔ خیر آج کل کیا مصروفیات ہیں۔"

"ہاں کیوں نہیں۔۔۔ مگر ان کی بھی تو اپنی مصروفیات ہیں اور میری مصروفیات بھی یہی ہیں کہ "سرعام" ہے زندگی۔ اور کوئی دوسرا کوئی کام نہیں۔ صبح دوپہر شام اس میں مصروف رہتا ہوں۔"

"ہوں۔۔۔ بہت خطرناک پروگرام ہے۔ ڈر نہیں لگتا؟"

"نہیں اللہ کا شکر ہے ڈر نہیں لگتا کیونکہ کہتے ہیں کہ موت اسی وقت آتی ہے، جب اس کا وقت مقرر ہوتا ہے۔"

"نہیں۔۔۔ یہ غلط بات ہے، ہمارے پاکستان میں تو مرنا بہت آسان ہے، آپ بھی ملک سے باہر جاتے ہیں۔ میں بھی جاتی ہوں۔ زندگی بہت سیکیور ہے وہاں۔ وہاں لوگ "طبعی" موت مرتے ہیں مگر ہمارے یہاں تو؟"

"جی بالکل۔ ہم بلاسٹ سے نہیں مرے تو ٹارگٹ کلنگ میں مر گئے۔ یا بس ڈرائیور مار دے گا، یا کوئی بھی حادثہ ہو جائے گا، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے کہ "موت خود زندگی کی حفاظت کرتی ہے" بس۔۔۔ ایسا نہیں ہے کہ ہم اپنی حفاظت نہیں کرتے، کرتے ہیں۔ آگے اللہ مالک ہے۔"

"تو جناب "سرعام" کی طرف آنے سے پہلے میں چاہوں گی کہ اپنی فیملی کے بارے میں کچھ بتائیں آپ۔"

"میں حتمی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ میرا آبائی گاؤں کون سا ہے۔ ہمارے بزرگ قیام پاکستان سے کچھ ہی

عرصہ پہلے امرتسر سے ہجرت کر کے پاکستان آئے۔ سندھ میں کچھ زمینیں لیں، پھر انہیں بیچ کر قصور شفٹ ہو گئے اور وہاں زمینیں خرید لیں۔ ننھیالی بھی مختلف جگہوں سے ہوتے ہوئے لاہور میں آ کر آباد ہوئے۔ والد صاحب کے تعلقات اپنے والد سے خراب ہوئے تو انہوں نے فیصل آباد کے قریب ایک گاؤں گجر سنگھ والا میں رہائش اختیار کی۔ میری اسکولنگ کا آغاز وہیں سے ہوا اور میٹرک تک تعلیم اسی گاؤں کے اسکول سے حاصل کی۔ اور پھر ہم بچوں کی اچھی تعلیم کی خاطر ہمارے والدین لاہور شفٹ ہو گئے۔ بنیادی طور پر ہم پنجابی ہیں، لیکن ہمارے والدین نے کبھی ہمیں پنجابی بولنے نہیں دی۔ ہم اپنے گھر میں ہی رہتے تھے۔ باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی کہ کہیں بچے پنجابی نہ سیکھ لیں۔ امی ویسے تو ہاؤس وائف رہیں لیکن زندگی میں کچھ ایسا وقت بھی آیا کہ انہیں کام کرنا پڑا۔ والدین کی آپس میں کھٹ پٹ..... بس ساری زندگی ایسے ہی معاملات چلتے رہے۔ والد صاحب گاؤں میں پیش امام تھے اور اب مختلف جگہوں پر جا کر لیکچر دیتے ہیں۔ میں نے لاہور گورنمنٹ کالج سے پولیٹیکل سائنس میں ماسٹرز کیا ہے اور بہن بھائیوں میں ایک بہن مجھ سے بڑی ہیں اور ایک بھائی مجھ سے چھوٹا ہے۔ میں 29 مئی 1984ء کو پیدا ہوا۔"

"بچپن میں کیسے تھے، پڑھائی میں کیسے تھے، کیا بننا چاہتے تھے؟"

"اگر آپ بہت بچپن کی بات کریں تو بچپن سے ہی ایک آواز کانوں میں گونجتی ہے کہ انجینئر، ڈاکٹر یا پائلٹ بننا ہے۔ گاؤں میں دو کمرے کے گھر میں رہتے تھے۔ ایک کمرا ابا کی کتابوں سے بھرا ہوا ہوتا تھا کیونکہ انہیں ہمیشہ سے کتابیں پڑھنے اور دین کا علم حاصل کرنے کا شوق تھا۔ گھر میں ٹی وی رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ ریڈیو سننے کی اجازت نہیں تھی۔ گانے سننے کی اجازت نہیں تھی۔ باہر کھیل نہیں سکتے تھے، گھر میں کوئی تفریح نہیں تھی۔ کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔ تو بس پھر ابا کی چھوٹی سی لائبریری میں گھس جایا کرتے تھے اور علم کی تمام کتابیں، تفہیم القرآن، صحاح ستہ وغیرہ سب پڑھ لیں۔ کتنی سمجھ میں آتیں اور کتنی سمجھ میں نہیں آتیں، لیکن لاشعور میں وہ اسٹور ہوتی رہیں تو بس بچپن اس طرح کتابوں کے بیچ میں گزر گیا۔"

"گھر سے باہر نکلنے کی پابندی۔ ریڈیو نہیں، ٹی وی نہیں، گانے نہیں سننے، تو جس نے بچپن میں ریڈیو، ٹی وی دیکھا نہیں وہ خود اس فیلڈ میں کیسے آ گیا؟"

"زندگی بڑے ارتقا کے مراحل سے گزرتی ہے اور جس چیز کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے، ایک وقت ایسا آتا ہے کہ آپ شعوری سطح پر اس مقام پر آ جاتے ہیں اور پھر سوچتے ہیں کہ میں تو پاگل تھا جو ایسا سوچتا تھا۔ اور میں تو آیا ہی پی ٹی وی پر اور میری بیوی بھی ٹی وی پر آئی۔ جس کا کبھی کسی نے تصور بھی نہ کیا ہو گا اور ابا کو تو خیر ہمیشہ سے ہی اعتراض رہا میرے ٹی وی اسکرین پر آنے کا۔ انہیں شاید یہ خوف تھا کہ میں اگر ٹی وی پر آیا تو گانے گانا شروع کر دوں گا۔ مگر اب ایسا نہیں ہے، اب خوش ہوتے ہیں اور سب کو بتاتے ہیں کہ یہ میرا بیٹا ہے۔ اب یہ سوال کہ میں اس فیلڈ میں آیا کیسے۔ تو بچپن سے ہی تقریری مقابلوں میں حصہ لینے کا شوق تھا۔ پھر کالج میں بھی بہت بھرپور زندگی گزاری اور پاکستان کا ہر بڑا تقریری مقابلہ جیتا۔ سب کا یہ کہنا تھا کہ آپ بڑا اچھا بول لیتے ہیں۔ کالج لائف سے مجھے یہ احساس ہو چلا تھا کہ میں ایک دن کافی مشہور ہو جاؤں گا۔ میڈیا مجھے بہت متاثر کرتا تھا اور اس میں آنے کے لیے کبھی ادھر تو کبھی ادھر آڈیشن دیتا رہتا تھا اسکول کالج کے زمانے سے ہی میں سب کی توجہ کا مرکز رہا ہوں۔ نعتیں پڑھنی، تلاوت کرنی، تقریری مقابلوں میں حصہ لینا۔ کالج میں آئے تو بزم فروغ اردو، ڈیبیٹنگ سوسائٹی، پنجابی ادبی مجلس، بزم شاعری، ڈرامیٹکس کلب میں کسی کا صدر تو کسی کا جنرل سیکریٹری غرض یہ کہ کسی نہ کسی عہدے پر رہا اور کسی نہ کسی حوالے سے پہچان رہی میری.....

سب سے پہلا آڈیشن میں نے پی ٹی وی لاہور میں دیا، بحیثیت نیوز کاسٹر میں کامیاب ہوا، مجھے پانچ منٹ کا بلیٹن پڑھنے کے لیے دیا جاتا تھا۔ 2005ء میں پتا چلا کہ "اے آر وائی ون ورلڈ" کے لیے آڈیشن ہو رہے ہیں۔ میں بھی وہاں چلا گیا۔ وہاں تقریباً چار پانچ ہزار لوگ آڈیشن کے لیے آئے ہوئے تھے، میرا نمبر 2485 واں تھا۔ وہ ٹوکن میں نے ابھی بھی سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ لائن میں لگ کر آڈیشن دیا اور ان میں دو کا انتخاب ہوا لاہور سے۔ ایک کا نام "اقرار الحسن" تھا اور دوسری ایک تھیں "عائشہ بخش" اب جیو میں ہیں۔ میں تب سے لے کر اب تک اے آر وائی سے ہی منسلک ہوں۔

ابتدا میں یہ ہوا کہ چونکہ ان کا سارا اسیٹ اپ دبئی میں تھا تو انہوں نے کہا کہ آپ ہمیں جوائن کرنا چاہتے ہیں تو بحیثیت رپورٹر جوائن کر لیں، پھر میں نے لاہور کی سڑکوں پر چھ سے آٹھ مہینے خاک چھانی۔ اس کا بڑا فائدہ ہوا کہ فیلڈ رپورٹنگ آ گئی۔ پھر دبئی بلا لیا گیا وہاں سے تین سال خبریں پڑھیں۔ دبئی سے چینل کراچی شفٹ ہو گیا تو پھر یہاں سے بھی خبریں پڑھیں۔ ٹوٹل چھ سال خبریں پڑھیں اور اب گزشتہ ڈیڑھ سال سے "سرعام" کر رہا ہوں۔"

"دوسرے چینلز سے آفرز تو آئی ہوں گی، کھینچتے ہیں لوگ، اچھے لوگوں کو۔ ترقی کرنے کو دل نہیں چاہتا؟"

"ظاہر ہے۔ جب میں نیوز کاسٹر تھا تو دو یا تین آفرز تھیں لیکن وہ اتنی اچھی نہیں تھیں، لیکن الحمد اللہ جب سے سرعام کر رہا ہوں پاکستان کا کوئی ٹاپ کا چینل ایسا نہیں ہے کہ جس نے مجھے آفر نہ کی ہو، لیکن اے آر وائی کو چھوڑنا نہیں چاہتا اور ترقی ہی کرنی ہے اور آگے ہی بڑھنا ہے تو میں اپنے ہی چینل سے کیوں نہ آگے بڑھوں۔ میں جب اس چینل سے پاکستان کے ہر دوسرے چینل کو بہت Beat کر رہا ہوں تو مجھے کیا ضرورت ہے دوسرے چینل پر جانے کی۔"

"اب کچھ باتیں ہو جائیں "سرعام" کی۔ یہ آئیڈیا کس کا تھا؟"



"آپ کو یہ جان کر حیرت ہو گی کہ اس کا کوئی آئیڈیا نہیں تھا۔ جب ہم اس پروگرام کو پلان کر رہے تھے تو ہم نے یہی سوچا تھا کہ ہم اس کو بالکل Open ended رکھیں گے اور اس میں مختلف قسم کے موضوعات کو شامل کریں گے۔ کسی دن سیاست پر، کسی دن سوشل ایشو پر، کسی دن آؤٹ ڈور بھی ہو سکتا ہے، کسی دن کہیں چھاپا بھی مارا جا سکتا ہے، کسی دن ڈاکیومنٹری بھی شامل کر سکتے ہیں اور کسی دن ڈاکیو ڈراما بھی کر سکتے ہیں۔ اب تک ہر طرح کے پروگرام کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ چھاپوں والے پروگرام زیادہ مشہور ہو گئے ہیں حالانکہ ہم نے سرکس پر، پاگل خانوں پہ اور سیاست پر بھی پروگرام کیے ہیں۔ بلکہ ہر طرح کے پروگرام کیے ہیں.....

اور یہاں یہ بات بھی میں آپ کو بتاؤں کہ اس میں ہمارا ایک سلاٹ خالی تھا جہاں آپ آج جس ٹائم "سرعام" دیکھتی ہیں وہ خالی تھا۔ ایک دن کراچی کے حالات کافی خراب تھے تو میں نے اپنی مینجمنٹ سے کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو کراچی کے حالات پر کچھ ریکارڈ کروں۔ انہوں نے کہا کہ ہاں کر لو۔ اس دن ایک دن میں تقریباً سو لوگ قتل کیے گئے تھے۔ وہ پروگرام ریکارڈ کیا پھر اسے آن ایئر کیا تو اس کا فیڈ بیک بہت اچھا

آیا۔ ریٹنگ بھی بہت اچھی آئی جو کہ چینل کی کامیابی کی ضمانت ہوتی ہے۔ پھر مجھ سے کہا گیا کہ خبریں بھی پڑھتے رہو اس خالی سلاٹ میں بھی کچھ نہ کچھ کرتے رہو۔ تو پھر ہم نے اس پروگرام کو اے آر وائی نیوز اسپیشل کے نام سے شروع کیا اور جب فیڈ بیک مزید اچھا آنا شروع ہوا تو کہا گیا کہ اس کو کوئی پراپر نام دے دیا جائے۔ دو نام تجویز ہوئے "انکار اقرار کے ساتھ" اور دوسرا نام "سرعام" تھا۔ میں نے پھر فیس بک اور ای میل کے ذریعے لوگوں سے رائے مانگی تو "سرعام" کو زیادہ پسند کیا گیا اور بس تب سے اب تک کر رہا ہوں۔"

"آپ نے کھانے پینے والی چیزوں پر بھی پروگرام کیے ہیں۔ کھانوں میں کیا کیا خطرناک اجزا اور مضر صحت چیزیں ملائی جاتی ہیں ان کو دیکھ کر تو سچ پوچھو کھانے پینے کی چیزوں پر سے اعتبار ہی اٹھ گیا ہے۔ آپ کے بارے میں سنا ہے کہ آپ اپنے کھانے پینے کا سامان دبئی سے منگواتے ہیں۔"

قہقہہ۔ "یہ خوب کہی آپ نے کہ دبئی سے آتا ہے۔ میں تو ہر پتھارے والے سے اور ہر چھوٹے ہوٹل سے بھی کھانا کھالیتا ہوں کیونکہ ہم لوگ اب ان چیزوں کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ اگر اصلی چیزیں کھائیں گے تو شاید وہ ہمیں ہضم نہیں ہو پائیں گی۔ ہاں اپنے بیٹے کے استعمال کی چیزیں اور کھانے کی چیزیں کسی اچھے اور مستند اسٹور سے خریدتا ہوں۔"

"آپ ماشاء اللہ ایک فیملی والے ہیں۔ اس پروگرام کی وجہ سے دھمکیاں ملتی ہیں۔ پروگرام کو بند کرنے کی یا آپ کو جان سے مارنے کی؟"

"ہاں جی۔ دھمکیاں بالکل ملتی ہیں۔ کیونکہ جن پر ہم ہاتھ ڈالتے ہیں اور جو جرائم پیشہ لوگ ہوتے ہیں وہ کسی بھی حد تک گر سکتے ہیں اور ایسا ہوا بھی، ہماری ٹیم پر فائرنگ بھی ہوئی۔ ہمیں دھکے بھی پڑے ہیں۔ مارا بھی ہے مگر ایک چیز غلط ہے تو کیا اسے نہ دکھائیں؟ کیا چپ کر کے بیٹھ جائیں، ڈر خوف مجھے بھی ہے کیونکہ میرا تین سال کا بیٹا ہے۔ میری بیوی ہے، میرے ماں باپ، بہن بھائی ہیں۔"

"اپنے لیے کیا بہتر سمجھتے ہیں "سرعام" یا نیوز؟"

"میرے لیے یہ پروگرام میرا مشن ہے۔ ایک بڑا مقصد سمجھ کر میں اس کو کرتا ہوں۔ میری خواہش بھی ہے اور میری کوشش بھی ہے کہ میری وجہ سے اگر ایک چھوٹی سی تبدیلی بھی آجاتی ہے تو سمجھیے کہ میرے پروگرام کا مقصد پورا ہو گیا ہے۔"

"لوگ اپنے پروگرام کی ریٹنگ بڑھانے کے لیے Fake(جعلی) پروگرام بھی کر لیتے ہیں تاکہ لوگوں پر اچھا تاثر پڑے تو کیا آپ کو کسی نے مشورہ دیا؟"

"Fake پروگرام تو خیر کبھی نہیں کیا لیکن کچھ چیزیں ضرور ہوتی ہیں۔ فرض کریں کہ ایک چیز ہمارے علم میں آگئی لیکن ہمارے پاس اس کا ثبوت نہیں ہے اور ہم اچھی طرح جانتے بھی ہیں۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ ہر چیز کیمرے پر کیسے لے کر آئیں تو کبھی کہا بھی جاتا ہے کہ اس طرح کر لیتے ہیں تو میں ہی منع کر دیتا ہوں کہ جب تک پراپر ثبوت نہ ہو کچھ نہیں کرنا ہے کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ آپ جتنا بھی لوگوں کو بے وقوف سمجھ لیں لوگ بڑی آسانی سے اب جج کر لیتے ہیں کہیں نہ کہیں سے ایسی بات ضرور ہو جاتی ہے جو آسانی سے پکڑی جاتی ہے۔ تو کیا ضرورت ہے ایک آدھ پروگرام کی ریٹنگ کے لیے اپنی عزت خراب کی جائے۔ آپ کو اندازہ نہیں کہ لوگ کتنی دعائیں دیتے ہیں مجھے۔ Fake پروگرام وہی کرتے ہیں جن کو کام کرنا مشکل لگتا ہے۔"

"اصل میں آدھے ایک گھنٹے کے پروگرام میں پکڑ دھکڑ بھی ہو رہی ہوتی ہے۔ سلوشن بھی پیش کیے جا رہے ہوتے ہیں سب کچھ ٹھیک ہو رہا ہوتا ہے تو پھر لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ یہ کیسے ممکن ہے۔"

"حالانکہ وہ نہیں جانتے کہ ہم لوگ کتنی راتیں جاگے ہیں۔ اس کے لیے کہاں کہاں گئے ہیں۔ کس کس شخص سے ملے ہیں تو چونکہ لوگوں کو یہ چیزیں ناممکن

لگتی ہیں اس لیے وہ اس بات پر یقین نہیں کرتے۔ ابھی جو ہم نے "سرعام" کی جعلی ٹیم پکڑی ہے اس کو 99.9 فیصد لوگوں نے سراہا مگر کچھ لوگوں کو یہ باتیں ہضم نہیں ہوئیں کہ اپنے ہی بندے کیسے پکڑ سکتے ہیں۔"

"کبھی حکومتی سطح پر پذیرائی ملی؟ کبھی اثر ہوا ان پر؟"

"بس کبھی کبھار کارروائی ہوتی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے ہمارے کچھ پروگراموں کا یہ اثر ہوا کہ آئی جی سندھ فیاض لغاری صاحب نے مختلف مواقعوں پر دو تین پروگراموں کے حوالے سے چھیالیس پولیس والوں کو معطل کر دیا تھا۔ ان میں ڈی ایس پیز بھی تھے ایس ایچ او بھی تھے۔ کبھی کبھار اثر ہوتا ہے، کبھی نہیں بھی ہوتا۔ اعلا سطح پر حکومت کاغذی کارروائی تو کر دیتی ہے مگر عمل درآمد نہیں کرواتی اور پچانوے فیصد ایکشن نہیں ہوتا لیکن پانچ فیصد ہوتا ہے، وہ بھی ہمارے لیے حوصلہ افزا بات ہے۔"

"کوئی ایسا پروگرام جس کی تیاری میں بہت ٹائم لگا ہو اور بہت مشکل بھی پیش آئی ہو؟ ہمت ہار گئے ہوں؟"

"اللہ کا بڑا احسان ہے کہ ہمت کبھی نہیں ہاری۔ ایک مرتبہ ہم نے پگ لیدر والا شو کیا تھا سور کی کھال سے جوتے بنائے جا رہے ہیں پاکستان میں۔ اس پروگرام کے لیے ہمیں چار پانچ ماہ لگے تھے اور اب ہم جعلی ادویات پر کام کر رہے ہیں چھ آٹھ مہینے سے۔ تو مشکل تو ہر پروگرام کے لیے ہوتی ہے۔ میں ہر پروگرام کو پہلا اور آخری پروگرام سمجھ کر کرتا ہوں۔"

"آپ کو تو انٹیلی جنس میں ہونا چاہیے، لیکن کیا کوئی بیک یہ ہے آپ کے جو آپ کو ان سب باتوں سے آگاہ کرتا رہتا ہے؟"

"اکثر لوگ پوچھتے ہیں کہ کیا آپ کے پیچھے ایجنسیاں ہیں۔ ساری بات ول پاور کی ہوتی ہے۔ مثلاً" میں بار بار کہتا ہوں کہ جو ڈرگ انسپکٹر ہیں جو



اس کام پر مامور ہیں، جب ہم جعلی دوائیں پکڑ سکتے ہیں تو یہ کیوں نہیں پکڑ سکتے۔ جبکہ ان کو تو تنخواہیں ہی اس بات کی ملتی ہیں... ہم تک بات مختلف ذرائع سے پہنچتی ہے۔"

"سرعام کے لیے کچھ کہنا چاہیں گے، پھر ذرا ہلکے پھلکے سوال کرتی ہوں۔"

"جی ضرور۔ "سرعام" اور میرا بیٹا پہلاج (Pehlaj) یہ میرے لیے زندگی کی دو اہم چیزیں ہیں۔ دونوں میری اولاد کی طرح ہی ہیں۔ بعض اوقات میں سوچتا ہوں کہ خدانہ کرے اگر مجھے کسی اور چینل میں جانا پڑے تو وہاں مجھے کسی اور نام کے ساتھ کام کرنا پڑے گا۔ جبکہ مجھے اس نام کے ساتھ اور لوگوں کو اس نام کے ساتھ جو محبت ہو گئی ہے اس پر کتنا اثر پڑے گا۔ ہماری اصل کمائی تو یہ ہے کہ جب کوئی بزرگ خاتون اپنی آنکھوں میں آنسوؤں کے ساتھ ہمارے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دیتی ہے تو سوچیے کہ ہمیں کتنا اچھا لگتا ہو گا۔"

"اقرار! باتیں بہت ہیں اور باتیں ہوتی بھی بہت ہیں مگر سب کچھ شائع نہیں ہو سکے گا۔ اس کے لیے معذرت۔ یہ بتائیے کہ چہرے پر جو اتنی معصومیت ہے اس کا کیا راز ہے؟"

قہقہہ۔۔۔۔ "میں نہیں سمجھتا کہ ایسا ہے' آپ کا شکریہ کہ آپ ایسا کہہ رہی ہیں۔"

"فارغ اوقات میں کیا کرتے ہیں۔"

"اب تو خیر فارغ وقت ہے ہی نہیں لیکن میرے دو شوق ہیں ایک تو کتابیں پڑھنا اور دوسرا اچھا میوزک سننا۔ میرے پاس بہت اچھا کلیکشن موجود ہے۔"

"شادی کب ہوئی' اور سنا ہے بہت جلدی ہوئی ہے؟"

"شادی 2007ء میں ہوئی اور جی ہاں بہت جلدی ہوئی ہے۔ میں نے سوچا کہ ایک کام جو کرنے والا ہے' اسے کرکے فارغ ہوا جائے کیونکہ زندگی میں اور بھی بہت سے کام کرنے ہیں۔"

"لوگ کہتے ہیں کہ پہلے ضروری کام نبٹالیں پھر شادی کریں گے اور یہ بھی کہتے ہیں کہ شادی کے بعد ترقی رک جاتی ہے۔"

"نہیں ایسا نہیں ہوتا کہ ترقی رک جائے' اور یہ بھی تو کہتے ہیں کہ کامیابی میں عورت کا ہاتھ ہوتا ہے تو عورت کا ہاتھ یہ نہیں ہوتا کہ وہ مرد کو بہش کرتی ہے یہ کرو اور وہ کرو۔ اصل میں وہ مرد کو سکون دیتی ہے۔ وہ اس کا ہر طرح کا خیال رکھتی ہے اور الحمدللہ میری بیگم بہت اچھی ہے' اس نے مجھے جتنی سہولت دی ہے جتنی آزادی دی ہے۔ میرے پروفیشن میں بھی۔ وہ اس بات کی قائل ہے کہ "جہاں بھی گیا لوٹا تو میرے پاس آیا"

"کتنی عجیب بات ہے کہ جس بچے کے گھر میں ریڈیو ٹی وی رکھنے کی اجازت نہیں تھی' وہ نہ صرف میڈیا میں آیا بلکہ شادی بھی اس نے پسند سے کی۔ گھر والوں نے اعتراض کیا؟"

ہنستے ہوئے۔ "گھر والوں کو اعتماد میں لے کر ساری بات کی تھی تو کچھ نہیں کہا گھر والوں نے اور راضی ہو گئے۔"

"کھانے پینے میں کیا پسند ہے۔"

"کھانے پینے کی روٹین اب کچھ عجیب سی ہو گئی ہے۔ کچھ پتا ہی نہیں چلتا کہ کیا کھانا ہے اور کب کھانا ہے۔ اسی وجہ سے میری توند بھی نکل آئی ہے' تھوڑا موٹا ہو گیا ہوں۔۔۔۔"

"بیگم بھی اس فیلڈ میں' آپ بھی اس فیلڈ میں۔ پرابلم نہیں ہوتی؟"

"نہیں بالکل نہیں۔ اللہ نے بڑے اچھے رشتے دیے ہیں۔ اور جتنا کام میں کرتا ہوں' اتنا ہی کام وہ بھی کرتی ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ گھر بھی سنبھالتی ہے اور پھر میری والدہ سب سے الگ ماں ہیں۔ ان کی وجہ سے دونوں اس فیلڈ میں کام کررہے ہیں' شاید نہ کرپاتے۔ بیٹے کے لیے "میڈ" تو ہے مگر وہ دادی کے بہت قریب ہے اور جب وہ دادی کے ساتھ ہوتا ہے تو ہمیں بھی لفٹ نہیں کراتا۔ اس لیے ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔"

"بیٹے کو آپ کی شکل کب کب نظر آتی ہے؟"

"بیٹے کو تو میں فل ٹائم دیتا ہوں جتنا اس کا حق ہے۔ خواہ میں کتنا بھی مصروف ہوں۔ فرض کریں کہ مجھے شوٹ پر جانا ہے اور آفس جانا ہے اور میرے پاس پندرہ منٹ کا ٹائم ہے تو میری کوشش ہوتی ہے کہ ان پندرہ منٹ میں اس کے ساتھ کھیلوں اور اس سے باتیں کروں۔ الحمدللہ اس کے حقوق پورے کرتا ہوں۔"

اور اس کے ساتھ ہم نے اقرار الحسن سے اجازت چاہی اس شکریہ کے ساتھ کہ انہوں نے اپنی مصروفیات میں سے ہمیں وقت دیا۔

سرورق کی شخصیت	
ماڈل	مہوش اور سنینا
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافر	موسیٰ رضا



خبریہ ویگیلا

تبصیرہ نگار

شادی مبارک

مارننگ شوز تقریباً" ہر چینل کی نشریات کا حصہ ہیں۔ یہ مارننگ شوز تقریباً" ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ عموماً" یہ بھیڑ چال کی روایت پر عمل کرتے ہیں۔ ایک چینل اپنے شو میں اگر کوئی چیز دکھا دے تو دیگر تمام چینلز اندھا دھند اس کی تقلید کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً" اگر کسی چینل نے مارننگ شو میں شادی کی تقریبات دکھائیں تو ہر چینل اپنے مارننگ شوز میں شادی کا ڈھول پیٹنا شروع کردیتا ہے۔ صرف شوز کے فارمیٹ کے حوالے سے ہی نہیں نقل تقلید کی جاتی۔ بلکہ مارننگ شوز کی میزبان بھی ایک دوسرے کی نقل کرتی نظر آتی ہیں۔ محض شوز میں پہنے جانے والے لباس' ہیئر اسٹائل اور میک اپ میں ہی نہیں۔ بلکہ اپنی اپنی ذاتی زندگیوں میں بھی یہ ایک دوسرے کی نقل کرتی ہیں۔ کم از کم حالات وواقعات سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً" ایک معروف چینل کے مارننگ شو کی میزبان نے اپنے شوہر سے طلاق کیا لی۔۔۔۔ ان کے پیچھے شوہروں سے طلاق لینے والی مارننگ شوز کی



میزبانوں کی ایک قطار لگ گئی۔ ایسے میں ایک نجی چینل کے مارننگ شو کی میزبان جگن کاظم نے ذرا ہٹ کے کچھ کیا ہے۔ جگن کے لیے صرف مارننگ شو کی میزبانی کا حوالہ اس لیے دیا جارہا ہے کہ یہ اب اداکاری سے ایک عرصے سے کنارہ کشی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ ہاں! تو بات ہو رہی تھی جگن کاظم کے نئی روایت کا آغاز کرنے کی..... تو جناب! بتاہی دیں کہ ایسے میں جب مارننگ شوز کی میزبانیں اپنے پرانے بندھن توڑ رہی ہیں، جگن نے ایک نیا بندھن باندھا ہے۔ یعنی گزشتہ ماہ جگن کاظم نے شادی کرلی ہے۔ (طلاق لینے کے لیے سب سے ضروری چیز ہے شادی۔... اور جگن شوبز میں آنے سے قبل ہی اپنی پہلی شادی ختم کرچکی تھیں) جگن کے شوہر فیصل نقوی پیشے کے اعتبار سے وکیل ہیں۔ شادی دونوں کی پسند سے انجام پائی ہے۔ اس شادی سے قبل جگن پہلے بھی ایک شادی کرچکی ہیں۔ مگر ان کی علیحدگی ہوگئی تھی۔ فیصل کا معاملہ بھی جگن جیسا ہی ہے۔ وہ بھی اپنی بیوی سے علیحدگی اختیار کر چکے ہیں۔ چنانچہ جب دونوں کی ملاقات ہوئی تو ایک جیسا پس منظر رکھنے کی وجہ سے دونوں نہایت تیزی سے ایک دوسرے کے قریب آگئے اور بالآخر شادی کرلی۔ زندگی کے اس نئے خوش گوار موڑ پر جگن اور فیصل کے لیے ڈھیروں دعائیں۔

من موجی

من موجی انسان کبھی بھی، کچھ بھی کر سکتا ہے۔ من میں آئے تو وہ آسمان کے تارے بھی توڑ سکتا ہے اور من نہ ہو تو ایک تنکا بھی نہیں توڑتا۔ اپنی اداکاراؤں کی اکثریت خیر سے خاصی من موجی واقع ہوئی ہے۔

ڈراما "ہاتھ بڑھا زندگی" کی شوٹنگ زور و شور سے جاری تھی۔ ڈرامے میں حصہ لینے والے فنکار بڑی دلجمعی سے کام کر رہے تھے۔ ڈراما تقریباً" مکمل ہو چکا تھا۔ اس حوالے سے فنکاروں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ کیونکہ انہیں اس ڈرامے سے بے حد توقعات وابستہ تھیں۔ ڈرامے کا محض ایک سین ریکارڈ ہونا باقی تھا کہ اچانک ڈرامے کی ہیروئن کام ادھورا چھوڑ کے ملک سے باہر چلی گئیں۔ (گویا پکا کام کیا کہ پروڈیوسر انہیں تلاش ہی نہ کرسکے) یہ من موجی ہیروئن معروف اداکارہ ثنا ہیں۔ ثنا کا محض ایک سین کا کام رہ گیا تھا کہ وہ کام ادھورا چھوڑ کر ملائیشیا چلی گئیں۔ جہاں ان کا پندرہ دن قیام کرنے کا ارادہ ہے۔

فیض احمد فیض کے عشق میں تو کبھی کام آڑے آیا تو کبھی کام میں عشق الجھا۔ سو انہوں نے تنگ آکر دونوں کو ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ اب ثنا کے کام میں کیا آڑے آیا ہے۔ جو وہ کام ادھورا چھوڑ کر ملک سے باہر چلی گئیں۔ یہ تو خود ثنا ہی واپس آکے بہتر بتا سکتی ہیں۔ ہاں! ہم اتنا ضرور جانتے ہیں کہ اپنی بے جا اہمیت جتانے کے لیے اکثر لوگ ایسے ہتھکنڈے اپناتے ہیں

انوکھی درآمد

پاکستان بننے کے ایک سال بعد جب لیاقت علی خان نے امریکا کا دورہ کیا۔ تب سے امریکا نے پہلے ہم پر اپنا استحقاق اور پھر دھیرے دھیرے اپنا تسلط قائم کرلیا۔ ہمارے سارے ملکی فیصلے امریکا سے درآمد ہونے لگے۔ یوں ہماری حکومتیں اور عوام کی قسمت امریکا کے اشاروں پر ناچنے لگی۔ مگر جناب!

بات ہوتی گلوں تک تو سہہ لیتے ہم
اب تو کانٹوں پہ بھی حق ہمارا نہیں

امریکی مداخلت محض ملکی فیصلوں تک ہی محدود نہیں رہی۔ بلکہ اب عوام کے جذبات پر بھی امریکی تسلط قائم ہونے والا ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ اس سال چودہ اگست کے موقع پر ایک خصوصی ملی نغمہ تیار کیا جا رہا ہے۔ اس ملی نغمے کو انور مقصود نے تحریر کیا ہے۔ جبکہ دھن ارشد محمود نے بنائی ہے..... اور 'اور' اور اس نغمے کو گا رہی ہیں ایک امریکی گلوکارہ 'ہیدر شمٹ۔' گویا اب عوام میں ملی جذبات بھی امریکی زبان کے ذریعے اجاگر کیے جائیں گے۔ (چلو جی! اب ملی جذبات کی درآمد کا انوکھا کاروبار بھی شروع ہوگیا۔) ہیدر شمٹ کے شوہر پاکستانی ہیں۔ اس لیے وہ پاکستان آتی جاتی رہتی ہیں اور روانی سے اردو بولتی ہیں۔ (اوہو! آج کل تو مشرقی بہوئیں ہی اچھی سے اچھی سسرال کے بھی گن گاتی نظر نہیں آتیں..... تو یہ مغربی بہو سے سسرال کا قصیدہ کیوں گوایا جارہا ہے۔ خیر! یہ تو متعلقہ افراد جانیں۔ ہم تو بس اسی فکر میں ہیں کہ کیا اب "ملی نغموں" پر بھی ہمارا حق نہیں رہا؟)

کچھ ادھر ادھر سے

ایک مقبول چینل پر ایک مداری نے وختا ڈالا ہوا ہے۔ روز مذہب کی تجارت کرکے رمضان کو رسوا کرتا ہے۔ گھنٹوں ڈگڈگی بجاتا ہے۔ جھولی سے الم غلم نکالتا ہے اور ترسے ہوئے لوگوں پر پھینک دیتا ہے۔ پھر لوٹ مار کا تماشا دیکھتا ہے۔ رمضان جیسے مبارک مہینے کو بھانڈوں، مداریوں، اداکاروں اور کاسہ برداروں



کے حوالے کرکے اس چینل نے اپنی خدمت کی ہو تو کی ہو، اسلام یا عوام کی کوئی خدمت نہیں کی۔ یار! یہ سب کرو۔ مگر رمضان کے نام پر تو نہ کرو۔ کسی گلی محلے چوک چوراہے میں اپنا منجن بیچو۔

(ڈاکٹر ضیاءالدین خان..... امت)

موروں کی موت پر ماتم کرنے والے میڈیا سے صرف اتنی التماس ہے کہ وہ ان اہلیان تھر کی زندگی میں بہتری لانے کے سلسلے میں آواز بلند کرے۔ اگر وہ لوگ بچ گئے تو مور نہیں مریں گے۔

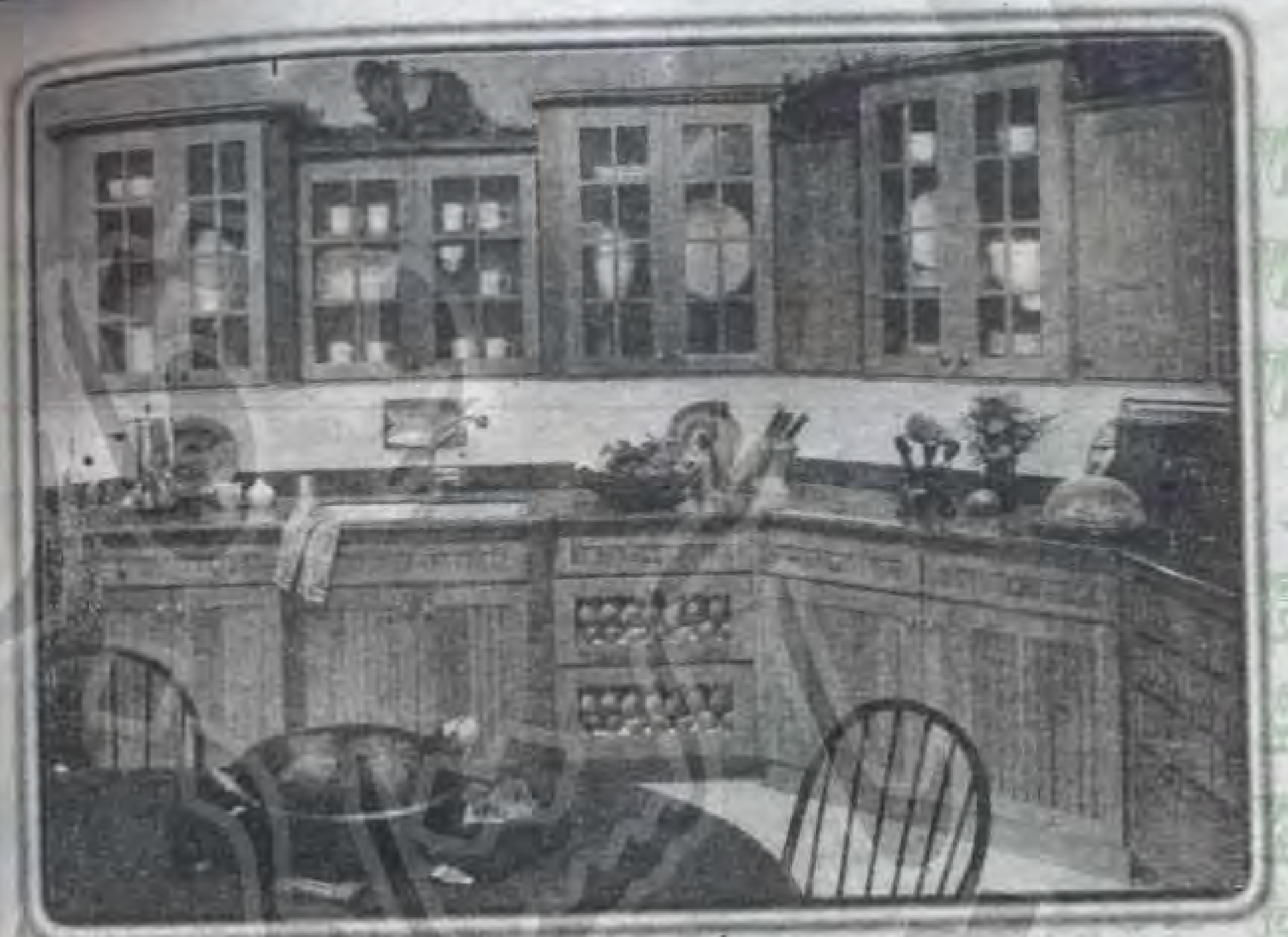
(اعجاز منگی۔ آواز حق)

امریکا میں قید ڈاکٹر عافیہ صدیقی کے بیٹے احمد نے قرآن پاک حفظ کرنے کی صلاحیت حاصل کرلی ہے۔

(نجی ٹی وی)

آم چھاتی اور کولون کے سرطان سے محفوظ رکھنے میں معاون ثابت ہوا ہے۔ آم اور دودھ کا آمیزہ مقوی دماغ ہے۔ اس کے استعمال سے دائمی سر درد اور آنکھوں کے آگے اندھیرا آنے کی شکایت دور ہو جاتی ہے۔

(ہمدرد صحت)



آپ کا باورچی خانہ

فاطمہ علی رضوی

پڑھائی سے فارغ ہونے اور گھر میں سب سے چھوٹی ہونے اور اس کے ساتھ ساتھ سب کی شادیوں کے بعد میرا نمبر ہونے کی بنا پر کچن کی تقریباً" ساری ذمہ داری اب میرے نازک کندھوں پر آچکی ہے۔ عرصہ ہوا مجھے کچن کی ذمہ داری سنبھالتے ہوئے تو سوچا کہ جناب ذرا ہم بھی "آپ کے باورچی خانہ" میں شرکت کرکے آپ سب کو اپنے جوابات سے سگھڑ ہونے کا ثبوت دیں۔ (آہم آہم...)

1 ۔ ہمارے ہاں کھانا پکاتے ہوئے پسند ناپسند کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ بڑے بھائی اور ان کے ساتھ ساتھ باقی سب کی بھی پسند بہت اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔

2 ۔ ہمارے ہاں اچانک مہمان آنے کا بہت رواج ہے لہٰذا فریج میں مرغی کا گوشت ہمہ وقت پایا جاتا ہے جو کہ وقت ضرورت چکن کڑاہی، چکن اچاری کی صورت میں جلدی سے تیار ہوجاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ آلو کے کٹلس میں فوری طور پر بھابھی کے ساتھ مل کر بنالیتی ہوں۔

آلو کے کٹلس

اجزاء :

ابلا ہوا چکن (ریشہ دار)	تین پیس
آلو ابلے ہوئے	آدھا کلو
ہرا دھنیا	آدھی گٹھی (باریک کٹی ہوئی)
ہری مرچ	چار عدد (باریک کٹی ہوئی)
نمک	حسب ضرورت
کالی مرچ	حسب ضرورت
انڈہ	ایک عدد
ڈبل روٹی یا پاپے کا چورا	حسب ضرورت

ترکیب :

آلو ایک پیالے میں ڈال کر اچھی طرح مسل لیں پھر اس میں چکن، ہرا دھنیا، ہری مرچ، نمک اور کالی مرچ ڈال کر اسے اچھی طرح سے مکس کرلیں۔ ایک پلیٹ میں انڈہ اور ایک پلیٹ میں بریڈ کرمز رکھ لیں۔ مکس آمیزے کے کٹلس بنا کر پہلے انڈے میں ڈبوئیں پھر بریڈ کرمز اچھی طرح لگا کر فرائی کرتی جائیں جب اس کی جلد ڈارک براؤن ہوجائے تو ایک پلیٹ میں ٹشو رکھ کر اس کے اوپر رکھتی جائیں۔ مزے دار کٹلس جھٹ پٹ تیار ہیں۔ کیچپ کے ساتھ پیش کریں، چاہے تو بنا کر فریز کرلیں۔

3 ۔ کھانا پکانے کے ساتھ میں کچن بھی صاف کرتی جاتی ہوں۔ سلیب پر اچھی طرح کپڑا پھیر کر اور کچن سمیٹ کر ہی باہر نکلتی ہوں اور ہفتے میں ایک بار تفصیلی صفائی ضرور کرتی ہوں۔ اس کے علاوہ کچن میں لیکوئیڈ سوپ ضرور رکھتی ہوں۔

4 ۔ ہمارے ہاں ناشتے میں زیادہ تر بھائی کے پسندیدہ نان چنے ہوتے ہیں غیر روز روز نہیں ہفتے میں دو دن ضرور بنتے ہیں ویسے رات کا سالن ساتھ روٹی یا پھر انڈہ ڈبل روٹی کھائی جاتی ہے۔ مہینے میں دو بار پائے بھی بنتے ہیں اس کے علاوہ میٹھے میں ہمارے ہاں کھویا سویاں بہت شوق سے کھائی جاتی ہیں لہٰذا یہ ترکیب آپ کے ساتھ ضرور شیئر کروں گی۔

کھویا سویاں

اجزاء :

سویاں	ایک پیکٹ
کھویا	آدھا پاؤ
بادام	100 گرام
تازہ کریم	ایک کپ
پستہ	100 گرام
گھی	آدھا کپ
کیوڑہ	حسب ضرورت
الائچی پاؤڈر	چائے کا آدھا چمچہ
چینی	حسب ذائقہ

ترکیب :

سویوں کو ایک سے دو منٹ کے لیے گرم پانی میں ابال لیں اور چھان لیں پھر برتن میں گھی گرم کرکے یہ سویاں دو منٹ تک بھون لیں۔ پھر سویوں میں کھویا اور کریم شامل کریں اور دو منٹ تک پکائیں اس کے بعد چینی اور الائچی پاؤڈر ڈال دیں اور پھر چند منٹ پکانے کے بعد اس میں باریک کٹے بادام، پستہ، کیوڑہ ڈال دیں۔ یہ دودھ کے بغیر سویاں ہوتی ہیں اب ایک اچھی سی پلیٹ میں یہ سویاں نکالیں اور پھر اس کے اوپر چاندی کے ورق، پستہ، بادام (باریک کٹے ہوئے سجا کر پیش کریں اور داد وصول کریں)

5 ۔ باہر کھانے کا پروگرام اچانک ہی بن جاتا ہے۔ ساری بات بڑے بھائی کی اور ان کے موڈ کی ہوتی ہے مہینے میں دو سے تین دفعہ کبھی بجی، شوارما، باربی کیو کھانے ضرور چلے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کچھ کھالیا جاتا ہے۔

6 ۔ جب ماں جی تھیں تب ہر کھانا موسم کے لحاظ سے بنتا تھا۔ اب بھی کبھی کبھار بن ہی جاتا ہے۔ ساری بات وقت کی ہے۔

7 ۔ اچھا کھانا پکانے کے لیے ضروری ہے کہ دھیمی آنچ پر کھانا پکایا جائے اور کوکنگ آئل کو حسب ضرورت استعمال کریں نا کہ تیل میں ڈوبے کھانے بنائے جائیں۔ (ہے نا...؟)

8 ۔ کھانا پکاتے وقت ورد کرتی رہیں، چاہے درود شریف پڑھتی رہیں یا پھر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتی جائیں۔ آپ کا دھیان بھی لگا رہے گا اور کھانے میں برکت بھی ہوگی۔

☆



موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

شیر خرما

اجزا :

سویاں	آدھا پاؤ
دودھ	دو کلو
چھوہارے	بارہ عدد
کشمش	دو کھانے کے چمچے
چینی	ایک پاؤ
الائچی	چار دانے

ترکیب :

چھوہاروں کو ایک گھنٹے کے لیے گرم پانی میں بھگو دیں، پھر گٹھلی نکال کر دو ٹکڑے کرلیں۔ دودھ ابال لیں۔ چھوہارے ڈال کر ہلکی آنچ پر مزید پکائیں۔ تھوڑی دیر بعد چینی بھی شامل کردیں۔ سویوں کو ایک کھانے کے چمچے گھی میں بھون کر دودھ میں ڈال دیں اور ہلکی آنچ پر پکنے دیں۔ کشمش کو ذرا سے گھی میں فرائی کرکے سویوں میں ڈال دیں۔ حسب مرضی گاڑھا ہو جائے تو اتار لیں۔ ٹھنڈا ہونے پر الائچی پیس کر چھڑک دیں۔ مزے دار شیر خرما تیار ہے۔

رس ملائی

اجزا :

دودھ	ایک کلو
سوکھا دودھ	ایک کپ
بیکنگ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
انڈا	ایک عدد
الائچی	پانچ دانے
بادام، پستے	حسب مرضی
چینی	ایک کپ
گھی	ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب :

دودھ میں چینی، الائچی اور بادام، پستے (کتر کے) ڈال کر چولہے پر رکھ دیں۔ سوکھے دودھ کو بیکنگ پاؤڈر، انڈا اور گھی (گھی اگر دانے دار اور سخت جما ہوا ہو تو زیادہ اچھا ہے) کے ساتھ گوندھ لیں۔ دس منٹ رکھ کر ہاتھ چکنا کرکے چھوٹی چھوٹی گولیاں بنالیں۔ دودھ میں جوش آنے پر ساری گولیاں ڈال کر آنچ کم کردیں۔ وقفے وقفے سے چمچہ ہلاتے رہیں۔ دودھ گاڑھا ہو جائے اور گولیاں پھول جائیں تو اتار لیں اور ٹھنڈا کرکے بادام پستے کی ہوائیاں چھڑک دیں۔

چکن سپریم بریانی

اجزا :

چکن بریسٹ	ایک کلو
باسمتی چاول	آدھا کلو
چکن یخنی	ایک کپ
انڈوں کی زردی	دو عدد
مکھن	تین کھانے کے چمچے
لیموں کا رس	چار کھانے کے چمچے
سفید مرچ پاؤڈر	ڈیڑھ کھانے کا چمچہ
زردہ رنگ	دو چٹکی
لونگ	چھ عدد
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

یخنی میں انڈوں کی زردی، سفید مرچ پاؤڈر، نمک اور مکھن ڈال کر اچھی طرح یکجان کرلیں۔ چکن کے ٹکڑوں پر کٹ لگا کر لیموں کا رس لگائیں پھر اسے بھی یخنی میں ڈال دیں۔ چاولوں کو نمک اور زردے کا رنگ گھول کر لونگ کے ساتھ ابال کر رکھ لیں۔ تیل گرم کر کے چکن کو یخنی سمیت دس منٹ تک پکائیں۔ سرونگ ڈش میں چاول نکال کر اوپر سے چکن آمیزہ ڈالیں۔ (چاہیں تو پتیلی میں تہہ لگا کر مکس کرلیں) ابلے ہوئے انڈوں سے سجاوٹ کرکے گرم گرم نوش فرمائیں۔

مغلئی مرغ

اجزا :

چکن	ایک عدد
دہی	ایک کپ
پیاز	چار عدد
ثابت سرخ مرچ	چار عدد
مکمل ثابت گرم مسالا	حسب ضرورت
لہسن ادرک پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
ہری مرچ	چار عدد
چینی	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
سرسوں کا تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

لہسن ادرک پیسٹ میں دو پیاز، ثابت لال مرچ، ہری مرچ اور کالی مرچ ملا کر پیسٹ بنالیں۔ باقی دو پیاز سرسوں کے تیل میں براؤن کرکے نکال لیں۔ دہی میں چینی، پیاز اور ہلدی مکس کرلیں۔ گرم تیل میں تیز پات، لونگ، چھوٹی الائچی اور جائفل جاوتری پاؤڈر ڈال کر کڑکڑائیں، پھر لہسن پیاز کا پیسٹ، نمک اور چکن (بڑے ٹکڑے) ڈال کر بھونیں۔ دو کپ پانی ڈال کر درمیانی آنچ پر ڈھک کر پکائیں پھر دہی کا پیسٹ بھی شامل کردیں۔ پانی خشک ہو جائے تو تھوڑا سا بھونیں پھر

پانچ منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں تاکہ روغن اوپر آجائے۔

گلاب جامن

اجزا :

خشک دودھ	دو کپ
میدہ	ایک کھانے کا چمچہ
انڈا	ایک عدد
بیکنگ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
سوڈا	ایک چٹکی
الائچی پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
چینی	دو کپ
گھی	ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب :

خشک دودھ میں الائچی پاؤڈر اور چینی کے علاوہ تمام اجزا ڈال کر انڈے سے گوندھ لیں اور پانچ منٹ رکھ کر چھوٹی چھوٹی بالز بنا کر ہلکے گرم تیل میں ہلکی آنچ پر تل لیں۔ چینی میں دو کپ پانی ملا کر گاڑھا سا شیرہ تیار کرلیں۔ گلاب جامن سنہری رنگ کے ہوجائیں تو شیرے میں ڈال کر ہلکی آنچ پر پکائیں۔ گلاب جامن پھول جائیں تو الائچی پاؤڈر ڈال دیں۔ ڈش میں نکال کر بادام کی ہوائیاں چھڑک دیں۔

سوسیجز کباب

اجزا :

قیمہ	ایک کلو
پیاز	تین عدد
لہسن ادرک پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
ہری مرچیں	چھ عدد
ڈبل روٹی کا چورا	ڈیڑھ کپ
گرم مسالا پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
سرخ مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

قیمے میں تمام اجزا ملا کر باریک پیس لیں اور آدھے گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ پھر سوسیجز شیپ میں کباب بنا کر گہرے تیل میں تل لیں۔ سنہرے ہو جائیں تو لچھے دار کٹی پیاز اور املی کی چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

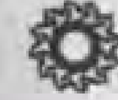
چکن نوابی مسالا

اجزا :

چکن	ایک کلو
پیاز بڑی	ایک عدد
لہسن ادرک پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
ناریل پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچہ
تل پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
کیوڑہ	ایک کھانے کا چمچہ
جائفل جاوتری	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
سرخ مرچ	ایک چائے کا چمچہ
دہی	ایک کپ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

پیاز براؤن کر کے چکن کے ساتھ لہسن ادرک پیسٹ' نمک اور سرخ مرچ ڈال کر بھونیں۔ پانی خشک ہونے لگے تو دہی کے ساتھ ناریل پاؤڈر اور تل پیسٹ ڈال دیں۔ ساتھ ہی آدھا کپ پانی ڈال کر ہلکی آنچ پر ڈھکن ڈھک کر پکائیں۔ گوشت گل جائے تو روغن آنے تک بھونیں پھر کیوڑے میں جائفل جاوتری ڈال کر چھڑک دیں۔ چند منٹ کے لیے دم پر رکھیں پھر گرم گرم نان کے ساتھ پیش کریں۔



بقیہ سروے

کی تیاریاں' تحفے' تحائف' عزیز و اقارب کو عیدی دینا۔ یہ سب کچھ اگر خلوص نیت سے کریں تو میری طرح آپ سب بھی محدود آمدنی میں با آسانی کر سکتے ہیں اور۔۔۔ اور۔۔۔ بات یہ بھی ہے کہ میں کافی پہلے سے

ایک ایک کر کے سب چیزیں اکٹھا کرتی جاتی ہوں۔ اس طرح رمضان میں اضافی اخراجات کا بوجھ نہیں پڑتا۔ پھر اللہ بھی روزی میں وسعت دیتا ہے۔ اگر ہم کسی کے لیے کچھ اچھا سوچیں تو ہمارے ساتھ کیسے کچھ برا ہو سکتا ہے۔ کیونکہ عید پر صرف اپنے گھر میں اضافی خرچا نہیں بڑھتا' بلکہ دینا دلانا بھی پڑتا ہے۔ اسی لیے اگر پہلے سے کچھ رقم ایک طرف پس انداز کریں اور پھر رمضان اور عید کی تیاریوں میں استعمال کریں تو کبھی بھی کسی پرابلم کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ ہم محدود آمدنی میں کفایت شعاری سے ہی کام لے کر اپنے اخراجات پورا کر سکتے ہیں۔ مگر رمضان میں ہم پر دوسرے سفید پوش لوگوں کا بھی حق ہے۔ اگر ہم نیک نیتی سے ان کی مدد کریں گے تو یقیناً" اللہ ہماری روزی میں برکت ڈال دے گا۔ (اپنا بہت خیال رکھیں' دعاؤں میں یاد رکھیں۔)

فرزانہ گل۔۔۔۔ کوٹ غلام محمد (سندھ)

1 ۔ عید کے دن سب سے زیادہ خوشی روزے مکمل ہونے کی ہوتی ہے۔ ہمارا یہ اہم ترین روایتی تہوار چوڑیوں' مہندی اور نئے ملبوسات کے بغیر نامکمل ہے۔ جب تک ہاتھ مہندی سے سرخ اور چوڑیوں سے کھنکتے ہوئے نہ ہوں' شیر خرما کھانے کا سواد ہی نہیں آتا۔ اسی لیے عید پر چوڑیوں' مہندی اور نئے ملبوسات کا اہتمام لازمی ہے۔ سوٹ چاہے لان کا ہو یا کاٹن کا۔ لیکن نیا ضروری ہے۔ ہمارے یہاں عید شیر خرما' ساگ پوری' چنے کی چاٹ اور قلمی بڑے بنتے ہیں۔ باقی ڈشز تو روایتی اور ہر جگہ ہی بنتی ہیں۔ تاہم قلمی بڑے اسپیشل ڈش ہے۔ جن کی ترکیب لکھ رہی ہوں۔ بہنیں بنائیں۔ بڑے مزے کے بنتے ہیں۔

قلمی بڑے

اشیا :

دال مونگ	200 گرام
دال مسور	200 گرام
دال چنا	200 گرام
نمک	حسب ذائقہ
سرخ مرچ پسی ہوئی	حسب ذائقہ
گرم مسالا (کوٹا ہوا)	دو کھانے کے چمچے
سوکھا دھنیا (کوٹا ہوا)	دو کھانے کے چمچے
ہرا دھنیا	دو کھانے کے چمچے
ہری مرچ کٹی ہوئی	چھ عدد
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب :

تمام دالیں تقریباً" دو گھنٹے کے لیے بھگو دیں۔ پھر موٹی موٹی پیس لیں۔ پھر اس میں نمک' مرچ' دھنیا' گرم مسالا وغیرہ ملا لیں اور ہتھیلی پر رکھ کر چپلی کباب جیسی موٹی موٹی ٹکیاں بنالیں۔ انہیں آہستہ آہستہ تیل میں ڈالیں اور تھوڑا تلنے کے بعد نکال لیں۔ ٹھنڈا ہونے پر چھری سے انگلی کی لمبائی اور موٹائی کے بقدر ٹکڑے کاٹ کر رکھ لیں۔ ضرورت کے وقت انہیں دوبارہ ڈیپ فرائی کرلیں اور سرخ ہونے پر نکال کر املی کی چٹنی کے ساتھ گرما گرم پیش کریں۔

2 ۔ چاند رات کو ہی تمام ڈشز تیار کر کے رکھ لیتی ہوں۔ صبح فجر کی نماز کے بعد رات کی بنائی ہوئی ڈشز کی فائنل ٹچنگ کر کے ٹیبل پر سیٹ کرتی ہوں۔ پھر صرف پوریاں بیلنی رہ جاتی ہیں۔ یہ کام بچیوں اور اپنی ساس کو سونپ کر شوہر اور بیٹے کی عید گاہ روانگی کی تیاری میں مدد کرتی ہوں۔ میرے میاں نماز سے قبل پوری تیاری کرتے ہیں۔ آنکھوں میں سرمہ اور

لباس پر عطر لگانے کی ذمہ داری میں ہی انجام دیتی ہوں۔ پھر شیر خرما کھلا کر دونوں کو عید گاہ روانہ کرتی ہوں۔ اس کے بعد میری پہلی کوشش ہوتی ہے کہ باتھ لے کر کاٹن یا لان کا سوٹ پہن کر تیار ہو جاؤں۔ تاکہ مرد نماز پڑھ کر آئیں تو میں تیار ملوں۔ کیونکہ ان کی شدید خواہش اور اصرار ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مہمانوں کی آمد شروع ہو جاتی ہے۔ پوریاں تل تل کر پیش کرتی رہتی ہوں اور پڑوسنیں بھی عید ملنے کے لیے آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ غرض اسی ملنے ملانے میں عید کا دن تمام ہو جاتا ہے۔ کوشش بھرپور ہوتی ہے کہ میں بھی عید ملنے جاؤں۔ لیکن مہمانوں کی وجہ سے یہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ پھر دوسرے دن عید ملنے جاتی ہوں۔ اگر کراچی، حیدر آباد سے مہمان آجائیں تو مصروفیت دوچند ہو جاتی ہے۔

3 ۔ عید کی دلچسپ اور سب سے خوب صورت روایت تو عیدی ہی ہے۔ عید آنے سے ایک ہفتہ پہلے سے ہی نئے نوٹوں کے پیکٹ کا شور ہوتا ہے، جو بالآخر چاند رات کو بارہ بجے تک آ ہی جاتا ہے۔ بچوں کی تو عید ہی عیدی سے مشروط ہے۔ اگر عیدی توقع سے کم ملے تو ان کے چہرے اُتر جاتے ہیں کہ اتنی سی عیدی ملی ہے۔ میرے بچے امی، ابو اور اپنی دادی سے بار بار مانگ مانگ کر عیدی وصول کرتے ہیں۔ ساتھ ہی شکوہ کرتے ہیں کہ ماموں اور پھپھو حیدر آباد میں کیوں رہتے ہیں۔ یہاں کیوں نہیں؟

5 ۔ مہنگائی کی بات نہ کریں۔ مبادا اور نہ بڑھ جائے۔ سب کہتے ہیں کہ مہنگائی بہت ہے۔ لیکن بازاروں میں رش دیکھ کر لگتا نہیں کہ مہنگائی ہے۔ رمضان کے آخری عشرے میں تو جسے دیکھو بازار میں ملتا ہے۔ شاید عید کے روایتی لوازمات پورے کرنے کے لیے۔ میرا اصول ہے کہ میں رمضان میں بازار نہیں جاتی اور عید کی شاپنگ شب برات سے پہلے مکمل کر لیتی ہوں۔ اس وقت چیزیں مناسب قیمت پر اور اچھی مل جاتی ہیں۔ اس طرح کافی بچت بھی ہو جاتی ہے۔ دوسری اہم بچت میں عید کی تمام ڈشز گھر پر بنا کر کرتی ہوں۔ ساگ بنا کر اور پوری کا آٹا گوندھ کر فریج میں رکھ دیتی ہوں اور مہمانوں کی آمد پر گرما گرم ساگ پوری، چاٹ اور ٹھنڈے اسکواش سے تواضع کرتی ہوں۔ دوسری عادت میری ہے کہ میں اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاتی ہوں۔ دوسروں کی حرص و حسد میں فضول خرچی نہیں کرتی۔ بلکہ اعتدال کی راہ اختیار کرتی ہوں۔ قرض لے کر خواہشات پوری کرنا مجھے سخت ناپسند ہے۔

شمائلہ نصیر عاجز... گاؤں کریا اسلام آباد

1 ۔ عید از خود ایسا سجا اور خوشبوؤں سے بھرا لفظ ہے کہ مزید کہنے کی ضرورت ہی نہیں بچتی اور جہاں اہتمام ہو رنگوں، خوشبوؤں اور ملبوسات کا تو پھر ہم لڑکیوں کا سوا سیر خون بڑھنا تو بنتا ہے۔ مجھے تو مہندی لگانا اتنا پسند ہے کہ... خود کو ہی نہیں، بلکہ دوسروں کو بھی لگاتی ہوں۔ یہاں چوڑیوں کا ذکر آیا۔ بڑا عرصہ ہوا انہیں پہنے وہ چھن چھن سی مخصوص آواز سنے۔ بچپن ہی تھا، جب سارے شوق پورے ہوا کرتے تھے۔ اچھے ڈریسز میری کمزوری ہیں۔ مگر کبھی مرضی سے نہیں بنوایا۔ مجھ میں انتخاب کرنے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت قریباً "ناپید" ہے۔ مگر اب کوشش کر رہی ہوں پُراعتماد ہو جاؤں۔ (دیکھیے! کیا بنتا ہے) جہاں تک بات کھانے پکانے سے متعلق ہے۔ تو اگر کسی کو اپنے ہاتھ سے گھڑے سے پانی بھی ڈال کر دے دوں نا تو لگتا ہے برف سا ٹھنڈا اور شہد سا میٹھا... اہم... آگے آپ اندازا لگا لیجیے۔ ویسے کبھی کچھ بنا لوں تو زبردست سے کم نہیں ہوتا۔

بہرکیف میرا کام اہتمام کرنا کم اور اس کا بیڑا غرق کرنا زیادہ ہوتا ہے۔ (مطلب زیادہ مقصد خود بنا کر خود ہی کھانے سے ہوتا ہے۔) سو اہتمام پر اگر کوئی محاورہ کہوں تو ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا یا پھر کوا چلا ہنس کی... (اتنی بے عزتی کافی ہے شاید)

2 ۔ بچپن کی عید کا آغاز قبرستان جا کر ہوا کرتا تھا۔ اگر بتیاں جلانا، سورہ یاسین پڑھنا۔ مگر اب کچھ ایسا نہیں رہا۔ عید کے دن میری فجر تو اکثر قضا ہو جاتی ہے رات دیر سونے کی وجہ سے۔ میٹھے میں صرف دودھ والی سویاں ہی پسند ہیں تو سنعیہ آپی وہی بناتی ہیں۔ ابو اور چاچو لوگ عید کی نماز پڑھ کر آجاتے ہیں تو عید ملتی ہوں اور ان سے عیدی لیتی بھی ہوں۔ پھر میٹھے سے فارغ ہو کر کپڑے پہنے اور آنکھوں میں کاجل لگایا۔ بس تیاری مکمل۔ بچپن میں یاد ہے کہ جوں ہی کپڑے، چوڑیاں آجاتی تھیں تو ندیدوں کی طرح عید کا انتظار کرتے تھے کہ کب آئے اور ہم انہیں پہن سکیں۔ آپی کے ہی ہاتھ کی مزے دار چاٹ نوش فرما کر آئے گئے کو سلام آداب بجالاتے ہیں۔ بس پھر اس کے بعد رج کے کھانے اور رج کے بور ہونے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔

3 ۔ موقع کوئی بھی ہو، خصوصی پکوان کا اہتمام تو ہمارے گھر کی روایت ہے اور پھر جہاں موقع ہو عید جیسا۔ خصوصی پکوان بنانے میں پہلا نمبر بابدولت خود ہی حاصل کرتی ہوں۔ کیونکہ تیسرے روز خاندان بھر کی دعوت کی جاتی ہے۔

4 ۔ پہلے زمانے کی سی گرم جوشی تو اب مفقود ہو کر رہ گئی ہے۔ نہ میں کہیں جاتی ہوں اور نہ ہی کوئی آتا ہے ملنے۔ ہاں البتہ دعوت پہ سب آتے ہیں تو ہی مل لیتے ہیں۔ چونکہ ابھی طالبہ ہوں تو عیدی لیتی ہوں ابو اور چاچو وغیرہ سے۔ ویسے اگر کتنی ہی بڑی ہو جاؤں خود مختار لیکن ابو سے مانگتی ہی نظر آؤں گی۔ ان کے ہاتھ سے کچھ لیے بغیر چین ہی نہیں آتا۔

5 ۔ اس سوال کا جواب ویسے تو میں ٹھیک سے شاید نہ دے پاؤں۔ کیونکہ میں ذمہ دار نہیں ہوں۔ لیکن ذمہ دار اگر اعتدال پسند ہو اور اپنی ضروریات سے زیادہ دوسروں کی ضرورت کا خیال رکھے تو کم آمدنی میں بھی ٹھیک گزارہ ہو سکتا ہے۔ بے شک ضرورت بھی اعتدال پسندی کی ہی ہے ملک کو بھی، ہمیں بھی۔ (کہا سنا معاف) خوش رہیے۔ خدا حافظ۔

نوال افضال گھمن... گجرات

1 ۔ عید کے حوالے سے تمام روایتیں واقعی اپنے اندر بہت خوب صورتی کی حامل ہوتی ہیں۔ میں بھی اپنی خواہش کے مطابق چوڑیاں، مہندی اور نئے کپڑے بنواتی ہوں۔ چاند رات کو انار کلی میں جا کر یا تو بازار سے مہندی لگوانا اور ملٹی کلرز کی چوڑیاں خریدنا بہت خواب ناک سا لگتا ہے۔ کپڑوں کی خریداری کے لیے اچھرہ مارکیٹ زندہ باد۔

2 ۔ عید کے دن کا آغاز بہت جلد ہو جاتا ہے۔ فجر ادا کر کے سارا گھر دھونا، خوب چمکا چمکا کر اور نلکے سے لگے پائپ سے بار بار پانی پینا ہائے آج کون سا روزہ ہے... ہاہاہا... نماز عید سے پہلے سویاں وغیرہ تیار کرنا ختم دلوانا اور پھر سویاں بانٹنا، عید کی نماز کے بعد تمام دوستوں کی آمد کا منتظر ہونا۔

3 ۔ ہاں جی ہمارے گھر میں زعفرانی فرنی تیار ہوتی ہے۔ ترکیب درج ذیل ہے۔ جو کہ بہت آسان سی ہے۔ مگر بہت لذیذ ہے۔

زعفرانی فرنی

اشیا :

دودھ	ایک کلو
چینی	چھ چمچے
زعفران	حسب ضرورت
چاول کا آٹا	ایک پاؤ
الائچی	دس عدد

ترکیب :

چاول کا آٹا تھوڑا پانی ڈال کر مکس کریں۔ دودھ میں سفید الائچی کے دانے ڈال کر پکائیں۔ جب دودھ نصف رہ جائے تو اس میں چاول کا آٹا ڈال دیں۔ دس منٹ پکائیں۔ آمیزہ گاڑھا ہو جائے تو اتار لیں۔ زعفران ڈال کر پیش کریں۔



مہندی کے ڈیزائن

ادارہ









عدنان

نفسیاتی اُلجھنیں

ہمارے اردگرد بہت سے لوگ ایسے نظر آتے ہیں جو آگے بڑھنے کے لیے بے تاب ہیں۔ ترقی کرنا اور آگے بڑھنا عین فطرت کا تقاضا ہے لیکن اس تقاضے کے لیے تحمل اور سکون بہت ضروری ہے لیکن لوگ بے تاب ہوتے ہیں۔ ان کی حرکات میں اضطراب ہوتا ہے۔ وہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں جیسے کوئی اہم کام کر رہے ہیں حالانکہ کوئی اہم کام نہیں ہوتا بلکہ اپنے کم تر پہلو کا احساس ان سے ایسے افعال کراتا ہے اور وہ یوں سمجھتے ہیں گویا وہ دوسروں سے برتر ہیں۔ ایسے لوگ ہمیشہ بے قرار رہتے ہیں اور نتیجے کے طور پر بے خوابی کا شکار رہتے ہیں۔ ان کے ذہن میں کمتری کا احساس اس قدر بے چینی پیدا کیے رہتا ہے کہ وہ مجبوراً" اسے چھپانے کے لیے عمل پیرا ہوتے اور بے چین رہتے ہیں۔

یہ بے چینی کسی ایسے خوف کی وجہ ہوتی ہے جو ان پر بھی عیاں نہیں ہوتا۔ اپنی صحت یا کسی دوست کی فکر یا کسی ناکامی کا خوف ان کے لاشعور میں ایک خوف پیدا کر دیتا ہے۔ کسی غلطی کے عیاں ہو جانے کا خدشہ بھی یہ حالت پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے اسباب خواہ کچھ بھی ہوں مگر کسی شخص پر خوف اور تشویش کے آثار نمایاں ہوں اور بے چینی، بے قراری کی وجہ سے ایسی حرکات سرزد ہونے لگیں تو سمجھ لیں کہ یہ شخص نفسیاتی طور پر کسی خوف کو محسوس کر رہا ہے۔ جس کا بعض اوقات اسے خود بھی علم نہیں ہوتا۔ اگر آپ کسی شخص میں ایسی صورت حال دیکھیں تو کسی ماہر نفسیات سے مشورہ کریں' اس کا علاج بہت آسان اور سہل ہے۔

☼ ☼ ☼

کبھی کبھی انسان کو کچھ فیصلے اپنی مرضی کے خلاف بھی کرنا پڑتے ہیں۔ بعض اوقات انسان کو اپنے آپ کو سمجھانا پڑتا ہے۔ کسی بات یا چیز کی خواہش رکھنا الگ بات ہے اور اسے حاصل کرنا یا کر کے رہنا الگ چیز ہے۔ خواہش رکھنا بری بات نہیں لیکن ناکامی پر بددل اور مایوس ہونا خرابی اور نقصان کی بات ہے۔ زندگی میں بہرحال سمجھوتے تو کرنا ہی پڑتے ہیں۔ خوش دلی کے ساتھ سمجھوتا کریں کیونکہ بددلی اور مایوسی سے ذہنی صحت کے ساتھ ساتھ جسمانی صحت پر بھی اثر پڑتا ہے۔

سائرہ

یہ زندگی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی امانت ہے۔ جو انسان کو صرف ایک بار ملتی ہے۔ اس امانت میں آپ کو خیانت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اصل میں طلاق ایک خوفناک چیز ہے۔ طلاق لینے اور دینے والے صرف اپنی طرف دیکھتے ہیں۔ بچوں کے مستقبل کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ بچے جب بڑے ہوتے ہیں تو حالات میں پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ان کے ذہن متاثر ہو جاتے ہیں۔ آپ کے معاملے میں آپ کے والد کو آپ کی زیادہ ضرورت ہے۔ وہ آپ کی توجہ اور محبت کے زیادہ مستحق ہیں۔ آپ اپنی ماں سے قطع تعلق کر لیں۔ انسان صرف اپنے لیے ہی زندہ نہیں رہتا ہے بلکہ اسے دوسروں کے لیے بھی زندہ رہنا پڑتا ہے۔ اپنے لیے تو سب ہی زندہ رہتے ہیں۔ دوسروں کے لیے زندہ رہنے کا نام ہی زندگی ہے۔

ع۔ا۔ گوجرانوالہ

میں نے آپ کے خط پڑھے ہیں۔ آپ بالکل نارمل اور صحت مند ہیں۔ جو باتیں آپ نے لکھی ہیں۔ وہ بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ آپ کو کچھ دوائیں استعمال کرنا ہوں گی۔ ہاں اگر فوری توجہ نہ دی تو آگے چل کر کچھ مسئلہ ہو سکتا ہے۔ آپ کے شہر میں اگر کوئی سائیکاٹرسٹ ہے تو آپ اس کو اپنا مسئلہ بتائیں اور جو دوائیں وہ تجویز کرے انہیں باقاعدگی سے استعمال کریں۔ ایک ہفتہ میں ہی نمایاں فرق محسوس ہوگا۔ روزانہ شہد کا ایک چمچہ آدھے گلاس پانی میں ملا کر پئیں۔ اس سے آپ کو تقویت حاصل ہوگی۔

دکھوں کی ماری

آپ کے ساتھ ایک مسئلہ ہوا جس کی بنا پر آپ کا رشتہ بھی ٹوٹ گیا پہلے ہی والد کی وفات کے بعد بھائیوں کی بے اعتنائی نے آپ کو کمزور کر دیا تھا پھر رشتہ ٹوٹا تو آپ مزید مایوس ہو گئیں۔ ایسے میں ان صاحب کو موقع ملا اور انہوں نے آپ سے ہمدردی کر کے آپ کا دل جیتنے کی کوشش کی۔ وہ شادی شدہ اور بچوں کے باپ تھے۔ آپ کو اور بھی بہتر رشتے مل سکتے تھے لیکن آپ ان سے متاثر ہو گئیں آپ کی شادی ان سے ہو گئی اور اب وہ بیوی جو انہیں پہلے پسند نہیں تھی۔ انہیں اچھی لگنے لگی ہے۔

آپ کو اپنے گھر بھی نہیں لے کر گئے ہیں۔ نہ ہی علیحدہ گھر لے کر دیا ہے۔ آپ اپنے بھائیوں کے ساتھ رہتی ہیں۔

اچھی بہن! جو کچھ ہوا' اس کی ذمہ داری سب سے زیادہ آپ پر عائد ہوتی ہے۔ آپ پڑھی لکھی ہیں۔ اپنے پیروں پر کھڑی ہیں۔ آپ کو سمجھ داری سے کام لینا تھا۔ دوسری شادی کرنا گناہ یا جرم نہیں ہے۔ لیکن مرد عموماً" انصاف نہیں کر پاتے کبھی دوسری بیوی کی طرف مائل ہو کر پہلی بیوی کی حق تلفی کرتے ہیں اور کبھی پہلی بیوی کی طرف لوٹ جاتے ہیں اور دوسری بیوی خالی ہاتھ رہ جاتی ہے۔ ان کی دوسری بیوی کا پلڑا اس لیے بھاری ہے کہ وہ ان کے بچوں کی ماں ہے۔

ایک صورت تو یہ ہے کہ آپ علیحدگی اختیار کر لیں لیکن آپ نے لکھا ہے کہ آپ ان کے بغیر نہیں رہ سکتیں تو آپ کو حالات سے سمجھوتا کرنا ہی پڑے گا۔ اور بہت کچھ برداشت کرنا پڑے گا اپنے بھائی سے کہیں وہ انہیں کسی طرح سمجھائے' وہ آپ کو گھر لے کر دیں یا اپنے گھر میں رکھیں۔ سکون آور ادویات کا اتنا زیادہ استعمال کسی طور درست نہیں ہے آپ اپنی صحت تباہ کر رہی ہیں' آہستہ آہستہ دواؤں کو کم کریں اور پھر چھوڑ دیں۔

اپنی جان لینے کی کوشش مزید حماقت ہے۔ آپ سمجھ دار میچور عمر کی خاتون ہیں۔ لوگوں کی باتوں میں آکر اپنی جان لینے کی کوشش کرنا بے وقوفی اور اپنی دنیا اور آخرت کو تباہ کرنا ہے۔

آپ نے خود کو دکھوں کی ماری لکھا ہے۔ جو کچھ آپ کے ساتھ ہوا۔ وہ افسوس ناک ضرور ہے لیکن اتنا بھی المناک نہیں۔ خود کو سنبھالیں' سکون آور دوائیوں کا سہارا لینے کے بجائے اللہ کا سہارا لیں۔ اللہ کا ذکر ہی دلوں کو سکون بخشتا ہے۔



امت الصبور

بیوٹی بکس

عید میک اپ سے پہلے کی تیاری

چہرے کی خوب صورتی میں سب سے زیادہ اہمیت جلد کی ہے۔ صاف شفاف، چمک دار جلد آپ کی خوب صورتی میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اگر چہرے پر مہاسے چھائیاں اور بال ہوں تو چاہے جتنا بھی اچھا میک اپ کرلیں۔ بے کار رہتا ہے۔ چہرے پر بالوں کی کئی وجوہات ہیں اِس میں ایک وجہ ہماری گرم تاثیر غذائیں ہیں۔

ہماری بہت سی بہنیں دیہی علاقوں میں رہتی ہیں جو بیوٹی پارلر نہیں جاسکتیں یا پھر ویکس منگوا نہیں سکتی ہیں تو وہ گھر میں بھی شیرہ تیار کرسکتی ہیں۔ ترکیب یہ ہے آپ آدھا کپ چینی لیں اِس میں ایک گلاس پانی ڈال دیں پھر ایک خوب رس والے لیموں کا عرق بھی ملا دیں بیج نکال دیں، پھر ایک برتن میں پکانے چڑھا دیں۔ جب اس کا پانی سوکھ کر جلنے لگے اور اوپر جھاگ آنا شروع ہوجائے جیسے ہی وہ ہلکا براؤن ہو ویسے ہی اتار لیں۔ زیادہ گہرا رنگ ہوگا تو جم جائے گا۔ پھر اسے ایک شیشے کی بوتل میں پلٹ لیں بوتل کھلے منہ کی ہو۔ اسے ٹھنڈا ہونے دیں۔ اتنا ٹھنڈا ہوجائے کہ آپ چہرے پر لگاسکیں۔ ہلکا نیم گرم جسے چہرے کی جلد برداشت کرسکے پھر کند چھری یا مکھن لگانے والی چھری سے لگائیں اور اوپر سے نیچے ہاتھ لائیں تاکہ سارے روئیں چھپ جائیں۔ اس پر فوراً ہی ایک موٹا کپڑا لگادیں اور ہلکے ہاتھوں سے دبائیں۔ جب وہ شیرا کپڑے میں جذب ہوجائے تو اسے نیچے سے پکڑ کر اوپر کی طرف زور سے جھٹکا دیں۔ شیرے میں سارے روئیں آجائیں گے اس طرح سارے چہرے پر کریں۔ آپ موٹے ——— کپڑے سے چھوٹے چھوٹے دس بارہ ٹکڑے بنالیں۔ ہر بار نیا کپڑا شیرے پر جذب کریں۔ سر کے بالوں کو پہلے اچھی طرح دوپٹے سے یا کسی کپڑے سے ڈھانک لیں ورنہ وہ چہرے پر آکر شیرے سے چپک جایا کریں گے۔ آنکھیں اور بھنویں بچاکر شیرا استعمال کریں آپ شیرے سے ہاتھ پیر سب کے بال صاف کرسکتی ہیں۔ یہ نقصان دہ بھی نہیں ہے اِس کے بعد جو لیموں کا عرق نکالا تھا۔ اس کے چھلکے کو چہرے پر ملیں پانچ منٹ تک۔ بعد میں گرم پانی سے منہ دھو کر برف سے مساج کریں تاکہ مسام بند ہوجائیں اگر جلد خشک ہے تو بالائی کی چکنائی لگالیں اور اگر جلد چکنی ہے تو ہلکی کولڈ کریم لگا کر چہرہ کسی کپڑے سے اچھی طرح صاف کرلیں۔

اب چہرے پر ماسک لگائیں۔

ایک بہت سادہ اور آسان ماسک۔ ایک انڈے کی سفیدی اچھی طرح پھینٹ لیں۔ اس میں ایک چمچہ لیموں کا عرق اور ایک چمچہ شہد ملالیں۔ روئی کی مدد سے اسے چہرے پر لگائیں۔ بیس منٹ تک لگا رہنے دیں۔ پھر صاف ٹھنڈے پانی سے چہرہ دھولیں۔

اب عید کے دن ہلکا سا میک اپ بھی کریں گی تو چہرہ چمک اٹھے گا۔

